دسمبر 2013
کرن
مکمل ناول نمبر
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

مستقل سلسلے

دسمبر 2013
جلد 36 شمارہ 9
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ
کرن
37- اردو بازار کراچی

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

دسمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
2013ء بھی اپنے اختتام کو پہنچا مگر گردش لیل و نہار جاری ہے۔ دن، مہینے، سال گزرتے چلے جاتے ہیں، موسم بدلتے رہتے ہیں، ہر خوب صورت آغاز اپنے انجام سے ہمکنار ہونے کے لیے محوِ سفر رہتا ہے کہ وقت کا پہیہ تو بہرحال چلنا ہے۔
پیڑ، پودے، پہاڑ، آبشار، سبزہ زار، لوگوں کی بھیڑ بھاڑ، چہرے، خدوخال، غرض یہ کہ ہم ہر چیز میں خوب صورتی تلاش کرتے ہیں اور بدصورتی سے نظریں چراتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہم فلموں، ڈراموں، افسانوں اور قصے کہانیوں کی بھی "ہیپی اینڈنگ" چاہتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ہر آغاز کو خوب صورت انجام تک پہنچانے کا بیڑہ اٹھالیں۔
آیئے رواں عیسوی سال کی سرحد پر کھڑے ہو کر نئے سال کا استقبال کریں۔ اس عہد کے ساتھ کہ ہم محبتیں بانٹیں گے، محبتیں سمیٹیں گے، خوشیاں کشید کریں گے، خوشیاں لٹائیں گے، ملک پاکستان کو امن و آشتی کا گہوارہ بنائیں گے اور بفضل تعالیٰ بشرطِ زندگی آنے والے سال کو بھی ایک خوب صورت اختتام دیں گے۔
اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، آمین۔

اس شمارے میں،

- اریج فاطمہ سے شاہین رشید کی ملاقات،
- "میری بھی سنیے" میں رِدا اصفہانی کی باتیں،
- "مقابل ہے آئینہ" میں اقرا مظفر،
- نبیلہ عزیز اور فوزیہ یاسمین کے ناول کی اقساط،
- فاخرہ گل، فرح بخاری، فرحین اظفر اور حیا بخاری کے مکمل ناول،
- ریحانہ امجد بخاری اور غزالہ جلیل راؤ کے دلکش ناولٹ،
- فرحی نعیم، عنیقہ محمد بیگ اور فہیم مک کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

کرن کے ہر شمارے کے ساتھ معلوماتی کرن کتاب "موسم کے رنگ" علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

اُس کی کرتے ہیں سات آسماں جُستجو
مہر و مہہ، انجم و کہکشاں جستجو

نکہتیں ہیں چمن میں اُسی کی بسی
اُس کی کرتا ہے یہ گلستاں جُستجو

"پی کہاں" اور "کُو کُو" کی آواز میں
گوشِ دل سے سُنو، ہے نہاں جُستجو

اُس کی وسعت سمائی ہے دل میں مرے
رہ گئے کرتے سب نکتہ داں جُستجو

کس نے کشتی نکالی ہے طوفان سے
بحر میں کرتا ہے بادباں جستجو

اُس کی قربت مرے دل کی آواز ہے
میرے ہر سجدے سے ہے عیاں جستجو

اُس کی آنکھیں ہیں نم، پھول ہے کر رہا
تیری رحمت کی اے مہرباں! جستجو

تنویر پھول

شعاعِ مہر منور شبوں سے پیدا ہو
متاعِ خواب مسرت غموں سے پیدا ہو

مری نظر جو گم ہو گیا وہ ظاہر ہو
صراطِ شہرِ صفا اُلجھنوں سے پیدا ہو

مثالِ قوس قزح بارشوں کے بعد نکل
جمالِ رنگ کُھلے منظروں سے پیدا ہو

گلِ مراد! سرِ دشتِ نامرادی کِھل
رُخِ نگار، وفا عملوں سے پیدا ہو

فروغِ اسمِ محمدؐ ہو بستیوں میں منیر
قدیم یاد نئے مسکنوں سے پیدا ہو

منیر نیازی

اریج فاطمہ سے ملاقات

شاہین رشید

اریج فاطمہ کو آج کل آپ متعدد ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔ ان کا اس فیلڈ میں آنا محض اتفاق تھا۔ کیونکہ یہ تو پاکستان اس لیے آئی تھیں کہ ان کو ایک این جی او کے لیے کام کرنا تھا۔ مگر وہ کام تو فی الحال بیچ میں ہی رہ گیا۔ البتہ ڈائریکٹرز کو ان کی شکل میں ایک اچھی فنکارہ مل گئی جس نے اپنی بے ساختہ اداکاری سے اس فیلڈ میں اپنے قدم تقریباً جما ہی لیے ہیں ایک "مسٹری ہورر" ڈرامے میں ایک بدروح کی اداکاری کر کے انہوں نے یہ ثابت کیا کہ یہ ہر طرح کے رول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

★ "ہیلو کیسی ہیں اور کیا ہو رہا ہے آج کل؟"

✳ "جی اللہ کا شکر ہے اور کام ہی ہو رہا ہے کچھ کام آن ایر ہو چکے ہیں۔ کچھ آنے والے ہیں اور کچھ کام تکمیل کے مراحل میں ہیں جو تکمیل کے مراحل میں ہیں ان میں "تیری الفت میں صنم" اور دو تین اور ڈرامہ سیریلز ہیں جن کے نام ابھی تک کنفرم نہیں ہوئے ہیں اور اداکاری کے علاوہ "ترکش" ڈراموں میں ڈبنگ بھی کرا رہی ہوں۔"

★ "بہت اچھی پرفارمر ہیں آپ۔۔۔ مگر کیا بات ہے کہ زیادہ تر رونے دھونے والے یا پھر نگیٹو رول ہوتے ہیں آپ کے؟"

✳ "سچ بات بتاؤں جب میں نئی نئی اس فیلڈ میں آئی تھی تو میری اردو کا بہت مسئلہ تھا تو میں زیادہ تر رونے دھونے والے کردار لیتی تھی کہ اس طرح کے کرداروں میں بولنا بہت کم پڑتا ہے۔ ڈائریکٹر کہتے تھے کہ اس میں کم بولنا ہے اس لیے آپ یہ کردار کر لیں۔ تو جو ذرا صحیح اردو میں نے بولی ہے وہ "ماہی آئے گا" میں اور "اک پاگل سی لڑکی" جیسی میں بولی ہے۔"

★ "اردو کیوں نہیں آتی؟ کہاں سے تعلق ہے آپ کا؟"

✳ "میری امی ایرانی ہیں اور ابو پاکستانی ہیں اور ہم سب بہن بھائی ملک سے باہر یعنی یو ایس اے میں پیدا ہوئے تو گھر میں ہمارے انگریزی بولی جاتی ہے اور میرے امی ابو ابھی بھی ملک سے باہر ہیں۔"

★ "تو آپ کیا کر رہی ہیں؟ پاکستان میں! اور کس کے پاس رہتی ہیں؟"

✳ "کیا کر رہی ہوں؟ کام کر رہی ہوں اور میں یہاں دادی دادا کے پاس رہتی ہوں اور چونکہ میں نے چائلڈ سائکلوجی پڑھی ہے تو میں یہاں پاکستان میں "این جی اوز" میں کام کرنے آئی تھی اور مجھے یہاں ایک "یتیم خانہ" کھولنا تھا یہی میری زندگی کا مقصد تھا اور اس لیے میں نے چائلڈ سائیکلوجی بھی پڑھی تھی مگر جب پاکستان آئی تو یہاں کے تو حالات ہی کچھ اور تھے اور مجھے یہاں کے حالات کا قطعی کوئی اندازہ کوئی آئیڈیا نہیں تھا کہ یہاں سیکورٹی کے کتنے ایشو ہوتے ہیں۔ تو بس پھر مجھے اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔"

★ "تو پھر اس فیلڈ میں کیسے آ گئیں؟ کیونکہ "یتیم خانہ" کھولنا اور شوبز میں آنا دو مختلف کام ہیں؟"

✳ "اس فیلڈ میں ایسے آئی کہ میرے چاچو جو پہلے پاکستان میں رہتے تھے وہ کمرشلز کرتے تھے۔ میں جب یہاں آئی اور این جی اوز کے سلسلے میں میرا کوئی کام نہیں بنا تو انہوں نے مجھے کہا کہ تم فلاں ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلی جاؤ میں چلی گئی۔ ابتدا میں ڈبنگ کا کام کیا کمرشلز میں مجھے یاد ہے کہ پہلا کمرشل ایک ٹیلی کام کمپنی کا تھا جس میں مجھے ایک لائن بولنی تھی اور اس ایک لائن کو صحیح طرح بولنے میں تقریباً "10 گھنٹے لگ گئے تھے مجھ سے ٹھیک طرح سے بولا ہی نہیں جارہا تھا۔ کمپنی والوں نے سر پکڑ لیا تھا اور یہی سوچا ہو گا کہ آئندہ نہیں لیں گے۔ اب سب اس وقت کو یاد کرتے ہیں تو ہنستے ہیں۔"

★ "اچھا۔۔۔ چلیں پہلے اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

✳ "جی ضرور۔۔۔ میرا اصلی اور پورا نام اریبہ فاطمہ جعفری ہے لیکن مجھے سب اریج بولتے ہیں جس کا مطلب خوشبو ہے اور پیار سے سب مجھے "بیا" بلاتے ہیں اور جناب میں 2 نومبر 1989ء میں یو ایس اے میں پیدا ہوئی میرے دو بھائی ہیں ایک مجھ سے بڑے ایک چھوٹے۔۔۔ میں درمیان کی ہوں۔"

★ "اچھا ۔۔۔ سنا ہے کہ درمیان کے بچوں کے ساتھ بہت زیادتی ہوتی ہے؟"

✳ ہنستے ہوئے "نہیں جی میرے ساتھ نہیں ہوتی کیونکہ میں اکلوتی بیٹی ہوں۔ بہت پیار محبت مجھے ملا ہے اور مل رہا ہے والدین کا بھی اور بھائیوں کا بھی۔"

★ "این جی اوز چلانے کا بنانے کا ارادہ تھا مگر اس

فیلڈ کے مزے آ گئے تو اس کو اپنانا ہے اب کیا؟ اور آپ کے والدین کیا کرتے ہیں؟"

* "ابھی بھی ارادہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میرے ارادے بدل گئے ہیں۔ اب میں نے یہ سوچا ہے کہ اگر میڈیا میں میرا نام بن جائے تو پھر لوگ میری باتیں بھی سنیں گے اور میرے ساتھ تعاون بھی کریں گے تب مجھے اپنے چیریٹی پروگرام کو شروع کرنے اور چلانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ اور جہاں تک والدین کا تعلق ہے تو امی آج کل ہاؤس وائف بنی ہوئی ہیں چھوٹے بھائی کی وجہ سے زیادہ تر گھر پر رہتی ہیں ویسے انہوں نے ماسٹرز کیا ہوا ہے اور والد یو ایس اے میں جاب کرتے ہیں۔"

★ "یہاں پاکستان میں آپ کا دل لگ گیا؟"

* "بالکل لگ گیا ہے کیونکہ یہاں میرے دادا دادی بھی ہیں اور پانچ عدد کزن بھی آئے ہوئے ہیں یو ایس اے سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے۔"

★ "یو ایس اے سے میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے پاکستان آئے ہوئے ہیں... لوگ تو باہر جاتے ہیں... یہ تو بڑی حیران کن بات ہے؟"

* "جی وجہ یہ کہ وہاں یو ایس اے میں ایم بی بی ایس کرنے میں 8 سال لگتے ہیں جبکہ یہاں پاکستان میں 5 سال لگتے ہیں تو بس انہیں جلدی تھی اپنی تعلیم مکمل کرنے کی تو وہ اپنی فیملی کے ساتھ یہاں آ گئے۔"

★ "پاکستان میں لڑکیوں کی شادی بھی جلدی ہو جاتی ہے تو آپ کے کیا ارادے ہیں اس بارے میں؟"

* "میں اپنی کزنز میں بڑی ہوں تو ظاہر ہے کہ پہلے میری ہی ہو گی تو آپ کو بتاؤں کہ میری بات پکی ہو چکی ہے اور میرے منگیتر، میرے ابو کی پسند ہیں اور وہ میرے کزن ہیں۔ تو بس ان شاء اللہ شادی بھی جلدی ہو جائے گی۔"

★ "شوبز میں مزے آ رہے ہیں اور کون سا تھا پہلا ڈرامہ؟"

* "پہلا کمرشل تو میں نے آپ کو بتایا کہ ٹیلی کام کا تھا جس میں ایک لائن بولنی تھی البتہ سیریل "ہزاروں سال تھا" اور یہ تین بیٹیوں کی کہانی تھی اور میری والدہ کا کردار زیبا بختیار نے ادا کیا تھا جبکہ والد کا کردار ساجد حسن نے کیا تھا اور اس میں بھی دکھایا گیا تھا کہ میں امریکہ سے آئی ہوں اور مجھے اردو بولنی نہیں آتی اور سچ مچ مجھے بولنی نہیں آتی تھی۔"

★ "مگر اب تو آتی ہے... تو اب کیا چاہیں گی کہ کس طرح کے رول ملیں... یا پھر رونے دھونے والے رولز میں زیادہ مزا آتا ہے؟"

* "اب تو میں بہت اچھی اردو بول لیتی ہوں۔ اس لیے میں چاہوں گی کہ میں اب ہر طرح کے رول کروں اور نگیٹو رول بھی کروں۔ پہلا نگیٹو رول میں نے "سبز قدم" میں کیا تھا یہ پہلے نگیٹو تھا بعد میں پوزیٹو ہو جاتا ہے تو نگیٹو میں کام کرنے کا مارجن بھی زیادہ ہوتا ہے اور جس سیریل سے میری پہچان ہوئی وہ "مر جائیں بھی تو کیا" اور "اک پاگل سی لڑکی" نے مجھے بہت شہرت دی۔"

★ "میں دیکھتی ہوں کہ آپ ڈراموں میں بہت فرماں بردار بیوی کا رول کرتی ہیں حقیقت میں بھی ایسی ہی اچھی بیوی ثابت ہوں گی؟"

* "نہیں جی اگر میرے ساتھ کسی نے برا کیا تو جوتے مار مار کر ٹھیک کروں گی۔"

★ "او... ہو... اس فیلڈ میں پیسے کی کشش زیادہ ہے یا شہرت کی؟"

* "دونوں کی کشش ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلا کمرشل کیا تھا تو مجھے 50 ہزار ملے تھے اور دیپک پروانی کا فیشن شوٹ کیا تھا تو مجھے "دو لاکھ" روپے ملے تھے اور میں بہت خوش تھی اور بہت کم پیسے خرچ کیے تھے کیونکہ میرے گھر والے فضول خرچی کو بالکل بھی پسند نہیں کرتے تو وہی عادت مجھ میں بھی ہے۔ گھر والے کہتے ہیں کہ حالات پتا نہیں کب کیا سے کیا ہو جائیں تو بچت ضرور کرنی چاہیے۔"

★ "بالکل ٹھیک کہتے ہیں... شوبز میں آ کر کیا بات

نوٹ کی؟... سینئرز کو کیسا پایا؟"

* "بہت سی باتیں نوٹ کی ہیں اور سب سے بڑی بات تو یہ نوٹ کی ہے کہ ہمارے سینئرز کسی کو پروف کرنے نہیں دیتے پہلے سے ہی کہہ دیتے ہیں کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے... اور میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہر کوئی مختلف ہوتا ہے اور ہر ایک کو آپ ایک جیسی عزت دیا کریں تو زیادہ بہتر ہوتا ہے... اور میں نے جو محسوس کیا ہے وہ یہ کہ جب میں آتی ہوں تو میری اپنی گاڑی ہوتی ہے میرے ساتھ میرا گارڈ ہوتا ہے۔ تو میرے ساتھ تو سب بہت اچھا سلوک کرتے ہیں لیکن جو دوسری لڑکیاں ہیں جن کے پاس یہ سہولت نہیں ہے ان کے ساتھ بہت بری طرح پیش آتے ہیں تو وہ بہت دل برداشتہ اور دکھی ہوتی ہیں۔"

★ "یعنی پیسے والوں اور خاص طور پر پیسے والی لڑکیوں کی قدر ہے؟"

* "میری تو شروع سے ہی عزت ہے کیونکہ سب کو پتا ہے کہ یہ "یو ایس اے" کی نیشنل ہے۔ پیسہ ہے اس کا فیملی بیک گراؤنڈ اسٹرونگ ہے اور یہ شوقیہ اس فیلڈ میں کام کرتی ہے۔ لیکن جو لوگ مجبوری میں کام کرتے ہیں ان کی نہ عزت ہوتی ہے نہ قدر ہوتی ہے۔"

★ "ہوں... اچھا... ویسے پاکستان میں رہنا اچھا لگ رہا ہے یا واپس امریکہ جانے کی خواہش ہے؟"

* "امریکہ میں تو گھر ہے اپنا... مگر اس کے باوجود مجھے یہاں پاکستان میں رہنا اچھا لگتا ہے اور اس لیے اچھا لگتا ہے کہ وہاں امریکہ میں حلال حرام کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے جبکہ یہاں پاکستان میں ہر چیز آسانی سے مل جاتی ہے۔ مگر ایک بات بتاؤں... یہاں آ کر میں بہت دبلی ہو گئی ہوں پتا ہے کیوں؟... مجھے یہاں کی گندم سے الرجی ہے۔ روٹی کھاتی ہوں تو بیمار پڑ جاتی ہوں۔ مگر ہر وقت چاول بھی تو نہیں کھا سکتی۔ اس لیے روٹی بھی کھاتی ہوں کیا کروں مجبوری ہے۔"

★ "اردو نہیں آتی تھی۔ اداکاری بھی نہیں آتی تھی مگر پھر بھی ایک کامیاب فنکارہ بن گئی ہیں تو لوگ تنقید کرتے ہیں کیا؟"

* "اداکاری کر کے تو مجھے خود بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ میں یہ صلاحیت دی ہے اور تنقید شروع شروع میں یہ ہوتی تھی کہ اردو کا تلفظ ٹھیک نہیں ہے۔ تو میں نے سب کو بتایا کہ اردو میری مادری زبان نہیں ہے۔ پھر یہ بھی کہتے تھے کہ ہر وقت رونے دھونے والے کردار ہی کرتی ہیں۔ تب بھی میں نے واضح کیا کہ مجبوری ہے اردو کی وجہ سے ایسے کردار لینے پڑتے ہیں۔ اور ایک بات بتاؤں آپ کو جب میں اس فیلڈ میں آئی تو میرا کام دیکھ کر ایک مشہور ڈائریکٹر نے کہا کہ ایک دن یعنی سال دو سال میں آپ پاکستان کی بہترین فنکارہ کہلائیں گی اور اللہ کا شکر ہے کہ اب آہستہ آہستہ لوگ میرے کام کو پسند کرنے لگے ہیں۔"

★ "ڈراموں میں جو ڈریسز ہوتے ہیں وہ آپ کے اپنے ہوتے ہیں یا ملتے ہیں آپ کو؟"

* "ارے جو ملتے ہیں وہ بہت ہی برے ملتے ہیں اس لیے میں زیادہ تر اپنے ڈریسز لے کر جاتی ہوں اور مجھے چونکہ چوڑی دار پاجامہ اور کرتا پسند ہے تو آپ نے دیکھا ہو گا کہ میں زیادہ تر یہی لباس پہنتی ہوں۔"

★ "کون سا کردار کرنا چاہتی ہیں اور کسی کردار کو کر کے پچھتائیں؟"

* "شروع شروع کے جتنے بھی کردار تھے ان کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں نے بہت برے کیے ہیں۔ مجھے خود بھی اپنی پرفارمنس اچھی نہیں لگی اور کون سا کردار کرنا چاہتی ہوں تو میں نے ینگ تو اولڈ کردار تو کیے ہیں لیکن اولڈ کرداروں میں "ساس" کا رول کرنا چاہتی ہوں۔"

★ "آپ نے اپنی کس عادت سے فیلڈ کے لوگوں کو متاثر کیا ہے؟"

* "میں وقت کی بہت پابند ہوں۔ ایسے ملک میں پلی بڑھی ہوں جہاں وقت کی بہت قدر کی جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں وقت کی پابندی کرنے والا بے وقوف کہلاتا ہے ..... مگر میں پھر بھی پابندی کرتی ہوں۔ کیونکہ میں اپنی عادت خراب نہیں کرنا چاہتی۔ ہمیشہ شوٹ سے ایک گھنٹے پہلے پہنچ جاتی ہوں چاہے کوئی آئے یا نہ آئے۔"

★ "یہ رونے دھونے والے اور اکثر مار پیٹ کے سین بھی ہوتے ہیں یا سب حقیقی ہوتے ہیں یا کیمرہ ٹرکس ہوتے ہیں؟"

✻ "کچھ رونے والے سین ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے مجھے گلسرین استعمال کرنی پڑتی ہے ورنہ اپنے اوپر طاری کر لیتی ہوں اور جہاں تک مار پیٹ والے سین ہیں تو میں یہی کہتی ہوں کہ آپ اسے سچ مچ کریں ورنہ لوگوں کو سمجھ میں آجاتا ہے کہ یہ سب کچھ Fake ہے۔"

★ "فلمیں دیکھتی ہیں..... کون پسند ہے؟"

✻ "جی فلمیں بہت شوق سے دیکھتی ہوں اور مجھے انڈین فنکاروں میں انیل کپور بہت پسند ہے اور میری خواہش بھی ہے کہ میں اس ہیرو کے ساتھ کم سے کم دس فلمیں تو ضرور ہی کروں لیکن ویسے فلم میں جانے کا شوق نہیں ہے۔"

★ "اس فیلڈ میں کیا کام بہت آسان لگتا ہے؟"

✻ "اداکاری کرنا مجھے زیادہ پسند ہے۔ ماڈلنگ میں میں اپنے آپ کو ایزی فیل نہیں کرتی۔ اور اداکاری میں تو یہ حال ہے کہ جب مجھے کوئی رول ملتا ہے تو شیشے کے سامنے کھڑی ہو کر پریکٹس کرتی ہوں اور اس وقت تک کرتی ہوں جب تک مجھے یہ نہیں لگتا کہ اب میں ٹھیک کر رہی ہوں۔"

★ "ماشاء اللہ آج کل اتنے ڈرامے بن رہے ہیں۔ کیا لوگ انہیں دیکھتے بھی ہیں اور کچھ سبق بھی سیکھتے ہیں؟"

✻ "میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بہت شوق سے ڈرامے دیکھتے ہیں اور ڈراموں کے ذریعے ہم لوگوں میں change لا سکتے ہیں' کیونکہ بہت سے لوگ ڈراموں کو فالو کرتے ہیں۔ اب میں آپ کو اپنی مثال دوں کہ میں نے ایک سیریل کیا تھا "مرجائیں ہم تو کیا" اس میں ایک فرماں بردار مشرقی بیوی دکھایا گیا تھا مجھے تو ایک دن میں جینز پہن کر کہیں جا رہی تھی تو ایک آنٹی نے مجھے روک کر کہا کہ ڈرامے میں تو آپ بہت شریف دکھائی گئی ہیں اور شریف لگتی بھی ہیں اور آپ نے جینز شرٹ پہنی ہوئی ہے۔"

★ "ڈراموں کے موضوعات سے بھی بہت اثر پڑتا ہے؟"

✻ "جی بالکل ..... ڈراموں کے موضوعات اگر نگیٹو ہوں گے تو لوگ برا اثر لیتے ہیں جیسے دو شادیاں' بہوؤں کی نفرت یا اس طرح کے موضوعات تو لوگوں پر ایسے موضوعات غلط اثرات چھوڑتے ہیں۔"

★ "فیوچر میں تو آپ نے این جی او بنانی ہے..... لیکن کیا کبھی اس فیلڈ میں رہ کر کسی اور شعبے میں بھی کام کرنے کی خواہش ہے؟"

✻ "نہیں ..... اگر آپ کا مطلب پروڈکشن اور ڈائریکشن سے ہے تو فیوچر میں ایسا کام کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ بس فلاحی کام کرنے کی خواہش ہے۔"

★ "اپنے ڈرامے دیکھتی ہیں؟"

✻ "نہیں اول تو ٹائم ہی نہیں ملتا اور میں دیکھنا بھی نہیں چاہتی کیونکہ مجھے لگتا ہے کہ جیسے میں نے اچھا کام نہیں کیا پھر میرا دل برا ہوتا ہے۔ بس پھر میں ڈائریکٹر کی ہی سنتی ہوں اور ان کی مرضی کا کام کرتی ہوں۔"

★ "شوٹ کہاں مشکل ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں یا بڑے گھروں میں؟"

✻ "چھوٹے گھروں میں وہاں لائٹ پنکھے نہیں ہوتے۔ پھر ماحول ایسا ہوتا ہے کہ پنکھے چلا بھی نہیں سکتے۔ لیکن خیر ہمیں تو کام کرنا ہے۔"

☼ ☼

سرورق کی شخصیت

ماڈل ______ ماریہ رضوی
میک اپ ______ روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ______ موسیٰ رضا

رِدا اصفہانی

شاہین رشید

1 "میرا پورا نام؟"
"مریم رضا اصفہانی۔"

2 "شوبز کا نام؟"
"ردا اصفہانی۔"

3 "پیار سے کیا کہتے ہیں؟"
"مانو' ردو۔"

4 "جنم دن / جنم شہر؟"
"26 ستمبر 1992ء / کراچی۔"

5 "ستارہ؟"
"Libra۔"

6 "تعلیم؟"
"گریجویشن کیا ہے بی کام۔"

7 "بہن بھائی؟"
"دو بھائی ہیں اور میں اکلوتی ایک بھائی بڑا ہے اور ایک چھوٹا ہے۔"

8 "شادی؟"
"جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا۔"

9 "شوبز میں متعارف کرانے کا سہرا؟"
"امی ابو کے سر جاتا ہے سہرا کیونکہ ماشاء اللہ دونوں ہی اس فیلڈ سے ہیں۔"

10 "مجھے شہرت ملی؟"
"ڈرامہ سیریل روگ سے۔"

11 "پہلے سیریل روگ سے میری پہلی کمائی؟"
"ایک قسط کے ڈھائی ہزار ملتے تھے۔ میرے لیے بہت تھے۔ کیونکہ میری ساری ضرورتیں تو میرے ماں باپ پوری کردیتے تھے۔ تو اپنی مرضی سے خرچ کرتی تھی اور اب بھی ایسا ہی ہے۔"

12 "مجھے مشکل لگتا ہے؟"
"صبح سویرے اٹھنا۔۔۔ اور اگر کبھی آنکھ کھل بھی جائے تو دوبارہ سوجاتی ہوں۔"

13 "اپنے آپ پر غصہ آتا ہے؟"
"جب غصے میں آکر اپنے والدین اور دیگر بڑوں سے بدتمیزی کرتی ہوں۔ تو سوچتی ہوں کہ میں نے ایسا کیوں کیا۔"

14 "اور جب غصہ آتا ہے تو؟"
"تو پھر کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں اور جب تک سب مناتے نہیں ہیں میں کھانا پینا شروع نہیں کرتی آخر اکلوتی بہن ہوں اتنے نخرے تو اٹھواؤں گی ہی نا۔"

15 "زندگی کس کی مرضی سے گزار رہی ہوں؟"
"سو فیصد اپنی مرضی سے گزار رہی ہوں۔ تب ہی تو اتنی خوش رہتی ہوں۔"

16 "امی کی ایک بات جو بری لگتی ہے۔"
"کچھ کرلو بیٹا، کچھ سیکھ لو پرائے گھر جاکر کیا کروگی۔ ناک کٹواؤگی وغیرہ وغیرہ۔"

17 "محبت کب ہوتی ہے؟"
"جب موڈ اچھا ہو تو محبت ہو جاتی ہے اور بار بار ہوتی ہے۔ کیونکہ بار بار موڈ اچھا ہوتا ہے اور جب موڈ خراب ہوتا ہے تو پھر محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔"

18 "آج کی اہم ضرورت؟"
"موبائل فون۔۔۔ اب تو اس کے بغیر ایک منٹ بھی گزارا نہیں ہے سوچتی ہوں کہ جب موبائل نہیں تھا تو ہم لوگ کس طرح گزارہ کرتے تھے۔"

19 "میں خواب دیکھتی ہوں؟"
"میں بہت خواب دیکھتی ہوں۔ جاگتی آنکھوں سے بھی اور سوتے ہوئے بھی اور شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ میرے بہت سے خواب سچے بھی ہو جاتے ہیں اور مجھے میرے خواب بتادیتے ہیں کہ آنے والے وقت میں کیا ہونے والا ہے۔"

20 "جھوٹ کی ضرورت کب پیش آتی ہے؟"
"کوشش کرتی ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں۔ لیکن جب بہت مجبوری ہوتی ہے۔ کہیں پھنس جاتی ہوں اور جھوٹ بولے بغیر گزارہ نہیں ہوتا تب پھر جھوٹ کا سہارا لیتی ہوں۔"

21 "کن کے آگے جھوٹ نہیں چلتا؟"
"والدین کے آگے جب میں نے جھوٹ بولا پکڑی گئی۔ اس لیے ان کو سب کچھ سچ سچ بتادیتی ہوں۔"

22 "تقریبات جو مجھے پسند نہیں؟"
"شوبز کی تقریبات میں جانا مجھے پسند نہیں ہے اس لیے کبھی نہیں جاتی۔"

23 "میری پسندیدہ سواری؟"
"رکشہ۔۔۔ بڑا مزا آتا ہے اس میں بیٹھ کر ادھر سے ادھر جانا مزے کی سواری ہے۔"

24 "فلاحی کام جو کرنا چاہتی ہوں؟"
"میری بڑی خواہش ہے کہ میں ایک چیریٹی اسپتال بنواؤں جہاں غریبوں کا علاج بالکل مفت ہو۔"

25 "سگنل پہ کھڑے ہو کر کیا دیکھتی ہوں؟"
"ان خواتین کو جو چھوٹے چھوٹے بچوں کو گود میں اٹھا کر بھیک مانگ رہی ہوتی ہیں۔ ان بچوں کو جو شیشے صاف کرکے دو چار روپے کمانے میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں بہت سے مشاہدے ہو جاتے ہیں۔"

26 "اپنے گھر میں میری پسندیدہ شخصیت؟"
"صرف اور صرف میری ماں اور میری خواہش ہے کہ اپنی امی کے ساتھ پوری دنیا کی سیر کروں دیکھیں یہ خواہش کب پوری ہوتی ہے۔"

27 "کب فریش ہوتی ہوں؟"

"رات کو جب شوٹ سے واپس آتی ہوں تو بہت سکون محسوس کرتی ہوں بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہوں۔ پھر گھر ہوتا ہے اور میری باتیں ہوتی ہیں۔"

28 "مرد حضرات کب برے لگتے ہیں؟"
"جب وہ کسی لڑکی سے فری ہونے کی کوشش کرتے ہیں یا حد پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

29 "کس ملک سے بہت پیار ہے؟"
"صرف اور صرف اپنے پاکستان سے۔ اس کے علاوہ کسی ملک میں رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

30 "دل کی باتیں کس سے کرتی ہوں؟"
"اپنی امی سے کیونکہ وہ ہی میری بہترین دوست بھی ہیں اور بہترین بہن بھی ہیں۔ دل کی باتیں کرنی ہوں تو بہن بنالیتی ہوں اور کچھ ضرورت ہو تو پھر سب کچھ امی ہی ہوتی ہیں۔"

31 "ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟"
"نفسیاتی مریضہ کا کردار کرنا چاہتی ہوں اور ایسے رول جس میں میرا عکس بھی نہ ہو۔"

32 "پسندیدہ چینلز؟"
"اے آر وائی اس چینل سے میرے کافی ڈرامے آن ایئر آچکے ہیں۔"

33 "میں ڈرتی ہوں؟"
"میں موت سے نہیں ڈرتی کیونکہ وہ تو آنی ہے۔ برحق ہے مگر مجھے قبر کے عذاب سے ڈر لگتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوگا۔"

34 "کب سکون محسوس کرتی ہوں؟"
"جب اپنے گھر میں ہوتی ہوں، جب اپنے کمرے میں ہوتی ہوں تو بہت سکون ملتا ہے۔"

35 "فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"یہی کوئی پانچ چھ مرتبہ۔۔۔ بس جب دل میں آتا ہے موبائل نمبر تبدیل کرلیتی ہوں۔"

36 "چوبیس گھنٹوں میں کون سا وقت اچھا لگتا ہے؟"
"جب سورج کی کرنیں آہستہ آہستہ نئے دن کا آغاز کرتی ہیں اور جب یہی سورج کی کرنیں شام کا منظر پیش کرتی ہیں تو یعنی صبح کا وقت اور شام کا وقت۔"

37 "اپنے چہرے میں کیا چیز اچھی لگتی ہے؟"
"اپنی آنکھیں۔"

38 "مجھ میں یہ خامی ہے کہ؟"
"کہ میں اپنے اصولوں پہ چلتی ہوں۔ میں نے زندگی گزارنے کے لیے کچھ اصول بنائے ہوئے ہیں۔ نہ میں خود ان اصولوں کو توڑتی ہوں اور نہ میں کسی کو توڑنے دیتی ہوں۔"

39 "گھر میں کھانا کون اچھا پکاتا ہے؟"
"میری امی، میری امی سے اچھا کھانا پوری دنیا میں کوئی نہیں پکا سکتا وہ بہترین کھانا پکاتی ہیں۔"

40 "میرا پسندیدہ کھانا؟"
"امی کے ہاتھ کی پکی ہوئی بریانی اور کچھ بھی وہ ہر چیز اچھی پکاتی ہیں۔"

41 "میں بھروسا کرتی ہوں؟"
"کسی پر بھی نہیں، سوائے امی کے۔ کیونکہ خواہ لڑکیاں دوست ہوں یا لڑکے، میں کسی کو بھروسے کے قابل نہیں سمجھتی۔"

42 "کوئی سوتے میں جگادے تو؟"
"اف، بہت غصہ آتا ہے میں اپنی مرضی سے اٹھنا پسند کرتی ہوں اس لیے برداشت نہیں کہ کوئی مجھے جگائے۔"

43 "لڑکوں کا گھورنا کیسا لگتا ہے؟"
"بہت برا... میں بھی گھورنے لگتی ہوں۔"

44 "صحافیوں کا ایک سوال جو برا لگتا ہے؟"
"جب کوئی پوچھے کہ آپ شوبز میں کیسے آئیں... حالانکہ سب کو پتا ہے کہ میں اس فیلڈ میں کیسے آئی۔ میری امی کو سب جانتے ہیں اور ان کے حوالے سے مجھے۔"

45 "تحفہ دینا اچھا لگتا ہے یا لینا؟"
"مجھے تحفہ دینا اچھا لگتا ہے اور اگر کوئی تحفہ دے دے تو کیا کہنے، بہت خوشی ہوتی ہے کہ ہمیں بھی کسی نے کسی قابل سمجھا۔"

46 "گھر آتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ ایک تو کوئی مجھ سے سوال جواب نہ کرے اور میرے کہے بغیر مجھے ٹھنڈا پانی مل جائے اور ایسا ہی ہوتا ہے کیونکہ سب کو میری عادت کا پتا ہے۔"

47 "چھٹی کے دن کیا دل چاہتا ہے؟"
"کہ دیر تک سوتی رہوں، کوئی مجھے نہ اٹھائے اور جب اٹھوں تو میرے سامنے ناشتا ہو اور وہ بھی امی کے ہاتھ کا۔"

48 "چھٹی کے دن کیا فرمائش کر کے پکواتی ہوں؟"
"بریانی دوپہر کے کھانے میں اور ناشتے میں پنیر والے سینڈوچ۔"

49 "آئینہ کیا کہتا ہے؟"
"کہ تم بہت پیاری ہو ہر وقت آئینہ دیکھ دیکھ کر اپنا وقت ضائع مت کیا کرو۔"

50 "اپنی ایک خامی جو دور کرنا چاہتی ہوں؟"
"کہ میں اپنی شخصیت میں سے غصہ کم کرنا چاہتی ہوں اور طبیعت میں ٹھہراؤ لانا چاہتی ہوں۔"

51 "قسمت سے سب کچھ ملتا ہے یا محنت سے؟"
"سب کچھ قسمت سے ملتا ہے اس پر میرا سو فیصد یقین ہے۔ انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

52 "کب رونے کو دل چاہتا ہے؟"
"اکثر دل چاہتا ہے، کچھ الٹے سیدھے خیالات آجائیں تو رونے لگتی ہوں۔ یا جب مجھے پتا چلے کہ کوئی مجھ پر شک کر رہا ہے تو مجھے بہت رونا آتا ہے۔"

53 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی؟"
"پرفیوم اس کے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتی۔ ہینڈ بیگ اور موبائل۔"

54 "جس دن موبائل سروس آف ہو تو؟"
"تھوڑا سکون تو ہوتا ہے۔ مگر بے چینی بھی بہت ہوتی ہے کیونکہ گھر والوں سے رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔"

55 "کب بہت ڈانٹ پڑتی ہے؟"
"جب کوئی کام گھر والوں کے مشورے کے بغیر کروں اور غلط ہونے پر، بہت ڈانٹ پڑتی ہے کہ مشورہ کیوں نہیں لے لیتیں۔ اپنی من مانی کیوں کرتی ہو۔"

56 "اپنی کمائی سے کیا کچھ خرید چکی ہوں؟"
"ارے، بہت کچھ شاپنگ کے لیے جاتی ہوں تو جو چیز پسند آتی ہے خرید لیتی ہوں۔"

57 "کہاں خرچ کرنے میں مزا آتا ہے؟"
"کوئی فرمائش کردے کہ فلاں چیز چاہیے تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور فوراً اس کی فرمائش پوری کرتی ہوں، چھوٹے بھائی کے لیے تو میں خود ہی کچھ نہ کچھ خریدتی رہتی ہوں اور اللہ کی راہ میں ضرورت مندوں پر بھی بہت خرچ کرتی ہوں۔"

58 "نیند کب آتی ہے؟"
"بستر پر لیٹتے ہی۔ خواہ تھکی ہوئی ہوں یا نہ ہوں۔ اپنے بستر پر اتنا سکون ملتا ہے کہ فوراً نیند آجاتی ہے۔"

59 "زندگی کے لیے تاثرات؟"
"بہت خوب صورت چیز ہے زندگی اور اگر صحت کے ساتھ ہو تو کیا کہنے میں بہت خوش ہوں اپنی لائف میں۔"

60 "کیا زندگی بدلتی ہے؟"
"بالکل ہر لمحہ بدلتی ہے اور میری تو بہت بدلی، کیونکہ جب میں اس فیلڈ میں نہیں تھی تو کوئی مجھے جانتا بھی نہیں تھا لیکن جب اس فیلڈ میں آئی تو سب مجھے جاننے پہچاننے لگے تو واقعی زندگی بدلتی رہتی ہے۔"

مقابل ہے آئینہ

اقرا مظفر

ادارہ

★ "آپ کا پورا نام گھر والے پیار سے کیا پکارتے ہیں؟"
* "اقرا مظفر، پیار سے دادا ابا ہی پکارتے تھے اور وہ مجھے "میری شہزادی" کہتے تھے۔"

★ "آئینے نے آپ سے یا آپ نے کبھی آئینے سے کچھ کہا؟"
* "آئینہ دیکھ کے مسکراتی ہوں اور آئینے سے کہتی ہوں "ایک ناک بلال سعید کی طرح زیادہ اونچی نہ ہوتی تو مزہ آجاتا۔" (ہاہاہا)

★ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"
* "قیمتی ملکیت ہاتھ فاؤنڈر کالج میں بیتے خوشگوار دن فخر النساء کے ساتھ مل کر بریڈ زبنک کرنا۔ کینٹین میں چاٹ کھانا اور چشتی جی (کینٹین والے انکل) کا چاٹ مسالے والا پورا ڈبا اڑانا۔ خوب سارا چاٹ مسالا ڈالنا اور پھر آنکھوں سے بہتے پانی اور شوں شوں کرتی ناک کے ساتھ کولڈ ڈرنک کا کین اڑانا۔ وہ دن بھی کیا دن تھے یہ خوشگوار یادیں ہی سب سے قیمتی ملکیت ہیں۔"

★ "اپنی زندگی کے دشوار لمحات بیان کریں؟"
* "دادا ابا کی وفات۔ وہ لمحات بھلائے نہیں بھولتے۔ اتنا غم تھا، بے یقینی سی تھی کہ اب وہ ہم میں نہیں ہیں۔"

★ "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"
* "محبت یہ لفظ عجیب مٹھاس لیے ہوئے ہے مگر بدقسمتی سے چاشنی سے بھرپور یہ لفظ میری زندگی کی تختی پہ شاید لکھا ہی نہیں گیا۔ بہت کم محبت ملی مجھے اپنوں سے۔ تین رشتے واحد ہیں جنہوں نے مجھے محبت دی۔ دادا ابا، میری دوست فخر النساء جس کی دوستی پر مجھے فخر ہے، تیسری عفیفہ، بہت غصیلی ہے، اول فول بک دیتی ہے مگر تھوڑی دیر بعد پھر سے ویسی ہی ہو جاتی ہے ٹھنڈی میٹھی۔"

★ "مستقبل قریب کا کوئی منصوبہ جس پر عمل کرنا آپ کی ترجیح میں شامل ہو؟"
* "کچھ خاص نہیں بس سوشیالوجی میں بی اے کرنا ہے۔"

★ "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جس نے آپ کو مسرور کیا؟"
* "ابھی کوئی ایسی کامیابی ملی نہیں جسے شیئر کیا جا سکے۔ بس انٹر کے رزلٹ نے مسرور کیا تھا جو کہ بہت اچھا آیا تھا۔"

★ "آپ اپنے گزرے کل، آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"
* "مایوسی۔"

★ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"
* "بہت حساس ہوں، سچی دل بھی ہوں، تھوڑی سی بے وقوف بھی ہوں۔ ایک ہی جگہ سے بار بار دھوکہ کھانے کے باوجود پھر انہی سے دھوکہ کھانے کے لیے تیار ہو جاتی ہوں۔"

★ "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی اپنے پنجے آپ میں گاڑے ہوئے ہیں؟"
* "بہت سے ڈر ہیں مگر شیئر نہیں کروں گی آپ لوگ ہنسیں گے۔"

★ "آپ کی کمزوری اور طاقت کیا ہے؟"
* "کمزوری چاکلیٹ اور طاقت صرف اللہ تعالیٰ۔"

★ "آپ خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"
* "اتنے خوشگوار لمحات زندگی میں آئے ہی نہیں کیا

بتاؤں۔"

★ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

* "ہاتھ کی میل ہے مگر اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔"

★ "گھر آپ کی نظر میں؟"

* "محفوظ پناہ گاہ ہے مگر اکثر اوقات یہی پناہ گاہ اجاڑ جنگل میں تبدیل کر دی جاتی ہے۔ اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی آپ خود کو غیر محفوظ تصور کرتے ہو۔"

★ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

* "بھول جاتی ہوں اور معاف بھی کر دیتی ہوں۔ مگر کبھی کبھی معاف کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

★ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصے دار ٹھہراتی ہیں؟"

* "کوئی خاص کامیابی ملی ہی نہیں کہ یہ بتاؤں کہ اس کے پیچھے فلاں فلاں کا ہاتھ ہے۔"

★ "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

* "بے پایاں مسرت حاصل ہوتی ہے کامیابی سے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔"

★ "سائنس نے ہمیں مشینوں کا محتاج کر دیا ہے یا واقعی یہ ترقی ہے؟"

* "فقطی فقطی مشینوں کا محتاج کر دیا ہے اور یہ ترقی بھی ہے۔"

★ "کوئی عجیب خواہش یا خواب؟"

* "عجیب خواہش یہ ہے کہ ایک دفعہ، صرف ایک دفعہ میرے دادا ابا اور میرے کزن عمر بھائی (مرحوم) اور وجیہہ مجھے ملیں اور میں ان سے ڈھیر ساری باتیں کروں۔"

★ "برکھارت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

* "برکھارت کو بہت زیادہ انجوائے کرتی ہوں۔ چھت پر دادی اماں لوگوں کے پاس چلی جاتی ہوں اور صحن میں بارش میں بھیگتی ہوں اور وہاں ریلنگ کے پاس کھڑے ہوئے اپنی مرحوم ننھی منی بہنا وجیہہ مظفر کی قبر کو دیکھتی ہوں جو کہ ہمارے گھر کے سامنے قبرستان میں ہے۔"

★ "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

* "اللہ تعالیٰ نے سوچ سمجھ کے ہی مجھے بنایا ہو گا۔ اسی لیے جو ہوں اسی میں خوش اور مطمئن ہوں۔"

★ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

* "بہت اچھا محسوس کرتی ہوں جب میرا بھائی سعد مظفر پروگرامز میں حصہ لیتا ہے۔ جب ریڈیو کے نعتیہ پروگرامز میں نعت پڑھتا ہے تو عجیب کیفیت ہو جاتی ہے' خوشی کی لہر دل و دماغ میں دوڑتی ہے۔"

★ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

* "حسن بہت متاثر کرتا ہے۔ خاص طور پر خوب صورت لڑکیاں اور خوب صورت نظارے۔"

★ "کیا آپ نے زندگی میں وہ سب پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

* "اس سوال کا کیا جواب دوں؟ زندگی میں ابھی کچھ پایا ہی نہیں' کھویا ہی کھویا ہے۔ بہت عظیم رشتوں کو اپنے پیارے دادا ابو کو' اپنی پیاری بہنا وجیہہ مظفر کو اور نٹ کھٹ' شریر' زندہ دل کزن بھائی عمر نعیم کو۔ اس نے زندگی کی صرف بیس بہاریں دیکھی تھیں۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور سب کزنز کے دلوں کی جان' محفل کی شان۔ —— جہلم کا بچہ بچہ عمر نعیم کا دوست تھا۔ سب کو ہنسانے کے لیے عجیب عجیب پھلجھڑیاں چھوڑتا تھا۔ دادا ابا کی وفات کے ایک سال بعد وجیہہ اور وجیہہ کی وفات کے پندرہ دن بعد وہ روڈ ایکسیڈنٹ کا شکار ہوا تھا۔ مجھے یاد ہے وجیہہ کی وفات پہ وہ کیسے بچوں کی طرح رویا تھا اور ہاں ایک بات بتایئے گا یہ سب عمر نامی بندے سحر انگیز شخصیت کیوں رکھتے ہیں اور اتنی جلدی دنیا سے رخصت کیوں ہو جاتے ہیں۔"

★ "اپنی ایک خوبی اور خامی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

* "خوبی یہ ہے کہ بہت لونگ ہوں اور خامی یہ کہ بہت اندھا اعتماد کرنے لگتی ہوں دوسروں پہ اور پھر منہ کی کھاتی ہوں۔"

★ "کوئی ایسا واقعہ جو آج بھی آپ کو شرمندہ کر دیتا ہے؟"

* "واقعات بہت سے ہیں مگر صفحات کم پڑ جائیں گے اس لیے یہ سوال پھر کبھی پر اٹھا لیتے ہیں۔"

★ "کیا آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوفزدہ ہو جاتی ہیں؟"

* "انجوائے کرتی ہوں مگر خود کسی کا چیلنج قبول نہیں کرتی بس تالیاں پیٹنے کی حد تک انجوائے کرتی ہوں۔"

★ "متاثر کن کتاب' مصنف' مووی؟"

* "قرآن پاک اس کے علاوہ قیصر و کسریٰ' ابو بہار شاہ منصور' Twillight۔"

★ "آپ کا غرور؟"

* "کوشش کرتی ہوں اس بلا سے دور رہوں۔"

★ "کوئی ایسی شکست جو آج بھی آپ کو اداس کر دیتی ہو؟"

* "ذہن پہ بہت زور ڈالا مگر کوئی شکست یاد نہیں آئی۔"

★ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

* "کسی کی حاصل کی گئی کامیابی حسد میں نہیں رشک میں مبتلا کر دیتی ہے اور دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ میں بھی اس کی طرح محنت کروں گی تو کامیاب ہو جاؤں گی۔"

★ "مطالعہ کی اہمیت آپ کی زندگی میں؟"

* "ڈائجسٹ کی حد تک مطالعہ کرتی ہوں یا کورس کی کتابیں پڑھتی ہوں۔"

★ "آپ کے نزدیک زندگی کی فلاسفی کیا ہے جو آپ اپنے علم تجربہ اور مہارت میں استعمال کرتی ہیں؟"

* "اللہ کی دی ہوئی انمول نعمت۔ اب ہم پہ منحصر ہے کہ اس نعمت سے کس طرح اور کتنا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کیسے اعمال کرتے ہیں کہ ہماری اگلی زندگی جو ابدی ہوگی وہ سنور جائے۔"

★ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

* "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' مولانا طارق جمیل صاحب اور سر عبدالمالک صاحب (بھوتہ)۔"

★ "ہمارا پیارا پاکستان سارا کا سارا خوب صورت ہے۔ آپ کا کوئی خاص پسندیدہ مقام؟"

* "زیادہ گھومی پھری نہیں ہوں۔ ویسے بادشاہی مسجد' شاہی قلعہ اور قلعے میں موجود موتی مسجد جو بہت پراسرار ہے مگر مجھے بہت پسند ہے۔"

☼ ☼

سال نو کے موقع پر کرن ڈائجسٹ نے ہر سال کی طرح اس سال بھی قاری بہنوں سے کچھ سوالات کیے ہیں۔ ان سوالوں کے جوابات اور اگر آپ تصویر شائع کرانا چاہیں تو ایک پاسپورٹ سائز تصویر جلد از جلد 37' اردو بازار کراچی پہ روانہ کر دیں۔

سوالنامہ

☆ کیا سال کی شروعات میں آپ اپنے اہم کاموں کو پلان کرتی ہیں؟

☆ صرف ہندسے کے بدل جانے سے زندگی پہ طاری جمود پہ کوئی فرق پڑتا ہے؟ اس بارے میں آپ کی رائے۔

☆ آگہی کے اس دور میں جب چھوٹی سی خبر بھی سیکنڈوں میں میلوں کا فاصلہ طے کر لیتی ہے۔ گزرے سال کی کس عالمی خبر نے آپ کو بہت متاثر کیا اور کیوں؟

☆ یہ زندگی کا اصول ہے لوگ ملتے ہیں بچھڑ جاتے ہیں گزرے سال میں کون اپنا جدائی کا غم دے گیا اور کس نے آپ کی زندگی میں شامل ہو کر اس کی رعنائیوں کو آپ پر منکشف کیا؟

☆ جنوری کے امیدوں بھرے موسم میں آپ کا زندگی سے بھرپور پیغام کس کے لیے اور کیا ہے؟

وہ صبح چھ بجے کے الارم کی آواز سے بے دار ہوئی

نیند اس کی آنکھوں میں سمائی ہوئی تھی، مگر اسے لازمی بستر چھوڑنا تھا ابھی اسے ملازمت کرتے ——— آدھا مہینہ ہو رہا تھا مگر وہ وقت کی پابندی نہیں کر پا رہی تھی۔ پھر اسے اس کی یہاں صوفیہ بیگم نے الارم کی تاکید کی وہ بستر تو چھوڑ چکی تھی مگر نیند کا خمار ابھی بھی اسے جکڑے ہوئے تھا۔

"یا خدا ـــــ یہ ملازمت کیسی مصیبت ہے؟" وہ منہ میں بڑبڑائی اور آنکھیں مسلتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی ـــــ نیند سے نجات پانے کے لیے اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے زور زور سے اپنی خوب صورت آنکھوں پر مارے نیند سے رہائی تو مل گئی۔ البتہ آنکھوں میں سرخی پھیلنے کے ساتھ درد کا احساس ہوا اس نے جمائی لے کر آئینے میں خود کو دیکھا اور پھر آئینے میں خود کو دیکھتی رہ گئی۔

"یہ ـــــ یہ میں ہوں ارم حیات ـــــ" اس نے آنکھوں کے گرد گھرے سیاہ حلقوں کو اپنے ہاتھوں سے محسوس کیا تو اس کے وجود میں اداسی اترتی چلی گئی۔ اور پھر اس کی آنکھوں میں درد کے ساتھ آنسوؤں کی تپش بھی شامل ہونے لگی۔

"ارم بیٹی جلدی کرو ناشتا تیار ہے۔" صوفیہ بیگم کی آواز اس کے کانوں میں دور سے پڑی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"اماں ـــــ یہ الفاظ آپ کے منہ سے سننے کے لیے میں کتنی بے چین رہتی تھی مگر آج یہ الفاظ میری ذات کو مزید اذیت میں مبتلا کر رہے ہیں کاش کہ میں نے کبھی ان لفظوں کی چاہت نہ کی ہوتی اماں مجھے اپنی آغوش میں چھپالیں مجھے معاف کر دیں میں آپ کی محبت کو سمجھ نہ سکی۔" اس نے روتے ہوئے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا وہ خود سے شرمندہ تھی بہت زیادہ اس لیے کافی دیر تک روتی رہی۔

"ارم کہاں رہ گئی ہو ناشتا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" صوفیہ بیگم کی پھر دور سے آتی ہوئی آواز نے اسے چونکایا تو اس نے بجھے دل سے آنسوؤں کو پونچھا اور جلدی سے تیار ہونے لگی، دس منٹ کے بعد وہ ماں کے پاس باورچی خانے میں آ پہنچی۔

صوفیہ بیگم نے اسے پیار سے ناشتا ٹیبل پر سجا کر دیا ابھی پہلا نوالا اس کے حلق میں پہنچا تھا کہ ڈور بیل بج اٹھی۔

"لو تمہاری ویگن آ گئی روز تم بھوکے پیٹ گھر سے چلی جاتی ہو ـــــ مجھے سارا دن تمہاری فکر رہتی ہے آج تم ٹفن ساتھ لے جاؤ۔" صوفیہ بیگم نے تیزی سے ٹفن نکال کر ناشتا پیک کرنا شروع کر دیا۔

"اماں میں آفس میں کھالوں گی آپ ٹفن رہنے دیں۔" اس نے نظریں چرا کر ماں کو جواب دیا جس کی آنکھیں آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش میں تھیں۔

"نہیں میری جان اتنی کمزور سی ہو گئی ہو گھر اور باہر کے ناشتے میں بہت فرق ہے۔" صوفیہ بیگم نے ٹفن کو شاپر میں رکھا اور اسے پیار سے تھماتے سمجھایا۔

اس نے خاموشی سے اثبات میں سر ہلا دیا اور آنسوؤں کو چھپا کر گھر کا بیرونی دروازہ پار کر گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس پہنچی تو ہر کوئی اپنی سیٹ پر کام کرتا دکھائی دیا وہ تیزی سے سیٹ کی طرف لپکی ابھی وہ سیٹ پر بیٹھی نہیں تھی کہ منیجر رشید نے اسے پیچھے سے پکارا۔

"مس ارم۔" وہ گھبرا کر پلٹی جانتی تھی کہ منیجر رشید اس کی کلاس لینے والے ہیں اور یہ کلاس تین' چار دفعہ وہ پہلے بھی لے چکے تھے۔

"مس ارم آپ کیوں میری بات کو نہیں سمجھ رہیں آپ کے یوں دیر سے آنے پر باقی ممبران بھی وقت کی پابندی نہیں کریں گے.... آپ کو آخری بار سمجھا رہا ہوں۔"

"سوری سر میں آئندہ شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔" اس نے نظریں چرا کر جواب دیا۔

"آپ سوری کر کے ہر مسئلے کو نہیں سلجھا سکتیں' میں آپ کو ہمیشہ وقت کی پابندی کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جی.... جی سر۔" وہ مزید شرمندہ سی ہو گئی اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا باقی ممبران اسے اب عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"مس ارم.... آپ نے کل کی فائل کا کام اگر مکمل کر لیا ہے تو پلیز وہ فائل باس کو دے دیں انہوں نے طلب کی ہے۔"

"سر.... وہ' وہ فائل کا کام ابھی مکمل نہیں ہوا۔" وہ گھبرا کر بولی۔

"کیا؟" منیجر رشید کے چہرے پر.... غصہ آ گیا اور وہ بے ساختہ بولے۔

"سر میں آدھے گھنٹے میں مکمل کر دیتی ہوں...." اس نے پریشانی سے جواب دیا۔

"آپ مس ارم اتنی قابل نہیں ہیں کہ.... آدھے گھنٹے میں وہ فائل مکمل کر سکیں جب آپ کو کل میں نے فائل دے کر بتا دیا تھا کہ صبح یہ فائل مکمل ہونی چاہیے تو پھر آپ کیسے لاپروا ہو سکتی ہیں آپ کو اندازہ بھی ہے کہ اگر باس کو اس بات کا علم ہو گیا تو وہ آج ہی آپ کو ملازمت سے فارغ کر دیں گے مس ارم جب آپ جاب لینے آئی تھیں تو آپ نے کہا تھا کہ آپ بہت محنت سے اس کمپنی کے لیے کام کریں گی تو پھر اب سب کچھ کیا ہوا؟" منیجر رشید غصے سے بولتے چلے گئے وہ سر جھکائے کھڑی رہی آج سے پہلے کسی نے اس کی اتنی انسلٹ نہیں کی تھی اور نہ ہی کبھی اس نے خاموش رہ کر اپنی انسلٹ برداشت کی تھی اس کے اندر صبر کا پودا اگ چکا تھا اور یہ صبر کا پودا اس کے باپ کے مرنے کے بعد اور بھائی کی جدائی سے پیدا ہوا تھا۔

"آپ کھڑی رہیں گی تو فائل کون مکمل کرے گا؟" منیجر رشید اس کے خاموش رہنے پر چیخے....

"سر.... میں۔" اس نے زبان کھولنا چاہی مگر سر رشید غصے سے بولے۔

"مجھے آج شام تک یہ فائل مکمل چاہیے.... آپ تسلی سے اس پر کام کریں اس سے زیادہ میرے پاس آپ کے لیے وقت نہیں مجھے اور بھی کام دیکھنے ہیں۔" منیجر رشید لفظ چبا چبا کر ہدایت دے کر چلے گئے اور وہ ایک لمبی سانس چھوڑ کر سیٹ پر بیٹھ گئی۔

اس نے اسٹاف کے باقی ممبران کو نظریں اٹھا کر نہیں دیکھا۔

جن سب کی نظریں اس پر ٹکی ہوئی تھیں.... اس نے فائل پر کام کرنا شروع کر دیا تقریباً" دو گھنٹے کے اندر اندر اس نے وہ فائل مکمل کر لی اس نے سکون سے سانس لیا اور اپنی جھکی گردن کو اٹھایا جس میں اب درد ہو رہا تھا....

"یا اللہ مجھے ہمت سے نواز مجھے اچھی صحت عطا کر یوں کام کرتے کرتے کہیں میں بیمار پڑ گئی تو میرے گھر کا کیا ہو گا۔" اس نے گردن کو اوپر نیچے کر کے اللہ سے مدد مانگی وہ ابھی گردن کے درد کی کشمکش میں تھی کہ اس

کی نظر اپنے ٹفن پر پڑی اس نے پیار سے ٹفن کا ڈھکن کھولا.... ناشتا اب ٹھنڈا ہو چکا تھا.... وہ دیر تک اس ناشتے کو گھورتی رہی.... اور پھر اپنے ماضی میں کھو گئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں' اماں آج آپ کیا پکا رہی ہیں؟" وہ بستے سمیت ہی باورچی خانے میں چلی آئی.... اور بے تابی سے پوچھنے لگی۔

صوفیہ بیگم نے اسے پلٹ کر دیکھا وہ ہنڈیا بھون رہی تھیں۔

"اوہو ارم کپڑے تو بدل لو اور بستہ بھی باورچی خانے میں لے آئی ہو جاؤ ہاتھ منہ دھو کر آؤ.... ابھی کھانے میں وقت ہے...." صوفیہ بیگم نے ڈوئی چلاتے ہوئے لاپروائی سے بتایا۔ پنجوں کے بل اوپر ہو کر اس نے ہنڈیا میں جھانکا اور خوشی سے بولی۔

"اماں.... چکن قورمہ بنا رہی ہیں۔"

صوفیہ بیگم جو اس سے بے نیاز ہنڈیا بھون رہی تھیں اس کی بات سن کر نظریں چراتے ہوئے بولیں۔

"ہاں.... چکن قورمہ ہی بنا رہی ہوں۔"

"اماں.... آپ مجھے کھانا دے دیں مجھے بہت بھوک لگی ہے میں یہاں بیٹھ کر ہی انتظار کر لیتی ہوں...." اس نے بستہ اتار کر اسٹول پر رکھا اور دوسرے اسٹول پر خوشی سے بیٹھ گئی۔

صوفیہ بیگم اس کی نیت کو بھانپ چکی تھیں آخر اس کی ماں تھیں مگر اپنی بیٹی کو کن لفظوں سے سمجھاتیں کہ وہ جس چیز کی تمنا کر رہی ہے اسے پانا اس کے لیے مشکل ہے۔

"ارم بیٹی یونیفارم پہن کر لنچ کرو گی کیا؟ میری جان جلدی سے جاؤ اور کپڑے چینج کر کے آجاؤ.... تب تک ہنڈیا تیار ہو جائے گی۔" صوفیہ بیگم نے پیار سے اس کا گال چھوا وہ اپنی معصوم بیٹی کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھیں۔

"نہیں اماں آپ مجھے بہانے سے باورچی خانے سے نکال رہی ہیں میرا ابھی دل کرتا ہے کہ میں لیگ پیس کھاؤں؟" صوفیہ بیگم کی ہدایت پر وہ فوراً" پھٹ پڑی۔

"ارم.... میری بچی! میں نے تمہیں پچھلی بار سمجھایا نہیں تھا کہ گھر کا جو سربراہ ہوتا ہے لیگ پیس اس کی پلیٹ میں جاتا ہے تم پھر بھول گئیں؟" صوفیہ بیگم نے فکرمندی سے سمجھایا۔

"اچھا.... ایسی بات ہے تو عثمان کو کیوں آپ لیگ پیس دے رہی ہیں؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"عثمان تمہارا بھائی ہے۔ میری جان تم جانتی ہو کہ اگر اسے لیگ پیس نہیں ملتا تو وہ گھر سر پر اٹھا لیتا ہے تمہارے بابا آفس سے تھکے ہارے گھر آتے ہیں یوں وہ پھر تمہارے بابا سے شکایت کرتا ہے اور ان کا دل برا ہو جاتا ہے تم تو میری سمجھ دار بچی ہو۔"

صوفیہ بیگم نے.... لیگ پیس کے بجائے اسے دو بوٹیاں پلیٹ میں نکال کر دیں۔

"اماں مجھے لیگ پیس ہی کھانا ہے....." وہ غصے سے پلیٹ کو دیکھ کر بولی۔

"نہیں لیگ پیس صرف میرا ہے...." عثمان باورچی خانے میں داخل ہو گیا اور صوفیہ بیگم کے پاس کھڑا ہو کر بولا۔

"ارم.... میری بچی.... اب جب اگلی دفعہ چکن قورمہ بناؤں گی تو لیگ پیس تمہیں دوں گی آج یہ کھالو۔"

صوفیہ بیگم نے پلیٹ اس کے پاس پڑی ٹیبل پر رکھی اس نے غصے سے پلیٹ کو ہاتھ مارا۔

"نہیں مجھے لیگ پیس ہی چاہیے میں عثمان بھائی سے زیادہ مارکس لے کر آئی ہوں میں آپ کی اچھی بیٹی ہوں تو لیگ پیس کھانے کا حق میرا ہے۔" وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

"تم نے اللہ کی دی نعمت کو پھینکا تمہیں اندازہ نہیں کہ اللہ تمہاری اس حرکت سے کتنا خفا ہوا ہے۔" صوفیہ بیگم نے غصے سے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر

کے بتایا وہ رونے لگی ماں کے تھپڑ سے وہ مزید بکھر سی گئی۔

"آپ مجھ سے محبت نہیں کرتیں آپ صرف عثمان سے محبت کرتی ہیں۔" وہ روتے روتے باورچی خانے سے ماں کو دیکھتے دیکھتے نکل گئی۔

صوفیہ بیگم کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ـــــ انہوں نے فرش سے سالن کو صاف کیا۔ ان کا دل اندر سے کانپ اٹھا ـــــ ایسا غصہ کبھی انہوں نے ارم کی آنکھوں میں نہیں دیکھا تھا ـــــ اور وہ جانتی تھیں کہ یہ غصہ ارم کے دل میں جگہ پا گیا ہے ـــــ پھر اس دن کے بعد ارم نے ہر بات پر احتجاج کرنا شروع کر دیا ـــــ جس سے گھر کا سکون تباہ ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"اماں آپ، آپ نے بہت اسے سمجھا کر دیکھ لیا ہے مگر اس نے کوئی بات آپ کی مانی کیا میں کب تک اسماء کی نظروں میں شرمندہ ہوں گا۔" عثمان نے خفگی سے کہا۔

"دیکھو بیٹا تم بہو کے ساتھ گھر چھوڑ دو گے تو ہمارا کیا ہو گا میرے سر پر تو تمہارے باپ کا سایہ بھی نہیں۔" صوفیہ بیگم نے لرزتی آواز سے جواب دیا۔

"آپ ارم کو کیوں نہیں سمجھا رہیں اب میں مزید کچھ سمجھ نہیں سکتا میرا تو جینا حرام اس نے بچپن سے کیا ہوا تھا اب میری شادی کے بعد میری بیوی کا اس نے جینا حرام کر دیا ہے آپ مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں؟" عثمان ماں کے سامنے سر پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔

"عثمان ارم کو معاف کر دو ابھی وہ بچی ہے مجھے یقین ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ وہ سمجھ جائے گی اور آئندہ تمہاری اور تمہاری بیوی کی عزت کا خیال کرے گی ـــــ" صوفیہ بیگم نے عثمان کا ہاتھ تھام لیا۔

"اماں ـــــ بابا کی کم تنخواہ ـــــ کا ذمہ دار وہ مجھے ٹھہراتی ہے میں نے کبھی اس سے کوئی چیز نہیں چھینی بابا نے مجھے اچھے اسکول ـــــ اور اسے گورنمنٹ اسکول میں داخل کیا۔ یہ بابا کا قصور تھا میرا نہیں۔"

عثمان غصے سے بے قصور ہونے کی وضاحت دینے لگا۔

"بیٹا تم بس اسماء کو سمجھا کر روک لو آئندہ ارم کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہیں ہو گا میں تم سے وعدہ کرتی ہوں۔" صوفیہ بیگم نے بیٹے کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔

"اماں، مجھے معاف کر دیں اب میں خود بھی اس گھر سے جانا چاہتا ہوں۔" عثمان نے نظریں چرا کر ان کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑوا لیا۔

صوفیہ بیگم رونے لگیں۔

"نہیں ـــــ میرے بچے میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ میں اس بار ارم سے سختی سے پیش آؤں گی تم تو اس کے غصے سے واقف ہو میں ہر بار خاموش ہو جاتی تھی مگر اب میں ارم سے دو ٹوک بات کروں گی۔" صوفیہ بیگم نے دوبارہ سے اپنے بیٹے کا ہاتھ تھام لیا! وہ ماں تھیں میں اپنے بیٹے سے جدائی کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔

"اماں آپ ارم سے کوئی بات نہیں کریں گی ـــــ میں نہیں چاہتا کہ اس کے اندر کا زہر مزید بڑھ جائے اور وہ اپنی زندگی کو اداسیوں کے اندھیرے میں ڈبو دے۔ میرا اس گھر سے جانا مناسب ہو گا میں آپ سے ملنے آجایا کروں گا اماں یہ آپ کی محبت کی پیاسی ہے اور شاید ہم اس کے گناہ گار ہیں۔" عثمان نے اداس لہجے میں بات کو ختم کیا۔ صوفیہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں وہ بھی جانتی تھیں کہ ارم کی ہر خواہش کو انہوں نے دبا دیا تھا اور آج انہیں اپنی غلطی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ارم بہت بدتمیز اور خود سری ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مس ارم ـــــ مس ارم!" منیجر رشید نے اسے پکارا تو وہ اپنے ماضی سے باہر نکلی اس نے بمشکل خود کو سنبھالا جس کو اپنی سانس اٹکتی محسوس ہو رہی تھی۔

"جی سر" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ نے فائل مکمل کر لی ہے کیا؟" منیجر رشید

تقریباً" تین گھنٹے کے بعد اس کے سامنے کھڑے تھے۔

"جی ـــــ سر" اس نے تیزی سے فائل ان کے ہاتھوں میں دی اور لمبی سانس لی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں؟" منیجر رشید نے اس کے چہرے کو گھور کر پوچھا۔

"جی سر میں ٹھیک ہوں۔" اس نے نظریں چرا لیں۔

"یہ دوسری فائل کا کام آج ہی ہو جائے تو بہتر ہو گا۔" منیجر رشید نے ایک فائل اسے تھمائی جو وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔

"جی سر میں فائل دیکھ لیتی ہوں۔" اس نے تابعداری سے فائل کو تھام لیا۔ اسے یہ جاب ہر حالت میں کرنی تھی منیجر رشید کے جانے کے بعد اس نے آنکھیں بند کیں تو صوفیہ بیگم کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

"کیوں ہر وقت عثمان کو کوستی رہتی ہو۔ بے چارہ ملازمت کر کے تھکا ہارا گھر پہنچتا ہے اور تم اس کے ساتھ بحث کر کے مزید اس کا دماغ خراب کر دیتی ہو۔"

"اماں یہ ڈرامے ہیں سب اس کے، سارا دن سیٹ پر بیٹھا رہتا ہے بس گھر آکر تھکن کا اظہار کرتا ہے تاکہ اس کے آپ نخرے اٹھا سکیں اور بچپن سے لے کر اب تک آپ اس کے اور اس کی بیوی کے نخرے ہی تو دیکھ رہی ہیں کیا میں سچ نہیں کہہ رہی۔"

"خدا کے لیے ارم آہستہ آواز رکھو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا اس سے معافی مانگ لو۔" صوفیہ بیگم نے لرزتی آواز سے بات کی۔

"گھر چھوڑنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے جا سکتا ہے میں خود جاب کر کے اپنا گزارہ کر سکتی ہوں اور اس گھر کو بھی چلا سکتی ہوں۔" اس نے آواز کو مزید اونچا کر دیا تاکہ عثمان اس کی بات سن سکے۔

اس کے سامنے اپنی تلخ یادوں کا سمندر دوڑنے لگا اس نے اپنی آنکھیں ڈر کے مارے کھول لیں ـــــ جیسے کہ وہ ڈراؤنا خواب نہیں دیکھنا چاہتی ہو اور خاموشی سے فائل پر کام کرنے لگی اس کا سر اب درد سے پھٹ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ تھکی ہاری گھر پہنچی اور گھر میں آتے ہی اپنے بستر پر جا پڑی صوفیہ بیگم کی آواز باورچی خانے سے ابھری اور اس کے کانوں میں پڑی۔

"ارم کھانا تیار ہے تم جلدی سے کپڑے تبدیل کر کے آجاؤ۔" صوفیہ بیگم نے پیار کے ساتھ اسے پکارا۔

اس نے ہمت کر کے خود کو سنبھالا اور باتھ روم میں ہاتھ منہ دھو کر وہ ماں کے پاس باورچی خانے میں آکر بیٹھ گئی۔

"آج آفس میں دن کیسا رہا ـــــ" صوفیہ بیگم نے پیار سے پوچھا۔

"جی ٹھیک تھا۔" تھکن سے اس سے بات بھی نہیں ہو رہی تھی۔

"دیکھو تو آج تمہارے لیے میں نے خاص چکن قورمہ بنایا ہے ـــــ" صوفیہ بیگم نے ہنڈیا میں سے سالن نکال کر اس کے سامنے کھانے کی پلیٹ پیش کی۔

اس نے اپنی پلیٹ میں لیگ پیس دیکھا تو اس کا سر مزید جھک گیا۔ صوفیہ بیگم اس سے پہلے کہ مزید کچھ بولتیں ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی وہ ٹیلی فون کی طرف لپکیں کہ شاید عثمان کا فون ہو۔

اب وہ باورچی خانے میں اکیلی بیٹھ کر لیگ پیس کو گھور رہی تھی ـــــ بمشکل دو تین نوالے ہی اس کے حلق سے اترے نیند اور تھکن نے اس کے جسم کو بری طرح سے جکڑ لیا تھا وہ پانی پی کر بوجھل قدموں سے بستر پر آگری اور اپنے آنسوؤں کو تکیے پر بہا دیا کافی دیر رونے کے بعد اس نے لمبی سانس لی اور منہ میں بڑبڑائی گھر کا سربراہ ہی لیگ پیس کھانے کا حق رکھتا ہے مگر اس لیگ پیس کو پانے کے لیے بہت سے قربانیاں دینی پڑتی ہیں جیسے کہ میرے بابا اور میرا بھائی عثمان قربانیاں دیتے رہتے تھے۔

☼ ☼

نبیلہ عزیز

دردِ دل

بڑی حویلی کے تمام مکین وقار آفندی سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے ہیں اور علیزے تو اپنے بابا کی شخصیت سے بہت ہی متاثر ہے۔

مدحیہ اور نبیل حیات دو ہی بہن بھائی ہیں، مدحیہ انتہائی بگڑی ہوئی اور خود سر لڑکی ہے، وہ انگلینڈ کی رنگینیوں میں مکمل طور پہ رنگ چکی ہے، جس کے پیش نظر فائزہ بیگم، نبیل کو پاکستان شفٹ ہونے کا مشورہ دیتی ہیں، لیکن مدحیہ پاکستان جانے سے انکار کر دیتی ہے، جس پہ نبیل اور فائزہ بیگم بے حد پریشان ہیں۔

زری کو اپنے بھائی عبداللہ کے دوست سے محبت ہے، مگر وہ کسی کو بھی اس راز میں شامل نہیں کرنا چاہتی اور یہ جذبہ اندر ہی اندر پنپ رہا ہے۔

عدیل کافی عرصہ سے نوکری کی تلاش میں ہے، مگر ہر روز مایوسی اور ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا، بے بسی اور مجبوری سے تنگ آ کر خودکشی کرنے کا سوچتا ہے، لیکن ایسے میں ایک روز اسے ڈھابے میں چائے پیتے ہوئے بابو امتیاز مل جاتا ہے، جو اسے کام کی آفر کرتا ہے، جس پر عدیل کافی خوش ہوتا ہے، اسی خوشی میں وہ کام کی بابت پوچھنا بھول جاتا ہے۔

منصور حسین ایک غریب اور میٹرک پاس آدمی ہے، وہ مبارک خان کے توسط سے بڑی حویلی میں وقار آفندی سے نوکری مانگنے آتا ہے، وقار آفندی کوئی بھی جگہ خالی نہ ہونے کے باعث اسے دوبارہ آنے کا کہہ کر واپس بھیج دیتے ہیں اور وہ مایوسی سے واپس لوٹ جاتا ہے۔

دل آزر شاہ کا شمار ملک کے بہترین اور منجھے ہوئے وکیلوں میں ہوتا ہے، وہ اپنے قول و فعل کا بہت پکا آدمی ہے، اس نے کبھی ہارنا نہیں سیکھا، اس کی ماں بتول شاہ کو اپنے بیٹے کی قابلیت اور ذہانت پہ بہت بھروسہ ہے اور اس کا یقین وہ دوسروں کو بھی دلاتی ہیں۔

۳۷
سینتیسویں قسط

اور علیزے بھی یکدم چونک گئی تھی۔
"نبیل بھائی؟" اسے بھی کافی حیرت ہوئی تھی۔
"ہوں۔۔ وہی ہے۔۔۔ تم نیچے بیڈ روم میں چلو' میں اسے دیکھتا ہوں۔" دل آور اسے کہتے ہوئے بڑے پرسوچ اور پریشان سے انداز میں سیڑھیوں کی طرف بڑھا تھا۔ مگر نہ جانے کس خیال کے تحت وہ جاتے جاتے پھر رک گیا اور پلٹ کر دوبارہ علیزے کی سمت دیکھا۔ وہ وہیں کھڑی تھی جہاں دل آور نے اسے خود سے الگ کیا تھا۔ اس لیے وہ دوبارہ پلٹا اور اس کے قریب آگیا اور علیزے کے سامنے رکتے ہوئے اس کا خوب صورت اور دلنشین چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"میرے اندر کی اداسی اور میری ذات کی تنہائی کو میرے نفس کی کمزوری مت سمجھنا۔ میں نفس کے ہاتھوں کمزور اور مجبور ہونے والا انسان نہیں ہوں۔ میں نے تمہیں کبھی حاصل کیا بھی تو تمہاری مرضی' تمہاری رضا اور تمہاری اجازت سے کروں گا۔ تمہاری اجازت کے بغیر کبھی کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم بے فکر رہو' اتنا بے لگام بھی نہیں ہوں۔ اپنے نفس کو لگام ڈالنا اور اسے کھینچ کے رکھنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔ اس لیے جو بھی کروں گا' تمہاری چاہ سے اور رضا سے کروں گا۔ فی الحال ریلیکس رہو یو ڈونٹ وری اوکے۔" وہ بڑے تحمل اور بڑے ٹھہراؤ سے اسے ایک بھرپور تسلی سے نواز کر اس کے دونوں رخساروں کو اپنے ہاتھوں سے تھپکتا ہوا پلٹ گیا۔ لیکن چند قدموں کے فاصلے پہ جا کے پھر ٹھہر گیا اور ایک بار پھر علیزے کی طرف پلٹا اور اس کے انتہائی قریب آرکا۔

"اور ہاں۔۔۔ اپنے ذہن میں یہ بات' یہ سوچ کبھی مت لانا کہ میں شاید کسی اور کے تصور یا کسی اور کی طلب میں تمہارے قریب آتا ہوں۔ بلکہ یہ سوچنا کہ میں تمہیں اپنی ذات کا حصہ سمجھ کر تمہارے قریب آتا ہوں۔ کیونکہ کسی بھی انسان کی ذات کے بٹے ہوئے حصے اچھے نہیں ہوتے' اس طرح انسان بکھر کے رہ جاتا ہے۔ اسی لیے میں بھی یہ حصے سمیٹنا چاہتا ہوں' یکجا ہونا چاہتا ہوں۔ اس طرح بکھرا ہوا نہیں رہنا چاہتا اور سمیٹنے کے لیے ضروری ہے کہ میں تمہارے قریب آؤں۔ میاں' بیوی کی قربت ایک دوسرے کے لیے کالے جادو کی طرح ہوتی ہے۔ جتنا عمل تسلسل سے ہوگا' اتنا ہی اثر شدید ہوگا۔ لہٰذا میاں' بیوی کا ایک دوسرے کی قربت میں رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

اس وقت ان دونوں کے درمیان یہ لمحہ بہت ہی نازک لمحہ تھا۔ اس لیے دل آور نہیں چاہتا تھا کہ اس لمحے اس نازک سی لڑکی کے نازک سے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچتی یا اس کی سوچ کسی غلط سمت میں جاتی۔ اسی لیے وہ اتنی پریشانی اور عجلت بھرے احساس کے باوجود جاتے جاتے بھی بار بار ٹھہر رہا تھا۔
"تو پھر تم اداس کیوں تھے؟" علیزے کا سوال بہت زیادہ معصومیت لیے ہوئے تھا۔
"اپنی تنہائی کی وجہ سے' اپنے اکیلے پن کی وجہ سے' اپنی بالکل خالی اور سپاٹ زندگی کی وجہ سے' مگر جب تم پہ نظر پڑی تو خیال آیا کہ میں تنہا نہیں ہوں۔ میں اکیلا نہیں ہوں اور میری زندگی بالکل خالی نہیں ہے' کیونکہ اس میں تم میرے ساتھ ہو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔
اسی لیے دل چاہا کہ تمہارے وجود میں اپنے آپ کو تلاش کروں۔
تمہیں دل کی گہرائیوں سے چھو کر اور سینے میں چھپا کر محسوس کروں۔
کہ تمہارے دل میں میں بھی دھڑکتا ہوں یا نہیں۔
مگر ابھی دل کی دھڑکن دھڑکنا شروع ہی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑ گیا۔" دل آور کو جیسے افسوس ہوا تھا۔ مگر علیزے اسے ہنوز یک ٹک کھڑی دیکھ رہی تھی۔
"کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے عجلت میں بھی سوال کر ڈالا تھا اور علیزے چہرے پر استہزا لے کر رہ گئی۔

"بتاؤ نا؟"
"ہونہہ۔۔۔ بس یہ دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت واقعی تمہاری ذات پہ کوئی خول نہیں ہے یا یہ کہ غلط فہمی ہے؟" علیزے اسے اس ملگجے سے اندھیرے میں بھی بغور دیکھ رہی تھی۔
"یہ تمہاری غلط فہمی نہیں ہے بلکہ یہ وہی چار گھنٹے ہیں جن میں کسی بھی انسان کی ذات پہ کوئی خول نہیں ہوتا اور اس وقت میری ذات پہ بھی کوئی خول نہیں ہے۔" دل آور نے واقعی اسے سچ بتایا تھا اور علیزے اس کے سچ پہ چپ ہو گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ دل آور کچھ اور کہتا اتنے میں گل سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آگئی۔
"صاحب۔۔۔ وہ نبیل صاحب اور مومنہ بی بی آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔" گل نے آکر اطلاع دی تھی اور نبیل کے ساتھ ساتھ مومنہ بی بی کا سن کر دل آور تشویش سے ٹھٹکا تھا۔
"مومنہ بی بی بھی ساتھ آئی ہیں؟" وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہتا ہوا پھر علیزے کی طرف متوجہ ہوا۔
"ٹھیک ہے' تم نیچے چلو' میں بھی جا رہا ہوں۔ گل تم علیزے بی بی کے ساتھ آجاؤ۔" وہ گل کو اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں اتر کے نیچے چلا گیا تھا اور علیزے اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!" بہرحال جو بھی تھا وہ ڈرائنگ روم میں بڑے سکون سے داخل ہوا تھا۔
"وعلیکم السلام!" نبیل جو ڈرائنگ روم کی مغربی دیوار پہ لگی ایک بہت ہی خوب صورت' مگر انتہائی اداس سا منظر پیش کرتی پینٹنگ دیکھ رہا تھا۔ دل آور کی آواز پہ فوراً اس کی طرف پلٹا اور اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اس کے قریب آگیا۔
"آج بڑا دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں گلے لگا کے ملوں۔ اس لیے دیکھ لو بے وقت چلا آیا ہوں۔" نبیل نے دل آور سے بغل گیر ہونے کے لیے خود ہی بازو پھیلا دیے تھے اور دل آور اس کی بات پہ حیران ہوتا اس کے گلے لگ گیا۔
"آج ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ تمہارا گلے ملنے کو دل چاہ رہا تھا؟ اور تمہیں بے وقت آنا پڑا؟" دل آور نے گلے ملتے ہی سوال کیا۔ اتنے میں گل اور علیزے بھی سیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی تھیں۔
"ذرا زور سے بھینچو' تاکہ مجھے پتا تو چلے کہ میں دل آور سے گلے مل رہا ہوں۔" نبیل کی باتیں ہی عجیب سی ہو رہی تھیں۔ دل آور نے فوراً" ہی محسوس کیا۔
"کیوں ویسے یقین نہیں آرہا کہ تم دل آور کے گلے مل رہے ہو؟" دل آور نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا تھا اور نبیل آہستگی سے مسکرا دیا۔
"یقین ہے یار۔۔۔ سب یقین ہے' تم پہ ہی تو یقین ہے۔" نبیل نے اس کا ہاتھ تھپکا۔
"کس بات کا؟" دل آور نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اس بات کا صرف تم ہی تو ہو جو نبیل حیات کو سچے دل سے چاہتے ہو' اپنا سمجھتے ہو' اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرتے ہو' لیکن آج دیکھو میں بھی کچھ کر گزرا ہوں۔" نبیل نے مومنہ بی بی کی طرف اشارہ کیا اور دل آور اس کے اشارے پہ چونک گیا۔
"کیا مطلب؟ کیا کیا ہے تم نے؟" اس کے اتنے تشویش بھرے انداز پہ نبیل ایک بار پھر طنزیہ سا مسکرایا۔
"ارے ڈونٹ وری یار۔۔۔ ایسا بھی کچھ نہیں کیا میں نے' صرف نکاح کیا ہے اور نکاح کرنا کوئی بری بات تو نہیں ہے نا؟" نبیل نے بڑے ریلیکس سے انداز میں کہتے ہوئے لاپروائی ظاہر کی تھی۔
"کیا؟ نکاح؟" دل آور کے دماغ پہ چوٹ پڑی تھی اور اس نے کرنٹ کھا کے نبیل کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ نکاح۔۔۔ میں نے مومنہ سے نکاح کرلیا ہے۔ گھر بسالیا ہے تمہاری طرح، مبارک دو مجھے۔" نبیل کی بات پہ دل آور کا چہرہ تاریک پڑگیا اور اسے یوں لگا جیسے اس کا پورا جسم نیلو نیل ہوگیا ہو اور اس کی ذات کھڑے کھڑے ریت کے ڈھیر میں تبدیل ہوگئی ہو۔ وہ ڈھے جانے کو تھا جب علیزے آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پہلو میں آکھڑی ہوئی اور اس کا کندھا دل آور کے بازو سے ٹچ ہوا تھا۔ جس پہ اس نے چونک کر خالی خالی نظروں سے علیزے کی سمت دیکھا۔ علیزے بھی نبیل کی بات پہ بہت شاکڈ نظر آرہی تھی۔

"نبیل؟" دل آور کے ہونٹ ذرا سے ہلے تھے۔

"ارے۔۔۔ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہو؟ ابھی تو میں نے تمہیں ایک اور گڈ نیوز دینی ہے۔" نبیل بہت ہی ہلکے پھلکے اور فریش موڈ میں نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

"گڈ نیوز؟" دل آور کے بس ہونٹ ہل رہے تھے۔ البتہ سمجھ کچھ نہیں آرہا تھا۔

"ہاں گڈ نیوز۔۔۔ عبداللہ کے حوالے سے ہے۔" نبیل نے بے حد آہستگی سے کہا۔

"نبیل یہ سب کیا کہہ رہے ہو؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا؟ میرا۔۔۔ میرا۔۔۔ دماغ۔۔۔ پھٹ رہا ہے۔" دل آور کی حالت اس وقت بہت ہی عجیب سی ہو رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس وقت کسی دلدل پہ کھڑا ہو اور لحہ بہ لحہ اس دلدل میں دھنس رہا ہو اور اس کے پاس اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

"میں مشکل زبان میں تو نہیں بتا رہا۔ آسان سی اردو ہے یار میری طرف سے گڈ نیوز تھی کہ میں نے آج چند گھنٹے پہلے مومنہ سے نکاح کرلیا ہے اور عبداللہ کی طرف سے یہ گڈ نیوز ہے کہ زری کو ہاسے ہوش میں آگئی ہے۔ وہ اب ٹھیک ہے۔" نبیل نے یکے بعد دیگرے دھماکے کرڈالے تھے اور دل آور اس کے ان دھماکوں سے دھجی دھجی بکھر گیا تھا جبکہ علیزے بری طرح چونک گئی۔

"کیا زری ہوش میں آگئی؟" علیزے کے چہرے پہ بے پناہ خوشی امڈی تھی اور اس نے بڑے بے ساختہ اور بڑے بے تاب سے انداز میں پوچھا تھا۔ جس پہ الٹا نبیل نے علیزے کو حیرانی سے دیکھا کہ وہ اتنی خوش کیوں ہو رہی ہے؟ اور علیزے بھی اس کے یہ حیرت آمیز تاثرات بھانپ گئی تھی کہ وہ اسے اس طرح کیوں دیکھ رہا ہے اور اس کی آنکھوں میں کیا سوال ہلکورے لے رہا ہے؟ اسی لیے پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ علیزے بے اختیار ہوگئی تھی۔

"زری میری دشمن نہیں ہے اور نہ ہی میرے لیے غیر ہے۔ زری میری اپنی ہے، میری کزن ہے، میرے ماموں کی بیٹی ہے۔ بہن ہے میری اور۔۔۔ اور عبداللہ بھائی، میرے ماموں زاد بھائی ہیں۔۔۔ میں ان کی پھوپھی آسیہ آفندی کی بیٹی ہوں۔ مجھے۔۔۔ مجھے اس بدنصیب کی خوشی نہیں ہوگی تو اور کس کو ہوگی؟ اس کے درد، اس کی تکلیف کی تڑپ مجھے نہیں ہوگی تو کیا آپ دونوں کو ہوگی؟ آپ دونوں۔۔۔ جو اپنے اپنے جذبات میں جل کر اپنے اپنے دلوں کی تسکین کے لیے نہ جانے کیا کیا کرتے پھر رہے ہیں۔ ہونہہ۔۔۔ کبھی کوئی لو میرج کرلیتا ہے اور کبھی کوئی کورٹ میرج اور پھر بھی دونوں کے دونوں پاک صاف اور نیک کے نیک۔ کمال ہے، ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ محبت اس طرح بھی ہوتی ہے؟ ایسی محبت تو بندہ زندگی میں کئی بار کرلے اور پھر بھی ٹینشن فری رہے۔ آپ دونوں کی طرح آئندہ اگر کسی نے محبت کرنی ہوئی تو ان کو آپ دونوں کا ایڈریس میں دوں گی اور کہوں گی کہ محبت سے نبٹنے کے لیے نئے اور انوکھے طریقے سیکھنے کے لیے آپ کے پاس کلاسز لیں اور ماہر ہوجائیں، محبت کسی اور سے اور نکاح کسی اور سے کرنے میں۔ کیوں ہے نا سچی بات؟ کرنا چاہیے نا ایسا؟" علیزے نے نبیل کی حیرت دور کرتے کرتے ان دونوں کو اک ایسے کٹہرے میں کھڑا کردیا جہاں ان دونوں کے پاس چپ کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔

"کیوں نبیل بھائی؟ کچھ غلط کہا میں نے؟ غلط کہا ہے تو میں اپنی غلطی تسلیم کروں گی۔" علیزے نے نبیل پہ

سوال داغا تھا اور ساتھ ہی اک نظر اپنے برابر کھڑے دل آور کو دیکھا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔ آپ لوگوں نے محبت نہیں کی بس محبت کرنے کی کوشش کی ہے اور آپ اس کوشش میں ناکام ہوئے ہیں اس لیے اپنی اپنی جگہ پہ چپ سادھ کے بیٹھ گئے ہیں۔ البتہ جو اس کوشش میں کامیاب ہوئی ہے وہ اس وقت اسپتال کے بستر پہ پڑی آپ کی طرح نئی زندگی کے مزے نہیں لوٹ رہی۔" علیزے کے لہجے میں طنز، تمسخر اور کاٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ وہ دونوں حقیقتاً کچھ نہیں بول پائے اور اپنی جگہ پہ کھڑے رہ گئے تھے۔

"بہرحال پھر بھی آپ کی اس کوشش پہ میں آپ کو داد دیتی ہوں اور کچھ نہ سہی آپ نے کوشش تو کی ہے ورنہ میرے اور مومنہ جیسے لوگ تو یہ بھی نہیں کرتے۔" آج علیزے وہ لہجہ اور وہ زبان بول رہی تھی جس کا اسے ڈھنگ ہی نہیں آتا تھا اور سننے والے حیران ہو رہے تھے۔

"خیر! کوئی بات نہیں۔ جس نے برباد ہونا تھا وہ تو ہوگئی۔ آپ بیٹھیے نبیل بھائی آپ کی نئی زندگی کی شروعات کی خوشی میں میں آپ کو اپنے ہاتھوں سے بنی چائے پلواتی ہوں اور آپ کا منہ میٹھا کرواتی ہوں۔" علیزے کہتی ہوئی کچن کی طرف بڑھی۔

"نہیں بھابھی! اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ کافی وقت ہو رہا ہے ہمیں اب گھر چلنا چاہیے۔" نبیل کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیے۔

"ٹائم؟ ہوں ٹائم تو واقعی کافی ہو رہا ہے مگر اب آپ آہی گئے ہیں تو بیٹھیے بھی، اتنی سی دیر میں کیا ہوجائے گا بھلا؟ صرف چائے ہی تو تیار کرنی ہے۔"

علیزے نے لاپروائی سے کندھے اچکائے تھے مگر نبیل بھلا اس وقت چائے پینے کی پوزیشن میں کب تھا؟ اس کی تو بھوک پیاس علیزے نے اڑا کے رکھ دی تھی۔

"نہیں! ہم چلتے ہیں اب بس یہ بے خبر تھا میں اسے خبر دینے کے لیے آیا تھا کہ کل کو یہ اعتراض نہ کرے کہ میں نے اسے بتایا نہیں۔ اب بتا دیا ہے اس لیے امید ہے کہ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لہٰذا اب اجازت چاہتا ہوں، آپ بھی آرام کریں، اللہ حافظ۔" نبیل دل آور کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہوا مومنہ کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے نکل گیا اور وہ دونوں وہیں کھڑے دیکھتے رہ گئے۔

"مبارک ہو! نبیل حیات آپ کا دوست ہی نکلا۔" علیزے ایک اور طنزیہ نشتر پھینکتی ہوئی وہاں سے چلی گئی اور قدرت کی اس ستم ظریفی پہ دھواں دھواں ہونے والا دل آور شاہ وہیں کا وہیں صوفے پہ ڈھے گیا تھا!

☼ ☼ ☼
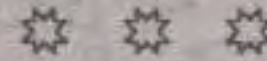
عدیل ابھی سونے کی نیت سے اپنے بستر پہ لیٹا ہی تھا کہ اس کی موبائل رنگ بجنے لگی اس نے سرہانے رکھا موبائل نکال کر دیکھا اس کی اسکرین پہ مدیحہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"مدیحہ؟" اسے اس وقت مدیحہ کی کال دیکھ کر سخت حیران ہوئی تھی۔ مگر اس حیرانی کے باوجود اسے فوراً کال بھی ریسیو کرنی پڑی۔

"ہیلو!" اس کا ہیلو بھی حیرت لیے ہوئے تھا۔

"السلام علیکم!" مدیحہ نے بڑی مشکل سے سلام کی رسم نبھائی۔

"وعلیکم السلام! مدیحہ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" عدیل اپنے بستر پہ اٹھ بیٹھا تھا۔

"ہاں! میں ٹھیک ہوں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔" مدیحہ کی آواز کافی رندھی ہوئی سی لگ رہی تھی، جس پہ عدیل کو مزید تشویش ہوئی۔

"اس وقت؟" اس نے وال کلاک کی سمت دیکھا جہاں رات کے ساڑھے بارہ بجے کا ٹائم ہو رہا تھا۔
"ہاں اس وقت اور ابھی" مدحیہ نے کبھی بھی اس سے۔ اس طرح کی کوئی ضد نہیں کی تھی اور آج اگر کی تھی تو بہت ہی دو ٹوک۔ اور سرکش سے انداز میں کی تھی جس پہ عدیل جز بز سا ہو گیا۔
"لیکن مدحیہ۔! ٹائم۔"
"عدیل پلیز۔! میں اس وقت تم سے ملنا چاہتی ہوں' صرف تم سے اگر نہیں مل سکتے تو پھر زندگی بھر نہ ملنا۔" مدحیہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور عدیل پریشان ہو اٹھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ کس طرح کی جذباتی اور جنونی قسم کی لڑکی ہے اگر وہ واقعی نہ گیا تو نجانے کیا کر بیٹھے؟ کیونکہ اس کے جنون کی ایک دو جھلک تو وہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔
"اف خدایا! نجانے کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو؟ اللہ خیر کرے سب خیریت ہی ہو۔" عدیل مجبوراً کمبل ہٹا کر اٹھا اور جوتے پہن کر کھڑا ہو گیا۔
موبائل جیب میں ڈالا اور جرسی پہن کر بائیک کی چابی اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔
"کون ہے؟" باہر کھٹکے کی آواز پہ عابدہ خاتون نے فوراً" اندر سے آواز دی تھی۔
"امی! میں ہوں۔ میں ذرا کام سے باہر جا رہا ہوں کچھ دیر میں آجاؤں گا۔" عدیل کافی عجلت میں لگ رہا تھا اور اس کی آواز پر مریم بھی اپنے کمرے سے باہر آگئی۔
"اس وقت کہاں جا رہے ہیں آپ؟" مریم پہلے کی ڈسی ہوئی تھی اسے وہ وقت یاد آگیا تھا جب پہلے بھی ایک بار یونہی عدیل کچھ دیر بعد آجانے کا کہہ کر گیا تھا مگر ایک بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔
"بس ایک کام سے جا رہا ہوں جلدی آجاؤں گا۔" وہ بائیک نکالنے کی غرض سے بائیک کی طرف بڑھا۔
"ایسا کون سا کام ہے؟ جو آپ کو یوں آدھی رات کو یاد آگیا ہے؟" مریم بھی اس کے پیچھے صحن میں نکل آئی تھی۔
"مریم! میں آکر بتاؤں گا پلیز" اس نے عجلت میں نکل جانا چاہا تھا۔
"نہیں! آپ اس طرح بتائے بغیر کہیں نہیں جائیں گے۔ جہاں بھی جانا ہے بتا کر جانا ہے۔" مریم نے انتہائی ضدی لہجے میں کہا تھا اور عدیل کو عجلت کے باوجود رکنا پڑ گیا تھا۔
"مجھے مدحیہ کی کال آئی تھی۔ وہ کچھ پریشان ہے' اس نے بلایا ہے' اس لیے جا رہا ہوں۔" اسے آخر بتانا ہی پڑا تھا۔
"مدحیہ کی کال۔۔۔؟ وہ بھی اس وقت؟" مریم بھی چونکی تھی۔
"ہاں! مجھے بھی تو اس بات کی پریشانی ہے کہ اس نے اس وقت کال کیوں کی اور کیوں بلایا ہے؟" عدیل کہہ کر بیرونی دروازے کا لاک کھولنے لگا۔
ہوں! ٹھیک ہے آپ جائیے لیکن پلیز گھر کے نمبر پہ میسج یا دو منٹ کی کال کر کے خیریت ضرور بتا دیجیے گا۔" مریم نے دروازہ کھول کر بائیک باہر نکالتے عدیل کو تاکید کی۔ اور اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"اور ہاں! امی کو بھی بتا دینا' وہ بھی پوچھ رہی تھیں۔" وہ کہہ کے دروازہ عبور کر گیا تھا اور مریم دروازہ بند کر کے اندر آگئی۔

☼ ☼ ☼
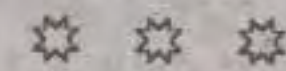
وہ گاڑی کے اسٹیئرنگ پہ سر رکھے بے آواز رو رہی تھی جب اچانک اس کے موبائل پہ رنگ بجی تھی اور اس نے چونک کر موبائل اٹھا لیا تھا۔

"ہیلو!" اس نے بے حد آہستگی سے ہیلو کہا تھا۔
"کہاں ہیں آپ؟ میں آرہا ہوں۔" عدیل شاید بائیک پہ تھا اس لیے ہینڈ فری کے ماؤتھ پیس سے اس کی آواز کے ساتھ ہوا کا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔
"میں روڈ پہ ہوں اپنی گاڑی میں تمہارے گھر سے ذرا فاصلے پہ۔" مدحیہ نے اپنے آنسوؤں پہ تھوڑا سا کنٹرول کرتے ہوئے بتایا تھا۔
"کس سائیڈ پہ؟" عدیل نے اپنی بائیک کو بریک لگا دیے تھے۔
"لیفٹ سائیڈ پہ" مدحیہ اسے جگہ کا بتاتی گئی اور عدیل نے سیدھا اس کی گاڑی کے قریب آکر بریک لگائے تھے اور بہت تیزی سے اپنی بائیک سے اتر آیا۔ اور اتنے میں مدحیہ بھی اسے دیکھ کر گاڑی سے نیچے اتر آئی تھی۔
"مدحیہ! آپ ٹھیک تو ہیں! رات کے اس پہر آپ یہاں کیا کر رہی ہیں؟" عدیل کے لہجے میں بے پناہ تشویش تھی اور مدحیہ جو بار بار اپنے آنسوؤں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے اتنے پریشان کن اور اپنائیت آمیز سوال پہ بے ساختہ سر جھکانے پہ مجبور ہو گئی۔
"مدحیہ!" عدیل کو لمحہ بہ لمحہ مزید پریشانی اور تشویش ہو رہی تھی کیونکہ مدحیہ کا ایسا انداز' ایسا رویہ' ایسا روپ وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا اس نے کبھی بھی اس طرح کا کوئی تجسس کری ایٹ نہیں کیا تھا۔ اور آج اگر کیا تھا تو اسے واقعی پریشانی گھیرے میں لے رہی تھی۔
"عدیل۔۔۔! ہم۔۔۔ ہمارا۔۔۔ گھر برباد ہو گیا ہے۔۔۔ تباہ ہو گیا ہے۔ ہمارے گھر میں تو پہلے ہی کوئی سکون اور کوئی خوشی نہیں تھی مگر اب۔۔۔ اب تو اور بھی ویرانی چھا گئی ہے۔۔۔ منحوس ہو گیا ہے ہمارا گھر۔" مدحیہ اس کے پکارنے پہ اس کی طرف پلٹتی ہوئی رو پڑی تھی اور عدیل نے اسے ناسمجھی سے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔
"مدحیہ پلیز! کیا ہوا آخر؟ آپ صاف صاف کیوں نہیں بتا رہیں؟ میرا پریشانی کے مارے دماغ ماؤف ہو چکا ہے۔" عدیل ذرا جھنجلا کے بولا تھا۔
"کیا بتاؤں۔۔۔؟ اور کس طرح بتاؤں؟ کچھ سمجھ نہیں آرہا مجھے۔ میرے۔۔۔ میرے۔۔۔ پاس الفاظ نہیں ہیں کہ میں اپنے گھر کی تباہی کا قصہ بیان کر سکوں۔ اور بتا سکوں کسی کو کہ یہ ہوا ہے ہمارے ساتھ۔" مدحیہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بے تحاشا رو رہی تھی۔
"نبیل صاحب اور آنٹی تو ٹھیک ہیں نا؟" عدیل کا پہلا خیال ان کی طرف ہی گیا تھا۔
"ہاں ہاں سب ٹھیک ہیں مگر سب کی قسمت خراب ہے اور جن کی قسمت خراب ہو وہ لوگ کبھی خوش نہیں رہ سکتے' وہ لوگ کبھی سکون سے نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہم لوگ بھی کبھی خوش نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کبھی سکون سے رہ سکتے ہیں۔ سوچا تھا ولی آور بھائی کے حوالے سے کوئی خوشی ملے گی مگر انہوں نے اپنی پسند سے بنا بتائے نکاح کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حیرت میں ڈال دیا اور ہم نے ساری امیدوں کا رخ نبیل بھائی کی طرف موڑ دیا تھا اور باقی رہ جانے والی امیدیں ان سے وابستہ کر لی تھیں مگر آج۔ آج انہوں نے بھی سب کچھ جلا کر راکھ کر ڈالا ہے آج انہوں نے بھی وہی جھنڈا لہرایا ہے۔ جو ولی آور بھائی نے لہرایا تھا۔ آج انہوں نے بھی نکاح کر لیا ہے۔" مدحیہ دکھ سے کہتے کہتے سسک رہی تھی' بلک رہی تھی اور عدیل دم بخود سا رہ گیا۔
"نبیل صاحب نے نکاح کر لیا؟ اتنا اچانک؟ مگر کیوں؟" عدیل کو واقعی دھچکا لگا تھا۔
"ہاں نکاح کر لیا ہے۔ وہ بھی ملک حق نواز کی ستائی ہوئی مومنہ بی بی کے ساتھ۔ جس کو انہوں نے پچھلے کافی عرصہ سے اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اور آج انہوں نے وہی گھر مومنہ بی بی کو سونپ دیا ہے' اپنا سب کچھ اسے دے دیا ہے سب کچھ۔۔۔ اپنا آپ بھی۔ زری کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا انہوں نے اس کا انتظار بھی نہیں کیا اور زری آج

ہوش میں بھی آگئی ہے' اور۔۔۔ اور۔۔۔ میں اس سے ملنے بھی نہیں جاسکی آخر۔۔۔ کس منہ سے جاتی اس کے سامنے؟ ہم لوگوں نے اسے دیا ہی کیا ہے بھلا؟ ہمیں اس کی پرواہی کب ہے؟ ہم سب نے تو اسے جیتے جی مار ڈالا ہے۔۔۔ مار ڈالا ہے اسے۔" مدحیہ روتے روتے چیخ اٹھی تھی اور عدیل بے ساختہ گھبرا گیا۔

"مدحیہ پلیز! بس کریں۔ ہم لوگ اس وقت روڈ پہ کھڑے ہیں' لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے پلیز صبر سے اور حوصلے سے کام لیں۔" عدیل نے اسے تسلی دینی چاہی تھی۔

"صبر۔۔۔ کیسے کروں صبر۔ کس چیز کا صبر۔۔۔ بات صرف اتنی سی ہوتی تو شاید صبر بھی آجاتا مگر یہاں تو کوئی ایک نہیں' پورا گھر برباد ہوا ہے۔"

مدحیہ کا صبر و برداشت آج جواب دے چکے تھے اور وہ بات بات پہ بپھر رہی تھی' بلک رہی تھی۔

"پورا گھر۔۔۔؟ کیا مطلب؟ کیا ہوا ہے؟ کیا کوئی اور بھی مسئلہ ہے؟"

"عدیل۔۔۔! مسئلہ نہیں ہوا۔ مسئلے کی حد ہو گئی ہے۔ مما اور بابا میں ڈائیورس ہو گئی ہے۔۔۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے ہیں۔ بابا نے گھر چھوڑ دیا ہے۔" وہ یونہی گاڑی سے ٹیک لگائے روتی ہوئی نیچے بیٹھ گئی۔ اور عدیل ایک اور انکشاف پہ دم بخود سا رہ گیا۔

"ڈائیورس؟" اس کی سماعتوں پہ یہ لفظ ہتھوڑے کی طرح برسا تھا اور اس پہ مدحیہ کی سسکیاں اور ہچکیاں الگ ضربیں لگا رہی تھیں۔

"اوئے ہوئے! یہاں کیا سین چل رہا ہے؟ سو رومینٹک یار۔" قریب سے ہی تین چار لڑکوں کی آوازیں اور معنی خیز سی سیٹیاں بجانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور عدیل کو جیسے کرنٹ چھو گیا اس نے یکدم پلٹ کر ان لڑکوں کی طرف دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے یار؟ کیا مان نہیں رہی؟" وکی نے آنکھ دباتے ہوئے انتہائی خباثت سے کہا اور عدیل کے تن بدن میں خون کی لہر دوڑ گئی وہ سر سے پاؤں تک غصے اور غضب ناکی سے سلگ اٹھا تھا۔

"شٹ اپ! تمیز نہیں ہے تم لوگوں کو؟ کون کیا کر رہا ہے تم لوگوں کو کیا تکلیف ہے آخر؟ اپنے کام سے کام رکھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" عدیل نے مدحیہ کے خیال سے ذرا ضبط سے کام لیتے ہوئے انہیں مناسب الفاظ میں وہاں سے جانے کا کہا تھا۔

"ارے یار! غصہ کیوں کرتے ہو؟ ہم تو بس اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ اگر نہیں مان رہی تو ہم حاضر ہیں' پوری پوری ہیلپ کریں گے تمہاری اور حصہ آدھا آدھا۔" کامی نے وکی سے بھی زیادہ خباثت کا مظاہرہ کیا تھا اور عدیل کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

"تم گاڑی میں بیٹھو۔" اس نے مدحیہ کو انتہائی سختی اور آہستگی سے گاڑی میں بیٹھنے کا کہا تھا۔

"عدیل۔۔۔! آپ۔۔۔" مدحیہ بھی اس کے تیور دیکھ کر رونا دھونا بھول گئی تھی۔ لیکن عدیل اتنے میں ان لڑکوں کی طرف پلٹ چکا تھا۔

"عدیل پلیز! اسٹاپ اٹ! میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ پلیز کوئی اور پریشانی کری ایٹ مت کریں۔" مدحیہ پیچھے سے اونچی آواز میں چیخی اور عدیل کے قدم نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئے تھے کیونکہ اسے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ مدحیہ حقیقتاً" کتنی پریشان اور اپ سیٹ ہے۔ اس کے کسی بھی جذباتی اقدام پر کوئی بھی نیا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے رک جانے پہ ان لڑکوں نے یکدم زوردار قہقہے لگاتے ہوئے ہوٹنگ کرنا شروع کر دی۔

"واؤ! بڑا اثر رکھتی ہے یار تھوڑا سا ہم پہ بھی سہی کیوں جودت؟ کیا خیال ہے تمہارا؟" وکی نے اپنے خبیث خیالات میں اپنے ایک اور خبیث دوست کو شامل کیا تھا جو ان لوگوں سے بے زار اور اکتایا ہوا سا ذرا دور ان سے

ہٹ کے کھڑا تھا۔

"وکی پلیز! چھوڑ یہ تماشا چل یہاں سے۔" جودت نشے کے باوجود خاصی اکتاہٹ کا شکار نظر آرہا تھا۔

"ہونہہ! چھوڑنے کو دل ہی تو نہیں چاہ رہا۔ چیز ہی کچھ ایسی ہے' مل بانٹ کے کھانے والی۔" اس کا اشارہ مدحیہ کی طرف تھا اور عدیل کا ضبط جواب دے گیا وہ یکدم غصے سے پاگل ہوتا تیر کی سی تیزی سے ان لڑکوں کی طرف لپکا اور اس وکی نامی لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔

"اوہ! تیری تو۔" اس نے عدیل کو کوئی گالی دینا چاہی تھی لیکن عدیل کے زوردار گھونسے نے اس کے منہ سے پھوٹنے والی گالی کو اس کے گلے میں ہی گھسا دیا تھا۔

"ارے یار! چوری اوپر سے سینہ زوری ایک تو رات کے اس پہر اتنی خوب صورت لڑکی کو ساتھ لے کر سڑکوں پہ رومینس کرتا پھر رہا ہے اور اوپر سے کسی کے ساتھ شیئر بھی نہیں کرتا۔" کامی بھی وکی کی خاطر اپنی شرٹ کے بازو فولڈ کرتا ہوا میدان میں کود پڑا تھا۔

"کیا تم لوگ اپنی منگیتروں' اپنی بیویوں اور اپنی ماں' بہنوں کو دوسروں کے ساتھ شیئر کرتے ہو؟" عدیل نے اپنی طرف بڑھتے کامی کو بھی انتہائی زوردار دھکے سے نیچے پٹخ دیا تھا۔

"بے غیرت گھروں کے بے غیرت لوگ ہو تم۔" عدیل ان کو مارتے ہوئے دھاڑ رہا تھا اور اس کی بات پہ جودت کا میٹر بھی گھوم گیا پھر وہ تینوں تھے اور ان سے نپٹنے کے لیے وہ اکیلا تھا۔

"پلیز! چھوڑ دو اسے عدیل پلیز بس کرو۔" مدحیہ لپک کے پاس آئی تھی اور اس نے عدیل کے شکنجے میں دبوچے جودت کو چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

جودت کی گردن کے گرد عدیل کا بازو کسی پھندے کی طرح لپٹا ہوا تھا اور جودت کی آنکھیں باہر کو ابل رہی تھیں۔

"اور کسی معاملے میں نہیں' صرف اتنی سی بات پہ تمہاری غیرت جاگ اٹھی ہے؟ حالانکہ غیرت نام کی تو کوئی چیز ہی نہیں ہے تم میں۔" عدیل جو منہ میں آرہا تھا وہ انہیں بکتا جا رہا تھا۔

"دیکھو چھوڑ دو اسے ورنہ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔" وکی نے خونخوار سے لہجے میں کہتے ہوئے جھپٹ کر مدحیہ کا بازو پکڑ لیا اور عدیل مدحیہ کا بازو اس خبیث لڑکے کی گرفت میں دیکھ کر بے بس ہو گیا اور مجبوراً" اس نے جودت کی گردن کو پرے جھٹک دیا تھا۔

"اب چپ چاپ جہاں سے آئے ہو وہاں چلے جاؤ۔ یہ لڑکی ہمارے ساتھ جائے گی یہی تمہاری سزا ہے۔" وکی اور کامی نے مدحیہ کے دونوں بازو اپنی گرفت میں دبوچ رکھے تھے اور عدیل کو وہاں سے چلے جانے کی وارننگ دی تھی مگر اس سے پہلے کہ عدیل کوئی اور طریقہ آزماتا اتنے میں دور سے ہی پولیس جیپ کے سائرن کی آواز سنائی دینے لگی اور مدحیہ نے ان لڑکوں کو پولیس کے خیال سے یکدم چونکتے دیکھ کر زور زور سے چلانا شروع کر دیا اور ان دونوں نے فوراً" اس کے بازو چھوڑ دیے تھے کیونکہ سائرن کی آواز اور بھی قریب آتی جا رہی تھی۔

"جودت! چلو نکلو یہاں سے۔" وکی نے لپک کے جودت کو سنبھالا تھا۔

"وہ تو ہم نکل ہی رہے ہیں۔ مگر مسٹر عدیل اتنا یاد رکھنا غیرت اور بے غیرتی کا بڑا لمبا چوڑا حساب نکلتا ہے تمہاری طرف تیار رہنا ہم ایک چکر پھر لگائیں گے۔" جودت نے جاتے جاتے اسے وارننگ دی تھی اور عدیل نے ان کی طرف سے رخ ہی پھیر لیا تھا اور ان کے جاتے ہی پولیس جیپ بھی ان کے پاس سے زناٹے سے گزر گئی تھی۔ جبکہ مدحیہ اس نئے ہنگامے اور اس نئی مصیبت سے چکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے روتی ہوئی عدیل سے لپٹ گئی تھی۔

"مدحیہ!" عدیل اس کی اس بے بس اور بے اختیاری حرکت پہ دھک سے رہ گیا تھا۔

"عدیل پلیز! یہ دنیا، یہ لوگ، یہ ماحول سب بہت گندے ہیں، بہت غلیظ ہیں مجھے نفرت ہو گئی ہے سب سے۔ ہر طرف ہوس ہی ہوس ہے، ہر کوئی نفس کا ستایا ہوا پھر رہا ہے۔ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں ہے پلیز مجھے اپنا لو، مجھے چھپا لو اپنی بانہوں میں۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھپ جانا چاہتی ہوں۔" وہ اس کے سینے سے لگی روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور عدیل اس کی خواہش پہ سر سے پاؤں تک دھڑک اٹھا تھا اور اسی دھڑکن کی شدت سے ڈر کے اس نے مدحیہ کو فوراً بہت نرمی اور بہت ہی احتیاط کے ساتھ خود سے الگ کر دیا تھا۔

"اس وقت بہت رات ہو رہی ہے مدحیہ! اور رات کے وقت گھر سے باہر رہنا لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا اس لیے پلیز اب تم گھر چلو۔ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں تمہارے گھر والے بھی پریشان ہوں گے۔" عدیل نے اس کے کندھوں کو تھپکتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی اور مدحیہ نے اس کی بات کے جواب میں سر جھکا دیا اس لیے عدیل نے گاڑی کا دروازہ کھول کے اسے فرنٹ سیٹ پہ بٹھایا کچھ دور ایک جنرل اسٹور تھا وہاں اس نے اپنی بائیک پارک کی اور مدحیہ کی گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

نبیل سخت بے چینی کے عالم میں گھر کے لان میں ٹہل رہا تھا۔

آج کا دن بہت ہی ہنگامہ خیز اور تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ بہت کچھ دیکھتے ہی دیکھتے پلٹ کے رہ گیا تھا اور وہ سب خالی ہاتھ رہ گئے تھے۔ ہر کسی پہ کوئی نہ کوئی قیامت ٹوٹی تھی، اور کوئی نہ کوئی انکشاف پیش آیا تھا جس کی وجہ سے سب کے دل و دماغ ہی زلزلے کی زد میں تھے اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب اتنا اچانک کیسے ہو گیا؟

فائزہ بیگم اپنے بیڈ روم میں بند تھیں۔

مومنہ نبیل کے بیڈ روم میں اکیلی بیٹھی اپنی قسمت پہ حیران پریشان ہو رہی تھی۔

مدحیہ نجانے کب سے گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک نہیں آئی تھی۔

اور نبیل لان میں ٹہلتا ہوا ہر طرف سے سوچوں میں گھرا قطرہ قطرہ موم کی طرح پگھل کر ختم ہو رہا تھا۔ لیکن ابھی پوری طرح سے پگھل کر ختم نہیں ہوا تھا کہ باہر گیٹ پر مدحیہ کی گاڑی کا ہارن بجا تھا۔ نبیل نے بے ساختہ اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھا رات کے سوا دو بجے کا ٹائم ہو رہا تھا نبیل کو ٹائم دیکھ کر سخت خفگی محسوس ہوئی اور وہ چوکیدار کے گیٹ کھولنے تک خود بھی ڈرائیووے کے قریب آ گیا تھا۔ لیکن مدحیہ کے بجائے کسی اور کو ڈرائیونگ سیٹ پہ دیکھ کر نبیل کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ اور اتنے میں گاڑی عین اس کے سامنے آرکی اور اگلے دو سیکنڈ میں اس کے شوروم کا منیجر عدیل عمر نیازی مدحیہ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ سے اتر کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم! سر کیسے ہیں آپ؟" عدیل نے بے حد شائستگی سے سلام کرتے ہوئے نبیل کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بھی بڑھایا، نبیل نے بہت مرے مرے انداز میں تھام کر سلام کی رسم نبھائی تھی۔

"ہوں! ٹھیک ہوں!" اس کا لہجہ اور اس کی آواز بھی جیسے کہیں دب چکے تھے۔

"سر! میں آپ کی فیلنگز اچھی طرح سمجھ سکتا ہوں کیونکہ میرے گھر میں بھی بہنیں ہیں۔ ایک نہیں بلکہ پانچ پانچ بہنیں ہیں اس لیے بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ بہنوں کے معاملے میں آدمی کی فیلنگز اور سوچیں کیا ہوتی ہیں؟ کتنی فکر ہوتی ہے ان کے حوالے سے؟ انسان بہت ہی حساس ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی میں آپ کی تسلی کے لیے اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی بہن، آپ کی عزت ہر طرح سے محفوظ ہے۔ آپ کی عزت سر آنکھوں پہ میں جتنا آپ کا احترام کرتا ہوں اتنا ہی مس مدحیہ کا احترام بھی کرتا ہوں، اس لیے پلیز آپ اس وقت کچھ بھی غلط

مت سوچے گا۔ مس مدحیہ کچھ پریشان تھیں، ڈپریشن کا شکار تھیں، رو رہی تھیں کہ وہیں کچھ آوارہ لوفر لڑکوں سے ٹکراؤ ہو گیا اور مجبوراً "بڑی مشکل سے" بچاؤ کے بعد مجھے ان کو گھر ڈراپ کرنے کے لیے آنا پڑا۔ اور مجھے خوشی ہے کہ میں نے انہیں خیریت سے باحفاظت ان کے گھر پہنچا دیا ہے اور مجھے آپ کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا پڑا۔"

عدیل نیت کا سچا کھرا تھا اس لیے اس نے بات بھی سچے اور کھرے طریقے سے کی جس پہ نبیل کے دل و دماغ پہ اتر آنے والا بوجھ خود بخود ہی کہیں دور ہٹ گیا اور وہ اندر ہی اندر ریلیکس ہو گیا تھا۔

"تھینک یو ویری مچ..... ! تمہارے خیالات جان کر بہت خوشی ہوئی ہے مجھے..... اگر ہر مرد ایسی ہی سوچ رکھنے لگے تو یہ دنیا غلاظت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک اور صاف ہو جائے گی پھر میرے جیسے کسی بھی بھائی کو اس طرح کی کوئی ٹینشن نہیں ستائے گی۔" نبیل نے عدیل کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے سراہا تھا اور خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"اوکے سر! مجھے اجازت دیجیے میں اب چلتا ہوں۔ میرے گھر والے بھی پریشان ہو رہے ہوں گے۔" عدیل نے اس سے اجازت طلب کی تھی۔

"لیکن گھر جاؤ گے کیسے؟ تمہارے پاس تو نہ گاڑی ہے نہ بائیک اور اس وقت تو کہیں سے کوئی سواری بھی نہیں ملے گی؟" نبیل کو فکر ہوتی تھی۔

"ڈونٹ وری سر! کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جائے گا۔" عدیل نے اسے ریلیکس کرنا چاہا۔

"سبب بنائیں تو بنتا ہے نا؟ تم ٹھہرو، میں ڈرائیور سے کہتا ہوں وہ تمہیں ڈراپ کر دیتا ہے۔" نبیل کہہ کر سرونٹ کوارٹرز کی طرف پلٹ گیا اور عدیل اسے روکتا رہ گیا، مگر وہ نہیں رکا تھا۔

"تھینک یو!" عدیل اپنے دھیان میں سر جھکائے کھڑا تھا جب مدحیہ آہستگی سے گاڑی سے اتر کر اس کے برابر ہی آکھڑی ہوئی اور عدیل نے چونک کر اس کی سمت دیکھا اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"تھینکس؟ مگر کس لیے؟" عدیل نے اس کے جھکے ہوئے سر کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مجھے باحفاظت گھر پہنچانے کے لیے۔" وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہونہہ..... ! آپ کو کیا پتا کہ میں نے کس کو باحفاظت گھر پہنچایا ہے؟ آپ کو یا اپنے آپ کو؟" وہ کہتے ہوئے مبہم سا مسکرایا اور مدحیہ اس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بات بدل گئی تھی۔

"آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟" اسے اندازہ تھا کہ جتنی چوٹیں ان لڑکوں کو آئی تھیں اتنی ہی عدیل کو بھی آئی تھیں۔ آخر وہ تین تھے اور وہ اکیلا۔

"آئی تو ہے مگر اب مرہم کون لگائے؟ آپ سے تو مرہم کی امید بھی نہیں کر سکتا کیونکہ آپ نے تو پہلی بار گھر آئے مہمان کو چائے کا بھی نہیں پوچھا اور اتنی سردی میں ٹھٹھرتے ہوئے گھر بھیج رہی ہیں۔" عدیل نے جان بوجھ کر اسے چھیڑنے کے لیے شکوہ کیا تھا اور مدحیہ اپنی اس کوتاہی پہ یک دم سر اٹھا کر دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی اور عدیل اس کے اس طرح دیکھنے پہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

"تھینک یو! میں نے پی لی چائے۔" اس نے مدحیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ذومعنی بات کہی اور مدحیہ نے شرم سے جھجکتے ہوئے پلکیں جھکا لی تھیں۔

"لو ڈرائیور آ گیا ہے۔" نبیل ڈرائیور کو اپنے ساتھ ہی لے کر آیا تھا اور نجانے کیوں مدحیہ اور عدیل کو ایک ساتھ برابر کھڑے دیکھ کر نبیل کے قدم ذرا سے توقف کے لیے ٹھہرے تھے اور اک خیال تھا جو اس کی عقل کو چھو کے گزر گیا تھا مگر وہ اس پہ کچھ بول نہیں سکا بس دل ہی دل میں سوچتا رہ گیا۔

"اوکے سر! اللہ حافظ۔" عدیل اس سے ہاتھ ملانے کے بعد ان دونوں کو خدا حافظ کہہ کر گاڑی میں بیٹھا اور وہاں سے رخصت ہو گیا تھا مگر نبیل کے لیے اک نئی سوچ چھوڑ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ابھی سو کر اٹھا بھی نہیں تھا کہ اس کا موبائل بجنا شروع ہو گیا۔ اس نے فون اٹھا کر دیکھا کوئی اجنبی سا نمبر تھا اس لیے مجبوراً"اسے کال ریسیو کرنا پڑی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے بڑے شائستہ لہجے میں سلام کیا تھا کیونکہ یہ اس کی عادت تھی۔

"ملک اسد اللہ بات کر رہا ہوں۔" دوسری طرف سے، بہت ہی نپی تلی سی آواز سنائی دی تھی اور دل آور کے ماتھے پہ بل پڑ گئے کیونکہ وہ جان گیا تھا کہ اس نے کال کیوں کی ہے۔

"جی کہیے بات! میں سن رہا ہوں۔" دل آور کا لہجہ اس سے بھی زیادہ سخت اور سپاٹ ہو چکا تھا۔

"تم جانتے ہو کہ کل ملک حق نواز کے کیس کی آخری پیشی ہے اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ تم کل عدالت نہ جاؤ۔" ملک اسد اللہ نے وہی بات کہی تھی جس کی دل آور کو امید تھی۔

"وجہ؟" اس نے یک لفظی سوال داغا۔

"وجہ یہ ہے کہ تمہارے جانے سے ملک حق نواز کو سزا ہو گی۔"

"پھر تو مجھے کل ہر حال میں جانا چاہیے نا؟ کیونکہ آخر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔" دل آور نے تمسخر سے کہا تھا۔

"دیکھو دل آور شاہ! ہم چاہتے تھے کہ تم سے بات کر کے معاملہ سلجھا لیں مگر لگتا ہے کہ معاملہ اس طرح نہیں سلجھے گا ہمیں اپنے رنگ میں آ کر اپنا آپ دکھانا ہو گا۔" ملک اسد اللہ کے لہجے میں سراسر دھمکی تھی اور وہ تھا کہ دھمکیوں سے ڈرتا ہی نہیں تھا۔

"آپ نے میرا رنگ بھی نہیں دیکھا ملک اسد اللہ صاحب! میں نے مومنہ بی بی سے وعدہ کیا تھا کہ اسے انصاف ضرور ملے گا اور میں اسے یہ انصاف دلا کر ہی رہوں گا چاہے مجھے اپنی جان پہ کیوں نہ کھیلنا پڑے۔" دل آور بھی اپنی بات کا اور اپنی ضد کا کتنا پکا ہے؟ یہ ملک اسد اللہ بھی اچھی طرح جانتے تھے اسی لیے ذرا نرمی اختیار کر لی تھی۔

"دیکھو! ہم مومنہ بی بی کو اپنانے کے لیے تیار ہیں۔ ہم ملک حق نواز کا نکاح پڑھوا دیں گے اس کے ساتھ۔" ملک اسد اللہ نے نیا راستہ اختیار کیا تھا اور اک نئی چال چلی تھی۔

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مومنہ بی بی کا نکاح ہو چکا ہے اور اس کا شوہر اتنی حیثیت ضرور رکھتا ہے کہ آپ لوگوں سے ٹکر لے سکے اس لیے ملک حق نواز کی بخشش کا خیال دل سے نکال دیں۔ وہ ذلیل انسان اب تمام عمر جیل میں ہی سڑے گا کیونکہ اس نے ایک مومنہ بی بی کی نہیں بلکہ کئی اور عورتوں اور لڑکیوں کی عزت بھی تباہ کی ہے اور اب وقت ہے کہ خدا کی طرف سے اس پہ عذاب نازل ہو۔" دل آور خاصا چبا کے بول رہا تھا اور ملک اسد اللہ اس نئے انکشاف پہ دنگ رہ گیا تھا۔

"اللہ حافظ ملک صاحب کل عدالت میں ملاقات ہو گی۔" دل آور نے فون بند کرنا چاہا تھا۔

"ٹھہرو دل آور شاہ!" ملک اسد اللہ نے یک دم اسے روکا تھا۔

"کہیے؟" وہ رک گیا۔

"تمہارا آخری فیصلہ کیا ہے؟" ملک اسد اللہ نے اس کا حتمی فیصلہ جاننا چاہا تھا۔

"میرا آخری فیصلہ ملک حق نواز کی سزا ہے، میرا آخری فیصلہ مومنہ بی بی کا انصاف ہے اور میرا آخری فیصلہ کل عدالت جانا ہے اور اس کام سے مجھے اللہ کی پاک ذات کے علاوہ دنیا کی کوئی اور طاقت نہیں روک سکتی اور امید ہے کہ میری یہ بات آپ لوگوں کے ذہن میں کافی اچھی طرح بیٹھ چکی ہو گی۔ اس لیے اب اللہ حافظ۔" اس نے پھر
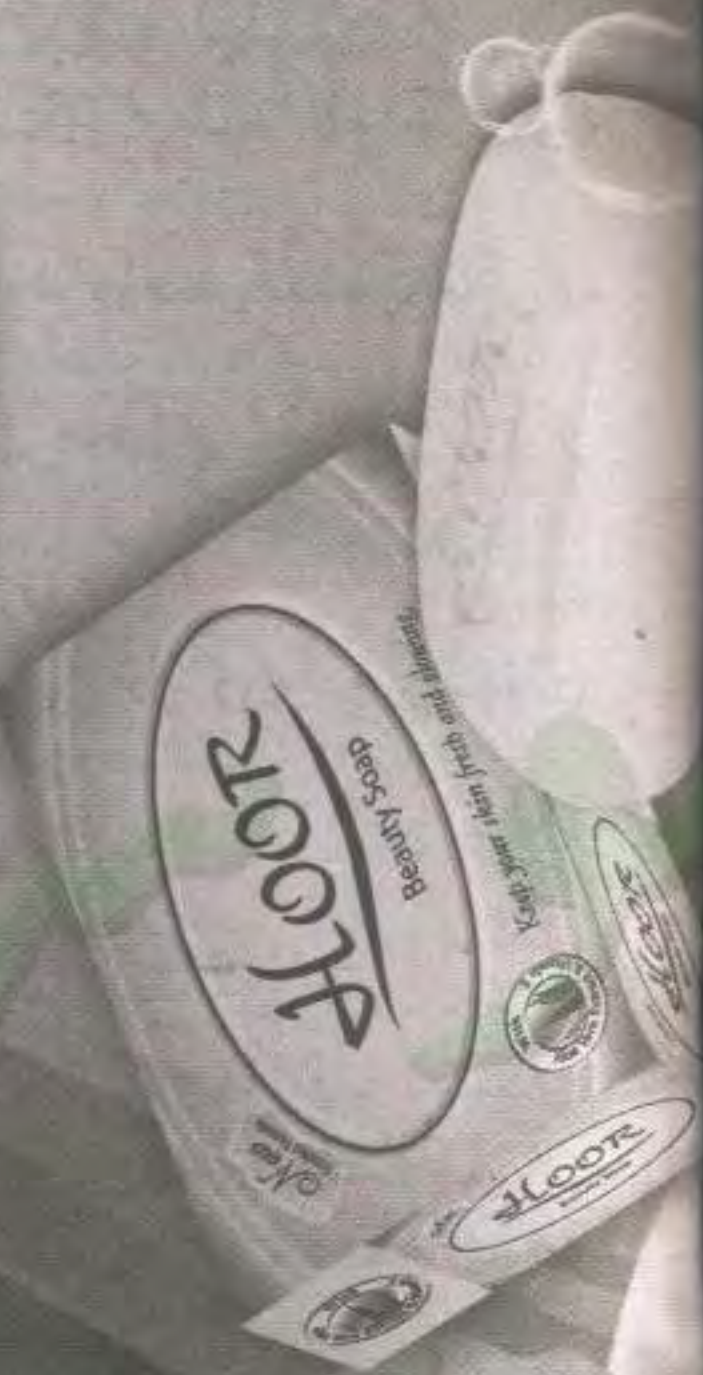
فون بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

"رکو دل آور شاہ! دیکھو ایک بار پھر سوچ لو' ہمارے پاس فیصلے کی گھڑی بس یہی ہے' اس کے بعد نہ ہم تم سے کچھ کہیں گے اور نہ ہی تمہیں سننے کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔" ملک اسداللہ نے اسے وقت دینا چاہا تھا۔

"میں نے جو کچھ بھی کہا ہے سوچ سمجھ کر ہی کہا ہے۔ اس لیے اب آپ بھی سمجھ جائیے" وہ دو ٹوک بات کر رہا تھا۔

"او کے دل آور شاہ! رب راکھا۔" ملک اسداللہ نے کہہ کر خود ہی فون بند کردیا اور دل آور نے اپنا موبائل بند ہوتے ہی بیڈ پہ اچھال دیا اور خود اٹھ کر وارڈ روب کھول لی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" اپنا موڈ آف ہونے کے باوجود اسے وارڈ روب میں موجود کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے دیکھ کر علیزے رہ نہیں سکی تھی اور بالآخر پوچھ ہی لیا تھا۔

"اپنا آف وائٹ شلوار سوٹ۔" دل آور بہت بے زار کن لہجے میں بولا تھا۔

"کیوں؟ شلوار سوٹ کیوں؟ تم نے کورٹ نہیں جانا؟" علیزے کو حیرت ہوئی تھی کیونکہ وہ صبح کے وقت شلوار سوٹ ذرا کم ہی پہنتا تھا۔

"نہیں! مجھے کہیں اور جانا ہے۔" اس نے ذرا ٹھہرتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"کہاں؟" وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"قبرستان!" دل آور کا جواب چونکا دینے والا تھا۔

"کیا؟ قبرستان؟ مگر کیوں؟" علیزے ٹھٹک گئی تھی اور دل آور اس کے سوال پہ دھیما پڑ گیا تھا۔

"اپنے ماں باپ سے ملنے اپنوں سے ملنے۔" اس کا لہجہ بہت ہی نرم اور بہت ہی پگھلا ہوا سا لگنے لگا تھا۔

"کیوں؟ یوں صبح صبح اٹھتے ہی کیسے خیال آگیا ان کا؟" علیزے کا نجانے کیوں بار بار اس سے سوال کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

"رات کو خواب میں دیکھا تھا ان کو' اماں بہت رو رہی تھیں اور بابا بھی اداس تھے اس لیے آج میں نے سب سے پہلا کام یہی کرنا ہے کہ ان سے ملنے کے لیے جانا ہے۔ باقی کے کام بعد میں ہوتے رہیں گے۔" دل آور کا اپنا لب و لہجہ بھی کافی اداس لگ رہا تھا۔ اور علیزے کچھ کہتے کہتے رک گئی مگر وہ بھانپ چکا تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے۔

"کہو؟ کیا کہنا چاہتی ہو؟" دل آور نے اسے کہنے پہ اکسایا۔

"نہیں! کچھ نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی آگے بڑھ آئی اور وارڈ روب کے لاسٹ والے حصے سے دل آور کا آف وائٹ کھدر کا سوٹ نکال کر اس کے سامنے کردیا تھا۔

"پلیز علیزے! جو کہنا چاہتی ہو وہ صاف صاف کہہ دو میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا۔" وہ بہت اداس' مایوس اور ملول سا لگ رہا تھا۔ علیزے زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکی۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ قبرستان جاسکتی ہوں؟ تمہارے بابا وغیرہ کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کے لیے؟" علیزے نے بہت آہستگی سے پوچھا اور اس کا سوال ایسا تھا کہ دل آور اسے منع نہیں کرسکتا تھا۔

"کیوں؟ تم کیوں جانا چاہتی ہو؟"

"کیونکہ آج مجھے بھی اپنے مما اور پاپا بہت یاد آرہے ہیں۔ آج اگر وہ نہیں مل سکتے تو تمہارے اماں اور بابا سے مل لیتی ہوں میرے لیے تو وہ بھی مما اور پاپا جیسے ہی ہیں نا؟" علیزے کی بات پہ دل آور نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"مما اور پاپا جیسے؟" اس نے زیر لب بڑبڑا کے کہا تھا۔

"ہاں! مما اور پاپا جیسے کیونکہ وہ تمہارے مما اور پاپا ہیں' اس لیے میرے لیے بھی تو وہ مما اور پاپا ہی ہیں نا۔" اور علیزے کی بات پہ دل آور اسے دیکھتا رہ گیا تھا کہ اس نے کتنی اپنائیت بھری اور کتنی کھری بات کہی تھی۔

"کیا بات ہے؟ کیا میں نہیں جاسکتی؟" اس نے دل آور کو چپ دیکھ کر دوبارہ پوچھا۔

"نن... نہیں... ! ایسی بات نہیں ہے' میرے کپڑے چینج کرنے تک تم بھی تیار ہو جاؤ۔ تھوڑی دیر میں نکلتے ہیں۔" دل آور اسے کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا تھا اور علیزے کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

اسے دل آور کے بابا اور بتول شاہ کی قبروں پہ جانے کا سوچ کر بہت اچھا فیل ہوا تھا۔ اسی لیے وہ جلدی سے چینج کرکے بڑی سی سیاہ رنگ کی چادر اوڑھ کر فوراً" تیار ہوگئی اور وہ دونوں باقاعدہ باوضو ہو کر گھر سے نکلے تھے۔

"کیا قبروں پہ چڑھانے کے لیے پھول بھی مل جائیں گے؟" علیزے نے ڈرائیو کرتے دل آور کے چہرے کی سمت دیکھا تھا۔

"ہاں مل جائیں گے۔" اسے اس کی تسلی کے لیے جواب دینا ہی پڑا تھا۔

"کیا زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے بھی پھول مل جائیں گے؟" اس نے اک اور تیر پھینکا۔

"علیزے!" دل آور نے لب بھینچ لیے تھے۔

"تو اس میں غلط کیا ہے بھلا؟ زری بھی تو تقریباً" مر ہی چکی ہے نا؟ کیا ہوا جو وہ بے ہوشی سے ذرا ہوش میں آگئی ہے؟" علیزے بڑی ریلیکس نظر آرہی تھی۔

"تم مجھے ٹارچر کرنا چاہتی ہو نا؟" دل آور نے بڑے ضبط کا مظاہرہ کیا تھا۔

"نہیں! میں زری کو اس کا حق دلانا چاہتی ہوں' تم سے اس معاملے کو لے کر علیزے اور زری میں انصاف کروانا چاہتی ہوں' دیکھنا چاہتی ہوں کہ تم کتنے انصاف پرست آدمی ہو۔" علیزے نے اسے چیلنج کیا تھا اور دل آور نے ایک گہری سانس کھینچی تھی جیسے اس نے بھی کوئی ارادہ باندھ لیا ہو۔

"ٹھیک ہے! آج تمہیں جس چیز کا یقین نہیں ہے' اس چیز کا یقین دلاتا ہوں' لیکن یہ یقین تمہیں زندگی میں پہلی بار اور آخری بار دلاؤں گا اس کے بعد زندگی میں کبھی بھی مجھ سے کسی ایسے یقین کی امید مت رکھنا آؤ میرے ساتھ۔" دل آور نے بہت ہی پتھریلے اور سپاٹ سے انداز میں کہتے ہوئے قبرستان کے باہر والے ایریا میں اک جھٹکے سے گاڑی کو بریک لگائے تھے اور گاڑی سے اتر آیا مجبوراً" اس کے پیچھے علیزے کو بھی اترنا پڑا اور دل آور اس کے اترتے ہی پھول خریدنے میں لگ گیا۔ تازہ پھولوں کے دو الگ الگ شاپر لینے کے بعد وہ واپس اس کی طرف پلٹ آیا۔

"یہ لو یہ زری کی قبر پہ چڑھانے کے لیے اور یہ اماں اور بابا کی قبروں پہ چڑھانے کے لیے ہیں۔" اس نے دونوں شاپر علیزے کو تھما دیئے اور علیزے نے چپ چاپ تھام بھی لیے تھے۔

"آؤ۔" وہ کہتے ہوئے قبرستان کے چھوٹے سے جالی دار سبز رنگ کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ مگر ابھی قبرستان کے اندر داخل ہوا ہی تھا کہ اس کا موبائل دوبارہ بجنے لگا۔ اس نے موبائل نکال کر دیکھا ایس پی کامران مہدی کی کال تھی۔ مگر وہ قبرستان میں کھڑے ہو کر فون نہیں سننا چاہتا تھا اس لیے اس نے ایس پی کامران مہدی کی کال ڈس کنیکٹ کردی مگر اس کے ڈس کنیکٹ کرنے کے باوجود ایس پی کامران مہدی نے دوبارہ کال کی تھی اور دل آور نے دوبارہ ڈس کنیکٹ کر ڈالی تھی بلکہ اور تو اور موبائل کو سائلنٹ پہ لگا کر واپس جیب میں رکھ لیا تھا اور علیزے کا ہاتھ پکڑ کر اونچی نیچی جگہوں سے گزرتا ہوا تقریباً" قبرستان کے وسط میں آگیا اور ایک ساتھ بنی تین قبروں کے پاس رک گیا۔

"یہ ہے میرے بابا کی قبر۔" اس نے سب سے پہلے قبر کی طرف اشارہ کیا۔
"بابر شاہ ولد منصور حسین شاہ!" علیزے نے ان کا نام پڑھا تھا اور منصور حسین شاہ کے نام پہ دل آور کے چہرے کی طرف دیکھا جو دکھ اور اذیت سے دھوئیں کی طرح ہو رہا تھا۔
"یہ ہے میری اماں کی قبر۔" اس نے دوسری قبر کی طرف اشارہ کیا۔
"بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔" علیزے بتول شاہ کا نام پڑھ کر دنگ رہ گئی تھی۔
"بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔" اس نے دوبارہ اور پھر سہ بارہ پڑھا تھا۔
"بتول شاہ ولد منصور حسین شاہ۔" اس کے لب بار بار ہل رہے تھے مگر حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔
"ڈرائیور!" وہ جیسے کسی پاتال سے بولی تھی۔
"ہاں! یہ سچ ہے' یہ حقیقت ہے' بتول شاہ میری ماں سہی لیکن قبر کے اس کتبے پہ اگر میری پھوپھی بن جاتی ہیں کیونکہ وہ میرے بابا کی سگی بہن تھیں۔ لیکن میرے لیے میری ماں تھیں۔ آج بھی' کل بھی اور قیامت کے روز بھی وہ میری ماں ہی رہیں گی۔ وہ میری ماں کی حیثیت سے اور میں ان کے بیٹے کی حیثیت سے پہچانا جاؤں گا۔" دل آور نے بڑے مضبوط لہجے میں اعتراف کیا' مگر علیزے کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔
"تو کیا ڈرائیور کے ماں باپ دونوں ہی نہیں تھے؟ وہ محض اپنی پھوپھی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔" علیزے کے دل پہ ہاتھ پڑا تھا اور پہلی بار۔۔۔ زندگی میں پہلی بار اسے "اپنے ڈرائیور" سے ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اتنی ہمدردی کہ آنکھوں کے گوشے نم ہوتے محسوس ہوئے تھے۔
"اور یہ ہے میری امی کی قبر!" اس نے بابر شاہ کی قبر کی دائیں سائیڈ والی قبر کی طرف اشارہ کیا۔
"فردوس شاہ زوجہ بابر شاہ" علیزے نے دل آور کی ماں کا نام پڑھا اور پھر گم سم سی ہو کر رہ گئی۔ اس کے لیے یہ انکشاف کچھ کم نہیں تھا کہ بتول شاہ دل آور کی ماں نہیں بلکہ پھوپھی تھیں۔
"یہ ان تین افراد کی قبریں ہیں جو میرے اپنے تھے جو میرے سگے تھے جن سے میرا خون کا رشتہ تھا اور جن کے سوا میرا کوئی نہیں تھا ان کے بعد اس دنیا میں کسی کو اپنا سمجھا تو وہ صرف عبداللہ اور نبیل تھے اور جب عبداللہ اور نبیل سے دوستی ہوئی تو تب زری کہیں بھی نہیں تھی۔ ہماری اس دوستی کے درمیان زری کا کوئی وجود نہیں تھا' وہ بہت بعد میں آئی تھی۔ میرے لیے وہ سب سے اہم اور سب سے پہلے تھے۔ ہاں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ زری کو دیکھا وہ اچھی لگی تھی' پسند آئی تھی' اس سے محبت بھی ہوئی تھی' اسے چاہتا بھی تھا مگر ابھی اسے پانے کا خیال بھی دل سے نہیں گزرا تھا کہ مجھ پہ ادراک ہوا کہ نبیل اسے مجھ سے بھی زیادہ چاہتا ہے' مجھ سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے' وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ اچھی لگتی ہے اور وہ اسے مجھ سے بھی زیادہ پسند ہے اور جب کسی ایک انسان کو دوسرے انسان کی پسند کا ادراک ہوتا ہے تو پہلا انسان کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ اپنی پسند کو حاصل کرلے یا دستبردار ہو جائے' کسی کے دل کو روند ڈالے یا اپنے دل کی سیج سجائے؟ ایک بات۔۔۔ صرف ایک بات۔۔۔ تم خود سوچو علیزے اور انصاف کرو۔ اگر تم بازار جاؤ اور تمہیں وہاں کوئی چیز پسند آجائے اور تم اسے کسی بھی قیمت پر چھوڑنا نہ چاہو لیکن وہی چیز تمہاری بہن یا تمہارے کسی بھائی کو بھی پسند آجائے اور وہ بھی اسے چھوڑنا نہ چاہے تو تم کیا کرو گی؟ وہ چیز خود لے لو گی؟ یا اپنے بہن یا بھائی کے لیے چھوڑ دو گی؟" دل آور نے انتہائی سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس سے انصاف چاہا تھا اور علیزے اس کے سوال پہ چپ کی چپ رہ گئی تھی۔
"بولو! جواب دو علیزے! وہ چیز خود لے کر اپنے دل کی خوشی پوری کر لو گی یا اپنے بہن یا بھائی کی خوشی کے لیے چھوڑ دو گی؟" دل آور نے اسے اکسایا تھا۔ اور خود کو دل آور کی جگہ رکھتے ہوئے علیزے کا دل کانپ گیا تھا اور ہونٹوں پہ ہلکی سی جنبش ہوئی تھی۔

"چھوڑ دوں گی!" جواب بہت مختصر تھا مگر اعتراف بہت بڑا تھا آخر انصاف جو کرنا تھا۔
"اس چھوڑ دینے میں تمہاری بزدلی ہو گی؟ یا تمہاری فراخدلی ہو گی؟" انصاف کے اس ترازو پہ اس کے سوال مسلسل جاری تھے۔
"فراخدلی ہو گی!" علیزے نے اک اور اعتراف کیا۔
"کیا تمہارے دل میں اس چیز کو دوبارہ پالینے کی کوئی تمنا رہے گی یا نہیں رہے گی؟" اس کا تیسرا سوال بھی ہنوز سنجیدگی اور انصاف کے ترازو میں جھولتا ہوا سامنے آیا تھا۔
"نہیں رہے گی۔" علیزے بھی اس انصاف کے معاملے میں انصاف سے ہی کام لے رہی تھی۔
"تو پھر اب اس بات کا بھی انصاف کرو کہ کیا میں زری کو اپنا سکتا تھا؟ جبکہ مجھے یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ نبیل اس سے محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے؟" ایک اور سوال آیا۔
"نہیں۔" وہ بھی منصفی سے کام لے رہی تھی۔
"کیا کوئی عزت دار اور غیرت مند مرد یہ بات گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی کو اس کا دوست دل ہی دل میں چاہتا رہے؟ اور وہ یہ بات جاننے کے باوجود بھی اپنی بیوی کے ساتھ خوش رہے؟" دل آور نے علیزے کے سامنے امتحان اور انصاف کا ہر سوال کھول کے رکھ دیا تھا۔
"نہیں!" علیزے کے ذہن اور عقل کے در وا ہوتے جا رہے تھے اور وہ دل آور کے احساسات کے بہت قریب پہنچ چکی تھی۔
"تو پھر میں زری کے ساتھ شادی کیسے کر سکتا تھا؟ کیسے اس کے ساتھ خوش رہ سکتا تھا کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اس سے شادی میں کروں اور اسے چاہے نبیل؟ جب ہم اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کی ہوئی چیز خود استعمال کر لینے کا حوصلہ نہیں رکھتے تو پھر اپنے کسی بہن بھائی کی پسند کے جیون ساتھی کے ساتھ زندگی کیسے گزار سکتے ہیں بھلا؟ اور یہ صرف میری ہی بات نہیں ہے بلکہ میری جگہ نبیل بھی ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔ اب یہی دیکھ لو اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ اس نے مومنہ بی بی سے شادی کر کے زری کی طرف جانے والے تمام راستے بند کر دیے ہیں تاکہ اسے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور نہ ہونا پڑے۔ لیکن تم میری اس بات کو غلط مت سمجھنا میں نے زری سے بھاگنے کے لیے یا اس سے دور رہنے کے لیے تم سے شادی نہیں کی۔ میں نے صرف اپنی اماں کی خوشی کی خاطر تم سے شادی کی تھی۔ ورنہ دنیا میں خدا کی پاک ذات کے علاوہ ایسی کوئی طاقت نہیں تھی جو مجھے علیزے آفندی سے شادی کے لیے مجبور کر سکتی۔ میں مجبور ہوا تو صرف اپنی اماں کی وجہ سے۔۔۔ ورنہ شادی کرنا ہوتی تو میں کسی اور سے بھی کر سکتا تھا تم سے شادی کرنا ضروری نہیں تھا' مگر جب قسمت میں ہی یہی لکھا تھا تو پھر ضروری بھی ہو گیا اور جب قسمت میں لکھا یہ ضروری کام ہو ہی گیا ہے تو اسے پورے دل سے اپنا بھی لیا ہے بغیر کسی کھوٹ اور بغیر کسی ملاوٹ کے۔۔۔ اب دل میں تمہارے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے علیزے۔ کچھ بھی نہیں۔۔۔" دل آور نے اپنے دلی جذبات کا اور دلی کیفیات کا بہت ہی کھل کے اظہار کیا تھا۔
"اور زری؟" علیزے نے اسے آخری بار ٹٹولنا چاہا تھا۔
"علیزے! میں آج یہاں کھڑے ہو کے قسم کھاتا ہوں کہ زری کو میں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں وہیں انگلینڈ کی فضاؤں میں۔ چند سال پیچھے اتنا پیچھے کہ اب مڑ کے دیکھنا بھی چاہوں تو وہ کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ میرے آس پاس کہیں بھی نہیں ہے' نہ دل میں' نہ دماغ میں اور نہ ہی سوچ میں' ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ اسے چاہا تھا اس سے محبت کی تھی مگر اسے حاصل کیے بغیر' اسے وہیں چھوڑ آیا' اسے وہیں بھول آیا تھا یہ سوچ کر کہ میں کسی اور سے محبت کروں گا اور کسی اور سے شادی کروں گا۔ وہ "کسی اور" تم ہو گی یہ تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔ مگر یقین کرو

تمہارے سوا اور تمہارے بعد نہ کوئی اور علیزے ہو سکتی ہے اور نہ کوئی زری۔۔۔ میں تمہارے معاملے میں بالکل کھرا ہوں اس لیے مجھے کسی چیز کا کوئی ڈر نہیں ہے اور زری کے معاملے میں میری نیت اور میرا ضمیر بالکل صاف ہیں اس لیے میرے دل پہ کوئی بوجھ نہیں ہے۔ باقی اگر میں کسی معاملے میں قصوروار ہوں تو میں خدا کی عدالت میں حاضر ہوں وہ مجھے جو بھی سزا دے مجھے قبول ہو گی۔" دل آور نے آج ایسی باتیں کہہ دی تھیں کہ علیزے کے پاس جواباً" کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا اور وہ چپ کی چادر اوڑھ کے رہ گئی تھی۔ جبکہ دل آور اس کی طرف سے رخ موڑ کر اپنی جیب سے رومال نکال کر سر پہ باندھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ فاتحہ خوانی کے لیے بلند کر چکا تھا اور علیزے کی نظروں نے اسے پہلی بار بڑے دھیان سے یوں سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور پہلی بار اسے سامنے کھڑا اپنا "ڈرائیور" برا نہیں لگا تھا۔ جیسے ہی اس نے تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھنے کے بعد چہرے پہ ہاتھ پھیرا علیزے بے ساختہ چونک گئی اور فوراً" سنبھلتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں سے پھول نکال کر قبروں پہ چڑھانے لگی اور دونوں شاپر خالی کرنے کے بعد اس نے بھی تینوں قبروں پہ فاتحہ پڑھی اور پھر آہستگی سے سر جھکا کر دل آور کے برابر آگئی تھی۔

"سارے پھول ان قبروں پہ چڑھا دیے۔ زری کی قبر پہ چڑھانے والے پھول کہاں گئے؟" دل آور نے اسے خالی ہاتھ دیکھ کر پوچھا تھا۔

"نہیں! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں کبھی لے کر زری سے ملنے کے لیے جاؤں گی۔ کیا مجھے لے کر جاؤ گے؟" علیزے نے ذرا ہلکے پھلکے موڈ میں بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہاں! ضرور لے کر جاؤں گا بلکہ آج ہی لے کر جاؤں گا۔" اس نے فوراً" ہامی بھری تھی اور علیزے اس کے مان جانے پہ بہت خوش ہوئی تھی۔

"تھینک یو!" اس نے بڑے ریلیکس انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

"ویلکم!" وہ بھی دھیمے سے لہجے میں کہتا واپسی کے لیے قدم بڑھا چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی علیزے بھی چل پڑی، لیکن ابھی وہ قبرستان سے باہر نکلے بھی نہیں تھے کہ انہیں سامنے سے مبارک خان آتا ہوا دکھائی دیا تھا اور علیزے مبارک خان کو دیکھ کر چونک گئی۔

"مبارک خان۔" علیزے نے زیر لب اس کا نام دہرایا تھا۔

"السلام علیکم علیزے بی بی! السلام علیکم صاحب! کیسے ہیں آپ؟" مبارک خان نے علیزے کو سلام کرنے کے بعد دل آور کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا اور اس سے حال چال بھی پوچھا تھا۔

"وعلیکم السلام! میں ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیوں؟" دل آور کو کچھ تشویش ہوئی تھی۔

"میں بہت دیر سے آپ کے نمبر پہ کال کر رہا ہوں مگر آپ کال ریسیو نہیں کر رہے تھے تب مجھے گلاب خان کے نمبر پہ کال کرنا پڑی اور اس سے پتا چلا کہ آپ علیزے بی بی کے ساتھ قبرستان آئے ہوئے ہیں اور اس وقت خالی ہاتھ ہیں۔ سو مجھے مجبوراً" آپ کے پیچھے آنا پڑا۔"

مبارک خان کیا کہہ رہا تھا۔ علیزے کے کچھ پلے نہیں پڑا تھا وہ تو بس ماؤف ہوتے دماغ کے ساتھ ان دونوں کا اتنا دوستانہ انداز دیکھ رہی تھی اور ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

"مگر کیوں؟" دل آور کو الجھن ہوئی تھی۔

"کیونکہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔ ملک اسد اللہ اور ملک حق نواز کے بندے مسلسل آپ کی تاک میں ہیں۔ وہ کسی بھی وقت آپ پر حملہ کر سکتے ہیں اور یہ حملہ آپ کے لیے خطرناک اور نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ان کے عزائم کچھ اچھے نہیں ہیں۔" مبارک خان اس کے لیے متفکر ہو رہا تھا اور علیزے پاگل ہو جانے کو تھی۔ اسے

غش آرہے تھے۔

"تمہیں کیسے پتا؟" وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔

"صاحب! آپ کا بندہ ہوں' آپ کا نمک کھاتا ہوں' آپ کے اچھے برے کی خبر نہیں رکھوں گا تو اور کیا کروں گا؟ آپ کی فکر کرنا' آپ کا دھیان رکھنا میرا فرض بنتا ہے اور میں یہ فرض ضرور نبھاؤں گا آپ بس یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ ایس پی کامران مہدی بھی بہت پریشان ہیں آپ کے لیے۔۔۔" مبارک خان واقعی اس کے لیے بہت پریشان ہو رہا تھا۔

اور علیزے یہ جان کر ششدر سی رہ گئی تھی کہ اس کے ڈیڈ کا اور بڑی حویلی کا بہت ہی خاص اور بہت ہی بااعتبار ملازم مبارک خان کوئی اور نہیں بلکہ دل آور شاہ کا خاص آدمی تھا جس نے ہمیشہ دل آور شاہ کے لیے ہی کام کیا تھا یہاں تک کہ بڑی حویلی میں بھی۔۔۔!

"کیا مطلب۔۔۔؟ کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟" دل آور بھی چونک گیا۔

"میرا مطلب ہے کہ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں ہر طرف خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں آپ بس علیزے بی بی کو لے کر یہاں سے جلدی نکلیں ورنہ کوئی بڑا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔" مبارک خان کی پیشن گوئی کبھی غلط نہیں ہو سکتی تھی اسی لیے دل آور بھی علیزے کے خیال سے ایک دم الرٹ ہو گیا اور سر پہ بندھا رومال اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے علیزے کا ہاتھ کافی مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"چلو علیزے۔ جلدی نکلو یہاں سے۔۔۔" اس نے علیزے کو اپنے ساتھ کھینچا۔

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ مبارک خان۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟" علیزے مبارک خان کے متعلق جاننا چاہتی تھی۔

"یہ سب تمہیں بعد میں بتاؤں گا' ابھی چلو۔" دل آور کو اپنے بجائے علیزے کی فکر تھی اسی لیے علیزے کو بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے قبرستان سے باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے اپنا اسلحہ چادر کے نیچے چھپائے مبارک خان بھی باہر آ گیا تھا۔ دل آور کو تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر بڑے سے درخت کے پیچھے چھپے ایک آدمی نے یک دم فائرنگ کر ڈالی تھی اور فائرنگ کی اتنی ہولناک آواز سے دہشت زدہ سی علیزے بے ساختہ دل آور سے لپٹ گئی تھی اور اس کے لپٹنے کی وجہ سے جو گولی دل آور کے سینے میں آ کر پیوست ہونی تھی وہ علیزے کے کندھے میں جا گھسی تھی اور علیزے کی چیخوں سے پوری فضا گونج اٹھی تھی اور دوسری گولی علیزے کے بازو کو چھید کے رکھ گئی تھی۔

"ڈرائیور!" علیزے اس کے بازوؤں میں لہرائی تھی۔

"علیزے۔" دل آور کی اس افتاد پہ آنکھیں پھٹ گئی تھیں وہ اسے خون میں لت پت دیکھ کر پاگل ہو اٹھا اور علیزے کو دیوانوں کی طرح اپنی بانہوں میں جھنجھوڑنے کی کوشش کی تھی۔

"علیزے۔۔۔! علیزے۔۔۔!" وہ زور زور سے پکار رہا تھا مگر علیزے ہر چیز سے غافل ہو چکی تھی اور دوسری طرف مبارک خان نے ملک حق نواز کے بندوں کو گولیوں سے چھلنی کر ڈالا تھا لیکن دل آور کو علیزے کے سوا کچھ نہیں سوجھ رہا تھا' کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا' بس وہ تھی اور اس کا بہتا ہوا خون نظر آرہا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

٭ ٭

وہ کتنی دیر سے ٹیبل کیلنڈر کو ہاتھ میں لیے دیکھ رہی تھیں۔ یہ سال بھی گزر گیا۔ کسی کے لیے بہت تیز اور کسی کے لیے بہت دھیرے دھیرے۔ آج دسمبر کی 29 تاریخ تھی۔ صرف دو دن' دو دن رہ گئے تھے سال ختم ہونے میں اور پھر اس کے بعد ایک نیا سال' نئی تاریخ' نیا کیلنڈر' نیا سورج' واقعی؟ کیا واقعی نیا سورج' یا وہی ہزاروں سال سے طلوع ہونے والا' جو ہر روز دنیا اور اس کے باسیوں کے نئے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہے۔

"اف۔" انہوں نے ہاتھ سے اس کیلنڈر کو واپس میز پر رکھا اور اپنی سوچوں کو دوسری طرف مبذول کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن یہ سوچیں' پھر وہیں آکر ٹھہر گئیں۔ پھر ان کی نظر ایک طرف رکھے ٹیلی فون پر جم گئیں ــــــ کتنے دن' آج کتنے دن ہو گئے تھے ظفر اور عامر کے فون آئے ہوئے۔ انہوں نے پھر دل ہی دل میں حساب کتاب کرنا شروع کیا۔ شاید ایک ہفتہ یا دو ہفتہ یا شاید اس سے بھی زیادہ وہ سوچنا نہیں چاہ رہی تھیں' لیکن دل' ہیر پھیر کر وہیں آجاتا۔

"آپا جی' کھانا کھالیں' میں نے میز پر لگا دیا ہے۔" صغراں کی آواز انہیں سوچوں سے کھینچ لائی۔

"ہاں! کیا کہہ رہی ہو؟" انہوں نے خالی نظروں سے صغراں کی طرف دیکھا۔

"کھانا کھا لیجیے۔" اس نے اپنی بات دہرائی۔

"نہیں مجھے بھوک نہیں۔"

"کیوں نہیں بھوک' شام کو بھی آپ نے خالی چائے پی تھی اور اب تو چائے پیے ہوئے بھی تین گھنٹے ہونے کو ہیں۔"

"میں نے کہا نا صغراں کہ ــــ"

"آپا جی کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا اور رزق کو انتظار نہیں کرواتے۔" وہ خوب جانتی تھی کہ انہیں بھوک کیوں نہیں ہے۔ جب ہی اس نے ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کہا۔

"اچھا میں ابھی تھوڑی دیر بعد کھالوں گی۔" وہ بے چارگی سے بولیں۔

"دیکھیے عشاء ہوئے بھی کتنی دیر ہو گئی اور آپ نے ابھی تک نماز بھی نہیں پڑھی۔"

"ہائیں عشاء ہو چکی؟" وہ حیران تھیں۔

"جی ہاں آپ کب سے تو ظفری بھیا کے کمرے میں بیٹھی ہیں۔"

"آں ــــ اچھا ــــ اچھا۔" وہ ایک دم ہی چاروں طرف دیکھنے لگیں۔

"آئیے پہلے کھانا کھالیں' پھر نماز پڑھ کر ثانیہ بی بی سے بات کر لیجیے گا۔" صغراں نے ان کی چھوٹی بیٹی کا نام لیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ آج ساجدہ بیگم کو اپنے بچوں کی یاد بڑی شدت سے آرہی ہے۔ جب ہی تو وہ پچھلے دو گھنٹوں سے یہاں بیٹھی ہیں۔ پھر وہ اس کے اصرار پر اٹھ کر میز تک آگئیں۔ انہوں نے اپنی پلیٹ میں تھوڑا سا مٹر قیمہ نکالا اور بے دلی سے کھانے لگیں۔

"آپا جی یاد ہے مٹر قیمہ' عامر بھیا کتنے شوق سے کھاتے تھے۔" اس نے جان بوجھ کر عامر کا قصہ چھیڑا۔

"ہاں ــــ" وہ ایک دم مسکرا دیں۔

"عامر کو مٹر قیمہ بہت پسند تھا۔ وہ اکثر مجھ سے فرمائش کر کے پکواتا۔"

"تو جی آپ پکاتی ہی اتنے مزا کا ہو۔" صغراں جلدی سے بولی۔

"ہوں اور یاد ہے ظفری کو اتنی ہی چڑ تھی مٹر قیمہ سے اس کو ہری مرچیں قیمہ بھاتا تھا۔ پھر میں اس دن دونوں کی ہی پسند کا پکا دیتی۔" ساجدہ بیگم اب ہنس رہی تھیں۔ وہ لقمے جو بے دلی سے منہ میں جا رہے تھے اب بچوں کا ذکر کر کے شوق سے کھا رہی تھیں اور صغراں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"اور ثانیہ باجی کو میٹھا بہت پسند تھا۔" اس نے سلاد ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ہاں ثانیہ بچپن سے ہی روز کچھ نہ کچھ فرمائش کرتی' کبھی کھیر تو کبھی کسٹرڈ اور سردیوں میں تو گاجر کے حلوے کے بغیر رہتی ہی نہ۔" انہوں نے پلیٹ سے پیاز اور کھیرا اٹھاتے ہوئے کہا اور پھر اسی طرح بچوں کی باتیں کرتے ہوئے کھانا تمام ہوا۔ پھر وہ عشاء کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آج نماز کو بہت دیر ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نہ جانے رات کے کس پہر ان کو نیند آئی تھی کہ فجر میں بھی آنکھ نہ کھلی اور اب جانے کیا ٹائم ہو گیا تھا۔ دھوپ دیواروں پر آچکی تھی۔ وہ جب کمرے سے باہر آئیں تو صغراں اپنے معمول کے کام نبٹا رہی تھی۔ ان کو دیکھ کر وہ ناشتا میز پر رکھنے لگی۔

"صغراں آج تم نے بھی نہ اٹھایا۔ دیکھو تو کیا وقت ہو گیا ہے۔" ساجدہ بیگم نے دیوار گیر گھڑی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کو رات ٹھیک سے نیند نہ آئی ہوگی۔ میں نے فجر میں آپ کو آواز تو دی تھی۔ آپ نے مجھے اچھا کہا تھا تو میں واپس اپنے کمرے میں آگئی۔ پھر شاید دوبارہ آنکھ لگ گئی ہوگی۔" اس نے پورا تجزیہ کر دیا تھا۔

"ہاں شاید ایسا ہی ہوا ہے۔" وہ پھر خاموشی سے چائے پینے لگیں۔

"یہ سلائس تو لیں۔" اس نے ان کے آگے رکھے سلائس کی طرف اشارہ کیا۔

"بس ٹھیک ہے۔" انہوں نے اس کے کہنے پر بمشکل ایک سلائس چائے کے ساتھ اتارا اور پھر اخبار دیکھنے لگیں۔ ناشتے کے بعد وہ ایک تفصیلی نظر ضرور اخبار پر ڈالتیں۔

"کیا پکاؤں آپا جی؟" صغراں پھر پوچھ رہی تھی۔

"جو دل چاہے پکا لو ہمارا تمہارا کھانا ہی کیا۔" وہ استہزائیہ ہنس کر بولیں۔

"پھر بھی آپا جی جو آپ کہو۔"

"ارے میں کیا کہوں جو بھی سبزی فریج میں رکھی ہے وہ ہی بنا لو۔" وہ بات ختم کرتے ہوئے بولیں۔

صغراں ان کے پاس پچھلے کئی برس سے تھی۔ بچے چھوٹے تھے تو وہ کپڑے' برتن دھو کر چلی جاتی تھی۔ باقی کام وہ خود ہی کرتیں۔ پھر آہستہ آہستہ جب بچیاں بڑی ہو گئیں۔ تو وہ ہاتھ بٹا دیتیں۔ اس کے بعد پھر دونوں بیٹیاں ہی کام کرتیں اور ساجدہ بیگم چھوٹا موٹا کام ہی سمیٹ لیتیں۔ جب ایک ایک کر کے دونوں کی شادیاں ہو گئیں اور بیٹے بھی شادی ہو کر ایک امریکہ اور دوسرا دبئی جا بسا۔ اسی طرح ثانیہ کی شادی حیدر آباد میں ہوئی۔ سویرا اگرچہ اسی شہر میں بیاہی تھی لیکن دو سال پہلے اس کے میاں کا بھی پنڈی تبادلہ ہو گیا اور وہ بھی پردیس سدھاری اور اس طرح ساجدہ بیگم اکیلی ہو گئیں۔ جب تک میاں زندہ تھے انہیں اکیلا پن محسوس نہ ہوا۔ اگرچہ بچوں کی کمی اور ان کے دور دیس جا بسنے کی وجہ سے وہ بہت دلگرفتہ رہتیں ــــــ لیکن میاں کی تسلی اور سہارا انہیں مایوسی سے بچاتا' لیکن پانچ سال پہلے ضیاء صاحب کے انتقال کے بعد تو یہ تنہائی انہیں کاٹ کھانے کو دوڑتی۔

جب ہی بچوں کے کہنے پر انہوں نے اپنی پرانی ملازمہ صغراں کو مستقل اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ وہ بھی اکیلی حالات کی ستائی ہوئی تھی۔ ایک ہی بیٹی تھی جو شادی کے بعد گاؤں میں رہتی' میاں نے دوسری شادی کرلی تھی۔ لہٰذا وہ بھی بغیر کسی حیل و حجت کے ان کے ساتھ رہنے لگی اور سب سے بڑھ کر اتنے عرصہ ساتھ رہنے کی وجہ سے وہ غضب کی مزاج شناس بن چکی تھی۔ کب وہ کیا چاہتی ہیں۔ وہ بغیر کہے سمجھ لیتی۔ اس کے ساتھ رہنے سے بیٹیاں بھی خاص طور پر پرسکون ہو گئیں۔ کیونکہ ماں کی تنہائی کی وجہ سے وہ بڑی فکر مند رہتی تھیں۔

بچوں سے وہ فون پر بات کرتیں' لیکن پھر بھی اکثر ان کی یاد آنکھوں کو نم کر دیتی۔ دونوں بیٹیاں تو اپنے شوہروں کی نوکری کی وجہ سے مجبور تھیں۔ دوسری طرف بیٹے بھی صرف جلد آنے کی آس ہی دلاتے۔ انہوں نے ظفری کو کتنا ہی کہا کہ تم تو واپس اپنا تبادلہ یہاں کروالو' لیکن وہ بھی دبئی کی چمک دمک کو ماں پر فوقیت دیتا۔ پھر وہ بھی تھک ہار کر خاموش ہو گئیں۔ دونوں بیٹے رقم بھیج کر مطمئن ہو جاتے۔ لیکن یہ رقم

ان کا متبادل تو نہیں ہو سکتی تھی یہ کون انہیں سمجھاتا۔ اب تو دونوں کی مصروفیت اتنی بڑھ چکی تھی کہ فون کیے بھی کئی کئی دن ہو جاتے اور وہ ان کی تصویروں سے ہی دل بہلا لیتیں۔

☼ ☼ ☼

آج یکم جنوری تھی' نئے سال کا آغاز' نئے سال کی نئی صبح' کتنے ہی آنسو انہوں نے چپکے سے دوپٹے سے صاف کیے تھے۔

"آپا جی ناشتا کرلیں۔" وہ تسبیح پڑھ رہی تھیں تو صغراں نے انہیں آواز دی تھی۔

"ہوں۔" انہوں نے جواب دیا اور تسبیح مکمل کرکے کتنی ہی دیر دعا مانگتی رہیں' پھر چہرہ پر ہاتھ پھیر کر آنکھیں صاف کرکے وہ اٹھیں اور آہستہ آہستہ چائے کے گھونٹ بھرنے لگیں۔ صغراں نے ان کے بغیر کہے ہی اخبار لا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن انہوں نے نہ اٹھایا۔ آج پھر دل بہت اداس تھا۔ وہ چائے ختم کرکے اٹھ گئیں اور کمرے کی طرف قدم بڑھائے' ورنہ یہ وقت تو وہ لاؤنج میں اخبار پڑھتے اور صغراں سے بات چیت کرکے گزارتیں اور پکانے میں بھی تھوڑی بہت مدد کرواتیں۔

"آپا جی کیا ہوا؟" صغراں نے خلاف معمول ان کو جاتے دیکھ کر سوال کیا۔

"بس صغراں کچھ طبیعت ٹھیک نہیں' میں کمرے میں جا رہی ہوں۔" وہ آہستہ آواز میں بولیں۔

"خیریت' کیسی طبیعت ہے؟" وہ فکرمندی سے پوچھ رہی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

"نہیں۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں' بس کچھ سستی چھائی ہوئی ہے۔" وہ بولیں اور کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔

آج کھٹر پٹر کی آوازیں معمول سے زیادہ ہی آ رہی تھیں۔ صغراں بھی انہیں مصروف مصروف لگی' لیکن انہوں نے کچھ نہ پوچھا۔ صغراں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ صفائی کرنے والی لڑکی سے بحث کر رہی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ آج ہفتہ وار صفائی کروا رہی ہو۔ انہوں نے سوچا اور آنکھیں موند لیں۔ وہ اپنی آرام کرسی پر بیٹھی تھیں اور مایوس کن سوچیں ان پر ڈیرہ جما رہی تھیں۔

"کیا فائدہ ایسی زندگی کا' اگر مر بھی جاؤں تو بھی اولاد پاس نہیں۔ کندھا دینے کو بھی بیٹے نہ ہوں گے۔" وہ سخت آزردہ ہو رہی تھیں۔ آج طبیعت گری گری لگ رہی تھی۔ ورنہ وہ صغراں کے ساتھ کچن میں کچھ نہ کچھ کرتی رہتیں۔ وہ وقت بھی تھا جب بچے چھوٹے تھے اور ان کو منٹ بھر کی فرصت نہ ملتی اور کہاں اب فرصت ہی فرصت اور یہی سب سوچتے سوچتے ان کی آنکھ لگ گئی تھی۔

ہلکے ہلکے شور سے ان کی آنکھ کھلی تھی۔ پہلے تو وہ خالی الذہن سے سنتی رہیں' پھر یہ شور بڑھنے لگا تھا۔ کسی عورت کے تیز تیز بولنے کی آواز' پھر بچوں کی آوازیں' وہ چونک گئیں۔

"کون ہے؟" ان کے بے آواز لب ہلے' دل خوش گمان ہوا۔

"لیکن کسی نے اپنے آنے کی اطلاع تو نہ دی تھی۔" وہ ابھی یہی سوچ رہی تھیں کہ آہستگی سے دروازہ کھلا۔ انہوں نے ذرا سی گردن موڑی اور پھر ان کی آنکھیں بے یقینی سے آنے والے کو دیکھ رہی تھیں۔

"ثانیہ!" ان کے منہ سے مسرت بھری آواز نکلی اور ثانیہ دوڑتی ہوئی آئی اور ماں سے لپٹ گئی۔

"السلام علیکم۔" اردگرد اس کے بچے کھڑے نانی کو سلام کر رہے تھے۔ تب انہوں نے ثانیہ کو چھوڑ کر بچوں کو لپٹایا انہیں پیار کیا۔

"یہ تم اچانک کیسے' اطلاع بھی نہیں دی۔" وہ ہنس رہی تھیں' خوشی کے مارے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

"بس امی ایک دم ہی ہم نے پروگرام بنایا کہ کتنے ہی مہینے گزر گئے' آج چلنا چاہیے نیا سال امی کے

ساتھ۔" وہ مسکرائی۔

"رہنے آئی ہو نا۔" انہوں نے فوراً" ہی اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"جی جی آپ بے فکر رہیں' کل جاؤں گی' آج سارا دن یہاں ہی گزاروں گی۔"

"کل۔ بس۔" وہ ایک دم ہی چپ ہو گئیں۔

"امی پھر ان شاء اللہ جلد ہی آؤں گی میں بھی اور سویرا آپی بھی۔" اس نے تسلی دی۔

"سردیوں کی چھٹیاں بھی تم دونوں نے یوں ہی نکال دیں۔" انہوں نے شکوہ کیا۔

"امی آپ کو بتایا تو تھا کیسی مجبوری تھی۔ سسرال میں جیٹھ کے گھر شادی تھی' آپ ہی بتائیں کیسے آتی؟" وہ اپنی مجبوری بتا رہی تھی۔

"تم تو قریب ہو تو اتنا کہہ بھی دیتی ہوں' ادھر سویرا کو دیکھو' چھ مہینے ہو گئے۔" وہ شکایت نامہ کھول چکی تھیں۔

"وہ بھی کیا کریں' ان کے بچوں کی ہی اتنی طبیعت خراب تھی۔ چھوٹا تو چار دن اسپتال رہ کر آیا۔ اب ایسی حالت میں اسے لے کر کیا سفر کرتیں۔" وہ ان سے لاڈ سے لپٹ گئی تھی۔ یوں ہی لگے لگے بولی۔ ثانیہ چونکہ چاروں بچوں میں چھوٹی تھی۔ لہٰذا وہ لاڈ بھی بہت کرتی اور امی اس کی سنتی بھی تھیں۔ لیکن ابھی وہ مطمئن نہ ہوئی تھیں۔

"چلو بچوں آؤ دیکھو میں نے تمہارے لیے کیا بنایا ہے۔ آؤ بیٹی ثانیہ سردی ہو رہی ہے پہلے سوپ پی لو۔" صغراں سب کو بلا رہی تھی۔

"آئیے امی۔" ثانیہ نے امی کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے آئی وہ بھی کشاں کشاں ساتھ چلی آئیں۔

"صغراں خالہ' سوپ بہت مزے دار ہے۔" ثانیہ کی بڑی بیٹی چہکی اور سب نے اس کی تائید کی۔

اس کے بعد تو صغراں تو کچن میں گھس گئی ان کے لیے کھانے کی تیاری کے لیے اور امی و ثانیہ بیٹھ کر باتیں۔ کتنی ہی باتیں تھیں ثانیہ کے پاس امی کو سنانے

کے لیے۔ تب امی نے کہا۔

"ارے ایک فون ہی کر دیتیں اپنے آنے کا، میں کچھ تمہارے اور سہیل میاں کی پسند کا ہی تیار کر لیتی۔"

"چھوڑیں امی، اب کیا میں آپ کو آنے سے پہلے کچن میں گھسا دیتی اور ویسے بھی سہیل کے کوئی نخرے نہیں ہیں، وہ تو آپ کے ہاتھ کی ہر چیز شوق سے کھا لیتے ہیں۔ اپنے دوست سے ملنے گئے ہوئے ہیں، کھانا ساتھ ہی کھائیں گے۔"

دوپہر کے کھانے پر صغراں نے بڑا اہتمام کیا ہوا تھا۔ امی کی ساری بیماری طبیعت کی گراوٹ، کسلمندی کہیں غائب ہو گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھیں اور شاید اسی خوشی کی زیادتی میں انہوں نے غور نہیں کیا کہ صغراں نے اتنے مختصر وقت میں اتنا کچھ کیسے تیار کر لیا تھا۔ جبکہ پہلے سے کوئی اطلاع بھی نہیں تھی۔ بڑے خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔

اور پھر وہ سارا وقت بڑی تیزی سے گزر گیا۔ ظفری، عامر، سویرا سب کے فون آئے تھے۔ نئے سال کی مبارک باد دینے، امی بہت مگن تھیں۔ وہ دن اور اس سے اگلا دن، پتا ہی نہ چلا ثانیہ اور بچوں کے ساتھ کیسے گھر میں رونق اتر آئی تھی۔ ساجدہ بیگم الگ ہشاش بشاش نظر آ رہی تھیں۔ شاید بچوں کے آنے کی خوشی ہوتی ہی ایسی ہے۔ کتنے دن کے بعد اس گھر میں رونق اتری تھی اور یہ سب صغراں خالہ کی مہربانی کی وجہ سے ہوا تھا، ثانیہ بہت مشکور تھی۔

"خالہ... آپ جو کچھ ہماری ماں کے لیے کر رہی ہو اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔" جانے سے پہلے ثانیہ کچن میں صغراں کے ہاتھ پکڑے کہہ رہی تھی۔ امی بچوں کے ساتھ مصروف تھیں۔ لہٰذا ثانیہ نے موقع جان کر صغراں کا شکریہ ادا کیا۔ کیونکہ اسی نے فون کر کے ساجدہ بیگم کی طبیعت اور اداسی کا کہہ کر اس سے آنے کی درخواست کی تھی۔ ورنہ وہ تو گھر اور بچوں کی مصروفیت میں گھن چکر ہی بنی تھی۔

صغراں کا فون سن کر ہی اس نے سہیل کو چلنے پر راضی کیا تھا اور یوں وہ بہت سے کام آگے پیچھے کر کے گھر سے نکلی تھی۔

"بیٹی مجھے شرمندہ نہ کرو۔"

"شرمندہ تو ہم ہیں، جو اپنی ماں کے لیے بھی وقت نہیں نکال پاتے۔" اس کی آواز بھرا گئی تھی۔

"نہ بیٹی، ایسے نہ کہو، بس تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اپنی ماں کے لیے مہینہ میں ایک دفعہ ضرور آجایا کرو اور تو میں کسی سے نہیں کہہ سکتی، تم ذرا قریب ہو تو بس اس لیے تم سے کہہ رہی ہوں۔"

"جی خالہ میں پوری کوشش کروں گی۔"

"فون تو ضرور ہی ہر تیسرے چوتھے روز تم دونوں بہنیں کر لیا کرو اور ہو سکے تو اپنے بھائیوں سے بھی کہو کہ وہ بھی ہفتہ میں ضرور ماں کی خیر، خیریت لے لیا کریں، مجھ سے ان کی اداسی دیکھی نہیں جاتی۔"

"جی خالہ!" وہ بس اتنا ہی کہہ سکی اور کچن سے باہر آ گئی اور پھر اپنی چیزیں بیگ میں رکھنے لگی۔ امی نے مختلف قسم کے لوازمات اس کے ساتھ کر دیے تھے۔

کتنی مجبور تھیں وہ دونوں بہنیں، چاہتے ہوئے بھی ماں کے قریب نہیں آ سکتی تھیں اور کتنے بے حس ہو گئے تھے اس کے بھائی جو ماں کا وجود ہوتے ہوئے بھی اس کی چھاؤں سے اپنے آپ کو محروم رکھے ہوئے تھے۔ لیکن ماں کی ممتا تھی جو ان پر نثار ہوئے جاتی، اس کی دعائیں ان کے لیے ہی ہوتیں، کسی بھی دنیاوی غرض کے بغیر یہ محبت تو انمول تھی اور یہی سب سوچتے ہوئے وہ رخت سفر باندھ رہی تھی۔

☆ ☆

دسمبر کا مہینہ تھا سر شام ہی اندھیرا پھیل گیا۔ سرد ہواؤں کی شوخی اپنے عروج پر تھی۔ باہر سخت سردی پڑ رہی تھی اور دور کھڑکی دروازوں پر شدید ہوا سر پٹک رہی تھی۔ اس نے کھڑکی کھول دی۔ سرد ہوا کے جھونکے نے بڑھ کر اس کے گال پر بوسہ دیا اور کمرہ سرد ہواؤں سے بھر گیا۔ باہر دور دور تک سوائے کہر کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ نیم کے درخت سے ٹپکتے اوس کے قطرے بارش کی طرح گرتے اور زمین میں جذب ہو جاتے۔

چاند کے سامنے دھند کی چادر تن گئی تھی اور آسمان سے گرتے کہر کے قطرے موتیوں کی طرح بکھرے پتوں پر لمبی تان کر سو گئے تھے۔ ہوا پھر سے شور مچانے لگی تو اس کے وجود میں کپکپی سی دوڑ گئی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آتش دان میں سلگتے کوئلوں میں کبھی کبھی کوئی کوئلہ چیخ اٹھتا اور سناٹا ٹوٹ جاتا۔ ورنہ وہی خاموشی پھر طاری ہو جاتی۔

ہوا کی خنکی میں اب بھی تیری نرم باتیں
آہٹوں کا جال بنتی ہیں
سماعت اب بھی تیرے قہقہوں کا شور سنتی ہے
خیال اب تک تمہاری انگلیوں سے
میرے دل کے سرخ آنسو پونچھتا ہے
نگاہیں برف کے پھیلے چمکتے کینوس پر جابجا
تیری رفاقت کی ضرورت پینٹ کرتی ہیں
ٹھٹھرتے پانیوں کے تن پر بکھری دھوپ
تیرا لہجہ روتی ہے
کہاں ہوتی ہے تو
محبت کی سلگتی راہ گزاروں کے کناروں پر
دسمبر اب بھی تیرا منتظر ہے۔

اس نے برف پڑتے ہاتھوں سے گالوں پر بہتے موتیوں کو چنا۔ اس نے کبھی ناکامی کا منہ دیکھا تھا نہ کبھی خواب بنے تھے نہ کبھی ہاری تھی۔ وہ ایک حقیقت پسند لڑکی تھی۔ ہر وقت ہنستی کھلکھلاتی نظر آتی۔ نجانے کب اور کیسے اس نے جگنو کے ساتھ کے خواب دیکھنا شروع کر دیے۔ اس کے اطراف میں پھیلی ہوئی جگنو کی محبت کی دنیا بہت خوب صورت تھی پھر اس نے خواب بھی دیکھے اور ہار بھی گئی۔

اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ خواب تعبیر نہ پا سکے اور وہ ہار گئی ٹوٹ گئی بکھر گئی۔ ہنسنا بھول گئی۔ اس کی جلترنگ ہنسی کہیں کھو گئی دیا راؤ کا آرزوؤں کا تاج محل ٹوٹ گیا۔ وہ کانچ کی گڑیا بلندی سے منہ کے بل گری اور چکنا چور ہو گئی۔ جگنو نے کانچ سمیٹنا چاہے اس گڑیا کو زندگی دینا چاہی تو اسے اجازت نہ دی گئی۔

انہوں نے بہت کچھ پا کر بہت کچھ کھویا تھا اور کچھ ان کے اندر کہیں بکل مار کر بیٹھ گیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں کتنی محبت، کتنی حسرت اور کتنی خواہش دم توڑ رہی تھیں۔ وہ تو اسے اپنی آنکھوں کے دریچوں میں چھپا کر کہیں دور بہت دور لے جانا چاہتا تھا، مگر ان کی حسرتیں بھری نگاہیں ایک دوسرے کو جدائی کے سفر پر گامزن دیکھ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

سکندر اکبر راؤ کا پلاسٹک کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سکندر حسن راؤ اپنی راجدھانی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ نسرین بیگم ہر دم ان کی حکم کے لیے تیار رہتی تھیں۔ سکندر راؤ کی ریاست میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی تھی۔ انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے دی نہ انہیں اپنا راستہ خود بنانے دیا۔ ان کے مزاج میں ضد اور ہٹ دھرمی تھی۔

مرحوم جب تک زندہ رہے۔ انہوں نے تمام فیصلوں کا اختیار اپنے پاس ہی رکھا کسی دوسرے کی رائے یا خوشی اور ناخوشی کی بھی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ انہوں نے ہمیشہ ہر مسئلے کو اپنے نظریات کی عینک لگا کر ہی دیکھا۔ دوسرے کیا سوچتے

ہیں اور کیا چاہتے ہیں اس کی انہوں نے کبھی پروا نہیں کی۔

سکندر اکبر راؤ کے زمانے میں جگنو سے پہلے بھی کئی پرپوزلز ایسے بھی تھے جن پر دونوں بیٹوں اور بیوی کا مکمل اتفاق تھا، لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ہی عقل کل سمجھتے تھے۔ مشورہ یا رائے لینا اپنی ہتک تصور کرتے تھے۔ دراصل انہوں نے اپنے سامنے کسی کو اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ یہاں تک کہ نسرین بیگم کو بھی تمام معاملات سے الگ تھلگ ہی رکھا اور وہ نہ جانے کون کون سے غم اور حسرتیں دل میں چھپائے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔

ان کو کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ان کے فیصلے بچوں کی خوشیوں کی ڈور کاٹتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی من مرضی ہی کی اور آج اقبال سکندر راؤ کی خواہش تھی دیا راؤ حسن راؤ کا پرپوزل کو قبول کر لیں۔

"دیا یہ تو ایک فرض تھا جو بہت پہلے ادا ہو جانا چاہیے تھا، لیکن قسمت کی ستم ظریفی کہہ لیں یا ہماری کوتاہی اس کام میں دیر ہوتی چلی گئی۔" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"ابا کے مزاج سے تو تم بھی اچھی طرح واقف تھیں۔ امی جی تمہاری شادی کی خواہش دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔"

کمرے کی فضا ایک دم ہی سوگوار ہو گئی تھی۔ دیا اور آصفہ کی آنکھیں بھی بھیگ گئی تھیں اور اقبال سکندر کی آنکھوں کے گوشے بھی گیلے ہو گئے تھے۔ ذرا وقفے کے بعد اقبال سکندر پھر گویا ہوئے۔

"حسن راؤ نہایت اچھے اور نفیس انسان ہیں۔ ایجوکیٹڈ ہیں، ویل آف ہیں، ان کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے اولاد کوئی نہیں ہے۔ ایک عرصے بعد دیار غیر سے لوٹے ہیں۔ اپنوں میں رہنا چاہتے ہیں۔ ایک پرسکون زندگی کے خواہاں ہیں جس میں کوئی مخلص ہستی ان کی ہم سفر ہو۔"

دیا کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ ہنوز بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹھی رہی۔

"دیا پلیز خود کو ذہنی طور پر آمادہ تو کریں، زندگی کی یہ تبدیلی یقیناً" خوش گوار محسوس ہو گی۔" وہ اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔

"واہ، واہ، بہت خوب، جواب نہیں تم مردوں کا بھی پہلے ایک مرد نے ضد اور انا کی آڑ لے کر حسب نسب کے گارے سے اتنی اونچی فصیلیں کھڑی کر دیں، کوئی روزن، کوئی دریچہ نہیں چھوڑا اور اب دوسرا مرد ان فصیلوں کو ڈھا کے اس کے ملبے پر نئی تعمیر کا مشورہ دے رہا ہے۔ جب لکڑی سلگ سلگ کر ختم ہوتی رہی تو کسی نے پروا نہیں کی اور جب وہ ڈھیر بن گئی تو اس میں چنگاریاں تلاش کرنے کے جتن ہو رہے ہیں۔" اس کی نظریں بھائی پر مرکوز تھیں وہ سوچے چلی جا رہی تھی۔

"دیا۔۔۔" اقبال سکندر نے گھبرا کر اسے پکارا تو وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آ گئی۔

"اب تو خواہشوں کے چراغ بجھ گئے ہیں اور آپ لوگ پھر سے ان بجھے دیوں کو جلانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔" وہ بولی تو اس کے لہجے میں برہمی اور چہرے پر غم کے تاثرات تھے۔

"اب یہ عمر ہے میری شادی کی؟"

"تم ایسا کیوں سمجھتی ہو دیا؟" آصفہ بھابھی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"اڑتیس سال کچھ کم نہیں ہوتے۔ انسان کو حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیے۔" وہ خود کو ان کی مرضی کے مطابق تیار کرنے کو راضی نہ تھی۔

"لیکن تم تو پچیس سے زیادہ کی نہیں لگتی ہو۔" اس نے دیا کے نازک سے وجود کو رشک سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگنے اور نہ لگنے سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔" اس کے انداز میں خفگی تھی۔

"تم نے خود ہی اپنے آپ کو اوور ایج تصور کر لیا ہے۔ ورنہ کتنے ہی لوگ تو شادی ہی اس عمر سے زیادہ

میں کرتے ہیں۔ میری خالہ کی دو بیٹیوں کی ابھی شادی ہوئی ہے جو خاصی عمر کی ہیں اور اقبال کے ایک دوست ــــــ کی شادی بھی ابھی ہوئی ہے اس کی بیوی بینک میں سینئر افسر ہے۔ اب عمر کا اندازہ تم خود لگالو۔ آپ تو گئے تھے نا شادی میں آپ بتائیں نہ دیا کو؟" آصفہ نے شوہر سے مدد چاہی۔

"ہاں دیا یہ کوئی اتنی غیر معمولی بات نہیں ہے جتنا تم سمجھ رہی ہو۔" انہوں نے رک کر دیا کے جواب کا انتظار کیا لیکن اسے خاموش دیکھ کر دوبارہ گویا ہوئے۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا لیکن یہ میری بلکہ ہم سب کی خواہش ہے کہ اب تم بھی گھر بسالو۔ ایک خوش و خرم زندگی گزارو تمہاری ویران زندگی اب مجھ سے نہیں دیکھی جاتی۔ میں دل پر بوجھ محسوس کرتا ہوں۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں مجرم ہوں اور میں اپنی ذمے داریاں اچھے طریقے سے پوری نہیں کر سکا ہوں۔"

انہوں نے بے چینی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"ایسا کیوں سوچتے ہیں آپ بھائی۔" وہ تڑپ گئی۔

"کون کہتا ہے میری زندگی ویران ہے یا میں ناخوش ہوں۔ یہ گھر' آپ' بھابھی اور بچے یہ سب میری زندگی کا محور و مرکز ہیں۔ آپ سب کی خوشیوں سے ہی میری خوشیاں وابستہ ہیں۔ آئندہ ایسا خیال بھی دل میں نہ لائیے گا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں' یہ سب تو ابا کی ضد کی وجہ سے ہوا۔ آپ خود کو کیوں مجرم محسوس کرتے ہیں اور میری خوشیاں آپ لوگوں سے ہیں۔"

"اور ہماری خوشیاں' تمہاری ذات سے منسلک ہیں۔ پلیز ہمیں مایوس نہ کرو۔ آخری فیصلہ تو تمہارا ہی ہوگا' لیکن یاد رکھو کہ تم سے ہم سب کی خوشیوں کی ڈور بندھی ہوئی ہے۔ کیوں آصفہ!"

"ہاں دیا بے شک کچھ دیر ضرور ہو گئی ہے' لیکن ابھی وقت ہاتھ سے نہیں نکلا۔ تم ٹھنڈے دل سے اس پہلو پر غور کرو۔"

"اقبال بھائی آپ جانتے ہیں سب پھر بھی۔"

"یقین کرو دیا میں نے اپنی پوری کوشش کی تھی کہ تمہاری خواہش کی تکمیل ہو مگر ابا کے سامنے ہماری کسی کی نہیں چل سکی اور تمہاری خواہش حسرت بن گئی۔ کاش میں آج بھی تمہاری خواہش پوری کر سکتا۔"

دیا نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر پھر خاموش ہو گئی۔ اقبال اور آصفہ دونوں اس کے کمرے سے نکل گئے۔ دیا اپنے کمرے میں تنہا رہ گئی تھی اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور ہولے ہولے دبانے لگی۔ وہ خود کو بہت ٹینس محسوس کر رہی تھی۔ وہ ماضی کی پگڈنڈیوں پر سفر کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

دیا راؤ کا کھنکتا ہوا قہقہہ فضا میں بلند ہوا تو امی جی نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کتنی مرتبہ سمجھایا ہے دیا' آہستہ ہنسا کرو' میرا دل دہل کر رہ جاتا ہے ابھی تمہارے ابا ہوتے تو کتنا برا مناتے۔" انہوں نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں بھی امی جی وہ خوش کس بات پر ہوتے ہیں؟ میں نے تو آج تک ان کو ہنستے مسکراتے نہیں دیکھا۔ سچ کہیے' کیا آپ نے انہیں کبھی خوش باش دیکھا ہے' یہ نہ کرو' وہ نہ کرو' آہستہ بولو' زور سے نہ ہنسو' ایسے نہ اٹھو ویسے نہ بیٹھو اور سانس۔۔۔ ہاں وہ بھی گن گن کر لو۔" دیا راؤ کی آخری بات پر مریم بے اختیار ہنس پڑی۔ امی جی البتہ اسے پریشان نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"تمہارا ابھی جواب نہیں دیا۔ کتنے گلے شکوے جمع کر رکھے ہیں تم نے اپنے دل میں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا مزاج ہوتا ہے کیوں امی جی؟" مریم نے امی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا تمہارے ابا دل کے برے نہیں ہیں۔ ہاں مزاج میں ذرا سختی ہے اور کچھ اصول وضع کر رکھے ہیں۔ انہوں نے زندگی گزارنے کے جن پر وہ خود بھی سختی سے عمل کرتے ہیں اور چاہتے ہیں ان کی اولاد بھی ایسا ہی کرے۔" انہوں نے بڑے رسان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"امی اب ہر شخص ان کی نظر سے تو زندگی کو نہیں دیکھ سکتا نا۔ ہر ایک کا نقطہ نظر مختلف ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے۔" وہ بھی بحث کے موڈ میں تھی۔

"اچھا چھوڑو اس فضول بحث کو اور دو چار روٹیاں ڈال دو تمہارے بھائی بھی آتے ہی ہوں گے۔ فائزہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ورنہ وہ ہی ڈال دیتی۔"

"تم رہنے دو میں پکا لیتی ہوں۔" مریم نے اپنی کتابیں سمیٹتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہاتھ کی روٹیاں بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔" اس نے دیا کو چھیڑا۔

"ایک تو گھر بیٹھے دنیا کی سیر کرا دیتی ہوں مگر تمہیں مفت کی سیاحت ہضم ہی نہیں ہوتی ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی آنکھوں کے روشن جگنو بہت حسین لگ رہے تھے اور گھنٹیاں بجاتی جلترنگ ہنسی بہت دل موہ لینے والی تھی۔

چلو پھر سے دنیا کا نقشہ تمہارے سامنے رکھ دیتی ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔ ابا کے لیے تو ہوں گی نا فصیح کی روٹیاں' باقی سب کی خیر ہے۔" اس نے مریم کو شانوں سے پکڑ کر دوبارہ بٹھا دیا اور خود فائزہ کے پاس جا کھڑی ہوئی جو بستر پر دراز کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھیں۔

"ہاں بھئی بیمار لوگو کیا حال ہے؟" اس نے فائزہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کون بیمار؟" انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"جناب سنا ہے نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہے اور آپ ناسازی طبیعت کی وجہ سے روٹی پکانے سے قاصر ہیں۔"

فائزہ ہنستے ہوئے اٹھ بیٹھیں۔ انہوں نے پیار سے اسے ایک چپت رسید کی۔ کتنی رونق ہے اس کے دم سے ورنہ یہ گھر شہر خموشاں کا ہی منظر پیش کرے۔ وہ سوچ رہی تھیں۔

"کہاں کھو گئیں اپیا آپ آرام فرمائیں۔ آج یہ خاکسار خدمت پر مامور ہے۔" وہ ہنستے ہوئے کچن کی طرف چل دی۔

"ہمارا گھر کچھ عجیب سا ہی ہے اور اس میں رہنے والے نفوس وہ تو شاید عجیب و غریب ہیں' مجھ سمیت۔" فائزہ نے کتاب بند کر کے سرہانے رکھی اور سوچوں میں کھو گئیں۔

☼ ☼ ☼

ابا کے آتے ہی دیا نے کھانا لگا دیا۔ کھانا نہایت خاموشی سے کھایا جا رہا تھا۔

"اور سناؤ اقبال میاں' تمہاری ملازمت کیسی جا رہی ہے؟" ابا نے خاموشی کو توڑا۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آفندی صاحب بہت خوش ہیں میری کارکردگی سے ہو سکتا ہے چند مہینوں بعد میری ترقی بھی ہو جائے۔" اقبال نے خوش ہو کر بتایا۔

"بہت خوب۔" ابا نے پانی کا گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"اور برخوردار آپ کی پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" اب وہ مصطفیٰ سے مخاطب تھے۔

"جی باقاعدہ کلاسز اٹینڈ کر رہا ہوں۔" مصطفیٰ نے گڑبڑا کر جواب دیا۔ ان کی ساری شوخی و طراری ابا کے سامنے ہوا ہو جاتی تھی اور وہ بعد میں ہاتھ پر مکے مار مار کر تاسف کا اظہار کرتا رہ جاتا۔ تہنیں اس صورت حال سے محظوظ ہوئے بنا نہ رہتیں۔

"آپ کھانے کے بعد میرے کمرے میں آجائیے گا۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" ابا نے دسترخوان سے اٹھتے ہوئے امی کو مخاطب کیا تو سب نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ایسی کیا خاص بات ہو سکتی ہے؟" ابا کے جاتے ہی دیا کی زبان میں کھجلی شروع ہو گئی تھی۔

"مجھے خود بھی کچھ اندازہ نہیں ہے بیٹا۔ وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکے گا کیا بات ہے؟" امی نے پرسوچ انداز میں کہا۔

"رانا یونس کو تو آپ جانتی ہی ہیں۔" سکندر راؤ

اپنی باٹ دار آواز میں گویا ہوئے۔ "اور ان کی بیگم سے بھی آپ کی خاص واقفیت ہے۔ کئی دفعہ ملاقات ہو چکی ہے آپ کی۔"

نسرین بیگم نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس تمہید کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"وہ لوگ مریم کے لیے آنا چاہ رہے ہیں۔ ایک دو روز میں شاید چکر لگائیں۔ رانا یونس سے میری بہت پرانی واقفیت ہے، خاندانی لوگ ہیں۔ ان کے بچے بھی میرے دیکھے بھالے ہیں۔ میں نے اپنا عندیہ دے دیا ہے۔" انہوں نے اطمینان سے بات ختم کی تو نسرین نے حیرت سے ان کو دیکھا۔

"لیکن اس سے پہلے فائزہ اور دیا ہیں۔ ہمیں پہلے ان کے متعلق سوچنا چاہیے۔"

"بھئی انہوں نے خود مریم کے لیے کہا ہے اب کیا میں زبردستی فائزہ یا دیا کو ان کے سر منڈھ دوں؟" انہوں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا، لیکن وہ دونوں کیا سوچیں گی اور پھر لوگ الگ باتیں بنائیں گے کہ دو بڑیوں کو چھوڑ کر سب سے چھوٹی کی شادی کر دی۔ نجانے ان دونوں میں کیا کمی یا خرابی ہے۔ لڑکیوں کے والدین کو رشتے ناتے کرتے وقت سو طرح سے سوچنا پڑتا ہے۔"

"تم بھی کن چکروں میں پڑ گئیں بیگم۔ لوگوں کی مجھے پروا نہیں ہے اور رہی فائزہ اور دیا کی بات تو وہ ہماری بیٹیاں ہیں کیا وہ بہن کی خوشی سے ناخوش ہوں گی۔"

"میری بیٹیاں بڑے دل اور حوصلے والی ہیں اگر ان کے لیے آئے ہوئے رشتوں میں سے آپ کسی پر راضی ہو جاتے تو آج وہ بھی اپنے گھر بار کی ہوتیں۔" انہوں نے آزردگی سے کہا۔

"میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ میں ان کے خاندان اور ماحول سے مطمئن نہیں تھا اور پھر جو بات ختم ہو چکی ہو اس کو دہرانے سے فائدہ۔" ان کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔

"اور ہاں ایک بات اور... رانا یونس نے اپنے کسی رشتے کے بھائی کا ذکر کیا تھا جس کی بیٹیاں بھی پڑھی لکھی اور سلیقہ مند ہیں۔ مریم کے قصے سے فارغ ہو لیں تو اگلے ہفتے ان کے ہاں ہو آئیں گے دن اور وقت میں یونس سے مل کر طے کر لوں گا۔ اگر لڑکی معقول ہوئی تو اچھا ہے مریم کے ساتھ ساتھ ہم اقبال کے فرض سے بھی سبکدوش ہو جائیں گے ویسے بھی آج کل اچھے رشتے کہاں ملتے ہیں۔ یہیں بات بن جائے تو بہتر ہے۔"

وہ اپنی کہے جا رہے تھے اور نسرین بیگم حیرت سے ان کا منہ تکے جا رہی تھیں۔ آخر ہمت کر کے بول پڑیں۔

"یہ اقبال کا سلسلہ کہاں شروع کر دیا آپ نے؟ ابھی تو ملازمت لگی ہے۔ اسے قدم جمانے دیں، ترقی کرنے دیں۔ ابھی سے کہاں اسے بکھیڑوں میں الجھا رہے ہیں پھر اس کی تو عمر بھی کچھ نہیں ہے۔"

"کوئی دودھ پیتا بچہ نہیں ہے، وہ پڑھ لکھ گیا ہے برسر روزگار ہے۔ شادی کے لیے یہی عمر مناسب ہوتی ہے اور پھر کیا صحیح ہے کیا غلط یہ بات میں تم سے بہتر جانتا ہوں۔" انہوں نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ نسرین نے ٹھنڈی سانس بھر کر سر جھکا لیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ بحث فضول ہے اور تکرار لاحاصل، ہو گا وہی جو وہ چاہیں گے۔

پھر سب کچھ اس قدر اچانک اور جلدی ہوا کہ کسی کو سوچنے سمجھنے کی مہلت بھی نہ مل سکی۔ مریم روتی دھوتی اپنے گھر کو سدھاری اور آصفہ بیگم اقبال سکندر کی ہزار مخالفت کے باوجود دلہن بن کر اس گھر کے آنگن میں اتر آئیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ انہوں نے آتے ہی اپنے حسن سیرت سے سارے گھر کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ ساس کی وہ چہیتی بہو تھیں تو نندوں کی رازدار سہیلی اور دیور سے دوستی کا رشتہ استوار ہو گیا تھا اور تو اور سسر نے بھی ان کو لاڈلی بہو کا درجہ دے دیا تھا۔ اپنے انتخاب پر وہ بہت نازاں تھے۔ بہو سے بات کرتے وقت ان کے چہرے پر نرم سی مسکراہٹ پھیل جاتی جو سارے گھر کے لیے باعث حیرت تھی۔ ان

لوگوں کو محسوس ہوتا، جیسے ہمالیہ کے برف پوش پہاڑوں پر نرم گرم دھوپ پھیل گئی ہو اور اس کی حدت سے برف آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہو گئی ہو۔

آصفہ کے آنے سے گھر کی فضا میں خوش گوار تبدیلی رونما ہو گئی تھی اور گھٹن فضا میں قدرے کم محسوس ہونے لگی تھی۔ اب اگر دلہن کی ہنسی جلترنگ بجاتی یا دیا کا کھنکتا ہوا قہقہہ گھر کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتا تو ابا پہلے کی طرح روک ٹوک کرنے کے بجائے نظر انداز کر دیتے اور مریم اپنے شوہر کے ساتھ آ پہنچتی تو اس کے بلند بانگ قہقہوں سے گھر کے در و دیوار لرزتے ہوئے محسوس ہوتے۔ گھر کے مکینوں کے لیے ہی نہیں بلکہ یہاں کے در و بام کے لیے بھی یہ سارے مناظر نا صرف نئے بلکہ حیرت انگیز بھی تھے۔

☆ ☆ ☆
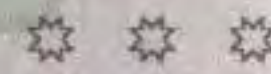
مریم کے آنے سے گھر میں رونق بڑھ جاتی ناصر کے لیے ان کی پسند کی ڈشز بنائی جاتیں۔ ناصر راؤ کے آتے ہی گویا گھر کے در دیوار انگڑائی لے کر بے دار ہو جاتے۔ گیٹ سے ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں اندر آتے ہی وہ آوازیں دے دے کر سب کو ایک جگہ جمع کر لیتے۔

فائزہ اپیا کو سوتے سے جگا دیتے۔ دیا کو چھیڑنے نہیں دیتے۔ ان کے ہاتھ کی چائے فرمائش کر کے پیتے وہ بھی لوازمات کے ساتھ۔ آصفہ کو کہتے ہمارے ساتھ باتیں کیجیے باقی کام بعد میں۔

ابا کے سامنے وہ بہت مودب اور سنجیدہ ہو کر بیٹھتے لیکن خاموش رہنا شاید ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ وہ ابا اور اقبال کے ساتھ ان کے پسندیدہ موضوعات پر گفتگو کرتے کہ وہ دونوں بھی ان کی معلومات اور خوش مزاجی کے قائل ہو جاتے اور یہی وہ وقت ہوتا جب اہل خانہ کو اپنے ادھورے کام نبٹانے کا موقع مل جاتا ورنہ وہ اپنی موجودگی میں کسی کو کچھ کرنے دیں، یہ ممکن نہ تھا پھر یہ بات بھی تھی کہ ان کی دلچسپ اور ساحرانہ گفتگو سن کر کسی کا محفل سے اٹھ کر جانے کا دل نہ چاہتا تھا۔

ان کی سنگت نے مریم کے موڈ اور مزاج پر بھی بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ انہوں نے بیوی کے اوپر چڑھے ہوئے خود ساختہ سنجیدگی کے خول کو توڑ کر شوخ و شنگ اور زندہ دل مریم کو برآمد کر لیا تھا جو اب قدم بہ قدم ان کے ساتھ تھی۔

دیا راؤ کا خیال تھا کہ وہ لوگ ان کے آنے پر ہفتے بھر کے لیے تازگی و توانائی کا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں جو آنے والے دنوں میں کام آتا رہتا ہے۔

آصفہ کے ہاں ننھے مہمان کی آمد تھی۔ اس کے استقبال کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ نسرین بیگم کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ سب کو ہدایات جاری کر دی تھیں۔

"دادی بننے کی خوشی میں ہاتھ پیر پھولے جا رہے ہیں۔" انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں ابا کے کیا جذبات ہوں گے دادا بننے پر؟" فائزہ نے دل ہی دل میں سوچا۔

"لیکن ہمیں کیونکر معلوم ہو سکتا ہے۔ انہیں تو اپنے جذبات و تاثرات چھپانے میں ملکہ حاصل ہے۔ اب دیکھیے کیا صورت حال بنتی ہے، گھر میں منے کی آمد کے بعد۔" وہ سوچتے ہوئے کچن کی طرف چل دیں۔

ننھے اذان کی آمد نے گھر کے منظرنامے کو بالکل تبدیل کر دیا۔ وہ گھر جہاں کبھی خاموشی کا بسیرا تھا۔ اب آوازوں کی آماجگاہ بن گیا۔ ہر کوئی اذان کے ساتھ اپنی اپنی بولی بولتا ہوا نظر آتا۔ سب کی خوشیاں اور غم گویا اس ننھے وجود سے منسلک ہو گئے تھے پھر سال بھر بعد رادیہ کی آمد نے رونقوں میں مزید اضافہ کر دیا۔

پھر اللہ نے فائزہ اپیا کے نصیب بھی کھول دیے۔ ابا کے دوست کے بیٹے تھے چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات تھی۔ رؤف شادی کے بعد فائزہ کو لے کر دوبئی سدھار گئے اور اب دیا رہ گئی تھی گھر کی فضا میں اس کی آوازیں گونجتی رہتیں۔ وہ بچوں کے ساتھ بچہ بنا رہتی۔ گھر کے ماحول میں بہت بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔

اس نے ایم اے میں دوسری پوزیشن حاصل کی تو ایک مقامی کالج میں لیکچرار کی آفر آگئی اور اس نے یہ آفر قبول کرلی۔ اس کے باوجود بھی وہ بچوں کے ساتھ کھیلتی اودھم مچاتی رہتی ہر طرف پھر نہ جانے کب اور کیسے دیا راؤ کی زندگی میں بہت بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔

جگنوؤں کے آنے سے اس کی زندگی میں کہکشاں اتر آئی۔ ایک فخر سا دل کو چھو گیا تھا کہ "جگنو راؤ میرا ہے صرف میرا جب چاہوں گی اسے پالوں گی۔" جگنو نے اس کی آنکھوں میں حسین خواب سجا دیے تھے۔ اب اس کی آنکھیں ان خوابوں کی تعبیر چاہتی تھیں۔ لیکن وہ بھول ہی گئی۔ خواب' خواب ہی رہتے ہیں جس کو پانے کے لیے وہ پر عزم تھی اس کا ساتھ دیا کی قسمت میں نہیں تھا۔

جگنو سے اس کی پہلی ملاقات کرن کی سالگرہ میں ہوئی تھی۔ وہ کرن کا کزن تھا۔ وہ بڑی ہی پرکشش پرسنالٹی کا مالک تھا۔ گندمی رنگت' موٹی موٹی بڑی بڑی آنکھیں' اونچا قد' خوب صورت خدوخال دوسری دفعہ وہ کرن کو کالج لینے آیا تب ملاقات ہوئی۔ تیسری مرتبہ کرن کی بہن کی شادی میں۔

شفون کے نیوی بلیو کامدانی سوٹ اور فیروزی دوپٹے میں وہ اسے اتنی پیاری لگی کہ وہ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر اسے دیکھا تو وہ شرمندہ ہونے کے بجائے مسکراتا رہا اور وہ وہاں سے اٹھ کر آگئی۔ اس پل جگنو کو احساس ہوا کہ وہ اس پیاری سی لڑکی سے پیار کرنے لگا ہے۔

وہ نادان تو نہ تھی کہ اتنا بھی نہ سمجھ پاتی کہ اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں کیوں مسکرانے لگتی ہیں۔ وہ انجان بنی رہی اور بنی ہی رہتی اگر ایک دن جگنو راؤ اپنے جذبوں کو اس پر عیاں نہ کردیتا۔ اس نے پہلو تہی کی کوشش بھی کی مگر زیادہ دیر اپنے آپ کو روک نہ پائی۔ دل کیسے لاچار ہوگیا تھا۔ وہ خود کو روکتے روکتے' دل کو انکار کرتے کرتے تھک گئی تو اس نے جگنو کا ہاتھ تھام لیا اور پھر دن رات زندگی کا سنہری کلس بن گئے۔ وہ پیار کی ست رنگی پھوار میں ایسی بھیگی کہ آنکھوں کا عکس اس کی روح کا ترجمان بن گیا۔ ہر سو خوشیاں دکھائی دینے لگیں اور دیا راؤ جیسے ہواؤں کے سنگ اڑنے لگی۔

جگنو راؤ نے اپنے تمام تر جذبوں کی سچائی کے ساتھ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ زندگی میں یوں تو حسن کی کئی دلفریبیاں نظر سے گزری تھیں' مگر وہ شوخ و شریر سی دیا اسے اتنی بھا گئی تھی کہ اس کے بغیر جینے کا تصور بھی اسے مشکل لگنے لگا۔ وہ اوکاڑہ صرف چار ماہ کے لیے آیا تھا۔ وہاں اس کی سب سے بڑی پھپھو جانی رہتی تھیں جنہوں نے اپنے گھر کی فروخت کے لیے اسے کچھ عرصے کے لیے اپنے پاس بلایا ہوا تھا۔ بیٹا تو ان کا کوئی تھا نہیں۔ شوہر بستر سے ہی لگ کر رہ گئے تھے۔ دو بیٹیوں کا بوجھ ابھی کندھوں پر تھا۔ اس لیے وہ چاہتی تھیں اس گھر کو بیچ کر کوئی چھوٹا سا گھر لے لیں تاکہ بچ جانے والا پیسہ بچیوں کی شادی پر کام آسکے۔ جوں ہی وہ لوگ دوسرے گھر میں شفٹ ہوئے اور مکان بکنے کے بعد رقم کی ڈلیوری عمل میں آئی' جگنو کی ممی نے فون پر جلد واپس آنے کا حکم سنا دیا۔ ویسے بھی جگنو راؤ ان کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا تھا ان کی امیدوں اور آرزوؤں کا محور اور ویسے بھی اب زبیر حسن بزنس کے ذمے داریاں اس کے کندھوں پر ڈالنا چاہتے تھے اور جگنو راؤ تو بھلا ہی بیٹھا تھا کہ اسے کلور کوٹ بھی واپس جانا ہے۔

دیا کو پتا چلا تو وہ بے حد اداس ہوگئی۔ ابھی تو زندگی میں دلکشی کا رنگ جھلکنے لگا تھا اور جگنو واپس جانے کو کہہ رہا تھا۔ وہ اداس تھی اور جگنو اسے ہنسانے کے لیے جتن کر رہا تھا۔

"بھئی تم تو اتنی افسردہ ہوگئی ہو جیسے میں کلور کوٹ جانے کے بجائے ملک عدم سدھار رہا ہوں۔" جگنو نے اسے چھیڑا تو اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

"ایک تو جا رہے ہو اس پر ایسی فضول باتیں کر رہے ہو۔" وہ رونے کی تمام تر تیاریاں پوری کرنے کو تھی کہ جگنو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"دیا دیکھو چند امیں ایک ماہ کے بعد چکر لگاؤں گا۔ اصل میں بابا کے سر پر بہت کام ہے۔ مجبوری ہے کہ مجھے جانا پڑے گا ورنہ تم سے دور کون کافر جانا چاہ رہا ہے۔ مجھے تو خود سمجھ نہیں آرہی تمہارے بغیر اتنا وقت کیسے گزاروں گا؟"

مگر دیا کی اداسی جگنو کی باتوں سے ختم نہ ہو پائی۔ وہ آنسو بہاتی رہی اور وہ اس کو دلاسے دیتا رہا۔ پھر وہ اسے روتا بلکتا چھوڑ کر جلد آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ وہ جگنو کی واپسی کے دن گن گن کر گزارنے لگی۔

کرن اکثر اس کی امی جی سے ملنے آتی رہتی تھی۔ کرن اس کی کولیگ تھی اور راجپوت فیملی سے تھی۔ دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ دونوں مقامی کالج میں پڑھاتی تھیں یہیں ان کی دوستی ہوئی تھی۔ آج بھی وہ اس کے گھر آئی ہوئی تھی کہ کرن نے اس کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"آنٹی آپ دیا کی شادی کیوں نہیں کردیتیں؟ اب تو یہ جاب بھی کرنے لگی ہے۔" اس نے آنکھ دبا کر دیا کو دیکھا۔ تو دیا کے ہونٹوں پر خوب صورت سی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"بس بیٹا کیا بتاؤں دیا کے ابا ہر رشتے کو رد کردیتے ہیں۔ ان کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے دیا کے نصیب بھی کھول دے شادی کی یہی عمر ہوتی ہے۔ لیکن دیا کے ابا کو کون سمجھائے۔ گھر میں بے کار بیٹھی تھی کہ اس نے سروس کرلی۔ اچھا ہے اس طرح اس کا دل بہلا رہتا ہے وہ تو شکر ہے اس کی نوکری کے سلسلے میں کوئی واویلا نہیں مچایا ورنہ دیا کی کیا مجال کہ نوکری کرلیتی۔ بیٹا لوگ باتیں بناتے ہیں کہ بیٹی کی شادی نہیں کرتے' لیکن وہ لوگوں کی باتوں کی پروا کب کرتے ہیں۔"

"ارے امی جی لوگ تو ہم سے جلتے ہیں۔ میں نے تو شوقیہ نوکری کی ہے۔ وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے اور گزارا بھی اچھا ہوجاتا ہے۔" دیا امی جی کے گلے سے لگ کر انہیں پیار کرتے ہوئے بولی۔

"اور کرن صاحبہ میں تھوڑی سی تفریح چاہتی ہوں۔ باہر کی دنیا اور اس کی پھیلی ہوئی رنگینیوں' دلچسپیوں سے محفوظ ہونا چاہتی ہوں مجھے خوش رہنے دو۔" دیا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"اور جگنو کا کیا ہوگا؟ رہ سکوگی اس کے بنا؟"

بھابھی چائے کی ٹرالی گھسیٹتی ہوئی اندر داخل ہوئی تھیں۔ انہوں نے کرن کی بات سن لی تھی۔ ان کے کان کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا بات ہے دیا یہ جگنو کون ہے' قصہ کیا ہے؟" انہوں نے جھکتے ہوئے دیا کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بتاتی کرن بول اٹھی۔

"میں بتاتی ہوں بھابھی دیا اور جگنو۔"

"کرن پلیز۔" اس نے کرن کو ٹوک دیا۔ کرن ایک دم ہی خاموش ہوگئی۔

"دیا میری جان سوری۔ میں کچھ نہیں بتاؤں گی جب تک تم خود نہیں بتاؤ گی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم نے ابھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔"

تھوڑے وقفے کے بعد کرن بولنے کے قابل ہوئی تھی۔ اس کا لہجہ شرمندگی لیے ہوئے تھا۔ اس نے دیا سے نظریں چرائیں۔

"کرن ایسی بات نہیں جانو ریلیکس پلیز۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کرن کی خجالت کم کرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کرن نارمل بھی ہوگئی۔ پرتکلف ماحول میں چائے پی گئی۔ امی جی مصطفیٰ کا فون سننے لگی تھیں۔ اس سارے معاملے سے وہ بے خبر تھیں۔

☼ ☼ ☼

مغرب کی نماز کے بعد دیا راکنگ چیئر پر بیٹھی آہستہ آہستہ جھولتی ہوئی کافی کی چسکیاں لے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی حسین سوچ نے گلاب کھلا دیے تھے۔ بھابھی اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتی رہیں اچانک دیا کی نگاہیں اٹھیں تو وہ گڑبڑا گئی۔

"اوہ بھابھی آپ!" وہ جلدی سے کپ رکھ کر بولی تو

وہ پھر بھی اسے گھورتی رہیں۔
"کیا بات ہے بھابھی اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں۔ پلیز بتائیں تو سہی۔" دیا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر سامنے والی کرسی پر بٹھا دیا۔
"اچھا آپ ناراض ہیں؟" وہ مسکرائی۔
"کیا میری ناراضی غلط ہے بولو؟"
"بالکل نہیں بھابھی ایک فی صد بھی غلط نہیں۔ میں خود آپ کو بتانا چاہتی تھی۔ دراصل وہ... وہ جگنو راؤ سے میں آپ کو کسی دن ملوانا چاہتی تھی۔ وہ بہت اچھا انسان اور پیاری شخصیت کا مالک' بڑی خوب صورت باتیں کرتا ہے۔ اس کی کمپنی میں ذرا بھی وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا۔" وہ بولتے بولتے کچھ کھو سی گئی۔
"لیکن دیا ابا کو کون منائے گا وہ تو کبھی تمہاری شادی جگنو سے نہیں کریں گے۔ انہوں نے تو مصطفیٰ کی پسند بھی ریجیکٹ کر دی ہے اور تمہارے لیے تو ناممکن ہے۔" بھابھی نے حقیقت کا خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔
"تم خود سمجھدار ہو بے وقوف اور نادان تو نہیں ہو۔ پھر تم نے دیا جگنو کو کیوں اپنے دل کی دہلیز تک آنے دیا۔"
"یہ سب باتیں سوچ سمجھ کر تو نہیں ہوتیں۔ دل پر کب کسی کا اختیار ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم جگنو کب اور کیسے میرے دل کا مہمان بن گیا۔ میں نے اسے اپنے دل سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام رہی۔ میں ہار گئی بھابھی' اس کے جذبوں کی شدت کے آگے' میں نے خود سے جنگ لڑتے ہوئے جگنو کے سامنے ہتھیار پھینک دیئے۔ وہ... وہ بہت اچھا ہے' بھابھی بہت اچھا۔ میں اس کے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔ آپ ایک بار اس سے مل کر تو دیکھیں۔"
"مگر دیا ابا کب مانتے ہیں کسی کی بات۔" ان کی آنکھوں میں موتی سے چمکنے لگے۔
دیا یک دم اٹھی اور نیچے بیٹھ کر ان کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رو پڑی اور ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔
"میری مدد کریں بھابھی ورنہ میرا دل بند ہو جائے گا۔"
دیا کے آنسوؤں سے ان کا گھٹنا بھیگ گیا تھا۔ وہ سخت تذبذب میں تھیں یہ کیا ہو گیا۔
"کیا سوچنے لگیں بھابھی؟" وہ کچھ خوف زدہ سی ہو کر بولی۔
بھابھی نے چونک کر اسے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور خود بھی کھڑی ہو کر بولیں۔
"ٹھیک ہے اپنے آنسو پونچھو۔ تم اسے کسی دن مجھ سے ملواؤ میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" انہوں نے اسے اور خود کو جھوٹی تسلی دی تھی۔ جبکہ ان دونوں کا ایک ہو جانا ناممکن تھا۔
"سچ بھابھی۔" وہ مسرت سے بے قابو ہو کر ان کی طرف بڑھی' مگر وہ اتنی دیر میں دروازے پر پہنچ چکی تھیں۔ دیا آنسو بھری پلکوں سے ان کو جاتا دیکھتی رہی۔
دیا خود بھی جانتی تھی کہ ابا کبھی نہیں مانیں گے مگر جگنو کی محبت نے اس کے دل سے سب خوف نکال دیئے تھے۔ وہ اس کی محبت میں رقص کرنے لگی تھی۔ اسے کچھ بھی تو ناممکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ ابا کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی تب ہی تو وہ سب کچھ بھول کر جگنو کی محبت کے رنگوں میں نہا گئی تھی۔ یاد رہا تو بس اپنا اور جگنو کا ملن۔

☆ ☆ ☆

اس نے پریشان ہو کر جگنو کو کال کی تھی اور ا[illegible] اوکاڑہ آنے کی جلد تاکید بھی۔ جگنو نے اسے بتایا تھا جلد آنے کی کوشش کرے گا' لیکن اس سے پہلے اپنے والدین سے بات کرے گا اور ان کو منانے کی کوشش بھی لیکن اس نے امید ظاہر کی تھی کہ وہ ان کو منالے گا۔ وہ اپنے ارادوں میں پختہ اور عہد کا پکا تھا۔ [illegible] کو امید ہی نہیں بلکہ پکا یقین تھا کہ وہ اپنی بات منوا لے گا۔

اس رات وہ بڑی دیر تک سوچتی رہی کہ اگر جگنو اپنے والدین کو منا بھی لیتا ہے تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ابا اس کی شادی جگنو راؤ سے کرنے پر راضی ہو جائیں گے۔ وہ سخت بے چین ہو گئی اور آخر اس نے اپنے ذہن کو یہ کہہ کر جھٹک دیا کہ دیکھا جائے گا۔ ابھی تو مرحلہ جگنو کو بھابھی سے ملانے اور ان کی رضا مندی کا ہے۔ آگے بھی "یقیناً" بھابھی کو ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ میری خاطر ابا کو راضی کرنے کے لیے۔
جگنو جو اسے ایک ماہ بعد آنے کا کہہ کر گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ہی لوٹ آیا۔ وہ دیا سے دوری برداشت نہیں کر پایا۔ اب اس سے دور رہنا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔
وہ ہنستا مسکراتا دیا کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ دیا نے اس کو اپنے سامنے دیکھا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک گئے۔
"جگنو آپ...؟"
"ہاں دیا میں تمہارا جگنو۔ اڑ کر آ گیا اپنی دیا کے پاس۔" اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو امڈتے دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
وہ ایک دم روتے روتے ہنس پڑی۔ اسے ہنستا دیکھ کر وہ بھی مسکرا دیا۔
"جگنو میں آپ کو اپنی بھابھی سے ملوانا چاہتی ہوں۔ میں نے ان سے آپ کا ذکر کیا تھا۔ انہوں نے کہا جگنو کو مجھ سے ملاؤ۔"
"تو پھر ٹھیک ہے پہلے میں بھابھی سے ملوں گا۔ کس دن ملوا رہی ہو؟" اس نے مسکرا کر پوچھا تو دیا نے کہا۔
"جب آپ کہیں...."
"تو گویا راستے ہموار ہو رہے ہیں۔" اس نے دیا کی آنکھوں میں جھانکا۔
"تو پھر آج ہی کیوں نہیں' نیک کام میں دیر کیسی؟" اس نے شوخ لہجے میں دیا سے کہا۔
"نہیں بھابھی سے معلوم کر کے آپ کو انفارم کروں گی۔"
"ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا اور اپنے ملن کی گھڑیاں گننا شروع کرتا ہوں۔" وہ ہنستا ہوا بولا۔
"خیر اب زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے' جو ہونا ہے وہ ہو جائے۔ آر یا پار۔"
"آپ نے بات کی ممی سے؟"
"ہاں ذکر کیا ہے ممی سے وہ راضی ہیں۔ اب بھابھی سے ملنے کے بعد جا کر پاپا سے بات کروں گا۔ پہلے بھابھی کی رضامندی معلوم کر لوں۔"
"کیا آپ کی فیملی..."
"تم پریشان نہ ہو۔ جیسا میں چاہوں گا ویسا ہی ہو گا۔"
پھر وہ ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے چلا گیا۔ دیا اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☆ ☆ ☆

ابا کسی کام سے لاہور گئے ہوئے تھے۔ بھابھی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آج ہی گھر انوائٹ کر لیا تھا۔ انہیں جگنو واقعی ہی بہت پسند آیا تھا۔ دیا نے جیسا انہیں جگنو کے بارے میں بتایا تھا۔ اس سے کہیں بڑھ کر پایا تھا۔ جگنو سے انہوں نے رسمی باتوں کے علاوہ جو معلومات لینی تھیں وہ حاصل کر لی تھیں۔ مگر ان کا ذہن کھٹک گیا تھا ابا کبھی دیا کی پسند سے شادی نہیں کریں گے۔
آصفہ بھابھی نے شوہر اور دیور سے جگنو کا ذکر کیا تھا اور ان دونوں کو دیا کا بتاتے ہوئے تاکید بھی کی تھی کہ ہر ممکن کوشش یہ ہی کی جائے کہ ابا جگنو کے پرپوزل کے لیے مان جائیں۔ اپنی ازلی ضد اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیں۔ دونوں بھائیوں نے ہامی بھری تھی اپنی کوشش کرنے کی مگر امید کسی کو بھی نہیں تھی کہ وہ مان جائیں گے۔
جب جگنو کا پرپوزل ان کے سامنے رکھا گیا تو پہلے رشتوں کی طرح یہ رشتہ بھی انہوں نے بنا ملے' جانے رد کر دیا۔ اقبال کا اصرار' مصطفیٰ کی تکرار اور مصطفیٰ کا اس کی خاطر ابا سے الجھ پڑنا گھر چھوڑنے کی دھمکی دینا۔ سب کچھ حیرت انگیز تھا۔ گھر میں جانو زلزلہ ہی آ گیا

تھا۔ کتنی دقتوں سے اس نے مصطفیٰ کو اپنے ارادے سے باز رکھا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر کہ وہ جگنو سے شادی ہی نہیں کرے گی۔ وہ کسی ایسی خوشی کی متحمل کیسے ہو سکتی تھی جس کا راستہ باپ اور بھائی کے درمیان پڑنے والی خلیج سے ہو کر گزرتا ہو۔

دیا آج ناکام ہو گئی تھی، ہار گئی تھی۔ ایسی ٹوٹی کہ کرچی کرچی ہو گئی۔

آج اس کی محبت کا تاج محل سرنگوں ہو گیا تھا۔

وہ کتنی دیر سوچتی رہی تھی۔ مسافتوں کا کرب چہرے سے عیاں تھا اس نے اپنے اندر جھانکا تو یہاں سے وہاں تک خاموشی کی ایک دبیز چادر تنی ہوئی تھی اور دل میں جذبوں کا شور برپا تھا۔ وہ بے تابی سے موبائل کی طرف لپکی اور اس نے جگنو کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو جگنو مجھے آپ کی ضرورت ہے پلیز۔"

اور اس کے ضبط کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ فون پہ ہی سسک پڑی۔ آگے اس سے کچھ بولا نہیں گیا اور جگنو موبائل پکڑے پریشان کر سوچنے لگا۔

"کیا دیا کی طبیعت خراب ہے۔ وہ رو کیوں رہی تھی؟" وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اس کے رونے سے جگنو کو شاک پہنچا تھا۔

جو کسی سے محبت کرتے ہیں وہ اسے دکھی نہیں دیکھ سکتے۔ وہ بھی تو دیا کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ ہی تو اس کی محبتوں کا مرکز تھی۔

وہ کتنا مجبور اور بے بس تھا۔ اس کے پاس جا سکتا تھا نہ اس کے آنسو پونچھ سکتا تھا۔ وہ تو اسے یہ بھی نہیں کہہ سکا تھا کہ "دیا روؤ نہیں مجھے تمہارے رونے سے تکلیف ہو رہی ہے۔"

وہ بار بار اسے کال کرتا رہا مگر اس نے کال پک نہیں کی۔ وہ اور بھی پریشان ہو گیا۔ کرن سوئی ہوئی تھی اس وقت کرن کو اس نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح تک اس کا ذہن مختلف منفی اور مثبت سوچوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ وہ رات بھر ایک پل کے لیے بھی نہ سو سکا تھا۔ وہ انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔

صبح اٹھا تو اس کی آنکھیں شب بے داری کا منہ بولتا ثبوت تھیں۔ وہ بہت پریشان پژمردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی حالت دیکھ کرن نے پوچھا۔

"جگنو آپ ٹھیک ہیں، کوئی پرابلم ہے تو بتائیں پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟"

"رات بھر سو نہیں سکا۔" اس نے عذر تراشا۔

"نہیں بتائیں گے بات کیا ہے؟"

"بات تو مجھے معلوم نہیں مگر رات دیا کی کال آئی وہ رو رہی تھی پھر فوراً ہی اس نے کال ڈراپ کر دی۔ میں نے اسے بہت کالز کیں، لیکن اس نے ریسیو ہی نہیں کی۔ یہ سمجھ میں نہیں آیا وہ رو کیوں رہی تھی بس اتنا ہی کہا تھا اس نے جگنو مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

"آپ نے مجھے نہیں بتایا میں معلوم کرتی ہوں اس سے۔" اس نے شکوہ کیا۔

"تم سو رہی تھیں نیند کے خیال سے نہیں جگایا۔"

اس نے کچھ کہنے کو لب کھولے مگر اس کیفیت دیکھتے ہوئے لبوں کو بھینچ لیا اور تھوڑے وقفے بعد بولی۔

"آپ پریشان نہ ہوں میں ملتی ہوں اس سے کالج میں۔ پھر بتاؤں گی آپ کو۔"

"کرن۔ کیا میری ملاقات نہیں ہو سکتی دیا سے؟"

اس نے بڑی آس سے پوچھا۔

"ایک بار ملنے دیں اس سے۔ پھر میں اپنے ساتھ ہی گھر لے آؤں گی۔"

"اوکے میں انتظار کروں گا۔"

اس کے کالج جانے کے بعد وہ کرن کی کال کا منتظر رہا۔ اس کا رواں رواں انتظار بن گیا اور انتظار کے لمحات طویل ہوتے گئے۔ اس نے پھر دیا کو کال کی مگر بیل بجتی رہی، دیا نے کال ریسیو نہیں کی۔ بہت انتظار کے بعد کرن نے بتایا کہ دیا آج کالج نہیں آئی۔ وہ دیا کے گھر جا رہی ہے۔ وہیں جا کر بتا سکے گی بات کیا ہے۔

اس نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا تھا "اوکے۔"

اسی دوران اس نے ممی کو کال کی۔ اس کے لہجے کی

"ممی آپ پاپا سے بات کریں مجھے دیا سے شادی کرنی ہے جتنی جلدی ہو سکے۔ ممی آپ اوکاڑہ آجائیں۔ آپ دیا کا ہاتھ مانگ لیں اپنے جگنو کے لیے۔ وہ چودھویں کے چاند جیسی حسین اور پاکیزہ ہے۔ وہ آپ کے جگنو کی زندگی ہے۔ ممی آجائیں پلیز۔"

اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ وہ خاموش ہو گیا۔

"میں مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی کہ کوئی میرے بیٹے کی خواہش پوری نہ ہونے دے اور میرے جگنو کی دیا کو چھیننے کی کوشش کرے۔ تم اپنے پاپا کی طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ اول تو وہ ضد نہیں کریں گے اگر ضد کی بھی تو میں ان کو منا لوں گی یہ میرا تم سے وعدہ ہے جگنو۔ میں کل ہی اوکاڑہ پہنچ رہی ہوں تم پریشان نہ ہو، بلکہ تمہارے پاپا کو بھی ساتھ لے کر آؤں گی۔"

انہوں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کال ڈراپ کر دی۔ اب اسے فکر تھی تو صرف دیا کی طرف سے۔ کیا ہونے والا تھا اور کیا نہیں۔

☼ ☼ ☼

وہ دیا کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں پہنچی تو سامنے کوئی نہیں تھا۔ اندر کمرے سے بچوں کے کھیلنے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ سیدھی دیا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دیا کروٹ بدلے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی طرف دیا کی پشت تھی وہ اس کے قریب جا کر بولی۔

"جگنو کو فون کر کے پریشان کر دیا اور خود اب آرام کے مزے لے رہی ہو۔" آگے بڑھ کر اس نے دیا کا ہاتھ پکڑ کر چہرہ اپنی طرف گھمایا تو دھک سے رہ گئی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور ہونٹ ہلکی ہلکی سسکیوں سے لرز رہے تھے وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"کیا بات ہے دیا رو کیوں رہی ہو؟" اس نے پیار سے پوچھا تو وہ ایک دم اٹھ کر اس سے لپٹ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

اگر ہوا کیا ہے کچھ بتاؤ تو سہی۔ اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

"میں ہار گئی کرن، ہار گئی۔" وہ ایک بار پھر بلک پڑی۔

"میں نے اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنا چاہی تھی۔ خوابوں کی تکمیل چاہی تھی اور میرے خوابوں کا تاج محل چکنا چور ہو گیا۔ ہم کبھی نہیں مل سکتے کرن۔ ہم جدا ہو گئے۔ ابا نے ہمیشہ کے لیے جگنو مجھ سے چھین لیا۔"

"کیا کہہ رہی ہو دیا تم ــــ؟" وہ ہلکی آواز میں چیخی۔

"ہاں دیا یہی سچ ہے۔ یہی حقیقت ہے۔ ایسی تلخ حقیقت کہ اس سے فرار حاصل نہیں کیا جا سکتا۔" پھر اس نے کرن کو سب بتا دیا۔ ابا کی ناہاں میں نہیں بدلے گی اب کبھی بھی۔ کرن سوچتی ہوئی گھر آگئی تھی جگنو کو کیا بتائے گی؟

☼ ☼ ☼

وہ پلکیں موند کر بیٹھا تھا کہ نیند آگئی رات بھر جاگتا جو رہا تھا۔

آنکھ کھلتے ہی مانوس سا احساس ہوا۔ کرن اس کے قریب بیٹھی تھی۔ اس نے کرن کے چہرے پر نظریں ٹکا دیں۔ جگنو کو کسی انہونی کا احساس ہو رہا تھا۔

"دیا ٹھیک ہے نا کرن؟" اس نے بے تاب لہجے میں پوچھا۔

"ہاں دیا ٹھیک ہے۔ بس بخار ہے۔"

"کیا ہوا اسے وہ رو کیوں رہی تھی؟"

"جگنو دیا کے ابا نے انکار کر دیا ہے اور اب وہ کبھی نہیں مانیں گے۔" دھیرے دھیرے اس نے جگنو کو ساری حقیقت بتا دی۔ خبر اتنی اذیت ناک تھی کہ اسے اردگرد کی چیزیں گھومتی ہوئی نظر آئیں۔

"لیکن میں دیا سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے بے چینی سے کہا۔

"مگر ابھی یہ ممکن نہیں۔ جس کیفیت سے وہ گزر رہی ہے اسے سنبھلنے میں بہت وقت لگے اور شاید کبھی بھی

نہ سنبھل سکے۔"

"کرن جیسے بھی ہو مجھے ایک بار صرف ایک بار دیا سے ملنا ہے۔ پلیز اسے میرا پیغام دے دو۔"

"ملنے کا تو نہیں کہہ سکتی ہاں فون پہ بات ہو سکتی ہے۔ وہ خود آپ کو کال کرے گی۔ اس نے کہا ہے مجھے۔" اس نے جگنو کو بہت کھوکھلی تسلی دی۔ ان دونوں کی کیفیات اس کے سامنے تھیں۔ وہ خود بھی ان کے لیے دکھی تھی مگر کتنی بے بس کہ کچھ نہیں کر سکتی تھی ان کے لیے۔

"میں نے ممی سے بات کی تھی وہ کل آرہی ہیں۔ میں ابھی ان کو منع کر دیتا ہوں۔ لیکن میں ہار قبول نہیں کرتا۔ میں ساری کوششیں دیا کو حاصل کرنے کے لیے لگا دوں گا۔ میں دیا کو حاصل کر کے رہوں گا چاہے عمر کے کسی بھی حصے میں کیوں نہ حاصل کروں۔" اس نے عزم سے کہا۔

"ان شاء اللہ" کرن نے آنکھوں کی نمی پونچھتے ہوئے کہا۔

حالات نے ایک نئی کروٹ لی تھی۔ فیصلہ تو ہر حال میں ہونا ہی تھا اور فیصلے کا کل اختیار ابا کے پاس تھا اور آج تک وہ اپنے اختیار کا استعمال کرتے آئے تھے۔ وہ صرف اپنی من مرضی کرتے تھے۔ کسی کی زندگی آباد رہتی ہے یا برباد ہوتی ہے۔ انہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

ان کے فیصلے کا دیا پر بہت گہرا اثر پڑا تھا۔ وہ برداشت نہیں کر پائی اور بیمار ہو گئی۔ کرن روزانہ اسے دیکھنے آتی۔ ایک دن اس نے دیا کو کہا کہ جگنو سے فون پر بات کر لو۔ تو اس نے کرن کو روتے ہوئے کہا۔ "کرن مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ جگنو سے بات کر سکوں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو گا۔"

کرن نے اسے بولنے دیا ابھی وہ جس اذیت سے گزر رہی تھی وہ دل سے نہیں دکھ سے کہہ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج وہ جگنو سے ملنے کے لیے کرن کے گھر گئی۔ اس نے بیل پر انگلی رکھ دی۔

"او دیا آؤ۔۔۔ آؤ۔" کرن اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لان میں لے گئی جہاں ایک کرسی پر جگنو راؤ بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام کیا اور دیا کے سلام کے جواب میں وہ احتراماً کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر دیا کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اچھا تم لوگ باتیں کرو۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔" کرن کہہ کر چلی گئی۔

"کیسی ہو دیا؟" وہ افسردگی سے بولا۔

"آپ کے سامنے ہوں۔" یوں تو اس نے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی، جس پر رویا جاتا۔ لیکن یہ اپنی ہی بے بسی کا احساس تھا جس نے اس کی آنکھوں کو لبریز کر دیا اور آنسو جھر جھر بہنے لگے۔

"دیا روؤ نہیں پلیز۔ تمہارے رونے سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" جگنو کا لہجہ بھی ٹوٹ رہا تھا۔ وہ بمشکل خود پر کنٹرول کیے ہوئے تھا۔

"دیا ہم بچھڑ کر بھی بچھڑ نہیں پائیں گے۔ ہمارے دل، ہمارے خیالات، ہماری خواہش ایک ہی رہے گی۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ہمیں ایک ساتھ ہونے کا موقع ملا تو ہم اسے گنوائیں گے نہیں۔" جگنو کے لہجے میں آس تھی، امید تھی شاید وقت کبھی انہیں ایک کر دے۔

"ٹھیک ہے جگنو مگر آج کے بعد ہمارا ہر رابطہ ختم۔ جب راستے ہی الگ ہو گئے ہیں تو رابطے میں رہ کر اذیت ہی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے دیا لیکن میں اپنا نمبر کبھی تبدیل نہیں کروں گا اور کسی وجہ سے تبدیل بھی ہوا تو میں اپنا نیا نمبر تمہیں سینڈ کر دوں گا۔ تم وعدہ کرو کہ کبھی اپنا یہ نمبر تبدیل نہیں کرو گی اور مجھے پکار لو گی، جھوٹی انا کو بیچ میں نہیں آنے دو گی۔"

"وعدہ جگنو۔۔۔" ایک بار پھر اس نے چہرہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا اور اٹھ کھڑی اور آخری بار وہ اس کو اپنے دل میں اتار لینا چاہتی تھی۔ اس نے ہاتھ چہرے سے ہٹائے۔

"دیا میں تمہاری پکار کا انتظار کروں گا۔"

"آئی لو یو جگنو، آئی لو یو۔" پھر وہ رکی نہیں اور بھاگتی ہوئی گیٹ عبور کر گئی۔ وہ گھبرا کر اسے جاتا دیکھتا رہا جیسے اس نے بہت کچھ پا کر سب کچھ کھو دیا ہو۔

اسی لمحے جگنو نے فیصلہ کر لیا کہ وہ نیویارک چلا جائے گا۔ اپنے دوست کے پاس اور پھر وہیں سیٹ ہو جائے گا اور مڑ کر کبھی پاکستان کا رخ نہیں کرے گا۔ اور پھر اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور ایک بار پھر ہنگامہ برپا ہوا۔ مصطفیٰ اپنی کولیگ سے شادی کرنا چاہتا تھا، لیکن ابا کی وہ ہی راجپوتوں والی ضد لیکن مصطفیٰ بھی ان کا خون تھا۔ ابا کا غیظ و غضب، امی جی کی خاموش فریاد کوئی بھی اس کی راہ کی دیوار نہ بن سکا۔ نہ جانے کیا لاوا بھر گیا تھا ان دنوں مصطفیٰ میں شوخی و شرارت کی جگہ ضد اور غصے نے لے لی تھی اور پھر اس نے اپنی من مانی کر کے ہی چھوڑی۔ وہ شاید ابا کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اگر بہنوں کی زندگی کا فیصلہ کرنے میں وہ کوئی اختیار استعمال نہیں کر سکے تھے تو کم سے کم اپنی زندگی کے فیصلے تو وہ خود کر ہی سکتا ہے۔

یہ ایک ایسا دھماکا تھا جس نے گھر کے در و دیوار کو ہلا ڈالا۔ ایک انہونی جس کا کبھی کسی نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کھلنڈرا اور ہنس مکھ سا مصطفیٰ کب اور کیسے اتنا ہٹیلا اور بااختیار ہو گیا کہ اتنا بڑا قدم اٹھا بیٹھا، سب کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اس واقعے نے گویا ابا کی کمر ہی توڑ دی۔۔۔ وہ جنہوں نے ساری عمر اپنی منوائی تھی جن کے ارادے اٹل اور فیصلے بے لچک ہوا کرتے تھے۔ ان کے اعصاب اس نافرمانی اور روگردانی کو برداشت نہ کر سکے اور ایک رات انہوں نے بہت خاموشی سے ہمیشہ کے لیے اپنی آنکھیں موند لیں۔

یہ دوسرا حادثہ تھا جس نے ان سب کو حواس باختہ کر دیا۔ امی جی کو چپ لگ گئی۔ گھر میں سناٹے گونجنے لگے۔ بالآخر گھر کی ویرانی سے گھبرا کر اقبال نے دوسرے گھر میں شفٹ ہونے کی ٹھان لی تاکہ جگہ اور ماحول کی تبدیلی اہل خانہ پر مثبت اثرات مرتب کر سکے۔

اور یوں وہ پرانے گھر سے بے شمار یادیں سمیٹ کر اس نئے مکان میں منتقل ہو گئے، لیکن امی جی تو گویا اپنا سب کچھ اسی گھر میں چھوڑ آئی تھیں وہ کسی بے چین روح کی طرح سارے گھر میں پھرا کرتیں۔ سب ان کی بے قراری کو سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ کو سنبھال لیں گی، مگر ایسا نہ ہو سکا۔ ابا کا انتقال اور مصطفیٰ کی جدائی دو ایسے گھاؤ تھے جو مندمل نہ ہو سکے اور وہ سال بھر بعد ہی عدم کے سفر پر روانہ ہو گئیں۔

زندگی کی سانسیں گویا رک سی گئی تھیں۔ پژمردہ چہرے، جامد سناٹے، اداس ماحول ایسے میں دیا نے گھبرا کر مزید تعلیم کے لیے لندن جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اقبال سکندر راؤ نے مخالفت سے گریز کیا۔

"اچھا ہے اس کا مستقبل سنور جائے گا، خود اعتمادی پیدا ہو گی۔ اپنی زندگی کے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکے گی۔ ہم تو ایسا نہ کر سکے۔" وہ بیوی سے کہہ رہے تھے۔

دیا انگلینڈ سدھاری۔ مریم شوہر کے ٹرانسفر کے باعث کراچی میں جا مقیم ہوئی اور مصطفیٰ نے سسرال میں ہی آشیانہ بنا لیا۔

وقت کا کام گزرنا ہے اور وہ گزرتا چلا گیا۔ کچھ وقت سرکا تو فضا میں رچی اداسی کا رنگ بھی کم ہو گیا۔ گھر کے باقی افراد نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر خود کو غم کے بحر بیکراں سے نکالا۔

☼ ☼ ☼

کچھ عرصے بعد دیا اپنی تعلیم مکمل کر کے لوٹ آئی۔ اس نے تعلیم اور جاب کی خاطر خود کو اس طرح وقف کر دیا کہ اپنی ذات کے متعلق سوچنے کی فرصت ہی نہ

مل سکی۔
لیکن آج اقبال کی خواہش نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اب تک کسی ریگستان میں سفر کرتی رہی ہو اور سفر کے اختتام پر کسی نخلستان کے بجائے اس کے پیروں تلے تپتی ہوئی ریت تھی۔

"تمہاری خواہش ہے کہ اب تم بھی اپنا گھر بسالو۔" اقبال کے کہے ہوئے الفاظ بار بار اس کی سماعت پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

گھر۔۔۔؟
اپنا گھر۔۔۔؟
وہ گھر جس کے لیے جگنو کے ساتھ کے خواب دیکھے تھے۔

"نہیں ہرگز نہیں جگنو نہیں تو اس کی جگہ کوئی بھی نہیں۔"

تم نہ ہوگے تو کوئی تم سا ہوگا
مگر دل کی یہ ضد کہ تم نہیں تو تم جیسا بھی نہیں
یہ اس کے دل کی آواز تھی۔

مسافتوں کا کرب چہرے سے عیاں تھا۔ تھکے تھکے ذہن سے جب اس نے اپنے اندر جھانکا تو آج بھی جگنو اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اس کے دل کی مسند پر روز اول کے چاند کی طرح روشن تھا۔

"تو کیا سمجھتی تھی دیا تو اسے بھول جائے گی۔ پس پشت ڈال دے گی دل کی مچلتی آرزوؤں کو مگر یہ تو تیری بھول تھی۔ تو آج بھی پور پور اس کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو لڑیوں کی صورت بہہ رہے تھے۔

"اور جگنو تم۔۔۔ جگنو تم بھی مجھے بھول نہیں پائے ہوگے۔"

وہ کیا جانے جگنو تو جیتے جی مر گیا تھا۔ اس پری کی خواہش نے اسے صلیب پر لٹکایا تھا وہ آج بھی وہیں لٹکا ہوا تھا۔

اچانک ہی گیٹ پر بیل چیخنے لگی تھی تو وہ چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر آگئی۔ ماضی سے حال تک کا سفر لتنا تکلیف دہ اور تھکا دینے والا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر آنکھیں موندلیں۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا کیا کروں؟" اقبال سکندر نے چشمہ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور بیڈ پر دراز ہوگئے۔

"اب ایسی بھی کیا بات ہوگئی؟" بھابھی نے چائے رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"بس وہ ہی دیا کا مسئلہ' نہ جانے کیوں وہ اس رشتے سے انکاری ہے۔ ایسے رشتے بار بار ہاتھ نہیں آتے۔ حسن راؤ بہت ہی نفیس انسان ہیں۔ خاندانی ہیں اور مالی اعتبار سے مستحکم بھی۔ دیا ان شاء اللہ بہت خوش رہے گی' مگر وہ مانے تو سہی۔ تمہاری تو بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے دیا کے ساتھ' تم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی؟"

"ایک بار نہیں بار بار۔" وہ ان کے قریب بیٹھ گئیں۔

"وہ جگنو کو بھول نہیں پائی۔ وہ شاید آج بھی اس کی منتظر ہے۔ وہ کچھ سننے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ اس کے پاس تو بس ایک ہی جواب ہے کہ اب یہ ممکن نہیں ہے اور میں سچ کہوں' مجھے تو لگتا ہے کہ اس موضوع نے ہماری دوستی کے بیچ دراڑ پیدا کردی ہے۔ میں تو اس کی ہمراز تھی۔ خفا خفا رہنے لگی ہے وہ مجھ سے۔ اب مریم آجائے تو بات بنے۔ آپ کی تو بات ہوئی تھی نا فون پر۔ کیا کہا اس نے آنے کے بارے میں؟"

"شاید دو چار روز تک آجائے۔" انہوں نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"تم نے دیا کو بتایا کہ میں جگنو کا سراغ لگانے میں ناکام ہوگیا ہوں۔ کرن اور اس کی بہن کی شادی ہوگئی اور دونوں کی شادی کے بعد ان کے والدین کی ڈیتھ ہوگئی۔ کرن شادی کے بعد نیویارک چلی گئی۔ بس یہی معلومات حاصل ہوسکی ہیں مجھے۔ اگر جگنو مجھے مل جائے تو میں کبھی کا دیا کی شادی جگنو سے کردیتا۔ کیونکہ

میں جانتا ہوں وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے' لیکن ابا کی ضد کہ وہ مل نہ پائے جگنو کی تلاش میں ناکام ہو کر ہی تو حسن کا پرپوزل سامنے رکھا ہے۔"

"نہیں بتایا میں نے۔ اگر یہ سب بتا دیتی تو وہ سوچتی جانے جگنو کو کیا ہوگیا ہے کہاں چلا گیا وہ؟ وہ بیمار ہوجائے گی اس خیال سے ذکر نہیں کیا۔"

"آپ نے کلورکوٹ سے معلوم کرنے کی کوشش کی؟"

"کلورکوٹ کوئی چھوٹا سا گاؤں تو نہیں ہے کہ معلوم ہوجائے۔ شہر ہے وہ اور جگنو کے نام کے علاوہ کوئی بھی تو معلومات نہیں مجھے کہ اسے تلاش کرتا۔ اسی لیے تو حسن کے پرپوزل کو قبول کیا ہے۔ ہر لحاظ سے رشتہ مناسب ہے۔"

"کاش یہ پرپوزل جگنو کا ہوتا تو دیا کو انکار نہ ہوتا یا پھر یہ پرپوزل پہلے آجاتا تو کوئی مثبت تبدیلی آہی جاتی۔" بھابھی نے تاسف سے کہا۔

"ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ شاید خدا کو یہ سب کچھ ہی اسی طرح منظور تھا۔ اب دیکھو نا سب کچھ تمہارے سامنے ہی کی بات ہے۔ ابا کے زمانے میں جگنو کے علاوہ بھی جو پرپوزلز اس لائق تھے جن کے متعلق سوچا جاسکتا تھا ان سے ابا مطمئن نہ تھے۔"

"اچھی اچھی خوش شکل اور پڑھی لکھی لڑکیاں مناسب رشتوں کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہوجاتی ہیں' مجھے تو خوف آتا ہے۔" آصفہ افسردگی سے کہا۔

"آپ ایک وعدہ کریں اقبال کہ آپ راویہ کے سلسلے میں ابا کی تاریخ نہیں دہرائیں گے۔ بلاوجہ میں نقص نکال کر رشتوں کو مسترد نہیں کریں گے۔ میں تو کہتی ہوں جیسے ہی کوئی مناسب پرپوزل ہاتھ آئے ہمیں راویہ کے فرض سے سبکدوش ہوجانا چاہیے۔"

"یہ تم کیسی باتیں کررہی ہو آصفہ وہ تو ابھی بچی ہے۔ ابھی پڑھ رہی ہے اور مزید پڑھنا چاہتی ہے۔" اقبال نے حیرانی سے آصفہ کو دیکھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ زیادہ پڑھانے کی۔ میں نے تو سوچ لیا ہے گریجویشن کرتے ہی ہمیں اس کی فکر کرنی ہے۔ کیا راویہ کے سلسلے میں ابا کا کردار ادا کریں گے؟"

"لاحول ولاقوۃ آصفہ بیگم یہ تم کس قسم کی باتیں سوچنے لگی ہو۔ بات ہورہی تھی دیا کی اور تم راویہ کو لے بیٹھیں۔" ان کے لہجے میں ناراضی کا عنصر نمایاں تھا۔

"دیا کے تجربے ہی نے تو مجھے ہراساں کردیا ہے۔ میرا دل وسوسوں اور اندیشوں میں ڈوبا رہتا ہے۔ آج دیا کے لیے ہم جس قدر پریشان ہیں ایسا نہ ہو کہ کل۔۔۔" آصفہ بیگم اپنا جملہ پورا نہ کرسکیں ان کی آواز رندھ گئی تھی۔

"ریلیکس۔۔۔ ریلیکس۔۔۔ آصفہ ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ کل حالات کچھ اور تھے آج کچھ اور ہیں اور پھر تمام والدین اپنے بچوں کی بہتری ہی چاہتے ہیں۔ ہاں نقطہ نظر میں فرق ہوسکتا ہے۔ ضروری نہیں جو ابا کی ترجیحات تھیں وہ میری بھی ہوں۔ تم ابھی سے اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔" انہوں نے بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ آصفہ بیگم نے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں پونچھیں تو اقبال سکندر مسکرا پڑے۔

☼ ☼ ☼

مریم کے آتے ہی گھر میں ہلچل پیدا ہوگئی تھی۔ راویہ' اذان نے اپنی پھپھو کے بچوں کے ساتھ مل کر خوب دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ وہ دیا کے کمرے میں آگئی۔ دیا بیڈ پر لیٹی ہوئی کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔

"مطالعے میں مصروف ہو دیا؟" اس نے بک شیلف میں دھری بے شمار کتابوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم جانتی ہو یہ کتابیں ہی تو میری ساتھی ہیں۔ رات کو جب تک کوئی کتاب نہ پڑھ لوں مجھے نیند نہیں آتی۔"

"اچھی عادت ہے تمہاری جو ابھی تک قائم ہے۔" مریم نے مسکرا کر کہا۔

"تو اس کے علاوہ کرنے کو ہے بھی کیا۔ بھابھی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ بچوں کو کھیل کود میں مصروف دیکھتی رہتی ہوں۔ ان کو پڑھاتی ہوں اور پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتی ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ اس مرتبہ اچانک کیسے نزول ہو گیا تمہارا ورنہ تو مہینے بھر پہلے تمہاری آمد کا شور شروع ہو جاتا ہے، تب کہیں جا کر تشریف آوری ہوتی ہے۔"

"یوں سمجھ لیجیے ایک خاص مہم کے سلسلے میں ایمرجنسی میں آنا پڑا۔" مریم کے معنی خیز انداز پر دیا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"دیا دراصل اقبال بھائی نے مجھے فون کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا تھا۔" مریم نے گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے صاف صاف بات کرنے کی ٹھانی۔

"آخر آپ کو انکار کیوں ہے۔ اقبال بھائی کی بات کیوں نہیں مان لیتیں۔" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"اوہ تو انہوں نے تمہیں بھی اس معاملے میں انوالو کر لیا جبکہ میں صاف انکار کر چکی ہوں۔"

"دیا کیا میں تم سب سے الگ ہوں؟" مریم نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہ میں نے کب کہا، لیکن جب ایک بات طے ہے کہ ایسا ممکن نہیں تو پھر اس پر مباحثے اور مذاکرے کی کیا ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔"

"ہم سب کی یہ خواہش ہے کہ زندگی کی بہاروں میں تمہارا بھی حصہ ہو۔ تمہارا بھی اپنا گھر ہو، پرسنل لائف ہو اور تم بھی زندگی کو اس طرح انجوائے کرو جیسے سب کرتے ہیں۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو مریم۔۔۔؟ تم تو جانتی ہو سب؟" دیا نے حیرت سے مریم کو دیکھا۔ دیا کو دکھ تو یہی تھا کہ وہ سب اس کے بارے میں سب جانتے تھے پھر وہ چاہتے تھے وہ اسے قبول کر لے جس کے لیے وہ راضی نہیں تھی۔ جس کو اس کا دل و ذہن قبول نہیں کر رہا تھا۔

"دیا اقبال بھائی نے جگنو کو بہت تلاش کیا ہے، اگر تمہارے پاس اس کا کوئی کونٹیکٹ نمبر ہے تو دے دو یا پھر کرن کا کوئی نمبر؟" مریم کی بات پر اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا اور اس کے اندر درد نے کروٹ لی تھی۔ اب جب جگنو کے لیے بھی اس کے جذبے سرد پڑ گئے تھے، مردہ ہو گئے تھے تو جگنو کو تلاش کیا جا رہا تھا۔

"تمہیں یہ جان کر حیرت ہو گی جب ابا نے انکار کیا تھا اور میں کرن کے گھر جگنو سے ملنے گئی تھی اس سے وہ میری آخری ملاقات تھی۔ اس روز کے بعد بھی کونٹیکٹ نہیں کیا اس سے اور کرن کے باہر شفٹ ہونے کے بعد اس سے ہر رابطہ ختم ہو گیا۔" جگنو کے ذکر پر دیا کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے بمشکل خود کو رونے سے روکا تھا۔

"جگنو کے گھر کا ایڈریس تو ہو گا تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" اس نے صاف انکار کر دیا جبکہ اس کے پاس جگنو کا ایڈریس سیل نمبر موجود تھا۔ جگنو نے نیویارک جا کر اسے اپنا نیا نمبر سینڈ کیا تھا، لیکن اس کے بعد دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"دیا تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"ہاں جب وہ نہیں تو اس کا نمبر، ایڈریس مجھے کیا کرنا تھا جب اس کی خواہش کی تو وہ ملا نہیں اب دل میں کوئی احساس کوئی جذبہ نہیں رہا تو جگنو۔۔۔" اس نے آنکھیں بھینچتے ہوئے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش کی تھی۔ مریم نے اسے دکھ سے دیکھا ضرور، مگر کہا کچھ نہیں۔

"اب خواب بننے کی عمر نہیں رہی میری اور پھر زندگی کے اس مرحلے پہ۔۔۔ پلیز مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے اپنی زندگی جینے دو۔ اقبال بھائی کو تو شاید میں نہ سمجھا سکوں، لیکن تم تو میری بات سمجھ سکتی ہو مریم دیکھو ہر کام اپنے وقت پر ہی اچھا لگتا ہے اور وقت ہاتھ سے نکل جائے وہ لوٹ کر نہیں آتا۔ یہ بات تم سب کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔ نہ جانے تم لوگ کیوں وقت کی الٹی سوئیاں گھمانے کی ناکام کوشش

کر رہے ہو۔" اسے اب غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔

"بچے ہمارے قد سے اونچے ہو گئے ہیں اب تو ان کی فکر کرنی چاہیے۔"

"تم بچوں کی عمروں میں کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔ یہ تمہارے بچے نہیں ہیں۔ ان کی فکر کرنے کے لیے ان کے ماں باپ موجود ہیں۔ بس تم اپنی زندگی کے متعلق غور کرو۔ کیا اسی طرح روکھی پھیکی بے رنگ زندگی گزارتی رہو گی۔ کیا تمہارا اپنی ذات پر کوئی حق نہیں۔ آج ہمارا مشورہ تمہیں برا لگ رہا ہے، لیکن کل جب زندگی کی تلخ حقیقتیں منہ کھولے تمہارے سامنے آکھڑی ہوں گی تب تمہیں احساس ہو گا کہ ہم لوگ غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ کچھ غلط نہیں چاہ رہے تھے۔" مریم بولنے پر آئی تو بولتی چلی گئی۔

"جن بچوں کی محبت کی بیساکھیوں کا سہارا لے کر تم زندہ ہو۔ کل کو جب وہ اپنی زندگی میں مصروف ہو جائیں گے۔ تب کسی کے پاس وقت نہیں ہو گا تمہارے لیے۔ اس وقت کیا کرو گی۔ کبھی سوچا ہے تم نے؟ اگر نہیں سوچا تو اب بھی وقت ہے، کچھ لمحے تمہاری مٹھی میں ہیں۔ اگر یہ بھی ہاتھ سے پھسل گئے تو کچھ باقی نہیں رہے گا۔ بالکل تہی داماں رہ جاؤ گی تم۔"

"مریم بس کرو پلیز۔ تم اتنی ظالم تو کبھی نہ تھیں۔" اس نے کراہ کر کہا۔

"سوری دیا اگر ڈاکٹر مریض کو کڑوی دوائیں دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اس کا دشمن ہے۔ ہم سب تمہاری بھلائی کے لیے ہی کہہ رہے ہیں۔ تم خود بہت سمجھدار ہو۔ جانتی ہو آنکھیں بند کر لینے سے زندگی کی حقیقتیں کچھ دیر کے لیے نظروں سے اوجھل تو ہو جاتی ہیں، بدل نہیں جاتیں وہ اپنا آپ منوا کر رہتی ہیں۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"بس بہت ہو گیا۔۔۔ تمہاری کوئی بات نہیں سنی جائے گی۔ اگر جگنو سے رابطہ ہو جاتا ہے تو ٹھیک ورنہ میں اقبال بھائی کو کہہ دیتی ہوں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

مریم کو دیا کی بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ اس کا جگنو سے رابطہ نہیں ہے۔ وہ اپنی بات مکمل کر کے کمرے سے باہر چلی گئی تھی اور دیا بھیگی بیٹھی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

مریم نے دیا کی خاموشی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے حسن راؤ کے گھر آمادگی کا سندیسہ بھیج دیا تھا اور خود بھابھی کے ساتھ مل کر خریداری کا آغاز کر دیا تھا۔ جب دیا نے سنا تو وہ کچھ نہیں بولی، مگر ہلکا ہلکا درد بائیں طرف کروٹ لینے لگا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی۔

میں نے عرصہ ہوا اپنی آنکھوں سے خوابوں کو نوچ کر پھینک دیا ہے۔ تمناؤں کو گہری نیند سلا دیا ہے۔ خواہشات کو دفن کر دیا ہے۔ اب یہ لوگ اس ویران بستی کو آباد کرنے کے درپے ہیں۔ نادان لوگ یہ نہیں جانتے کہ برفیلی وادیوں میں بہار کے پھول کھلانا کتنا مشکل کام ہے۔

اچانک ہی اس کے بائیں طرف درد ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔ اس نے ہراساں ہو کر کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔ نہ جانے کتنے ہی چہرے اس کے سامنے آ گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد اس کا پورا وجود پسینے میں نہا گیا تھا اور سانس اس طرح پھول گیا تھا جیسے کوئی طویل مسافت طے کر کے آئی ہو۔ درد تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس نے اپنے قریب رکھا موبائل اٹھایا اور اس پر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ لیکن کپکپاتے ہاتھوں سے موبائل گر گیا۔۔۔ پھر کوشش کر کے اس نے موبائل اٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ تیسری بار اس نے بائیں پہلو میں پھیلتی لہروں کو نظر انداز کرتے ہوئے موبائل پر ہاتھ کی گرفت سخت کر دی اور تیزی سے اس کی انگلیاں نمبر پریس کر رہی تھیں اور تیسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی گئی۔ دیا کے حلق سے بمشکل آواز نکلی تھی۔

"جگنو۔۔۔ جگنو۔۔۔ جگنو۔۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ جگنو۔۔۔ پلیز۔۔۔ جگ۔۔۔ن۔۔۔و۔۔۔"

"دیا تم رو کیوں رہی ہو؟" وہ چیخا تھا۔

موبائل دیا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ چیخنے لگی تھی اور درد پورے جسم میں سرائیت کر گیا تھا۔ حلق میں گویا کانٹے اگ آئے تھے۔ اس نے سیل دوبارہ اٹھانا چاہا لیکن ہاتھ بے جان سے محسوس ہو رہے تھے اور پھر۔۔۔ اس کا ذہن گہری تاریکیوں میں اترتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

دیا آئی سی یو میں تھی ضبط گریہ سے اقبال سکندر اور مصطفیٰ سکندر کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آصفہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اور مریم کسی بت کی طرح ساکت آئی سی یو کے باہر بیٹھی تھی۔ خدشے اندیشے وسوسے ان سب کے دل خوف زدہ انداز میں دھڑک رہے تھے۔

دیا کے سیل پر بیل ہو رہی تھی۔ جو مریم کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس کا سیل اٹھا لیا تھا۔ اس نے جگنو کا نمبر تلاش کرنے کی کوشش کی مگر جگنو کے نام سے کوئی نمبر سیو نہیں تھا۔ مریم کو اپنی ناکامی پر بے حد افسوس ہوا تھا اور اب انجان نمبر سے آتی کال نے اس کو خوش گمان کر دیا تھا۔ وہ اٹھ کر سائیڈ پہ چلی گئی جب اس نے کال ریسیو کر کے کان سے لگایا تو جگنو کی لرزتی آواز ابھری۔

"دیا کیوں رو رہی تھیں تمہیں کیا ہوا ہے۔ رات سے ٹرائی کر رہا ہوں تم کال پک کیوں نہیں کر رہی تھیں پھر تمہارا نمبر آف ہو گیا۔ میں جب سے مسلسل ٹرائی میں ہوں۔ بتاؤ کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"میں دیا کی بہن مریم بول رہی ہوں۔ دیا کا سیل آف تھا ابھی آن کیا ہے میں نے۔۔۔ اور دیا اسپتال میں ہے۔" پھر مریم نے جگنو کو سب بتا دیا۔ جگنو نے اس سے اسپتال کا نام پوچھ کر کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔

جگنو کئی روز سے کچھ بے چین اور بے سکون تھا اسے دیا کے حوالے سے برے برے خواب نظر آ رہے تھے اور اب وہ پاکستان آنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس دوران دیا کی کال نے اس کے لیے واپسی کے راستے آسان کر دیے تھے اور وہ پاکستان کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ اس کے لبوں پر صرف ایک ہی دعا تھی دیا کی زندگی کی دعا۔ نیویارک سے وہ سیدھا لاہور ایرپورٹ پہنچا تھا۔ لاہور سے اوکاڑہ کا سفر گاڑی کے ذریعے طے کیا تھا، لیکن یہ سفر جگنو کے لیے کتنا دشوار ترین ہو گیا تھا کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ وہ مسلسل مریم سے رابطے میں رہا اور دیا کی طبیعت کے بارے میں پوچھتا رہا تھا۔ جب وہ اسپتال پہنچا تو سب اسے پرامید نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان سے مل کر وہ دیا کے پاس آ گیا اور دیا کو پکارتا رہا۔ دیا کے ہاتھ پر اپنے لب رکھ دیے۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتا رہا بہت دیر گزرنے کے بعد اس نے دیا کو آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دیا نے جگنو کو دیکھا اسے پکارا پھر غنودگی میں چلی گئی۔ دیا کی یہ کیفیت ڈاکٹر نے خوش آئند بتائی تھی۔ اب وہ خطرے سے باہر تھی۔

☼ ☼ ☼

لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے لگا جیسے دیا نے اسے پکارا ہے۔

"جگنو۔۔۔" وہ اسے کتنے یقین سے پکار رہی تھی جیسے وہ اس کے پاس ہی کھڑا ہو اور وہ حیرت و خوشی سے پاگل ہی تو ہو گیا تھا۔

"دیا میری دیا۔" اس کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔

"جگنو۔۔۔" اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔" اس نے یقین و بے یقینی کی کیفیت میں اس کو چھوا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جگنو اس کے سامنے۔۔۔ اس کے قریب کھڑا ہے۔

"تم نے آواز دی تھی مجھے۔۔۔ تمہیں میری ضرورت ہے۔ تو میں لوٹ آیا اپنی دیا کے پاس۔ یقین کر لو دیا میں تمہارا جگنو ہوں۔ صرف تمہارا جگنو میں اپنی دیا کے پاس آ گیا ہوں۔ میری دیا مجھے پکارے اور میں نہ آؤں یہ کیسے ہو سکتا ہے دیا۔ تمہیں اپنے جگنو پر اعتبار نہیں تھا کہ جگنو تمہاری ایک پکار پر پلٹ آئے گا۔"

"جگنو۔۔۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

"جگنو۔۔۔" وہ اسے پکارتی ہوئی غنودگی میں چلی گئی۔ جگنو اس پر جھک گیا اور تیزی سے باہر نکلا اور ڈاکٹر کو بلانے بھاگا۔ اقبال نے اسے روکا اور مصطفیٰ ڈاکٹر کو بلانے بھاگا۔

ڈاکٹر نے آ کر انہیں دیا کی زندگی کی نوید سنائی تو سب نے یک زبان ہو کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

"ہم آپ کے بہت احسان مند ہیں کہ آپ کی وجہ سے ہماری دیا کی زندگی بچ گئی ورنہ ہم تو مایوس ہو چکے تھے۔"

مریم کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ واقعی اگر وہ نہ آتا تو شاید دیا زندگی ہار جاتی۔

"یہ سب تقدیر کا فیصلہ ہے۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔" اس نے شرمندہ سے لہجے میں کہا۔ پھر وہ ان کے پاس بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

دیا کو ہوش آیا تو بھائی، آصفہ بھابھی اور مریم، اس کے بچے سب خوشی سے اس سے لپٹ گئے تھے۔ وہ بھی سب کے گلے لگ کر آنسو بہاتی رہی۔ جب یہ جمگھٹا ہٹا تو جگنو اس قریب آ گیا۔ اب وہ دونوں تھے اس کمرے میں۔

جگنو نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور ان کی گرفت سخت کر دی۔

"جگنو۔۔۔" شدت جذبات سے اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

"ہمارا ملن یوں ہی لکھا تھا دیا۔" اس کے اندر سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔

"جگنو میں نے ہر لمحہ آپ کا انتظار کیا۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اور دیا میں بھی ہر لمحے تمہاری پکار کا منتظر رہا۔ دیکھو تم نے پکارا اور تمہارا جگنو اپنی دیا کے پاس آ گیا، تم نے کہا تھا کبھی مجھ سے رابطہ نہیں کرنا جگنو اور میں تم سے کیا وعدہ نبھاتا رہا ورنہ تو میں ہار گیا تھا۔"

"میں ہار گئی جگنو، اسی لیے تو تمہیں پکارا۔" دیا کی آنکھیں روپہلے جذبوں سے روشن تھیں اور جھلملاتی آنکھوں میں سمندر کا عکس لہرا رہا تھا۔

"جگنو میں نے اپنی محبت کے درد کو اپنی روح میں بھی محسوس کیا ہے۔ ایک عذاب لمحے نے جو فیصلہ ابا کی خواہش کے مطابق کرنے پر مجھے مجبور کر دیا تھا اس نے برسوں اپنا خراج لیا ہے مجھ سے۔ لمحہ لمحہ تڑپی ہوں آپ سے جدا ہو کر قدم بارہا آپ کی طرف بڑھے، مگر اس نوکیلے فیصلے نے ہر بار راستہ روکا۔ پھر دھیرے دھیرے وقت بیتنے لگا اور بیتتا چلا گیا۔ مگر جب دل بے اختیار ہوا تو اس کمزور لمحے میں میں نے اپنے آپ سے ایک عہد کیا اور وہ یہ تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پہ مجھے آپ کی ضرورت پڑی تو آپ کو پکار لوں گی اور میں نے کوئی انا بیچ میں نہیں آنے دی آپ کو پکار لیا۔"

"اب احتساب کے دن گزر گئے دیا۔ اب ہم مل کر نئی زندگی کی بنیاد رکھیں گے۔ تلخ یادوں اور گزرے وقت کو بھلا دینا ہی اچھا ہے۔ تب ہی تو زندگی کی نئی شاہراہ پر قدم رکھ سکیں گے۔"

جگنو نے اس کے ہاتھ تھام کے پلکیں موند لیں۔ جیسے گزرے سالوں کے ایک ایک لمحے سے خراج لے رہا ہو۔ جیسے ڈار سے بچھڑا پرندہ ڈار سے آن ملے۔ تنہائی مٹ گئی تھی۔ محافظت کے ساتھ ساتھ تاحیات رہنے والی محبت بھی اپنے سفر پر گامزن ہو چکی تھی۔

ٹھٹھرتے دسمبر کا چاند اور چمکتا ہوا جگنو جو صرف اور صرف دیا کا تھا۔ دیا کا جگنو۔ ضروری نہیں ہر دسمبر جدائی کا سبب ہی بنے۔ بعض اوقات جاتا ہوا دسمبر کسی کی جھولی میں ملن کے پھول بھی نچھاور کر جاتا ہے جیسے دیا اور جگنو کا ملن۔

☼ ☼

حیا بخاری

مکمل ناول

وہ پورے بیس برس بعد اس یونیورسٹی جارہے تھے جہاں سے انہوں نے ایم ایس سی فزکس کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کی تمام عمر دنیا کے دوسرے ممالک میں درس تدریس میں گزری۔ وہ کئی سالوں سے اس جامعہ میں نوکری ملنے کے لیے سرگرداں تھے اور اب کہیں جاکے انہیں کامیابی ملی تھی۔

انہوں نے اپنے آبائی "گومل فارم ہاوس" پہ بجے خوب صورت سے گھر میں ہی رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ جہاں ان کے خاندانی ملازم سارا انتظام سنبھالے ہوئے تھے۔ اسی لیے یہاں آکے انہیں کسی قسم کی کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ویسے بھی وہ اکیلے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا میڈیکل کی تعلیم کے سلسلے میں امریکہ میں مقیم تھا۔

آج نجانے کتنے عرصے بعد انہوں نے اپنے پسندیدہ لباس سفید کاٹن کے شلوار قمیص کے ساتھ مہندی رنگ کی واسکٹ زیب تن کی وہ کمرے میں لگے قدر آور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو جانچنے لگے۔ بیس برس بعد بھی وہ اتنی ہی شاندار شخصیت کے مالک تھے۔ وہی چوڑا سینہ، سرخ و سفید رنگت اور ہلکی ہلکی بڑھی ہوئی شیو، عمر کی باون بہاریں دیکھ چکنے کے باوجود ان کے بال ویسے ہی گھنے سیاہ تھے۔ بقول ان کے احباب کے وہ آج بھی اپنی عمر سے دس سال چھوٹے نظر آتے ہیں۔ اتنے ماہ و سال کے گزرے موسموں نے ان کی شخصیت پر کوئی اثر نہ چھوڑا تھا۔ لیکن یہ صرف ان کے دوست سمجھتے تھے۔ ان کا سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہ صرف وہ جانتے تھے۔ ان کا دل ایک ویران بستی تھا۔ ان کی زندگی کسی صحرا کی طرح اجاڑ اور تپتی تھی۔ اور ان کے سینے میں ان کی خواہشوں اور ارمانوں کے کتنے ہی قبرستان آباد تھے۔ وہ نہ تو کسی کو دکھائی دیتے نہ ہی کوئی انہیں محسوس کر سکتا تھا۔ اور کوئی محسوس کر بھی کیسے سکتا تھا۔ کہ اپنے ہمدرد اور غمگسار کو تو انہوں نے خود ہی اپنے سے دور کر دیا تھا۔

وہ ذرا سا آئینے کے قریب ہوئے اور اپنی آنکھوں میں جھانکنے لگے۔ ان کی آنکھوں کی وہ لو دیتی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ انہیں لگا عجیب سی وحشت جھلک رہی تھی ان کی آنکھوں سے۔ وہ بنا پلک جھپکائے انہی آنکھوں میں دیکھے گئے۔

"خان گاڑی تیار ہے۔" ملازم دروازے سے اطلاع دے کر واپس مڑ گیا تھا۔

"ابھی کہاں آدم خان گنڈہ پور۔ ابھی تو تم نے خود کو عدالت میں پیش کیا ہے۔ ابھی تو تمہاری کئی پیشیاں باقی ہیں۔ اور مشکل تو یہ ہے کہ جس عدالت میں تمہاری پیشی ہونی ہے وہ تمہارے اپنے ضمیر کی عدالت ہے۔ مطلب مدعی، داعی، ملزم اور منصف بھی کردار تم نے ہی نبھانے ہیں۔" انہوں نے لمبی سانس کھینچ کر خود کو جیسے ہلکا پھلکا کیا اور گاڑی کی چابی اٹھائے باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

کالی سیاہ رات میں ستاروں کی ٹمٹماہٹ بے حد خوشنما تھی۔ ثمو انہیں زبردستی بالکنی میں لے آئی تھی۔ اور اب مسلسل اپنی باتوں سے انہیں بہلائے جارہی تھی۔

"پتا ہے پھوپھو! مجھے لگتا تھا کہ لفظ خوب صورت بس صنف نازک کے لیے ہی بنا ہے۔ مرد کے لیے تو یہ لفظ بڑا مضحکہ خیز سا لگتا تھا مجھے۔" ثمو اپنی ہی دھن میں بولے جارہی تھی۔ اور وہ مسلسل اسے دیکھے جارہی تھیں۔ ثمو ہو بہو ان کی جوانی کی تصویر تھی وہی بڑی بڑی غلافی آنکھیں، بہت ہی نازک تراشیدہ پنکھڑی کے سے گلابی ہونٹ، بیضوی چہرے کی سفید رنگت کو مزید دلکش بنا رہے تھے بھرے بھرے گلابی گال اور جب وہ بولتی تو دائیں گال پہ بہت ہی ننھا اور گہرا سا نمودار ہونے والا ڈمپل۔ بس چھوٹا سا فرق تھا۔ ثمو کی چھوٹی سی ناک کے نیچے عین لبوں کے اوپر ننھا سا تل اسے کہیں زیادہ حسین بنا دیتا تھا۔ انہوں نے دل ہی دل میں اپنی بھتیجی کی نظر اتاری۔

"کئی دفعہ جب میں کہانیوں میں پڑھتی کہ ہیرو اس قدر خوب صورت ہے اور میں انہیں تصور کرنے کی

کوشش کرتی تو ایسی عجیب عجیب شکلیں بنتی کہ میری ہنسی چھوٹ جاتی۔" وہ اس وقت بھی کھلکھلا کے ہنسی تھی اور پھر ایک دم سے ہی خاموش ہوئی۔

"پھر میری سوچ بدل گئی۔ جب سے میں اسفندیار سے ملی مرد خوب صورت ہوتے ہیں یہ بات میں نے دل سے قبول کی۔ اس کا لمبا قد، چوڑا سینہ، دودھ جیسی سفید رنگت، آنکھوں سے جھلکتا غرور اور سب سے بڑھ کر اس کی مسکراہٹ۔" وہ گم سم سی بولے جارہی تھی۔ انہوں نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں کتنے ہی جگنو اترتے دیکھے۔ خوشی کے جگنو، جذبوں کے جگنو، اداسی کے جگنو اور سب سے بڑھ کر محبت کے جگنو، وہ ان رنگوں سے ناواقف تو نہ تھیں۔ سب کچھ ان پہ عیاں ہوتا جارہا تھا۔

"جب وہ مسکراتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے چاروں طرف روشنی سی بکھرنے لگی ہو۔ ہمارے پورے کالج میں وہ اپنی شخصیت اور اچھے کردار کی وجہ سے مشہور ہے۔ آپ یقین کریں پھوپھو، دنیا کی سپرپاور کے ذہین ترین اساتذہ اس کی ذہانت پہ رشک کرتے ہیں۔ کاش پھوپھو وہ ہم سے سینئر نہ ہوتا تو میں اس سے دوستی کرسکتی۔" ثمو کے لہجے میں بے تابیاں ہی بے تابیاں تھیں۔

"جنت بیٹا، میں نے تمہیں بہت نازوں سے پالا ہے۔ تم جانتی ہو میں تمہاری کوئی خواہش رد نہیں کرسکتا۔ مگر پھر بھی مجھ سے یہ نہیں ہوگا میرے بچے کہ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں آگ میں جھونک دوں۔" اندر کہیں کسی اپنے کی آواز گونجی تھی۔

ان کا دل ایک لمحے کے لیے کانپ سا گیا تھا۔ ان کی طرح ثمو بھی آگ سے کھیلنے جارہی تھی۔ ثمو کو اپنی باتوں میں مگن چھوڑ کر وہ آہستہ سے اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

بہت بڑے رقبے پہ پھیلے حسین سرسبز لہلہاتے کھیتوں کے درمیان بنے اس وسیع فارم ہاؤس سے کچھ فاصلے تک آکر ان کی ذاتی زمین ختم ہوتی تھی اور مین روڈ شروع ہوجاتا۔ موسم بہت خوب صورت ہورہا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف لہلہاتے کھیتوں اور اونچے درختوں کی قطاروں نے منظر کو مزید دلکشی بخشی تھی۔ انہوں نے ڈیرہ کا مقامی ریڈیو چینل گلوبل ایف ایم 91 آن کردیا اور سرائیکی کے خوب صورت نغموں سے لطف اندوز ہونے لگے۔ روڈ پہ زیادہ رش نہیں تھا۔ سو آدم علی خان نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ تقریباً" پندرہ منٹ کی ڈرائیو کے بعد ان کی گاڑی شہر میں داخل ہوگئی۔

بیس سال کے عرصے میں ڈیرہ کافی بدل گیا تھا۔ ان دنوں وہ اپنے آبائی گاؤں سے یہاں پڑھنے کے لیے آئے تھے۔ تب انہی راستوں سے ان کا گزر رہتا تھا۔ مگر اب یہ راستے بڑی حد تک تبدیل ہوچکے تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف جابجا خوبصورت مکانات اور دکانیں تعمیر ہوچکی تھیں۔ کہیں کہیں ہی کوئی پلاٹ نظر آجاتا۔ بیس سال پہلے جہاں اکا دکا گھر اور وسیع خالی میدان ہوا کرتے تھے آج وہاں رونقیں آباد تھیں۔

دریا کنارے بنی پکی سڑک پہ آتے ہی انہوں نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھادی تھی۔ اس روڈ پہ ٹریفک آج نہ ہونے کے برابر تھی۔ سڑک کے نیچے بہتے دریا کا پانی بھی اس وقت پرسکون تھا۔ پرانے راستوں پہ آتے ہی کئی پرانی یادوں نے تنگ کرنا شروع کیا تو انہوں نے سر جھٹک کے جیسے ان سے چھٹکارا چاہا۔ قریشی موڑ تک کا فاصلہ انہوں نے صرف پانچ منٹ کے اندر ہی طے کرلیا تھا۔ تبھی یونیورسٹی کی بس نے ان کا راستہ روکا تھا۔ انہوں نے گاڑی کی رفتار کم کردی۔ دل میں بے اختیار ہی کسی کی یاد نے سر اٹھایا۔ سینے میں عجیب سا درد جاگا۔ انہوں نے تیزی سے بس کی سائیڈ سے راستہ بنایا اور فل اسپیڈ سے گاڑی دوڑاتے گئے۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کی بیرونی دیوار صاف نظر آنے لگی۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے نم آنکھیں بے دردی سے رگڑ ڈالیں۔

بیس سال پہلے کے منظر بالکل بدل چکے تھے۔

سڑک کے اس طرف جہاں سالوں پہلے ویران میدان اور سرسبز کھیت تھے آج کچے پکے گھر بنے کھڑے تھے۔ چند ایک دکانیں بھی موجود تھیں۔ یونیورسٹی کے مین گیٹ کے سامنے بنے چھوٹے سے باغیچے کے سامنے انہوں نے اپنی گاڑی روک دی۔ مین گیٹ کے اوپر جلی حروف میں لکھا تھا۔

"گومل یونیورسٹی۔ ڈیرہ اسماعیل خان۔"

کئی لمحے وہ یونہی کھڑے رہے۔ کتنے ہی پل ارد گرد جیسے کسی کا وجود تلاشتے رہے۔ کافی دیر بعد انہوں نے لمبی سانس کھینچ کر جیسے خود کو پرسکون کیا۔ اور دوبارہ گاڑی میں جا بیٹھے۔ صرف چند لمحوں کے فاصلے پہ ان کی منزل مقصود تھی۔

☼ ☼ ☼

موسم کی شدت میں روز بروز اضافہ ہورہا تھا۔ سو آج کل ان کی کافی شاپ پہ گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا۔ شام تک وہ خود بھی کام کرتی رہیں مگر اب انہیں بے حد تھکاوٹ محسوس ہورہی تھی۔

کبھی کبھی انہیں شدت سے یاد آتا کہ کیسے پاکستان میں رہتے ہوئے وہ مغربی ممالک کی ترقی یافتہ زندگی کو آئیڈیالائیز کرتیں۔ اس وقت انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہاں کے لوگوں کی عام زندگی کتنی سخت محنت سے عبارت ہے۔ یہاں آکے ان پہ آگہی کے کتنے ہی در وا ہوئے تھے۔ کہ یہاں پہ کی جانے والی مشقت تو وہاں سے کہیں زیادہ تھی اور یہ بھی کہ ترقی کی منزل محنت کے بنا پانا واقعی ناممکن ہے۔

"مام آپ گھر جاکر آرام کریں۔ میں اور مائیکل سنبھال لیں گے۔ جب موقع ملا تو ہم بھی کیفے بند کرکے چلے جائیں گے۔ ورنہ یہیں رہ لیں گے۔" ان کے پاس کام کرنے والا خوش شکل نوجوان خالص انگلش لہجے میں بولا۔ ان کی ہدایت پہ وہ دونوں ہی انہیں مام کہہ کر پکارتے تھے۔

"ہاں ٹھیک ہے میں پھر نکلتی ہوں تم سنبھال لینا۔" انہیں واقعی بے حد تھکن محسوس ہورہی تھی۔ تبھی انہیں ہدایات دے کر فوراً" ہی گھر کی طرف نکل پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"ویلکم سر۔" فزکس ڈیپارٹمنٹ میں داخل ہوتے ہی جونیئر اساتذہ کے گروپ نے انہیں گھیر لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے ان سب سے ہاتھ ملانے لگے۔ سر حیدر سب سے آخر میں ان کے گلے آلگے۔

"ویلکم یار! آفٹر آلانگ لانگ ٹائم ہاں۔" خوش دلی سے کہتے وہ انہیں پرانا زمانہ یاد دلا گئے۔

"کیسے ہو توقیر۔" وہ ہلو سے ٹیک لگائے پروفیسر توقیر عباس کے پاس آکر براہ راست پوچھنے لگے۔

"ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر گئے تھے۔" عجیب سی تلخی تھی ان کے لہجے میں۔ آدم خان گنڈہ پور چپ ہوکے رہ گئے۔

"چلو تمہارے کمرے میں چل کر بات کرتے ہیں۔" سر حیدر نے سر آدم کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ دوسرے اساتذہ اپنی کلاسوں کی جانب بڑھ گئے۔

"مجھے کچھ کام ہے بعد میں آپ لوگوں سے آکر ملتا ہوں۔" ایک چبھتی ہوئی نگاہ آدم علی خان پہ ڈالتے ہوئے سر توقیر آفس سے باہر چلے گئے۔ آدم علی خان اداسی سے دروازے کو دیکھتے رہ گئے۔

"چھوڑو یار بہت بدل گیا ہے توقیر۔ کافی سنجیدہ طبیعت ہوگئی ہے اس کی۔ تم بتاؤ کیا حال ہے؟ قسم سے جب سے تمہارے آنے کا سنا ہے، صبر مشکل ہورہا تھا۔ اب دوستوں سے ایسی بھی دشمنی کہ بالکل روپوش ہی ہوگئے۔ غریب دوستوں کی یاد ہی نہ آئی اتنے برس۔" سر حیدر نے دوستانہ لہجے میں شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"بس یہی درس و تدریس کرتا رہا دوسرے ممالک میں۔ باقی زندگی کچھ ایسی گزری کہ پیچھے مڑنے کا وقت ہی نہ ملا کبھی۔" آدم نے اداسی سے جواب دیا۔

"ہاں بھئی جنت بھابھی کی ہمراہی میں بھلا تمہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔" سر حیدر نے

مسکراتے ہوئے شرارت سے کہا۔

"ویسے جنت بی بی ہیں کیسی؟" انہوں نے آدم علی خان پہ توجہ کیے بنا ہی سوال کیا جنت کا نام سنتے ہی ان کا چہرہ سیاہ پڑتا محسوس ہوا تھا۔

"مجھے نہیں پتا۔" روکھے لہجے میں جواب دیتے وہ سرحیدر کو شدید حیران کر گئے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے آدم علی خان کو دیکھا۔

"میں نے اسے عرصہ پہلے طلاق دے دی تھی۔" اور سرحیدر کو لگا جیسے کسی نے ان کے سر پر بم پھوڑ دیا۔ وہ مزید کچھ نہیں بول پائے تھے۔

☼ ☼ ☼

دھیرے دھیرے ایک اور سسکتی رات گزر رہی تھی۔ انہوں نے کھڑکی کھولتے ہوئے پردے بھی ہٹادیے۔ سردی کی شدید لہر بارش کی پھوار سمیت اندر آئی تھی۔ مگر انہیں تکلیف کی بجائے سکون محسوس ہوا تھا۔ کچھ دیر ٹھنڈک کو چہرے پر محسوس کر کے جیسے انہوں نے اپنے اندر سلگتی آگ کو کم کیا اور کھڑکی بند کر کے اپنی اسٹڈی ٹیبل پہ آبیٹھیں۔ ٹیبل کی چھوٹی سی لاکڈ دراز کھول کر اندر سے ایک بہت ہی نفیس سی کالے رنگ کی ڈائری نکال لی۔ یہ ڈائری انہیں بے حد عزیز تھی کیونکہ اس ڈائری میں ان کی ساری زندگی اس کے کاغذوں پہ درج تھی۔ آج بہت دنوں بعد انہوں نے اسے نکالا تھا۔ کافی دیر تک اسے یونہی تکتے رہنے کے بعد انہوں نے وہ ڈائری کھول لی۔ زندگی جیسے ورق در ورق پلٹنے لگی۔ بہت سے منظر ان کی یادداشت کے پردے پہ زندہ ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"چودہ جماعتیں پڑھ لیں اور کیا پڑھنا ہے تجھے؟" اماں نے نل پہ برتن مانجھتے ہوئے غصے سے کہا۔ جنت نے بی اے میں بہترین نمبر حاصل کیے تھے۔ اب وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی اماں مان نہیں رہی تھیں۔

"اماں! تو کیوں دشمن بنی رہتی ہے میری۔ مجھے تو لگتا ہے تیری سگی اولاد ہی نہیں ہوں میں۔" اس نے رونی سی صورت بناتے ہوئے کہا۔

"ہاں نہیں ہے تو میری سگی اولاد بس۔" انہوں نے غصے سے برتن کھڑکھڑائے جنت کانپ گئی۔ جبکہ چارپائی پہ بیٹھا آفتاب ماں کی جھنجلاہٹ پر مسکرا دیا۔

"اماں میں تو تعلیم مکمل نہ کر سکا۔ اب اس پہ اپنی حسرت پوری کرنا چاہتا ہوں تو تجھے کیا تکلیف ہے؟" وہ اٹھ کر ماں کے پاس آبیٹھا۔

"ہاں تو بس اتنا پڑھ لیا۔ اب اسے کچھ گھرداری سیکھنے دے۔" اماں نے اسے بھی جھڑکا۔ اور دوبارہ سے جنت کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"اور تو کیا صبح سے جھولے پر چڑھی بیٹھی ہے۔ ادھر آ برتنوں کو مٹی کا لیپ لگا۔"

"نہ اماں مجھ سے نہیں ہوتے یہ غلیظ کام۔ مٹی میں ہاتھ گندے کریں میرے دشمن، میں کیوں کروں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔ پھر آفتاب کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"لالا ذرا جھولا دو نا دیکھو کتنا آہستہ ہو رہا ہے۔" آفتاب اٹھ کر اس کی طرف بڑھ گیا۔ اماں نے ان ہی مٹی سے بھرے ہاتھوں سے اپنا ماتھا پیٹ لیا۔

☼ ☼ ☼

آج انہوں نے اس یونیورسٹی میں اپنی پہلی کلاس بطور پروفیسر لی تھی۔ جہاں تقریباً "بیس بائیس برس پہلے وہ خود بھی ایک اسٹوڈنٹ تھے۔ حسب عادت انہوں نے اپنی کلاس کے اسٹوڈنٹس کی ذہانت چیک کرنے کے لیے ٹیسٹ لیا تھا۔ یہ ان کی پرانی عادت تھی کہ جب بھی کسی نئی یونیورسٹی میں ان کی جاب ہوتی وہ پہلے دن ہی کچھ سوالات دے کر ان کا ٹیسٹ لے لیتے اور پھر اس ٹیسٹ کے نتائج کی روشنی میں ہر طالب علم کو اس کی ضرورت کے مطابق توجہ دیتے۔ اب بھی وہ جوں جوں پرچے دیکھتے جا رہے تھے ان کی حیرت میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ابھی چند دن پہلے جب وہ برطانیہ میں تھے۔ تو وہیں

ایک انگلش ٹیچر کی زبانی انہوں نے سنا تھا کہ پاکستان میں لڑکیاں، لڑکوں کی نسبت زیادہ ذہین اور باکمال ہوتی ہیں۔ وہ انگلش ٹیچر چند ماہ پاکستانی یونیورسٹیوں میں لیکچر دیتے رہے تھے۔ اور ان کے مطابق پاکستانی لڑکیوں کے سوالات نے انہیں کافی حد تک پریشان کر دیا تھا۔

آج کے امتحان میں ان کی بات بالکل سچ ثابت ہوئی تھی۔ ایم ایس سی فزکس کے فرسٹ سمسٹر کی سب ہی لڑکیاں بہت قابل تھیں۔ مگر چار لڑکیوں کے نمبر بے حد شاندار تھے۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ چاروں پاکستان کے مختلف حصوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

سر آدم علی خان گنڈہ پور نے ان چاروں لڑکیوں کے نام اور رول نمبر نوٹ کر لیے تھے۔ کل انہیں سب سے پہلا کام ان بچیوں سے ملاقات کرنا تھا۔ اور پھر انہیں اپنے علم و تجربے سے کندن بنانا تھا۔

☼ ☼ ☼

اماں کی انتہائی مخالفت کے باوجود آفتاب نے اس کا داخلہ انگلش ڈیپارٹمنٹ میں کرا دیا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی لاڈلی تھی اور اس کا بھائی اس کی کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ اسے اس بات پر پوری طرح یقین آگیا تھا۔

وہ کوئی جاگیردار لوگ نہ تھے۔ صرف چند کنال آبائی زمینوں کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ بابا کی اچانک موت نے ان کی کمر توڑ دی تھی۔ تب ہی آفتاب کو اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر گھر کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ زمین محنتی مزارعوں کے سپرد کر کے وہ خود رکشہ بھی چلانے لگا۔ جس کی وجہ سے جلد ہی اس کے حالات سنورنے لگے۔ وہ بے حد محنتی تھا۔

اب اس کی توجہ اس کی لاڈلی بہن پہ مرکوز ہو کے رہ گئی۔ رکشہ کی آمدنی سے وہ گھر کے اخراجات پورے کرتا۔ مگر زمین کی تمام آمدنی وہ اپنی بہن کی تعلیم کے لیے رکھ چھوڑتا۔ جنت بھی بے حد محنتی تھی۔ اس نے ہمیشہ اچھی پوزیشن لی تھی اور اپنے بھائی کی امیدوں کو شرمندہ نہیں ہونے دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"زبردست یار کتنا اچھا طریقہ ہے نا سر آدم کے پڑھانے کا؟" جنید نے تعریفی لہجے میں کہا تو سارے گروپ نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"شخصیت بھی تو کتنی شاندار ہے۔" شیتل گمی نے اپنی بڑی عینک ذرا سی نیچے کرتے ہوئے کہا۔

"اور لہجہ کتنا پر تاثیر تھا۔ سچ میں مجھے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے لیکچر ان کے لبوں سے نکل کر میرے دل و دماغ پہ تحریر ہوا جا رہا ہے۔" نور العارفین نے سحر زدہ لہجے میں کہا۔

"سنو بیٹا۔" بھاری مگر نرم لہجہ سبھی کو متوجہ کر گیا۔ وہ سب تیزی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"مس شیتل، نور، زارا اور فضا آپ لوگ پلیز ذرا مجھے میرے روم میں آکر ملیں۔" شفقت سے کہتے وہ واپس مڑ گئے۔ اور باقی سب بہت رشک سے ان چاروں کو گھورنے لگے جو یقیناً "اپنی ذہانت کی وجہ سے اپنے ٹیچر کے دل میں جگہ بنا چکی تھیں۔ وہ چاروں چند ہی لمحوں میں ان کے آفس پہنچ چکی تھیں۔

"آئی ایم سوری۔ مگر مجھے آپ سے بے حد ضروری کام تھا۔"

"جی سر۔ ضرور" سب ہی یک زبان ہو کر بولیں۔

"میرا اصول ہے کہ میں اپنی کلاس سے چند اچھے لوگ چن کر ان پہ اپنی ایکسٹرا انرجی استعمال کرتا ہوں مطلب انہیں ضرورت سے زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ یہاں آپ چاروں لڑکیوں کو چننے کا میرا ایک اور مقصد بھی ہے۔ آپ لوگ بے انتہا ذہین ہیں اور بدقسمتی سے پاکستان میں لڑکیوں کے لیے وسائل کم اور مسائل زیادہ ہیں۔ سو میں نے آپ لوگوں کا انتخاب اسی لیے کیا کہ آپ لوگوں کو کوئی بھی مسئلہ خواہ یہاں یا اپنی فیملی کی طرف سے پیش آئے۔ پلیز ایک مرتبہ مجھ پہ بھروسا ضرور کرنا۔ ہو سکتا ہے میں آپ لوگوں کو پاکستان کا ایک کامیاب معمار بننے میں مدد دے سکوں۔" وہ متانت سے بولے۔

"شکریہ سر۔" نور نے سب کی طرف سے جواب دیا۔

"اور یہاں میں آپ لوگوں سے ایک خاص رشتہ بھی بنانا چاہوں گا تاکہ آپ سب مجھ سے اپنے مسائل شیئر کرنے میں جھجک محسوس نہ کر سکیں۔" وہ سب چونکیں۔

"میری عمر کے باون سال گزر چکے۔ نوکری کے یہی چند سال ہیں جو میں یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔ پھر کبھی مجھے ایسا موقع ملے نہ ملے اسی لیے میں نے آپ سب کو چن لیا۔" انہوں نے قدرے توقف کیا۔

"آپ چاروں کی تمام معلومات دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ سب کا تعلق الگ الگ صوبے سے ہے۔ مگر ایک جیسی ذہانت اور بیک گراؤنڈ سو مجھے لگا میں اپنی محنت اور مدد سے آپ چاروں کو سنوار کر پاکستان کی ترقی میں اہم کردار ادا کر سکتا ہوں۔ تم سب میری بیٹیوں کی طرح ہو' اور آج میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ تم سب مجھے ایک ٹیچر نہیں بلکہ اپنے باپ کی طرح ہی سمجھو اور بلا جھجک اپنے مسئلے سے آگاہ کرتی رہو۔" ان کی بات ختم ہو چکی تو وہ ان کا شکریہ ادا کر کے باہر آ گئیں۔

"واؤ یار مجھے تو یہ کوئی خواب لگتا ہے۔" وفا خوشی سے بولی۔

"سوچو تو ذرا! ہم اور سر آدم کی بیٹیاں۔" زارا نے انگلی چبائی۔

"ہم! آدم کی بیٹیاں۔" شمتل نے کچھ سوچتے ہوئے دہرایا تھا۔

☼ ☼ ☼

آفتاب خود اسے صبح یونیورسٹی چھوڑ جاتا اور پھر لے بھی جاتا' آفتاب کی شادی کے بعد بھابھی نے سارے گھر کا کام سنبھال لیا تھا۔ سو اب اماں نے بھی ہر وقت اسے ڈانٹنا چھوڑ دیا تھا۔

زمینوں تک نہر آئی تو جیسے ان کی تقدیر ہی بدل گئی۔ پانی کی کمی پوری ہوئی تو زمینوں نے بہتر پیداوار دینا شروع کر دی۔ حالات بھی بہتر ہوتے گئے۔ آفتاب نے گھر کو مکمل طور پر نیا تعمیر کروایا تو سب سے خوبصورت کمرہ اسی کا سیٹ کیا گیا۔ اور اسے ہر سہولت فراہم کی۔ تاکہ جنت کو ذرا بھی مشکل نہ ہو۔ بھابی بھی اس کی دوستوں کی طرح تھیں سو وہ بے فکری سے پڑھائی میں مگن رہی۔

جھیل کی طرح پر سکون زندگی میں ہلچل تب مچی جب اس دراز قد پختون لڑکے نے اس کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ اس لڑکے سے انجان نہ تھی۔ وہ فزکس ڈیپارٹمنٹ کا اسٹوڈنٹ تھا مگر حیران کن طور پر انگلش ادب کا دیوانہ تھا۔ اور مزید حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ انگلش کے ناول' نثر اور شاعری کے نوٹس چند گھنٹوں میں بہت آسان انداز میں بنا دیتا۔ وہ ان کے کلاس فیلو عمر علی خان کا کزن تھا۔ اور اکثر اس سے ملنے آتا تھا۔ وہ عمر کی مدد بھی کر دیا کرتا تھا پڑھائی میں آہستہ آہستہ وہ دوسرے اسٹوڈنٹس کی بھی مدد کرنے لگا اور ان کے ڈیپارٹمنٹ میں بے حد مشہور ہو گیا۔

جنت کو پتا بھی نہ چلا کہ کب اس کے جیسی خاموش طبع لڑکی اس جیسے ہنس مکھ اور باتونی لڑکے کے دل میں گھر کر گئی۔

وہ اکثر جب عمر کے ساتھ ہری ہری گھاس پہ بیٹھا نوٹس بنا رہا ہوتا اور جنت پاس سے گزرتی تو وہ مدھر آواز میں کبھی پشتو تو کبھی سرائیکی گانے گنگنانے لگتا۔ لیکن جنت ہمیشہ ہی اس سے بے خبر رہی۔

اس کے ننھے سے دل میں ہلچل تب مچی جب تھرڈ سمسٹر کا پرچا دے کر گھر جانے لگی کہ چمچماتی کالی کار اس کے پاس آ کے رک گئی۔

"سنیے ایک منٹ۔" خوبصورت لہجہ اسے متوجہ کر گیا۔ اس کے اٹھتے قدم تھم سے گئے۔

"آئیے آج میں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔" اور وہ انکار نہ کر سکی۔ چپ چاپ اس کے ساتھ ہی فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا تھا۔ وہ کسی بات کی منتظر ہی رہی۔ اس کی منزل آ گئی۔ اور جب وہ مایوس ہو کر نیچے اترنے لگی تو اس نے کتنے عجیب طریقے سے جنت کو الوداع کہا تھا۔

"جنت" وہ جو دروازہ بھی بند کر چکی تھی۔ کھلے شیشے

سے اس کی پکار سن کر چونکی اور مڑ کر اسے دیکھنے لگی۔

"میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کے جواب کا منتظر رہوں گا۔ بہت محبت کرتا ہوں میں آپ سے۔" تیزی سے کہتا وہ گاڑی بھگا لے گیا۔ اور وہ اس کے اس قدر اچانک اور شرمیلے اظہار پہ دیر تک ہنستی رہی۔ وہ دن اس کی زندگی کے خوبصورت ترین دنوں میں سے ایک تھا۔

☼ ☼ ☼

جنت تو جیسے بنی ہی آدم کے لیے تھی۔ وہ بھلا اسے کیسے انکار کر سکتی تھی۔ آدم کے اظہار کے بعد خود اس پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ بھی اندر ہی اندر نہ جانے کب سے دام محبت میں گرفتار تھی۔ سو اس نے بھی اس کی طرف پیش قدمی کرنے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی تھی۔

کلاس ختم ہوتے ہی وہ دونوں جیسے ہنس کے خوب صورت جوڑے کی طرح ساری دنیا کو بھلائے بس ایک دوسرے میں گم رہتے۔

یونیورسٹی کا فزکس اور کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ سے متصل ٹی کیبن ہوتا یا اس کے سامنے بچھا خوب صورت لان' لائبریری کے پر سکون ماحول میں یا مختلف پارٹیوں کے ہنگاموں میں' وہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہی ٹھہرے۔

کبھی کبھی وہ دونوں اپنی کلاس چھوڑ کر لمبی ڈرائیو پہ نکل جاتے اور گھنٹوں دریائے سندھ کے کنارے بیٹھے ایک دوسرے سے لیے ساتھ اور وفا کے عہد کرتے گزار دیتے۔ عشق اور مشک تو ویسے بھی چھپائے نہیں چھپتے مگر ان دونوں نے تو چھپانے کی کوئی کوشش بھی نہ کی تھی۔ انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا بلکہ سچی محبت کی تھی۔ معصوم خواہشوں اور پاکیزہ جذبوں سے سچی محبت' تب ہی ان دونوں کے دل میں کوئی خوف نہیں تھا۔

جنت کی سہیلیاں اسے باقاعدہ چھیڑنے لگی تھیں اور اس کی بہترین دوست زاہدہ تو اسے دیکھتے ہی گنگنانے لگتی۔

کملی نہ لا اکھیاں' اے خان تہ خان ہوندے۔
اوچیاں دکاناں تے پھکے پکوان ہوندے۔
(پگلی نگاہیں نہ لڑا کہ خان تو خان ہوتے ہیں۔ اونچی دکانوں پہ ہمیشہ پھیکے پکوان ہی ملتے ہیں۔)

وہ جنت کو ہمیشہ سمجھاتی رہی کہ آدم علی خان گنڈہ پور کا تعلق ایک سردار گھرانے سے ہے اور وہ خود ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ سو اسے ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔ مگر جنت محبت کے طوفان میں یوں جکڑی تھی کہ خود کو بس آدم علی خان کے حوالے کر دیا تھا۔ اسے نہ اپنے آج کی فکر رہی تھی نہ ہی کل کا کوئی ڈر۔ اسے آدم علی خان کی محبت کی سچائی پہ یقین تھا اور اپنے بھائی کی محبت پہ زعم کہ وہ اس کی کوئی خواہش رد نہیں کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

"پھپھو میں ان سے بے حد محبت کرتی ہوں۔ آپ پلیز میرے لیے ایک بار ان سے مل کر تو دیکھو۔" ثمو کے لہجے میں چھپی محبت کے جذبے سے وہ کیسے انجان رہ سکتی تھیں کہ وہ خود بھی تو اس راہ کی راہی تھیں۔

"ثمو' میں بھی تم سے بہت محبت کرتی ہوں بیٹا۔ پلیز تم مجھ سے کوئی ایسی فرمائش نہ کرو جو میں پوری نہ کر سکوں۔" وہ تڑپ کے بولیں۔

"میں آپ سے اپنی محبت مانگ رہی ہوں پھپھو۔" ثمو کی پلکیں بھیگی ہوئیں۔

"یہ محبت ہی تو آگ کا دریا ہے بیٹا۔ اپنا سب کچھ جلا بیٹھو گی۔"

"اس کے بغیر بھی تو میرا سب کچھ خاک ہو جائے گا۔ پھر محبت کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے نا۔" پلکیں بھیگنے لگیں۔

"نہیں ثمو محبت گناہ نہیں' یہ تو بہت ہی خالص جذبہ ہے بچے۔ لیکن اس کے راستے بہت پر خار ہیں اور پھر منزل کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ تم نخلستان سمجھ کر چلتے جاؤ اور منزل صرف ایک سراب۔" ثمو چپ چاپ اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی' وہ سمجھ گئیں کہ وہ

خفا ہو کر گئی ہے۔ انہوں نے تکیے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ بند پلکوں تلے کتنے ہی منظر واضح ہوتے گئے۔

☼ ☼ ☼

اس نے سب سے پہلے بھابھی کو اعتماد میں لیا تھا۔ ویسے بھی وہ تعلیم مکمل کرچکی تھی اور آفتاب بھائی اس کے لیے کسی اچھے رشتے کی تلاش میں تھے۔ بھابھی سے اس کی گہری دوستی تھی۔ سو اس نے ان کی مدد لی تھی۔ بھابھی نے آفتاب تک بات پہنچادی تھی اور آج جب لالا نے اسے چائے لانے کے لیے کہا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آفتاب لالا اس سے آدم کے بارے میں پوچھیں گے۔ وہ تو حیرت سے ان کا چہرہ تکے گئی۔

"جنت بیٹا تم جانتی ہو کہ میں نے تمہیں کتنی محبت سے پالا ہے اور پھر یہ بھی معلوم ہے تمہیں کہ میں آج کل باہر ملک جانے کی کوششوں میں لگا ہوا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ ہم سب اکٹھے جائیں۔ پھر میرے دوست نے وہاں میرے لیے نوکری کا بھی بندوبست کر رکھا ہے۔ میں یہ گھر اور زمینیں بھی بیچ رہا ہوں اور اب ایسے حالات میں یہ سب۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"لالا۔ وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ میرا بہت خیال رکھے گا۔ پھر تم نے ویسے بھی تو میری شادی کرنی ہے نا۔" آفتاب اسے دیکھے گیا اس کی ننھی سی جنت کتنی بڑی ہو گئی تھی۔

"جنت بیٹا میں نے تمہیں بہت نازوں سے پالا ہے۔ تم جانتی ہو میں تمہاری کوئی خواہش رد نہیں کرسکتا۔ مگر پھر بھی مجھ سے یہ نہیں ہوگا کہ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے اس آگ میں جھونک دوں۔ ہم غریب لوگ اور کہاں وہ سردار آدم علی خان گنڈہ پور۔" لالا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا لالا۔ بہت محبت کرتے ہیں ہم ایک دوسرے سے۔" وہ تڑپی۔

"محبت آسان نہیں ہے جنت۔ پتا ہے محبت ایک نخلستان کی طرح ہوتی ہے۔ جس کے چاروں طرف لق و دق صحرا ہوتا ہے۔ نخلستان میں چاہے کتنا ہی لمبا پڑاؤ ڈال لو مگر ایک نہ ایک دن وہاں سے نکلنا ہی پڑتا ہے اور تب جدائی کی تپتی دوپہر اور ہجر کی لمبی عذاب راتوں کو جھیلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ وصل کے سبزہ زار سے متصل ہجر کی سختیاں اور مصائب کے ریگستان جہاں تنہائی اور کرب کی اذیت کے ساتھ اپنی ہی حسرتوں اور خواہشوں کے لاشے اٹھائے ننگے پیر چلنا پڑے۔ کیسے جانے دوں تمہیں ایسے سفر پہ کہ جس کی منزل ہی سراب ہے۔" انہوں نے کتنی باریکی سے اسے عشق و محبت کے راستے اور ان کے پیچ و خم سمجھا دیے تھے۔

"نہیں جنت تم آدم علی خان کو بھول جاؤ۔" لالا نے صاف انکار کردیا۔

اور جنت وہ تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئی۔ رت جگوں نے آنکھوں میں ڈیرے ڈال دیے۔ وہ اب لالا کے سامنے جانے سے بھی گریز کرتی۔ ایک طرف لالا کے انکار سے اس کی جان پہ بن آئی تھی۔ دوسری طرف اس دشمن جاں کا سوچ سوچ کے دل ہلکان ہوتا رہتا۔ اس کی لال آنکھوں کا کرب اور ہر وقت مسکراتے لبوں پہ چھائی اداسی لالا کی برداشت سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ تب ہی انہوں نے ایک بار پھر اس کی ضد مان لی تھی۔ وہ اس کی شادی آدم علی خان سے کرنے پہ راضی ہوگئے۔

آدم علی خان نے سب کچھ خاموشی سے کرنے پہ زور دیا۔ اس کی طرف سے بس چند لوگ ہی نکاح میں شریک ہوئے۔

نہ ڈھول بجے نہ باجے، نہ ہی اس کی سہیلیوں نے گیت گائے، بس بھابھی نے اسے مہندی لگائی اور دلہن بنایا اور نکاح کے بعد لالا اور بھابھی کو روتا چھوڑ کر وہ جنت بی بی سے جنت آدم علی خان بن کر حویلی چلی آئی۔ اسے آج شدت سے اماں یاد آئی تھی۔ اگر وہ ہوتیں تو شاید کبھی اس طرح سادگی سے اس کی شادی کرنے کے لیے راضی نہ ہوتیں۔ یہ تو بس لالا تھے جو اس کی ہر ضد کے آگے ہار جاتے تھے اور جنت تو بس اپنی ضد میں ہی خوش تھی۔

☼ ☼ ☼

آدم خان کی سنگت میں وہ تو جیسے جنت کی باسی ہوئی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے بنا کچھ پل بتانا مشکل ہو جاتے۔ آدم خان یونیورسٹی میں جس قدر شرمیلا اور کم گو مشہور تھا۔ شادی کے بعد اس کی وارفتگیاں جنت کو پانی پانی کیے جاتیں وہ سارا دن اسے پشتو اور سرائیکی کے گانے سناتا رہتا۔

آفتاب نے ایک دوبار چکر لگایا۔ مگر اسے نئی زندگی میں مگن اور خوش و خرم دیکھ کر ان کے دل کو بھی سکون مل گیا۔ ویسے بھی پختون معاشرے میں بہن یا بیٹی کے سسرال روز جانا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

ان ہی دنوں ان کا امریکا جانے کا انتظام ہوا تو وہ جنت کو الوداع کہہ کر بیوی کے ہمراہ امریکا چلے گئے۔ جنت رو رو کے ہلکان ہوتی رہی، مگر آدم کی محبت نے جلد ہی اسے سنبھال لیا۔ اس کے دل میں آدم کی امارت کا جو ذرا سا ڈر تھا وہ بھی دم توڑ گیا۔

"لالا کہتے ہیں کہ محبت نخلستان ہے۔ محبت تو جنت ہے لالا، زندگی ہے۔ بھلا محبت کا صحرا سے کیا لینا دینا لالا بھی نا۔" دل ہی دل میں خود سے باتیں کرتی اس نے ایک مطمئن سی نگاہ گہری نیند سوئے آدم پر ڈالی اور کھڑکی کے پردے گرادیے۔ آدم کے پہلو میں لیٹتے ہی اسے گہری نیند نے آلیا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد آدم کے سب گھر والوں کا رویہ اس کے ساتھ اگر اچھا نہیں تھا تو برا بھی نہیں تھا۔ آدم کی اپنی فیملی میں صرف ایک ماں تھی۔ لیکن چونکہ مشترکہ خاندان آباد تھا اس بڑی حویلی میں تو اس کے چچا اور پھپھو کے خاندان کے تمام افراد ملا کر پچیس چھبیس لوگ تھے اور اتنی بڑی حویلی میں اسے یہ لوگ بھی بہت کم لگے تھے۔

ان سب سے مل کر جنت بے حد خوش تھی اور ان سے اچھی بھلی دوستی بھی ہوگئی تھی اس کی۔ مگر دو لوگوں سے وہ ہمیشہ خائف رہتی تھی۔ ایک آدم کی ماں سے اور ایک اس کے چچا زاد بھائی زمان سے جو آدم سے عمر میں بڑا تھا۔ دل میں چھپا یہ انجانا سا خوف بہت جلد ہی اس کے سامنے حقیقت بن کر آکھڑا ہوا تھا۔

اس کی شادی کو چار ماہ ہوگئے تھے۔ آدم آج کل زمینوں پہ مصروف رہنے لگا تھا۔ وہ گھر میں بیٹھے بیٹھے اس کی راہ تکتے بور ہو جاتی۔ کبھی یہ انتظار جلدی ختم ہوتا مگر اکثر ہی آدم کو شام ہو جاتی۔ تب جنت نڈھال سی ادھر ادھر پھرتی۔ اس کے آتے ہی جنت کے چہرے کی رونق لوٹ آتی۔ مگر وہ بس چند لمحے ہی اس کے پاس ٹھہرپاتا۔ پھر وہ زمان کو سارے دن کی رپورٹ دینے اور اس کے بعد اماں سے ملنے ان کے کمرے میں جاتا تو رات کو ہی واپس پلٹتا آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کمرے میں آیا تو وہ جھٹکے سے اٹھ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"کہاں تھے تم؟"

"اماں اور لالا نے بلایا تھا۔" اس نے سادہ سا جواب دیا۔

"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ آخر روز ان دونوں کو کون سا کام یاد آجاتا ہے کہ تمہیں بلا لیتے ہیں اور میں یہاں تڑپتی رہتی ہوں۔"

"تو سوجایا کرو۔" وہ باتھ روم کی طرف بڑھا۔

"تمہارے بغیر کیسے سوجایا کروں؟ تم جانتے ہو۔ مجھے اتنے بڑے کمرے میں اکیلے سوتے ہوئے کتنا ڈر لگتا ہے۔" وہ چلائی۔

"ہش۔" آدم نے جھٹکے سے اسے خود سے لگاتے ہوئے اس کے منہ پہ ہاتھ دھرا۔

"آئندہ اتنی اونچی آواز میں بات مت کرنا جنت۔ ہمارے خاندان کی عورتوں کی آواز کمرے سے باہر نہیں جاتی۔" اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ جنت نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا۔

"میں کوئی عورت نہیں ہوں تمہاری بیوی ہوں۔ باشعور بیوی جو اپنا حق سمجھتی بھی ہے اور لینا بھی جانتی ہے۔" وہ پھر سے پھٹ پڑی۔

"پلیز سو جاؤ میں ویسے بھی بہت تھکا ہوا ہوں۔" آدم نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے جیسے ہار مانی۔ تب ہی دروازے پہ ہلکی دستک ہوئی۔ وہ فوراً اٹھ کر دروازے پر گیا۔

"لالا آپ" زمان کو سامنے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

"آدم خان تمہیں اپنی ضد پوری کرنی تھی سو کرلی۔ مگر اب یہ تمہاری ہی ذمہ داری ہے کہ اپنی بیوی کو حویلی میں رہنے کے آداب سکھاؤ۔ آئندہ اس کی آواز کمرے سے باہر نہ آئے۔" غصے سے کہہ کر وہ واپس مڑ گئے۔

آدم نے دروازہ بند کیا اور ایک کرخت نظر جنت پہ ڈال کر بیڈ پہ لیٹ گیا۔ ذرا ہی دیر میں اس کے خراٹے گونجنے لگے تھے۔ جنت کے آنسو ساری رات اس کا تکیہ بھگوتے رہے۔

☆ ☆ ☆

"چاچی۔ آپ کی بیٹیاں اسکول نہیں جاتیں کیا؟" جب سے اس کی شادی ہوئی تھی سوائے چند چھوٹی بچیوں بچوں کے اس نے بڑی بچیوں کو کبھی اسکول جاتے نہیں دیکھا تھا بالآخر اس نے چاچی سے پتا کرنے کی ٹھانی تھی۔

"نہیں۔ ہمارے ہاں بس آٹھ تک ہی پڑھاتے ہیں بچیوں کو۔ کیوں کہ گاؤں میں آگے اسکول ہے نہیں اور بچے شہر میں جاکر تعلیم مکمل کرلیتے ہیں۔" چاچی نے نپے تلے لہجے میں جواب دیا۔

"تو لڑکیاں بھی جاسکتی ہیں شہر۔" وہ حیران ہوئی۔

"نہیں لڑکیوں کے لیے یہی کافی ہے۔ زیادہ پڑھ لکھ کر کیا کریں گی پھر ویسے بھی انہیں گھر سے دور جانے کی بھی اجازت نہیں ہے۔"

"تو گھر پہ پڑھائیں پرائیویٹ امتحان دلوائیں۔ مگر بچیوں کا مستقبل تو خراب نہ کریں۔"

"کیا ایسا ہو سکتا ہے گھر بیٹھے بھلا کیسے تعلیم حاصل کریں گی بچیاں۔"

چاچی کے لہجے میں خوشی سی ابھری۔ اسے خوشی ہوئی کہ کم از کم ان کے دل میں بچیوں کی تعلیم کی خواہش تو تھی۔

"آپ فکر نہ کریں۔ یہ میرا مسئلہ ہے۔" وہ خیالوں ہی خیالوں میں ان کی تعلیم کا بندوبست کرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"آپ لوگوں نے کبھی کسی کمہار کو دیکھا ہے۔ کتنی مہارت سے وہ اپنے کیچڑ میں لت پت ہاتھوں سے گیلی مٹی سے خار کھائے بغیر اسے کتنی ہی شکلیں دے دیتا ہے۔ اس کے گندے ہاتھوں سے بھلے ہی آپ لوگوں کو سخت کوفت ہوتی ہو مگر ان ہی ہاتھوں سے ایسے اعلا شاہکار وجود پاتے ہیں کہ بڑے فخر سے ہم نہ صرف انہیں اپنے گھروں میں سجاتے ہیں بلکہ روزمرہ استعمال میں بھی لاتے ہیں۔

میرے خیال میں علم ایک ایسا ہی سفال گر ہے۔ جس کے پاس نہ تو ہنرو مہارت والے ہاتھ ہوتے ہیں نہ ہی سوندھی خوشبو سے مہکتی گیلی چکنی مٹی۔ لیکن پھر بھی یہ ہمارے کردار، شعور اور شوق کو اتنی خوب صورتی سے ایک متناسب سراپے میں ڈھالتا ہے کہ ہماری شخصیت نکھری سی جاتی ہے۔ ہمارے لیے راہیں آسان اور منزلیں قریب تر ہوتی جاتی ہیں۔ ایسے رنگ بھر دیتا ہے ہمارے خیال کے سادہ اوراق پہ کہ ہمیں زندگی کے سب ہی رنگ سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔ ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کی طاقت بھر دیتا ہے ہم میں۔

میرا تو یہ ایمان ہے کہ تعلیم کسی بھی ملک اور قوم کے مستقبل شاندار مستقبل کے لیے بنیادی کی حیثیت رکھتی ہے اور لڑکیوں کی تعلیم اسی بنیاد کو مضبوط بنانے والا جزو اعظم۔ سو تعلیم نسواں کی شرح جس قدر کسی ملک میں زیادہ ہوگی۔ ترقی اتنی ہی تیز تر ہوتی جائے گی۔"

سارا ہال تالیوں سے گونجنے لگا تھا۔ یونیورسٹی کی یوتھ ونگ نے تعلیم نسواں کے لیے ایک علمی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا اور سر آدم علی خان کی تقریر سن

کر سب ہی نے انہیں بے تحاشا داد دی تھی سوائے سر توقیر کے۔ ان کی تقریر کے دوران سارا وقت ایک طنزیہ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم نے ڈرائیور سے کیا کہا ہے؟" وہ گنگناتے ہوئے اپنے کپڑے پریس کر رہی تھی کہ اچانک ہی آدم نے اس کا بازو دبوچ کے اپنے مقابل لا کھڑا کیا۔

"چھوڑو میرا ہاتھ مجھے درد ہو رہا ہے۔" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"تم نے کیا کہا ڈرائیور سے۔" وہ دانت پیس کر بولا۔

"مجھے کچھ کتابیں چاہیے تھیں وہ منگوائی ہیں بس۔" وہ سہم گئی۔

"کس کے لیے۔" وہ گرجا

"حویلی کے بچوں کے لیے۔" جنت بولی۔

"کس سے پوچھ کر۔"

"کیا مطلب آدم۔ میرا دل چاہا ان کے لیے تو منگوالیں۔"

"کیوں منگوالیں؟ کیا تمہیں چاچی نے بتا نہیں دیا تھا کہ لڑکیوں کو آگے پڑھنے کی اجازت نہیں۔" اس نے جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا۔

"مگر کیوں؟" وہ چلاتی ہوئی اس کے سامنے ہوئی۔

"کیونکہ یہ ہماری حویلی کے اصول ہیں۔" آدم نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"لیکن یہ تو غلط بات ہے آدم، تعلیم پہ ان کا بھی حق ہے۔ پھر انہیں کیوں اس حق سے محروم کیا جارہا ہے؟" وہ اب نرمی سے اس کو سمجھانے لگی۔

"یہ تمہارے مسئلے نہیں ہیں وہ ہماری ذمہ داری ہیں۔ تمہارا ان سے کوئی واسطہ نہیں سو ان کے حقوق کی فکر تم مت کرو۔" زمان لالا نہ جانے کب وہاں آئے تھے۔ ان کے کرخت لہجے نے دونوں کو چونکا دیا تھا۔

"اور آدم۔۔۔ تم آؤ میرے ساتھ۔" وہ مڑ کر واپس چلے گئے۔

"جنت۔۔۔ میں نے بہت مشکل سے تمہیں حاصل کیا ہے۔ پلیز تم میرے لیے مزید مشکلات پیدا نہ کرو۔ لالا کے میرے اوپر بہت سے احسان ہیں۔ مگر تمہاری وجہ سے وہ مجھ سے خفا رہنے لگے ہیں۔ پلیز میرا خیال کرو۔" آدم نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔ آنسو پلکوں کی باڑ توڑتے اس کا خوب صورت چہرہ تر کر چلے۔

☆ ☆ ☆

حویلی کی تین اطراف سر سبز و شاداب وسیع لان تھے۔ مگر دائیں طرف والا حصہ بے حد خوب صورت تھا اور اس کی بدقسمتی کہ وہ بس کھلی کھڑکی سے ہی اس جگہ کو دیکھ سکی تھی۔ کئی دفعہ اس نے یہاں آنے کی کوشش کی تھی۔ مگر ہر بار کسی نہ کسی نے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہاں عورتوں کا جانا منع تھا۔ آج اس نے زمان لالا سے خود اجازت مانگ لی اور خلاف توقع انہوں نے اسے بڑی خوشی سے اجازت دے دی تھی۔ وہ جلدی سے وہاں چلی آئی۔

ٹھنڈی ملائم گھاس پہ قدم رکھتے ہی اسے بے پایاں خوشی کا احساس ہوا تھا۔ وہ چند لمحے ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ پھر پرسکون سی گلابوں کی کیاری کے پاس بیٹھ گئی اور اپنی زندگی کے متعلق سوچنے لگی۔

اسے سب کچھ ٹھیک لگ رہا تھا۔ بھائی بھابھی بھی امریکہ خوش تھے اور کبھی کبھار ان سے رابطہ ہو ہی جاتا تھا۔ یہاں بھی اسے گھر والے اچھے ہی ملے تھے۔ بس ایک لالا کی خاموش گہری سیاہ آنکھوں سے اسے عجیب سا خوف محسوس ہوتا۔ ان کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ کئی بار جنت کو لگتا کہ وہ شیطانی چمک ہے مگر پھر وہ اپنی ہی سوچ پہ سو سو بار توبہ کرتی اور خدا سے معافی مانگتی۔

اور زمان لالا۔ اس کو ان سے بھی ڈر لگتا۔ نہ جانے کیوں مگر ان کی آنکھوں میں جنت کو اپنے لیے عجیب ہی رنگ نظر آتے۔ ان کا رویہ بھی کچھ عجیب تھا۔ آدم

کے سامنے وہ اس کے ساتھ بے حد سخت رویہ رکھتے۔ مگر آدم کے پیچھے وہ اس سے بے حد آرام سے پیش آتے۔ اس کی ہر بات کا خیال رکھتے۔ وہ ان کے رویے کو سوچتی چلی گئی۔ تب ہی کسی مضبوط ہاتھ نے اسے اپنی پناہ میں لینے کی کوشش کی تھی۔ چنبیلی کی مسحور کن خوشبو اسے آنے والے کی پہچان کرا گئی۔ اس نے خود کو اس مضبوط حصار کی پناہ میں دیتے ہوئے سکون سے آنکھیں میچ لیں۔

مضبوط سینے پہ سر دھرتے ہی اسے جیسے سارے جہاں کی دولت مل گئی۔ اوپری منزل کی کھڑکی سے جھانکتی دو سیاہ آنکھوں کی چمک مزید بڑھ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆
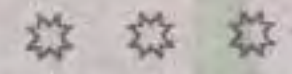
"اپنی ساری وحشتیں مجھے بخش دو جنت۔" زمان لالا اور آدم کی آواز میں حیران کن مشابہت کے باوجود وہ زمان لالا کی آواز بخوبی پہچان چکی تھی۔ تب ہی کرنٹ کھا کے دور ہٹی تھی۔ اتنی تیزی سے پیچھے ہوئی کہ پاؤں گلابوں کی کیاری میں جا پڑا اور کئی کانٹے اس کا پیر زخمی کر گئے۔ وہ زخموں سے بے پروا پھٹی نگاہوں سے بس زمان لالا کو دیکھے گئی۔

"لا... لالا... آ... آپ؟" وہ ہکلائی۔

"ہش..." زمان نے اپنا نرم گرم ہاتھ اس کے لبوں پہ دھر دیا۔

"مجھے لالا نہ کہا کرو جنت۔ میں زمان ہوں' صرف تمہارا زمان۔" جنت کو ان کے چاہت بھرے لہجے سے سخت گھن محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس کے خوب صورت لبوں سے ہاتھ ہٹا کر دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"چھوڑیں میرا ہاتھ۔" وہ تڑپی۔

"تم چھوڑ دو اس بے وقوف کو' جسے تم جیسے ہیرے کی کوئی قدر نہیں۔ وہ تمہارے قابل نہیں ہے جنت۔ اسے نہ تو تمہاری تنہائی کا احساس ہے' نہ ہی تمہارے درد کا۔" جنت ان کا یہ انداز دیکھ کر دہشت زدہ سی ان کو دیکھے گئی۔ تب ہی اس نے بہت زور سے زمان کو دھکا دیا تھا۔ وہ بس ذرا سا ڈگمگائے تھے اور جنت دوڑتی چلی گئی۔ زمان خان کتنی ہی دیر ہوا میں اس کی خوشبو محسوس کرتے رہے۔

☆ ☆ ☆
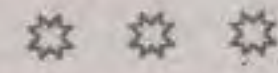
جنت چاہ کر بھی کسی سے اس بات کا ذکر نہ کر پائی تھی اور شاید یہی اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اس کی خاموشی نے زمان خان کو مزید شہہ بخشی تھی اور اگلی رات وہ بڑے دھڑلے سے اس کے کمرے میں موجود تھے۔ جنت تو دل و جاں سے کانپ گئی۔

"آپ کی ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں آنے کی۔" بہت مشکل سے خود میں ہمت پیدا کر کے اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"یہ ہماری حویلی ہے جنت۔ ہم جہاں چاہیں جائیں' کوئی ہمیں روکنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ہاں تم کہو تو دنیا بھی چھوڑ سکتے ہیں۔" وہ مسکرا کر اس کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ وہ دو قدم پیچھے ہٹی تو دیوار سے جا لگی۔

"آپ بس میرے کمرے سے چلے جائیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ آنسو خود بخود ہی اس کا چہرہ بھگونے لگے۔

"اچھا... اچھا... میں چلا جاتا ہوں۔ مگر پلیز تم روؤ مت۔" زمان خان واقعی میں مچل گئے۔ اس کے آنسو دیکھ کر۔ وہ فوراً" دور ہٹ گئے۔

"دفع ہو جائیں یہاں سے۔ نکل جائیں میرے کمرے سے۔ میں آپ کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ زور' زور سے چلائی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلا اور آدم اندر چلا آیا۔ زمان کے چہرے کے تاثرات یک لخت بدل گئے۔

"واہ آدم خان واہ... تو اب ہمیں تمہارے کمرے سے یوں بے عزت کر کے نکالا جائے گا۔" انہوں نے ایک چبھتی نگاہ جنت کے وجود پہ ڈالتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔ آدم خان نے ایک تنبیہی نگاہ جنت پہ ڈالی' جو اب مدد طلب نظروں سے اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں معافی مانگتا ہوں لالا آپ پلیز بیٹھیں۔" آدم نے جنت کو قطعی طور پہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ وہ ششدر سی آدم کو دیکھے گئی۔

"نہیں میں چلتا ہوں۔ مجھے نہر والی زمین کے کاغذات چاہیے تھے' تم لے آنا۔" وہ تیزی سے باہر نکل گئے۔

"تم آخر چاہتی کیا ہو جنت۔" وہ بھی تیزی سے جنت کے قریب آیا اور اس کا بازو دبوچتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"میں نے انہیں کچھ نہیں کہا بلکہ انہوں نے..." وہ ہچکچائی۔

"وہ میرے بڑے بھائی ہیں جنت۔ تمہیں کم از کم میری وجہ سے ہی ان کا لحاظ کرنا چاہیے تھا۔" اس نے جھٹکے سے جنت کا بازو چھوڑتے ہوئے مایوس سے لہجے میں کہا۔

"اب میں آپ کو کیسے بتاؤں آدم مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔" وہ بے آواز رونے لگی۔

"جنت... تم جانتی ہو' میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم اگر الگ گھر میں رہنا چاہتی ہو تو میں تمہیں وہ دینے کو تیار ہوں۔ مگر پلیز میرے گھر والوں کے سامنے یوں مجھے شرمندہ کرانا چھوڑ دو۔" وہ سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر بیڈ پہ ڈھے سا گیا۔

"نہیں آدم... میں تو خود بہت خوش ہوں یہاں' مگر زمان لالا..." وہ تڑپ کے اس کے سامنے آ گئی۔

"کیا زمان لالا... ہاں؟" اس نے ناراضی سی نظر جنت پر ڈالی۔

"زمان لالا... وہ... وہ مجھے بہت تنگ کرتے ہیں آدم... وہ مجھے..." اور وہ مزید کچھ بھی کہہ نہ پائی تھی۔ چٹاخ کی زوردار آواز نے نہ صرف کمرے کے ماحول کو بلکہ جنت کی روح تک کو دہلا دیا تھا۔ گال پہ ہاتھ رکھے نم آنکھوں کے ساتھ وہ اپنے چارہ گر کو دیکھے گئی۔

"میرے خاندان کی نفرت میں تم اس حد تک جا سکتی ہو' اتنا گر سکتی ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا جنت۔" آدم کے لہجے کے ساتھ اس کی آنکھوں سے بھی بے اعتباری ٹپک رہی تھی۔

"یہ جھوٹ نہیں ہے آدم۔ پلیز میں واقعی۔" وہ تڑپ کے ایک بار پھر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"وہ خان ہے جنت' انہیں پتا ہے اپنی اقدار کا کہ ایک تایا زاد کی بیوی کا ان سے کیا رشتہ ہے۔ وہ مر کر بھی ایسا نہیں سوچ سکتے' سمجھیں۔" جنت کو اس کے مان بھرے لہجے پہ حیرت سے زیادہ دکھ ہوا۔

"اور پھر انہیں کوئی کمی نہیں ہے عورتوں کی تو وہ بھلا تمہاری طرف کیوں دیکھیں گے۔" وہ غصے سے لب کچلنے لگا۔ جیسے اس کی برداشت جواب دینے لگی ہو۔

"مرد پہ جب شیطانیت سوار ہوتی ہے نا تو پھر اس کے لیے کوئی بات معنی نہیں رکھتی آدم۔ وہ بس اپنی ہوس پوری کرتا ہے۔ اپنی خواہش کے لیے جیتا ہے وہ۔ رشتوں کا تقدس تک پامال کر دیتا ہے۔ نہ رسم و رواج کا نہ سماج کا۔ دامن داغ دار ہوتا ہے تو صرف عورت کا۔ خوف' دہشت اور دامن بچانے کی لاکھ کوششوں کے باوجود اس کے حصے میں آتی ہے تو بس رسوائی' تہمتیں' داغ اور سوال' لوگوں کے' اپنے خاندان والوں کے' مرد کا یقین سب ہی کر لیتے ہیں اور وہ بھی آنکھیں بند کر کے۔ مگر عورت' عورت کا یقین کوئی نہیں کرتا۔ کیونکہ مرد طاقت ور ہے اور عورت مجبور اور بے بس۔"

آدم چپ چاپ اسے سنے گیا۔ وہ ہانپنے لگی تو خود ہی خاموش ہو گئی۔

"اماں نے مجھے کتنی بار کہا کہ تم حویلی کے لوگوں کے ساتھ خوش نہیں ہو۔ سو تمہیں الگ گھر لے دوں۔ مگر میں نے سوچا محبتوں سے گندھی میری جنت' ساری حویلی کو جنت بنا دے گی۔ میں نے کتنا غلط سوچا تھا جنت۔" وہ بولتا گیا۔

"لالا نے کتنی بار مجھے کہا کہ تم سارا دن فون پہ اپنی دوستوں سے تو باتیں کر سکتی ہو مگر حویلی کی عورتوں سے مل بیٹھنا تمہیں اچھا نہیں لگتا۔ سو اچھا

ہی ہے تمہیں شہر میں گھر لے دوں لیکن میں تم پہ اعتبار کر کے ان سب کو جھٹلاتا رہا۔"

جنت گم سم سی یاد کرنے لگی کہ کیا واقعی اس نے کبھی اس حویلی کے کمینوں سے نفرت کی تھی۔ وہ تو ہمیشہ ان سے گھلنا ملنا چاہتی تھی مگر اماں اور لالا خود ہی۔۔۔

"لیکن اب۔۔۔ اب یاد رکھو جنت۔ اگر تم میرے ساتھ میری اس خاندانی حویلی میں یہاں کے سادہ دل کمینوں کے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو کہیں بھی نہیں۔ اس حویلی سے باہر اگر تم کسی دوسری جگہ رہنے جاؤ گی تو میرے نام کے بغیر۔ ورنہ یہیں گزارہ کرو۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔" اسے بستر پہ پھینکتے ہوئے وہ چلا گیا اور وہ بے آواز تکیہ بھگونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"چاچی۔۔۔ اس نے میری بات پہ یقین کرنے کی بجائے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا۔ یہ بھلا کیسی محبت ہوئی؟" سلمیٰ چاچی بھی اس کی طرح تعلیم یافتہ تھیں۔ لیکن تھیں ان کے خاندان کی۔ تب ہی انہیں جنت کے کمرے میں آنے میں دقت نہیں ہوئی تھی۔ ورنہ یہ واقعی سچ تھا کہ نوجوان لڑکے لڑکیوں کو اس سے زیادہ نزدیک ہونے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے سلمیٰ چاچی کو بلا جھجک ہی سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ ایسے چپ ہو گئیں جیسے یہ ان کے لیے کوئی معمولی بات ہو۔

"تمہیں یہ سب ایسے ہی آدم کو نہیں بتانا چاہیے تھے۔ بلکہ کسی اچھے موقع کی تلاش کرتیں؟" بہت دیر بعد انہوں نے کہا تو وہ حیران رہ گئی۔

"کیسا موقع چاچی۔۔۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں وہ۔ کیا اپنی عزت لٹانے کا موقع ڈھونڈتی رہتی۔" وہ تلخی سے بولی۔

"پٹھان بہت غیرت مند ہوتا ہے جنت۔ وہ ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر کوئی شیطانیت پہ اتر بھی آئے تو اس کے گھر والوں کو یقین نہیں آتا۔ کیونکہ پٹھان معاشرے میں بھابھی کو بالکل ماں کا مقام واحترام دیا جاتا ہے۔"

رہی بات زمان کی تو وہ شروع سے ہی ایسا ہے۔ ذرا سا حسن دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ مگر آدم اس کی فطرت سے انجان ہے۔ کیونکہ وہ زیادہ عرصہ تعلیم کے لیے باہر رہا ہے۔ تب ہی وہ اس بات کو ماننے سے قاصر ہے۔ پھر تم خود سوچو کہ تمہاری شادی آدم سے کرانے کے لیے آدم کا سب سے زیادہ ساتھ خود زمان نے دیا ہے' تو آدم بھلا اس کی نیکی کیسے بھلا سکتا ہے۔ آدم بہت نیک طبیعت انسان ہے۔ لیکن مجھے سخت افسوس ہے کہ وہ نا سمجھ بھی ہے۔

پٹھانوں میں ایک بات بہت عام ہے کہ یہ اپنے بھائی پہ بہت بھروسہ کرتے ہیں اور ان کی بات پہ آنکھیں بند کر کے یقین کرتے ہیں۔ یہی سب آدم کا مسئلہ ہے۔ بس تم اب صرف دعا ہی کر سکتی ہو کہ کسی طرح یہ سب کچھ خود ہی آدم پہ عیاں ہو جائے۔

میرے خیال میں تو تمہارے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں اور صبر ہی دنیا کے ہر مسئلے کا بہترین حل ہے۔" وہ چپ ہوئیں تو جنت انہیں نا سمجھی سے دیکھے گئی۔ وہ اس کے گھنے بالوں پہ ہاتھ پھیرنے لگیں۔

"دیکھو بیٹا جب ہم کسی معاملے میں جلد بازی کرتے ہیں تو اس کا مطلب ہم سب اختیار اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بڑی سے بڑی مشکل پہ بھی جب ہم صبر کر لیتے ہیں نا تو اس کا مطلب ہم ہر اختیار اپنے رب کو سونپ کر اس کے فیصلے کے منتظر ہو جاتے ہیں اور سب کچھ' انجام تک اپنے خدا کے ہاتھ میں دینے سے اللہ کو اپنا مالک مان لینے سے ہمارا دل پر سکون ہو جاتا ہے اور ہمیں واقعی اپنی سوچ سے بڑھ کر اس صبر کا اجر ملتا ہے۔ تم بھی اپنا معاملہ خدا پر چھوڑ دو۔ ان شاء اللہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔"

وہ پر سوچ نگاہوں سے چاچی کو دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼
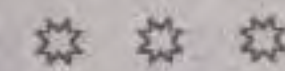
"السلام علیکم سر۔" نور اور شیتل لائبریری کی طرف جا رہی تھیں کہ سر توقیر کو آتا دیکھ کر رک گئیں۔

"والسلام بیٹا' کیسی جا رہی ہے آپ لوگوں کی اسٹڈیز۔" انہوں نے بھی بھرپور شفقت سے جواب دیا۔

"بہت بہتر سر خصوصاً" سر آدم کے آنے کے بعد تو بے حد عمدہ۔" نور نے پر جوش لہجے میں کہا۔

"سر اتنا اچھا پڑھاتے ہیں۔ پھر ہمیں تو وہ بالکل اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ ہر مسئلے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ بہت ہی مخلص اور اچھے انسان ہیں سر آدم۔" شیتل بولنے پہ آئی تو بولتی چلی گئی۔

"بہت نوازش۔۔۔ لیکن یہ صرف آپ لوگوں کی اچھی سوچ ہے۔" ان سب کو باتوں میں پتا ہی نہ چلا کہ کب سر آدم بھی وہاں آ ٹھہرے۔

"بالکل ٹھیک کہا آدم آپ نے۔" سر توقیر نے اتنی ہی تیزی سے کہا جتنی اچانک سر آدم آ کے بولے تھے۔

"واقعی یہ ان بچیوں کی اچھی سوچ ہی ہے جو ہر انسان کو اچھا سمجھنے لگتی ہیں۔"

"مگر ایک بات یاد رکھنا بیٹا' اس خود غرض اور مطلبی دنیا میں مخلص اور اچھے لوگوں کا ملنا بے حد مشکل ہے۔ میں چلتا ہوں آپ سب اپنا خیال رکھنا۔" وہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں' مگر ان سب نے سر توقیر کے لہجے میں تلخی سی محسوس کی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج کل اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی۔ عجیب نڈھال سی ہوتی۔ اس لیے صبح ناشتے میں ایک گلاس دودھ لینے کے بعد وہ دوبارہ سو گئی تھی۔ مگر صرف کچھ ہی دیر بعد کسی کی آہ و بکا سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اٹھ کر توجہ کی۔ آواز نیچے ہال کمرے سے آ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے بڑی سی چادر سے خود کو ڈھانپا اور باہر چلی آئی۔ زمان خان کے خوف سے اب وہ کمرے سے باہر چادر لے کر ہی نکلتی تھی۔

نیچے اترتے ہی اس کی نظر تخت کے ساتھ زمین پہ دو زانو بیٹھی زار و قطار روتی عورت پہ پڑی۔ اماں کی اس کی طرف پشت تھی جو سر اٹھائے ایک شان بے نیازی سے تخت پہ براجمان تھیں۔

"خانانی (وڈیرن) میری بچی پر رحم کرو۔ خان سے کہو کہ وہ جرگے سے نرمی کی درخواست کرے فیصلے میں۔" اس کے نم لہجے پہ جنت کا دل بھی رونے لگا۔

"دیکھو بچو' پوری برادری بیٹھی ہے اس جرگے میں اور یہ سب کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ بھلا زمان تمہاری کیا مدد کر سکتا ہے۔" اماں نے پاؤں اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے کہا۔ جو وہ فوراً" دبانا بھی شروع ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو ویسے ہی جاری رہے۔

"لیکن میری بچی کی عمر بھی تو دیکھو خانانی' ابھی تو سترہ لگا ہے اور وہ بڈھا مرید لوہار' میں خود بچی تھی' تب سے یاد ہے وہ مجھے۔" وہ پھر گڑگڑائی۔

"نا۔۔۔ تو یہ تو تیرے شوہر کو خیال رکھنا چاہیے تھا نا۔ کیوں خود گیا تھا دن دہاڑے اس کی بیوی سے چکر چلانے۔" اماں بپھر گئیں تب ہی پاؤں واپس کھینچ لیا۔

"وہ تو ہے ہی کمینہ اور مرید کی بیوی بھی پورے محلے میں مشہور ہے اپنی کہانیوں کی وجہ سے۔ پھر مرید بے غیرت بھی تو کتنے دھڑلے سے جرگے بٹھا کر یا تو پیسے مار لیتا ہے یا پھر ایک اور من پسند بیوی۔" اس نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔

"جو بھی ہو' جرگہ جو فیصلہ دیتا ہے سب کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ تو اگر بیٹی نہیں دینا چاہتی تو پانچ لاکھ روپے جرمانہ بھر دے۔ بات ختم۔"

"ہم کمی کمینوں کے پاس اتنے پیسے کہاں خانانی۔" وہ مایوسی سے بولی۔

"تو پھر جا۔۔۔ چپ چاپ نکاح کی تیاری کر اس جمعرات تک۔" اماں نے اسے جانے کا کہا تو وہ سسکیاں بھرتی اپنی خوب صورت گوری چٹی بیٹی کو لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تب ہی جنت آگے بڑھی تھی۔

"تم بے فکر رہو میں بات کروں گی آدم سے۔" اماں کے چہرے پہ یک لخت ہی طیش نمودار ہونے لگا۔

غصے سے ان کے سفید نرم گال لال پڑنے لگے۔

"تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے' حویلی کے کاموں سے دور رہا کرو۔" اب تک اماں اور وہ عورت پشتو میں بات کررہی تھیں۔ تب ہی جنت نے بھی پشتو کا ہی سہارا لیا تھا۔

"یہ حویلی کا معاملہ نہیں ہے۔ ایک بے قصور زندگی کا سوال ہے۔ گناہ اس کے باپ نے کیا ہے تو سزا یہ معصوم کیوں بھگتے۔" جنت نے دوبدو جواب دیا تھا' اماں کی آنکھوں سے شعلے نکلتے محسوس ہونے لگے۔

"تم جاؤ بے فکر ہو کے۔ میں نے کہا نا۔ میں خان سے بات کروں گی۔ تمہاری بچی کو میں ہر قیمت اس عذاب سے بچا کے رہوں گی۔ یہ میرا جنت آدم خان کا وعدہ ہے تم سے۔" اس نے ایک تیکھی سی نگاہ اماں کے غصے سے لرزتے وجود پہ ڈالتے ہوئے اس کمزور عورت کو تسلی دی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ وہ غریب عورت اسے زور' زور سے دعائیں دیتی رہی۔

☼ ☼ ☼

وہ رات اس کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ وہ جو صبح سے بے چین تھی کہ آدم کے آتے ہی اس سے اس مظلوم عورت کے بارے میں بات کرے گی۔ سر شام خود ہی مظلومیت کی تصویر بن گئی۔

آدم شام سے کچھ دیر پہلے ہی حویلی لوٹا تو حسب معمول اماں کے کمرے میں ہی گیا۔ جنت کی بے قراری اس کی آمد کے بعد مزید بڑھ گئی۔ وہ کمرے میں ہی اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ تب ہی وہ شخص کمرے میں آیا تھا جو اس کی متاع حیات تھا۔ اس کی محبتوں کا یکتا حق دار ٹھہرا تھا۔ لیکن اس شخص کی لال آنکھوں سے چھلکتی تپش اور لرزتے چہرے کے نقوش دیکھ کر وہ پل کے پل میں سہم سی گئی اور بے اختیار ہی دو قدم پیچھے ہٹی۔ مگر سامنے بھی وہی مضبوط جسم تھا جس کی وجاہت پہ' مضبوطی پہ وہ دل و جان سے فدا ہو گئی تھی۔ اسی ہر کولیس جیسے دیوتا نے اسے اپنے مضبوط حصار میں پناہ نہیں دی آج۔ بلکہ یوں جکڑا کہ اس کی آہیں نکل گئیں اور پھر دبوچتے ہی اس کے نرم و نازک وجود کو یوں روئی کی طرح دھن ڈالا کہ اس کی روح تک ریزہ ریزہ کردی۔

وہ جو صبح سے شام تک کسی بے گناہ کے ناکردہ گناہ کی سزا پہ کڑھ رہی تھی۔ اپنے لیے کچھ سوچنے کے قابل ہی نہ رہی۔ چپ چاپ اپنی محبت کے ہاتھوں پٹتی رہی۔ آدم خان نے تھک کر خود ہی اسے چھوڑا تھا۔

"اپنی اس سزا کو یاد رکھنا۔ مجھے پوری امید ہے تمہیں کبھی نہ تو اماں کے سامنے زبان چلانے کی ہمت ہوگی' نہ ہی کسی بے گناہ کی مدد کرنے کے بارے میں سوچنے کا حوصلہ۔"

گرختگی سے کہتا بیڈ کو زور سے لات رسید کرتا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جنت وہیں بے سدھ پڑی رہی۔

☼ ☼ ☼

"پھپھو۔۔۔ آپ کھانا کھا لیجیے گا میں اسفندیار کے ساتھ ہوں۔ رات میں وہ مجھے گھر کے پاس ہی ڈراپ کردیں گے۔ آپ بالکل بھی فکر مت کیجیے گا۔" تیزی سے کہتی ثمو نے انہیں بات کرنے کا موقع دیے بغیر ہی فون کاٹ دیا تھا۔ اس کے لہجے میں چھلکتی بے قراریاں محسوس کرکے وہ مزید متفکر ہو گئیں۔

"تمہیں کیسے سمجھاؤں ثمو' جس خاردار راستے پہ تم قدم جما رہی ہو' مدتوں پہلے میں ان ہی راہوں کی خاک چھان چکی ہوں اور مجھے سوائے درد اور نارسائی کے دکھ کے کچھ بھی تو نہیں ملا' کچھ بھی نہیں۔" کھڑکی کے شیشے پہ پڑنے والے بارش کے قطروں اور ان کے چہرے پہ لڑھکتے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

☼ ☼ ☼

حیرت انگیز طور پر جسمانی اور روحانی طور پہ گھاؤ لگنے کے باوجود اس میں خوف کی جگہ مزید حوصلہ پیدا ہوا تھا اور مسلسل سوچ بچار کے بعد اچانک ہی اسے ایک خیال آیا۔ وہ تیزی سے چادر لیے حویلی کے اسی صحن میں چلی آئی جہاں عورتوں کا آنا منع تھا۔

وہ وہیں گلابوں کی کیاریوں کے پاس جا بیٹھی اور سجو کی بیٹی کے بارے میں سوچنے لگی۔ آج بدھ کا دن تھا۔ مطلب آخری دن۔ کل اس کا نکاح ہو جانا تھا۔ اسے کسی حالت میں ناکامی قبول نہیں تھی۔ اسے آدم کی اماں سے عجیب سی ضد ہو گئی تھی۔

وہ اپنی سوچوں میں غرق تھی کہ اچانک ہونے والی آہٹ پہ چونک اٹھی۔ اس کی نظر اٹھی اور دل ہی دل میں اس نے اپنے اندازے کے صحیح ہونے پہ خود کو داد دی۔ اس کی توقع کے عین مطابق وہ زمان لالا تھے۔

"مجھے آپ سے کام تھا لالا۔" اس نے فوراً" ہی خود سے بات چھیڑی تھی۔ وہ ان کی بے خودی سے واقف تھی۔ تب ہی انہیں کوئی موقع دیے بغیر ہی اپنا کام نکلوانا چاہتی تھی۔

"حکم کرو جنت، بس یہ لالا نہ کہا کرو ہمیں۔" ان کے خوب صورت چہرے پہ بڑی حسین مسکراہٹ پھیل گئی۔ جنت نے مزید جلدی سے سجو کی بیٹی کی شادی رکوانے کا کہہ دیا۔ ایک پل کے لیے زمان بھی خاموش رہے تو اس کی رہی سہی امید بھی دم توڑنے لگی۔ وہ خاموشی سے اندر کی طرف قدم اٹھانے لگی۔ جب زمان کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔

"جنت نے کہہ دیا تو ہرگز نہیں ہوگی۔ یہ زمان خان کا وعدہ ہے۔" ان کی بھاری آواز پہ جنت کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ مڑ کر انہیں دیکھنے لگی۔

"کل ہم گھر پر نہیں تھے۔ تب ہی آدم خان نے تم پہ... لیکن جب سے ہم نے سنا ہے یقین کرو، دل سے تمہارا درد محسوس کیا ہے۔ کاش کاش کہ تم ایک بار مجھ پر اعتبار کرو۔" ان کی بات پہ خواہ مخواہ ہی اس کا دل بھرانے لگا۔ آنکھیں چھلکنے کو بے تاب ہوئیں۔

"میں چلتی ہوں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔

"ٹھیک ہے، تم آرام کرو۔" زمان خان نے گہری سانس خارج کرتے ہوئے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ سہولت سے واپس چلی آئی۔ ایک دفعہ پھر اسے آدم علی خان سے شدید نفرت محسوس ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آفتاب لالا سے اس کی بات ہوتی رہتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے بھائی سے اپنا کوئی درد بانٹنا گوارا نہیں کیا۔ اس نے سجو کی بیٹی کی زندگی بچالی تھی۔ مگر خود جیسے دن رات خوف کے انگاروں پہ لوٹنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی اس نے اپنی اس خوف زدہ زندگی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ خود کو کمرے تک ہی محدود کر دیا تھا اس نے۔ دروازہ بند کر کے سارا دن وہ آدم کی راہ تکتی۔ آدم اب اکثر راتوں کو بھی گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ اس نے ایک، دوبار گھر کے ملازموں سے پوچھا تو انہوں نے جو جواب دیا وہ اسے مزید افسردہ کرنے کے لیے کافی تھا۔ ماسی خیراں نے اسے بتایا تھا۔

"بی بی۔ خان ہیں، ایک جگہ کہاں ٹھہرتے ہیں۔ بھنوروں کی طرح کبھی اس نگر تو، کبھی اس نگر، پھول پھول کا رس چوستے ہیں۔ پر تشنگی نہیں مٹتی ان کی۔"

پھر زمان لالا کی مثال اس کے سامنے تھی۔ دو شادیاں کر چکے تھے۔ دونوں بیویاں ہی خوب صورتی میں بے مثال تھیں اور دونوں ہی بڑی خوش دلی سے ان کے ساتھ نباہ کر رہی تھیں۔ پھر بھی ان کے دل کو چین نہیں تھا۔

آج بہت دن بعد وہ باہر چمن میں آئی تھی۔ نرم سرسبز گھاس پہ قدم دھرتے ہی اسے بہت سکون محسوس ہوا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم دھرتی ادھر سے ادھر ٹہلنے لگی۔ معاً" آدم خان کی جیپ گھر میں داخل ہوئی۔ اس نے ایک گہری نظر فرنٹ سیٹ پہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے آدم خان پہ ڈالی۔ تب ہی اس کی نگاہ بھی جنت پہ پڑی۔

جنت نے فوراً" اداسی سے نگاہیں پھیر لیں۔ اس کا اجاڑ حلیہ آدم کی روح تک کو گھائل کر گیا۔ محبت پہ جمی انا کی گرد تھوڑی سی صاف ہوئی اور وہ سیدھا اپنی جنت کے پاس چلا آیا۔

"جنت۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ ہم کچھ دنوں کے لیے شہر چلیں گے۔ تم شاپنگ وغیرہ بھی کر لینا اور گھوم پھر بھی لیں گے۔" اس نے دھیرے سے اس کا نرم و ملائم ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ تو جنت کی اداس آنکھوں میں خوشی چھلک پڑی۔ وہ جو خود بھی اپنے ہم سفر کے التفات کی متلاشی تھی۔ فوراً" راضی ہو گئی اور پھر چند ہی لمحوں میں وہ تیار کھڑی تھی کہ اچانک ہی اماں نے آدم کو بلا بھیجا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی واپس آیا تو جانے کیوں جنت کو تھوڑا الجھا الجھا محسوس ہوا۔ اس نے پوچھا بھی، مگر آدم ٹال گیا۔ گاڑی کے حویلی سے نکلتے ہی جنت میں وہی جوش جاگ اٹھا تھا جو اب ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ آدم نے ایک الجھی سی نگاہ اس کے چہرے پہ ڈالی تھی۔ جس پہ بے حد دلکش مسکراہٹ سجی تھی۔

"میں سوچ رہی تھی کہ جاب کے لیے اپلائی کروں۔ لیکچرار کی پوسٹ خالی ہے۔" سرسبز کھیتوں کی ٹھنڈی مہک اپنے اندر اتارتے ہوئے اس نے ایک جذب سے کہا تو آدم چونک گیا۔

"تمہیں کیسے پتا؟"

"کیا مطلب کیسے پتا۔" جنت حیران ہوئی۔

"عمر نے بتایا ہے، ویسے توقیر بھائی سے بھی کنفرم کیا ہے میں نے۔" اس نے آرام سے جواب دیا۔

"تم ابھی تک ان دونوں سے رابطے میں ہو۔" آدم کے لہجے میں کیا تھا جنت سمجھ نہ سکی۔

"صرف ان دونوں سے نہیں، میں اپنے سارے دوستوں سے رابطے میں ہوں۔ ان کے نمبر ہیں میرے پاس، مگر بات کیا ہے، تمہیں کچھ کام ہے؟" جنت مزید حیرت سے بولی۔

"ہاں، بہت ضروری کام۔" اس نے کہتے ہوئے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی اور صرف پانچ منٹ بعد وہ دوبارہ حویلی کے قد آور لکڑی کے دروازے میں داخل ہو چکے تھے۔ جس کا مطلب تھا کہ آدم نے گاڑی کسی دوسرے راستے سے دوبارہ حویلی کی طرف موڑ دی تھی اور وہ جو راستوں سے انجان تھی سمجھ ہی نہ سکی، جنت حیرانی سے اسے دیکھے گئی۔

"اترو۔" آدم خان نے لب کچلتے ہوئے سختی سے کہا۔ وہ بیٹھی رہی۔

"اترو نیچے۔" وہ چیخا۔ جنت کانپ گئی اور تیزی سے نیچے اتر آئی۔ اس کے اترتے ہی آدم علی خان زن سے گاڑی واپس بھگا لے گیا تھا۔ وہ کئی لمحے وہیں کھڑی رہ گئی۔ تب ہی اس کی نگاہ اوپر کھلے دریچے پہ پڑی تھی۔ سیاہ کالی آنکھوں کے ساتھ پپڑی جمے ہونٹ بھی مسکرا رہے تھے۔ وہ نظر جھکاتے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

جنت آدم علی خان ماں بننے والی ہے۔ اس خبر نے حویلی کے ساتھ ساتھ سارے گاؤں میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی۔ آدم تو جیسے بالکل دیوانہ ہو رہا تھا۔ وہ اب زیادہ تر گھر پہ رہ کر اس کا خیال رکھنے لگا۔ لیکن اس موقع پر بھی اس نے آدم کی ماں کی آنکھوں یا رویے میں کوئی خوشی محسوس نہ کی۔ اسے سخت مایوسی ہوئی تھی۔

زمان تو خود اس کا بے حد خیال رکھنے لگے اور اس کی ہر ضرورت کا خود خیال رکھتے۔ یہ بات آدم کے لیے جتنی باعث مسرت تھی جنت کے لیے اتنی ہی پریشانی کا باعث، مگر وہ آدم کے رویے میں ہونے والی یک لخت تبدیلی کی وجہ سے سب اگنور کرنے لگی۔

اس نے سیکھ لیا کہ محبت کے نخلستان کے اندر ہی پناہ لے لی جائے تو صحرا کی طرف سے آنے والی گرم ہوائیں بھی ٹھنڈی محسوس ہونے لگتی ہیں۔ سو جنت نے خود کو مکمل طور پہ آدم کی پناہ میں دے دیا تھا۔ جب تک آدم نہ آجاتا تب تک ایک نوکرانی ہمیشہ اب اس کے پاس رہتی۔

زمان اس کا حال پوچھنے آتے تو یا وہ خود کو سوتا ظاہر کر دیتی یا تیزی سے واش روم میں گھس جاتی۔ اس کی یہ حرکت اسے بے شک مطمئن کر دیتی۔ مگر زمان اس کے فرار کو سمجھ گئے۔ تب ہی انہوں نے خود ہی کنارہ اختیار کر لیا تھا۔ جنت ان کی اس اچانک خاموشی سے بھی گھبرانے لگی۔ زمان لالا کی خاموشی اسے کسی بڑے

طوفان کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ لیکن یہ پریشانی بھی اس وقت مکمل طور پہ دم توڑ گئی۔ جب خوب صورت گول مٹول سا اسفند یار علی ان کی زندگی میں چلا آیا۔ ان کی جنت مکمل ہو گئی۔ وہ بالکل آدم کی شبیہہ تھا۔ سرخ و سپید رنگت، بہت مکمل اور پیارا، جنت تو سارا دن اسے سینے سے لگائے رکھتی۔ آدم ایک بار پھر دن رات مصروف رہنے لگا تھا۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ زمان، اسفند یار سے جنون کی حد تک محبت کرتے تھے۔

اسفند یار چھ ماہ کا ہوا تو زمان کا زیادہ تر وقت گھر پہ گزرنے لگا۔ وہ سارا سارا دن اب خود اسفند یار کو سنبھالتے۔ اس کا ڈائپر تک خود بدل دیتے۔ صرف اس وقت اسفند یار اس کے پاس لایا جاتا جب وہ بھوکا ہوتا یا پھر رات کو سونے کے لیے۔ مگر جوں جوں اسفند یار بڑا ہوتا گیا وہ خود بھی زمان کے لیے مچلنے لگتا۔ حتیٰ کہ رات کو بھی ان ہی کے پاس سونے کی ضد کرتا۔ صبح جب وہ زمینوں کے لیے نکلتے تو وہ بھی ساتھ ہو لیتا۔ وہ یا تو اب ناشتے کی میز پہ اس سے مل پاتی یا پھر شام کو۔ جب تھکا ہارا اسفند یار گھر لوٹتا، تو اس کی آغوش میں آتے ہی نیند کی وادیوں میں اتر جاتا۔ وہ اسے جی بھر کے دیکھ بھی نہ پاتی تھی کہ زمان لالا آدم سے کہہ کر اسے منگوا لیتے۔ وہ اسے اپنے ساتھ سلانے کی ضد کرتی مگر آدم ہمیشہ اسے اپنی قربتیں نواز کے اس کی ضد کو پس پشت ڈال دیتا۔ نہ جانے کیوں مگر اب اسے پہلے سے بھی زیادہ کسی بڑے خطرے کا احساس ستانے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"توقیر۔۔۔" سر توقیر جو آدم کو اپنی طرف آتا دیکھ کر تیزی سے وہاں جانے لگے تھے۔ سر آدم کی تیز پکار پہ رک گئے۔

"یار۔۔۔ ایک دفعہ میری بات تو سن لو۔" سر آدم نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"کچھ کہنے سننے کو بچا ہی کیا ہے۔" ایک تلخ نگاہ ان کے چہرے پہ ڈال کے وہ تلخی سے بولے۔

"پلیز۔۔۔ صرف ایک بار۔" سر آدم ان کے سامنے جا ٹھہرے۔

"ٹھیک ہے بولو۔"

"آفس میں بیٹھتے ہیں۔ مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" سر آدم نے کہا تو سر توقیر بھی سر ہلا گئے۔ چند لمحوں بعد ہی وہ سر آدم کے آفس میں موجود تھے۔

"اب جلدی بات کرو۔ مجھے کلاس لینی ہے۔" سر توقیر کے لہجے میں رکھائی محسوس کرکے سر آدم کے دل کو کچھ ہوا۔ کبھی ان دونوں کی دوستی کی لوگ مثال دیا کرتے تھے اور آج اس قدر فاصلہ، اتنی اجنبیت۔

"میں تم سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔" کچھ دیر بعد وہ شکستہ لہجے میں گویا ہوئے۔

"تم خود بتاؤ آدم، جو کچھ تم نے کیا کیا تمہیں معاف کر دینا چاہیے۔" سر توقیر نے تلخی سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"شاید نہیں مگر تم مجھے معاف نہ کر سکو یہ ناممکن بھی تو نہیں ہے نا۔" ان کی آنکھوں میں یقین تھا۔

"تم میرے مجرم نہیں ہو آدم، تم جانتے ہو یہ بات۔" تھک کر سر توقیر نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

"ہاں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجرم نہ سہی تمہارا کچھ نہ کچھ گناہ گار تو ہوں میں۔ دوسری بات مجھے معلوم ہے توقیر کہ اس کا پتا بھی صرف تم ہی مجھے بتا سکتے ہو۔" سر آدم نے اس لفظ پہ زور دیتے ہوئے کہا۔ تو سر توقیر چونک گئے۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔ جس کے لیے تم مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے۔" ان کے لہجے میں خود بخود طنز سمٹ آیا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا کہ میں کچھ نہ کچھ تو تمہارا بھی گناہ گار ہوں۔ تب ہی میں تم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں تم سے جنت کے بارے میں بھی پوچھنا چاہتا تھا۔ تاکہ تم مجھے اس کا پتا بتا دو اور میں اس سے معافی مانگ سکوں۔ شاید کہ میرے ضمیر کا

بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے۔"

"ضمیر اتنی معمولی چیز نہیں کہ تم جب دل چاہے اس پر بوجھ لاد دو۔ یا اتار دو، مسٹر آدم علی خان گنڈہ پور۔" سر آدم خاموش رہے تھے۔

"میری کلاس کا ٹائم ہو گیا۔" سر توقیر کچھ فائلز اٹھا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اور ہاں بھابھی، سوری باجی اپنے بھائی آفتاب کے پاس امریکہ چلی گئی تھیں۔" سر آدم کو وہیں اکیلا چھوڑ کر وہ آفس سے باہر نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

پورے سات سال بعد آفتاب لالا کے ہاں اولاد ہوئی تھی۔ جنت کی بھتیجی پیدا ہوئی تھی۔ آج پورے دو ماہ بعد اس کی اپنے بھائی اور بھابھی سے تفصیلی بات چیت ہو پائی تھی۔ وہ دونوں بے حد مسرور تھے۔ خود جنت کا خوشی سے برا حال تھا۔ وہ بچوں کی طرح اچھل رہی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ لال ہوا جاتا تھا۔ آدم نے بڑی مشکل سے اسے مزید ناچنے سے روکا تھا۔

"بس کرو، اتنا خوش تو تم اسفند یار کے وقت بھی نہیں تھیں۔" اس نے محبت سے جنت کے چہرے پہ آئی سیاہ لٹیں ہٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں آدم یہ بات نہیں۔ اصل میں بھائی کی شادی کو اتنے برس بیت گئے۔ بھائی تو خیر ہے مگر بھابھی بالکل مایوس ہونے لگی تھیں۔ ایسے میں بیٹی کی پیدائش پہ وہ کتنا کھل گئے ہیں آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ خوشی سے بولی۔ تب ہی میز پہ پڑا فون بجنے لگا۔ آدم نے بڑھ کر ریسیور اٹھایا تھا۔

"ہاں۔۔۔ توقیر۔۔۔ کیسے ہو یار۔" اس نے دوسری طرف سے کچھ سنتے ہی کہا تو جنت نے لپک کے ریسیور اس کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔

"توقیر بھائی۔۔۔ آفتاب لالا کی بیٹی ہوئی ہے۔" اس نے آدم کے سختی سے بھینچے لبوں پہ توجہ کیے بغیر جوش سے کہا۔ جب سے آفتاب امریکہ گیا تھا وہ توقیر میں اپنا بھائی ڈھونڈنے لگی تھی۔ وہ مزے سے باتیں کر رہی تھی اور آدم علی خان چپ چاپ اس کے چہرے کے رنگوں کو تکتا مارے ضبط کے ہونٹ چباتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نیند کی ہمیشہ سے کچی تھی۔ تب ہی رات کے پچھلے پہر نہ جانے کیسا کھٹکا ہوا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے سخت پیاس محسوس ہوئی۔

اس نے نیچے قالین پہ لیٹی اپنی نوکرانی پہ نظر ڈالی۔ وہ گہری نیند میں گم تھی۔ آدم آج رات پھر نہیں آیا تھا۔ جنت نے نوکرانی کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ وہ چپل پہن کے خود ہی کچن میں چلی آئی۔ لائٹ جل رہی تھی۔ اس نے ماربل کی سلیب سے گلاس اٹھایا اور کولر سے پانی لینے لگی۔ تب ہی گرما گرم بھاپ اڑاتا چائے کا کپ اس کی توجہ کھینچ گیا۔ واہ۔ اس نے پانی کی بجائے چائے کا کپ اٹھا لیا اور ایک سپ لے کر دوبارہ رکھ بھی دیا۔ الائچی کی زبردست چائے نے اسے بے حد لطف دیا۔ وہ دل ہی دل میں چائے کے ذائقے کی داد دینے لگی۔

"کتنی زبردست چائے ہے۔ مگر اس وقت اسے بنایا کس نے۔" اسے کافی دیر بعد خیال آیا تھا۔ تب ہی خود سے جیسے ہمکلام ہوئی تھی۔

"میں نے۔" کوئی بہت ہی قریب سے بولا تھا۔ جنت کا دل بند ہوا۔ اس نے مڑنا چاہا، مگر کسی کو اپنے بے حد قریب محسوس کرکے وہ ہل بھی نہ پائی۔ کسی نے بہت نرمی سے اسے کندھے سے تھام کر اس کا رخ پھیرا تھا۔

"ز۔۔۔ زمان لالا۔" اس کی آنکھوں میں دہشت سما گئی۔

"ہش۔" زمان نے دھیرے سے اس کے گلابی ہونٹوں پہ اپنا ہاتھ دھر دیا۔ زمان کے سینے سے لگی جنت کی سانسیں رکنے لگیں۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی مگر سلیب کی وجہ سے ناکام رہی۔

"پلیز لالا۔۔۔ مجھے جانے دو، کوئی دیکھ لے گا۔" بمشکل وہ بول پائی۔

"کوئی دیکھ بھی لے گا تو ڈر نہیں۔ زمان خان کسی سے نہیں ڈرتا۔" وہ بے خود سے اس پہ جھکتے گئے۔

"دور ہٹیں مجھ سے۔ پلیز لالا۔ چھوڑیں مجھے۔" وہ ان کے مضبوط سینے کو دھکے دینے لگی۔

"بس۔" زمان نے اس کے دونوں ہاتھ ایک ہی ہاتھ سے جکڑ لیے تھے۔

"میں اپنی بے عزتی بار بار برداشت نہیں کروں گا جنت۔ چھوڑ دو اس شخص کو، جسے نہ تو تمہارا احساس ہے نہ تمہاری کسی خواہش کا۔ تم جو کہو میں پورا کروں گا۔ بس آدم علی خان سے الگ ہوجاؤ۔ میری پناہ میں آجاؤ۔" زمان کی گرم سانسیں جنت کا چہرہ جلانے لگیں۔ جنت کو لگا اس کا اندر تک سلگنے لگا تھا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں زمان علی خان کہ جنت تو ہے ہی آدم کی میراث۔ شیطان چاہے جتنا بھی خودسر اور طاقت ور کیوں نہ ہوجائے۔ جنت سے محروم ہی رہے گا۔" وہ ایک ایک لفظ چبا کے بولی تھی۔ زمان کا مضبوط ہاتھ اس کے خوب صورت چہرے پہ نقوش چھوڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ زمان نے اسے مضبوطی سے دبوچ کے اپنے مزید قریب کرلیا۔

"تمہاری اتنی ہمت، تم جانتی نہیں کہ میں کیا کرسکتا ہوں جنت۔ بس۔ اب میرے انتقام کا انتظار کرنا۔ آدم کی جنت کو خود آدم کے ہاتھوں نہ اجاڑ دوں تو زمان خان نام نہیں میرا۔" تنفر سے کہتے ایک جھٹکے سے اسے خود سے دور ہٹا کر وہ مڑ گئے۔ جنت تیزی سے کمرے میں آئی اور بیڈ پر گر کر بے آواز رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

بار بار ہونے والی مسلسل دستک نے انہیں شدید غصہ دلایا۔ پتا نہیں کون تھا کہ بیل بجانا ہی نہیں جانتا تھا۔ غصے سے دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے وجود پہ نظر ڈالتے ان کا سارا غصہ رفوچکر ہوگیا۔ چوبیس سالہ خوبرو نوجوان کا دستک دیتا ہاتھ ہوا میں معلق رہ گیا۔

"اوہ۔ معافی چاہتا ہوں۔" وہ سر کھجا گیا، پھر مزید بولا۔

"میں اسفندیار ہوں۔ مجھے ثمو کی پھوپھو سے ملنا ہے۔ میرے خیال میں وہ عزت ماب خاتون آپ ہی ہیں۔ مجھے فخر ہوگا اگر میں چند لمحے آپ کے ساتھ گزار سکوں۔" وہ جب بولنے پہ آیا تو بولتا چلا گیا۔ وہ بس حسرت بھری نگاہوں سے چپ چاپ اسفندیار کو بولتا دیکھتی رہ گئیں۔

"ہیلو۔" اس نے ان کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرائے۔

"ہاں۔ آؤ بیٹا اندر آجاؤ۔" محبت پاش نظروں سے دیکھتیں وہ اس کے راستے سے ہٹ گئیں۔ وہ شکریہ کہتا ان کے پیچھے ہولیا۔ اسے لاؤنج میں بٹھا کے وہ کافی لینے چلی گئیں۔ جب تک وہ واپس آئیں اسفندیار گھر کا تفصیلی جائزہ لے چکا تھا۔

"شکریہ۔" اس نے کافی کا مگ تقریباً ان کے ہاتھ سے کھینچتے ہوئے کہا۔ انہیں خود بخود ہنسی آگئی۔

"واؤ۔ لیڈی یو آر آسم۔ آج اگر میری ماں ہوتیں تو بالکل آپ کی طرح لگتیں۔" اس نے کافی کا مگ منہ سے لگاتے ہوئے بائیں آنکھ دبائی تو وہ مسکرادیں۔

"اف لڑکے۔ تمہیں تمہارے گھر والے کیسے برداشت کرتے ہیں۔"

"کہاں یار۔ اکیلا رہتا ہوں۔ ایک پاپا ہیں، وہ بھی پاکستان میں ہیں۔" اس نے افسوس سے سرہلایا۔ وہ بھی خاموشی سے سرہلا گئیں۔

"اچھا لیڈی اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کو میری اور ثمو کی شادی سے کیا پرابلم ہے۔" وہ اتنا اچانک اپنے مدعا پہ آیا کہ انہیں اچھو لگ گیا۔

"اوہ۔ لگتا ہے بہت زیادہ پرابلم ہے۔" اس نے مایوسی سے کہا تو جنت بی بی مسکرادیں۔

"نہیں بیٹا پرابلم کوئی نہیں ہے۔ بس میں چاہتی ہوں کہ ثمو پوری عزت اور شان سے اپنی نئی زندگی کی شروعات کرے۔ پھر اب جبکہ بھائی، بھابھی کی موت کے بعد میں ہی اس کی ذمہ دار ہوں تو میں چاہتی ہوں کہ اس کی طرف سے مکمل طور پہ مطمئن ہوجاؤں۔" انہوں نے صاف بات کی۔

"وہ تو یہ بات ہے۔" اسفندیار سرہلاتے ہوئے بولا۔

"جی۔"

"ٹھیک ہے، آپ پوری طرح سوچ سمجھ لیں۔ اس کے بعد آپ جو شرائط رکھیں گی مجھے منظور ہوں گی وہ بھی بلاتردد۔" اس نے حتمی فیصلہ سنایا۔

"سوچ لو۔"

"سوچ لیا آپ کو ڈاکٹر اسفندیار پہ شک تو نہیں ہونا چاہیے مگر پھر بھی اگر آپ چاہیں تو سادہ کاغذ پر سائن کرالیں۔ لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسفندیار کی طرف دیکھا۔

"منگنی ونگنی پہ مجھے کوئی اعتبار نہیں۔ آپ بس شادی کی ڈیٹ دیں مجھے۔ میں اپنے پاپا کو حیران کردینا چاہتا ہوں۔" وہ تصور میں پاپا کا حیران چہرہ دیکھ کر بولا۔

"مطلب۔ تمہارے پاپا سے فنکشن میں ہی ملاقات ہوسکے گی۔" وہ کچھ سوچنے لگیں۔

"آپ چاہیں تو میں پہلے بھی ملوا سکتا ہوں لیڈی۔" وہ فوراً بولا۔

"نہیں، کوئی بات نہیں، مجھے تم اتنے پسند آئے ہو کہ اب دل میں کوئی شک وشبہ ہی باقی نہیں رہا۔" انہوں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"یہ تو میرے لیے بڑی عزت کی بات ہے لیڈی۔" وہ شریر ہوا۔

"ویسے آپ سے میری ایک درخواست ہے لیڈی۔ اگر آپ کو اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہ ہو تو ایسی صورت میں میری طرف سے بھی ساری تیاری آپ کو ہی کرنی پڑے گی۔ میرا مطلب ثمو کے کپڑے، زیور وغیرہ۔ کیونکہ بدقسمتی سے میری فیملی میں کوئی عورت نہیں ہے۔ پاپا تو شادی میں آجائیں بڑی بات ہوگی۔ اصل میں انہیں دیس دیس پھرنے کی عادت ہے میں تو انہیں انشاء جی کہتا ہوں۔" اس نے بائیں آنکھ دباتے ہوئے شرارت سے کہا تو وہ مسکرادیں۔

"میرے خیال میں تو مجھے اب اس رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن دیکھو جو اللہ کو منظور۔" انہوں نے بھی اس بار بائیں آنکھ دبائی تھی اور ڈاکٹر اسفندیار کا بلند قہقہہ ان کا دل دھڑکا گیا۔ کسی کی یاد نے پل بھر میں ان کے دل پہ حملہ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں پورے دو سال امریکہ میں رہا۔ مگر میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔ لیکن دیکھ بھی کیسے پاتا۔ وہ اگر وہاں تھی تو باہر تھوڑی گھومتی ہوگی۔ پتا نہیں کیسی ہوگی وہ؟" وہ سوچتے رہے۔

"میرے اس قدر ذلیل برتاؤ کے بعد بھلا کیسی ہوگی وہ۔ نہ زندوں میں، نہ مردوں میں، کہیں وہ۔" وہ مزید نہ سوچ پائے۔ انہوں نے اپنے بال دونوں ہاتھوں میں جکڑ لیے۔

"اف میرے خدا! یہ میں نے کیا کردیا۔ اپنی جنت اپنے ہی ہاتھوں برباد کردی۔ ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا کہ جس لڑکی کی عزت پہ میں انگلی اٹھانے لگا ہوں وہ میری ہے کون۔ میرے بغیر دو دن نہ رہ سکنے والی اتنی لمبی زندگی جیے گی میری بغیر تو کیسے جیے گی۔ وہ جسے میں نے ہی محبت سے روشناس کرایا۔ اس کا محبت سے اعتبار بھی میں نے ہی اٹھا دیا۔ وہ تو کبھی کسی کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتی تھی۔ اس کی حیا، انا اور وفا سب ہی کو کیسے پاش پاش کر بیٹھا میں۔ مجھے معاف کردو جنت۔ خدا کے لیے بس ایک بار میرے سامنے آجاؤ۔ صرف ایک بار۔" وہ جائے نماز پہ سر جھکا کے زاروقطار رو پڑے تھے۔ گزرے ہوئے کچھ سیاہ پل بے حد روشن ہوئے تھے۔

☆ ☆ ☆

زمان لالا کے کہنے پہ وہ کچھ ضروری کاغذات لینے گھر آیا تھا۔ مگر اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اندر کا منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ اماں مسلسل جنت کو پیٹے جارہی تھیں۔ جبکہ تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑکیوں کے پاس اس کے دو آدمیوں نے ایک خوبصورت نوجوان کو دھر رکھا تھا۔ وہ حلیے سے ہی کوئی شہری لگ رہا تھا۔

"آدم۔ آدم انہیں دیکھو۔ پتا نہیں انہیں کیا ہوگیا

ہے؟" جنت آدم پہ نظر پڑتے ہی فوراً" اس کی طرف دوڑی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ اس کے سینے سے جا لپٹتی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چند قدم دور رکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"ماں یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے اجنبی لہجے میں پوچھا تھا۔

جنت کو لگا کسی نے اس کے گلے پہ ناکارہ چھری پھیر دی تھی۔ ہاں بالکل ایسا ہی درد تو محسوس ہوتا ہے۔ جب اس شخص کی آنکھوں میں آپ کو اپنے لیے بے اعتباری کی جھلک نظر آجائے۔ جس کی محبت پر آپ کو بڑا زعم ہو۔ جس پہ آپ خود سے زیادہ اعتبار کرتے ہوں۔ بالکل ایسا ہی درد جنت نے محسوس کیا تھا اس وقت۔

"ماشاء اللہ ابھی بھی کچھ بتانے کو بچا ہے کیا۔" اماں پشتو میں چلائی تھیں۔

"کتنا سمجھایا تھا تمہیں آدم خان کہ یہ شہری پریاں گھر نہیں بسایا کرتیں۔ آزادی کی زندگی پسند کرتی ہیں یہ۔ تجر تجر گھومنے والی آوارہ چڑیاں ہوتی ہیں یہ۔ کبھی ایک شاخ تو کبھی دوسری۔ یہ تو شکر ہے کہ ان دونوں نے اسے کھڑکی سے اندر کودتے دیکھ لیا۔ ورنہ ہم تو اندھے تھے۔" اماں کے منہ سے غصے سے رال ٹپکنے لگی تھی۔

اور آدم کو یاد آیا کہ چند دن پہلے ہی تو جنت نے کتنی ضد کر کے کھڑکیوں پر لگی مضبوط گرل ہٹوادی تھی۔ بقول اس کے اس گرل کی وجہ سے اپنا کمرہ قید خانہ محسوس ہوتا تھا۔ آدم خان کی وہی ازلی غیرت جاگی تھی۔ جو پختونوں کی میراث تھی۔ اس نے نازک سی جنت کو کسی مومی مجسمے کی طرح اٹھا کے بیڈ پر پٹخ دیا تھا۔ تبھی زمان کمرے میں آئے تھے۔ ان کو دو پل لگے تھے سارا معاملہ سمجھنے میں۔

"تم دونوں یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ لے جاؤ اس کمینے کو اور زندان میں بند کرو۔ ساری عمر ترستا رہے گا اب تازہ ہوا کو۔" غصے سے پھنکارتے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے انہوں نے ایک زہر خند سی نگاہ جنت پر ڈالی۔ کارندے تیزی سے باہر نکلتے چلے گئے۔

جنت تو اماں کی مار سے ویسے ہی نڈھال تھی۔ آدم اور زمان کی بے اعتباری سے مزید حوصلہ بھی کھو بیٹھی۔ آنکھوں سے بہتا گرم پانی کا ریلا اس کے گال جلانے لگا۔ مگر دل کی جلن اس سے کہیں زیادہ تھی۔

"بے غیرت، کمینی۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" آدم کسی بھوکے شیر کی طرح اس کی طرف لپکا۔ اور بری طرح تھپڑ اور لاتیں برسانے لگا۔ زمان تیزی سے ان دونوں کے درمیان آگئے۔

"چھوڑو آدم رہنے دو۔" انہوں نے بے دم سی جنت کو اپنی پشت کے پیچھے چھپائے ہوئے کہا۔ جنت چاہ کر بھی خود کو ان سے الگ نہ کر سکی۔ وہ اپنی ساری ہمت کھو چکی تھی۔

"جانے دے کیسے جانے دے۔ ابھی تین لفظ بول کر باہر نکال اس غلاظت کی پوٹلی کو۔" اماں چلائی۔

آدم نے ایک تیخ نگاہ اس کے وجود پہ ڈالی۔ نفرت، غصہ اور بے اعتباری کیا کچھ نہیں تھا اس کی آنکھوں میں۔ جنت اندر سے کٹ کے رہ گئی۔ اماں نے تین کنکر اس کے ہاتھ رکھ دیے۔ آدم نے ایک پتھر جنت کی طرف اچھالا۔ "میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں جنت۔" اس نے دوسرا پتھر اچھالا تھا۔ جنت زمان کے پاؤں میں ڈھے گئی۔ آدم خان نے تیسرا پتھر اس کی گود میں پھینکا۔

"میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔" اور جنت پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ زمان اس سے چند قدم دور ہٹ گئے۔ آدم خان نے مضبوط ہاتھ میں اس کا کمزور سا بازو جکڑا اور اسے باہر گھسیٹنے لگا۔ جنت میں اچانک ہی جیسے توانائی بھری۔

"نہیں آدم نہیں مجھے اس وقت گھر سے نہ نکالو۔ رات کے اس پہر میں کہاں جاؤں گی۔" وہ ملتجی ہوئی۔

"یہ سب کرتے ہوئے تمہیں کچھ خیال کیوں نہ آیا ہاں۔ میں تمہیں اب ایک پل بھی یہاں رکھنے کا رسک نہیں لے سکتا ایک گندی مچھلی پورے تالاب کو گندا کر دیتی ہے۔" وہ اسے گھسیٹے گیا۔

"پلیز آدم رحم کرو۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔" وہ تڑپی۔

"تم پر رحم کروں؟" غصے سے کہتا وہ اسے مزید تیزی سے گھسیٹنے لگا۔

سیڑھیوں پہ تیزی سے لڑھکتے وجود پہ کتنی چوٹیں لگیں جنت کو کچھ احساس نہ تھا۔ اسے تو صرف روح کے زخم تڑپا رہے تھے۔ آدم خان نے حویلی کے قد آدم گیٹ کے سامنے لا کر اسے جھٹکے سے زمین پر گرا دیا۔

وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔

"چوکیدار اسے باہر پھینک دو۔" وہ چلایا۔ جنت بھاگ کے اس کے پیر پکڑ گئی۔

"نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ تم بے شک مجھے مار ڈالو۔ لیکن میں نہیں جاؤں گی یہاں سے۔" وہ چیخنے لگی۔ چوکیدار آدم کے دوبارہ پکارنے پر دوڑ کر وہاں آیا تھا۔

"آدم میں نہیں جاؤں گی۔ میرا اسفندریار یہاں ہے۔ میرا سب کچھ یہاں ہے۔ پلیز آدم رحم کرو۔" چوکیدار نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا تھا۔ تبھی اس کی چیخوں میں تیزی آگئی تھی۔

"لے جاؤ اس ذلیل کو اور باہر پھینک دو۔ اب اس کے غلیظ وجود پر ترس کھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ مڑ گیا۔

چوکیدار تیزی سے اسے گھسیٹنے لگا۔

"اسفندیار۔۔۔ اسفندیار۔" اس کی کرب ناک چیخیں آدم خوروں کے مسکن جیسی حویلی میں گونجتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"شیتل۔ ایک بہت بری خبر ہے یار۔" نور بوکھلائی ہوئی ان کے پاس آئی۔

وہ لان میں بیٹھی اپنے اسائنمنٹ بنانے میں لگی تھیں۔ اس کی آواز پہ چونک گئیں۔

"کیا ہوا خیریت تو ہے نا۔" زارا نے پوچھا۔

"سر آدم نے استعفیٰ دے دیا یار۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہو۔" وہ سبھی بوکھلا گئیں۔

"سچ میں۔" نور نے ان کے پاس ہی بیٹھتے ہوئے دوبارہ تصدیق کی۔

"اوہ! پھر تو ہم سب اتنے اچھے ٹیچر سے محروم ہو جائیں گے۔" فضا کو افسوس تھا۔

"ہماری تو ویسے بھی لاسٹ ٹرم ہے۔ مجھے تو جونیئرز پر ترس آ رہا ہے۔ اتنے محنتی ٹیچر سے محروم ہو گئے وہ سب۔" نور نے تاسف سے کہا۔

"السلام علیکم۔" سر آدم کی بھاری آواز پہ وہ سبھی چونک کے کھڑی ہو گئیں۔

"السلام علیکم سر۔"

"آپ کو پتا چل گیا ہو گا میرے جانے کا۔ سوچا جاتے ہوئے اپنی بیٹیوں سے بھی ملتا چلوں۔" ان کے لبوں پہ ہمیشہ والی مسکراہٹ سجی تھی۔ گھنی مونچھوں تلے اداسی بھری مسکراہٹ۔

"سر بیٹی بھی کہتے ہیں اور چھوڑ کر جانے کی بات بھی کرتے ہیں۔" فضا نے اداسی سے کہا۔

"آج نہیں تو کل ہمیں ایک دوسرے کو چھوڑنا ہی جانا تھا پھر بیٹیاں کب ہمیشہ باپ کے ساتھ رہتی ہیں۔ لیکن یہ وعدہ رہا کہ میں تم سب کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ اور ہاں میں تمہارا ایڈریس لینا چاہتا تھا سوچا تم سے پوچھ لوں۔ ہو سکتا ہے کبھی تم لوگوں سے ملنے کو دل کرے تو۔" انہوں نے شفقت سے کہا۔

"کیوں نہیں سر آپ ہمیشہ ہمارا مان تھے اور رہیں گے۔" نور نے فخریہ لہجے میں کہا تو باقی سب نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"او کے میں چلوں اور ہاں میرے لیے ایک دعا کرنا کہ جس مقصد کے لیے میں جا رہا ہوں اللہ مجھے اس میں کامیاب کرے۔"

"آمین سر ہم دل سے آپ کے لیے دعا گو ہیں۔" وہ سب یک زبان ہو کے بولیں۔

☼ ☼ ☼

کتنی ہی دیر جنت گیٹ بجاتی چیختی رہی۔ پھر نڈھال

سی وہیں بیٹھ گئی۔ گاؤں کی خاموش تاریک رات' اوپر سے کتوں کے مسلسل بھونکنے کی آوازوں نے اسے خوف زدہ کردیا۔ وہ خود میں سمٹ گئی۔ تبھی کسی گاڑی کی تیز ہیڈلائٹس اس کے چہرے پر پڑیں۔ اس نے چہرہ اٹھا کے دیکھنا چاہا مگر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ گاڑی وہیں رک چکی تھی۔ چادر میں لپٹا وجود دھیرے دھیرے چلتا اس کے پاس پہنچا۔ دو نرم ہاتھوں نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ اور اپنے ساتھ لاکر گاڑی میں بٹھادیا۔

"ڈرائیور واپس چلو حویلی۔" انہوں نے ڈرائیور کو حکم دیا اور جنت کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

"جنت میں ہوں چاچی سلمیٰ۔ میری طرف دیکھو بیٹا۔" جنت نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور پھر ان کے مہربان وجود سے لپٹ کے پھوٹ پھوٹ کے رودی۔

"ہمت کرو جنت دیکھو اللہ نے تمہاری مدد کے لیے مجھے بھیج دیا۔ اس کا مطلب ہے خدا تمہارے ساتھ ہے۔ جب خدا تمہارے ساتھ ہے تو تمہیں اور کسی کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔" انہوں نے شفقت سے جنت کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

"مجھے ابھی دو تین دن مزید رکنا تھا میکے۔ مگر نہ جانے کیوں آج شام سے ہی میرا دل بے حد پریشان ہورہا تھا۔ اب مجھے سمجھ آیا کہ خدا دراصل مجھے تمہاری مدد کے لیے بھیجنا چاہ رہا تھا۔" دور کہیں گاڑی کے ہارن سنائی دیے تھے۔

"گاڑی تیزی سے کسی مختصر راستے پر ڈالو جلدی یہاں سے نکلو۔" انہوں نے اچانک ہی خالص پشتو میں ڈرائیور کو حکم دیا۔ جس نے "فوراً" ہی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رفتار کافی بڑھادی تھی۔

"کیا ہوا تھا جنت؟" انہوں نے پھر سے ساری توجہ اس کے لرزتے وجود کی طرف مبذول کی اور جنت نے روتے روتے انہیں سب کچھ بتادیا۔

"ایسا میرے ساتھ ہی کیوں ہوا چاچی۔ میں نے تو کبھی کوئی شکوہ کیا نہ کوئی آرزو۔ ہر حال میں خوش رہی پھر کیوں۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے جنت' تم جانتی ہو کہ آدم کی اماں آدم کی سگی ماں نہیں۔" ان کے اس انکشاف پر جنت دنگ رہ گئی۔

"آدم کی سوتیلی ماں ہیں وہ جو بدقسمتی سے بانجھ ہیں۔ یہ آدم کے باپ کی سگی چچازاد تھیں۔ آدم کے ابو کو یہاں کی ایک غریب لڑکی پسند آئی۔

اس لڑکی کو دن دیہاڑے غائب کروادینا مشکل کام نہ تھا۔ مگر آدم کے والد اس سے بے حد محبت کرتے تھے تبھی پوری عزت سے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے وہ حویلی والوں کو اس شادی کے لیے رضامند نہ کرسکے۔ آٹھ سال تک کی بے اولادی کے بعد بالآخر تنگ آکر آدم کے دادا نے ان کو دوسری شادی کی اجازت دے دی۔ وہ لڑکی بھی تمہاری طرح معصوم اور نازک سی تھی۔ وہ آدم کے باپ کی دلہن بن کر آتو گئی مگر حویلی کے لوگوں کے دلوں میں کوئی جگہ نہ بنا سکی۔ حویلی والوں کو بس بچے سے غرض تھی۔ انہوں نے سوچ رکھا تھا کہ بچہ ہوتے ہی وہ اس سے کسی نہ کسی طرح چھٹکارا پا ہی لیں گے۔ لیکن قسمت دیکھو۔ شادی کے صرف گیارہ ماہ بعد ہی اللہ نے اسے آدم جیسا خوبصورت بیٹا عطا کیا۔ مگر وہ خود ہی حویلی والوں کا کام آسان کرگئی۔" جنت یک ٹک انہیں دیکھے گئی۔ سلمیٰ تھوڑا رکیں پھر بول پڑیں۔

"دوران زچگی ہی اس کی موت ہوگئی۔ شیر دل (آدم کے باپ) آدم میں اسے تلاشنے لگے۔ ان کی محبت کا محور اب آدم ٹھہرا۔ خدیجہ (اماں) پھر بھی ان کے دل میں جگہ نہ بنا سکیں۔ یہ چیز ان کی ضدی فطرت میں مزید حسد اور رقابت بھرتی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ تمہاری اور آدم کی محبت وہ برداشت نہ کرپائیں۔ مگر یہ بھی سچ ہے جنت کہ تمہاری بربادی میں صرف اماں ہی نہیں زمان کا بھی پورا ہاتھ ہے۔" وہ حیران رہ گئی۔

"کیا آپ...؟" وہ پوچھ نہ سکی۔

"ہاں میں سب کچھ جانتی ہوں جنت۔ جب سے تم نے مجھے وہ سب باتیں بتائیں میں نے کئی بار آدم سے بات کرنا چاہی' اسے سمجھانا چاہا۔ مگر اس کی آنکھوں پہ اماں اور زمان نے کچھ ایسی پٹیاں باندھ دی تھیں اپنی محبت کی کہ اسے دھوکہ کھانے میں ذرا دیر نہ لگی۔" وہ تاسف سے بولیں۔

"پھر تم تو جانتی ہو حویلی میں ایک عورت کی کیا حیثیت ہے۔ ہم ایسے بے زبان جانور کی طرح ہیں۔ جو صرف دیکھ سکتا ہے نہ تو اسے بولنے کی اجازت ہے نہ ہی احتجاج کرنے کی۔" وہ رکیں۔ گاڑی اب حویلی سے بس کچھ ہی دور تھی۔

"خیر تم یہ بتاؤ تمہارا کوئی جاننے والا ہے۔ جس سے رابطہ کیا جاسکے کیونکہ میں صرف تمہیں آج کی رات حویلی میں رکھ سکتی ہوں۔ کل شام سے پہلے پہلے تمہیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔"

جنت نے ان کی بات پہ سہمی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں معذرت خواہ ہوں جنت۔ مگر جہاں میں تمہیں لے جارہی ہوں وہ بھی ایک حویلی ہے۔ آدم خوروں کی حویلی۔ جہاں مجبور اور بے بسوں کی بے کسی کا ماس کھایا جاتا ہے۔ پھر میرے لالا تو ہیں بھی شرابی اور حسن پرست' سو میں تمہیں زیادہ دیر حویلی میں رکھ کر تمہیں مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتی۔" انہوں نے بالکل صاف گوئی سے کام لیا تھا۔ جنت کی روح تک کانپ گئی۔

"ڈرو مت جنت لالا کل رات تک شہر سے واپس آئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کل شام تک میں تمہیں کسی محفوظ مقام تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ تم بس جلدی سے کسی کا پتا مجھے سمجھادو۔" جنت کو صرف توقیر کا پتا یاد تھا اس نے "فوراً" ہی انہیں اس کا ایڈریس سمجھادیا تھا۔

"کیا آپ مجھے ابھی وہاں بھجواسکتی ہیں۔ میں ساری عمر آپ کا یہ احسان یاد رکھوں گی۔" وہ ایک حویلی سے رسوا ہونے کے بعد دوسری حویلی میں جانے کا رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ تب ہی کچھ دیر بعد بولی تھی۔

"تم... چلو میں کچھ کرتی ہوں۔" انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

حویلی میں اترتے ہی انہوں نے ایک نوکرانی اس کے ساتھ کی اور ڈرائیور کو ایڈریس بتاتے ہوئے سختی سے اسے صحیح سلامت مطلوبہ جگہ پہنچانے کی ہدایت کی۔ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کرنے کے بعد وہ ٹھنڈی سانس بھرتی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

توقیر نے اسے بھائیوں کی طرح سنبھال لیا۔ اس نے آفتاب کو بھی ساری تفصیلات سے آگاہ کردیا۔ اسے پاکستان آنے سے منع کرکے وہ خود ہی اسے امریکہ بھجوانے کے انتظامات کرنے لگا اور وہ دن آن پہنچا۔ آدم کی محبت کی قبر کو پیچھے چھوڑتی وہ ایک بار پھر سے بھائی کی محبت کے سائے تلے آپہنچی۔ بھائی' بھابھی نے اس کے آنسو چن لیے تھے اور پیاری سی گول مٹول ثمو میں وہ اپنے اسفندیار کو ڈھونڈنے لگی۔ زندگی پھر سے رواں ہوئی اور زخم بھرنے لگے۔ تب ہی وقت نے ایک اور گھاؤ لگایا اور ماں' باپ کی شفقت سے بھرپور اس کے بھائی' بھابھی ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

یہ صدمہ جنت کے لیے قیامت سے کم نہ تھا۔ مگر انہوں نے ثمو کے لیے خود کو سنبھال لیا۔ ثمو اور کافی شاپ کی ذمہ داریوں میں وہ یوں الجھیں کہ پھر پرانی یادوں کے لیے وقت نکالنا محال ہی ہوگیا۔ ان کی زندگی کی جھیل ایک مرتبہ پھر ساکت سی اپنی مدت پوری کرنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

آدم خان کی جنت اجڑے چھ ماہ ہوچکے تھے۔ اس کی دوسری شادی کی تیاریوں سے حویلی میں پھر سے رونقیں آباد تھیں۔ ایک غیرت مند انسان اپنی محبت کے جنازے پہ دو دن ماتم کرنے کے بعد اسے ہمیشہ کے لیے دفن کرچکا تھا۔

مگر زمان نے ان چھ ماہ میں —— کہاں کہاں جنت کو نہیں ڈھونڈا' مگر جنت کا کچھ پتا نہ چلا۔ آدم کی دوسری

شادی بھی زمان کی محنتوں کا ہی نتیجہ تھا۔ آدم کی جاب ہو گئی تھی۔ تب ہی زمین کی ساری ذمہ داری بھی زمان کے کاندھوں پہ آپڑی تھی۔ مگر وہ اپنا دھیان جنت سے ہٹا ہی نہیں پائے۔ انہیں خود پہ بے حد غصہ آرہا تھا۔ اتنی زبردست پلاننگ کرتے وقت انہوں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ حویلی سے نکلنے کے بعد جنت باہر نکلے گی تو اسے کسی محفوظ مقام پر بھی منتقل کرنا ہوگا۔ اس بارے میں وہ کوئی پلان نہ بنا پائے۔ وہ پچھتا رہے تھے یہ جانے بغیر کہ ان کی پلاننگ بھلا سب سے بڑے پلانر کے آگے کیسے ٹھہر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

آدم آج پورے پانچ ماہ بعد حویلی لوٹا تھا۔ صرف چند دن بعد اس کی شادی تھی۔ وہ اس شادی پہ دل سے راضی تھا اور مطمئن بھی کہ اس بار اس کی شادی کسی ایسی ویسی لڑکی سے نہیں، بلکہ اس کے اپنے اعلا خاندان کی لڑکی سے ہو رہی تھی۔ دل میں عجیب سا درد کئی بار سر اٹھاتا تھا مگر آدم علی خان نے اب دل کی سننا چھوڑ دی تھی۔

پشاور سے وہ اپنی گاڑی میں ہی حویلی جا رہا تھا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی اس نے گاڑی کی رفتار خاصی کم کر دی۔ اچانک ہی کھیتوں سے ایک چادر میں لپٹا وجود اس کی گاڑی کے سامنے آکے ٹھہر گیا۔ اس نے فوراً" بریک لگا دیے۔ ان کا اپنا علاقہ تھا۔ تب ہی وہ بے خوف و خطر باہر نکل آیا۔ اس آدمی نے آدم خان کو باہر نکلتا دیکھ کر چادر اتار دی تھی اور اسے دیکھتے ہی آدم خان غصے سے مٹھیاں بھینچ گیا۔

اس شخص کو بھلے ہی اس نے زندگی میں صرف ایک بار دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی اس شکل کو وہ ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

"تم۔۔۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے سامنے آنے کی۔" آدم خان غرایا۔

"صرف ایک بات کہنی تھی تم سے خان۔۔۔ سن لو چلا جاؤں گا۔" وہ آرام سے بولا۔

"میرے لیے یہی بات کافی ہے کہ تم ابھی تک زندہ ہو۔" آدم نے پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔ جو ہمیشہ اس کے پاس رہتا تھا سفر کے دوران۔

"یہ نہیں پوچھو گے کہ میں زندہ کیسے ہوں۔" اس نے بات بڑھائی۔

"نہیں۔۔۔ کیونکہ اب زندہ نہیں رہو گے۔" اس نے پستول کا رخ اس کی طرف کیا۔

"شوق سے گولی مار دو خان۔۔۔ مجھے ویسے بھی اب جینے کی کوئی آرزو نہیں رہی۔ مگر مجھے مارنے سے پہلے سچ تو سن لو۔ شاید تمہارے کام آسکے۔" اس کے بے خوف لہجے پہ آدم خان چونک گیا۔

"کیسا سچ۔" اس نے پستول کا رخ نیچے کی طرف کیا۔

"تمہارے لالا کا سچ۔۔۔ بی بی کا سچ۔" اس کی آنکھوں میں شرمندگی جاگی۔

"مطلب کیا ہے تمہارا۔"

"وہی بتا رہا ہوں خان۔"

"لیکن ایک بات یاد رہے۔ اگر تمہاری باتوں میں سے ایک فیصد بھی جھوٹ ہوا تو تمہارا مقدر صرف موت ہوگی۔" آدم خان نے اسے دھمکی دی، وہ مسکرایا۔

"تم شاید بھول رہے ہو خان کہ زندگی لینے اور دینے پہ قادر صرف ایک ذات ہے میرے پروردگار کی۔ میں بھی یہی بات تو بھول گیا تھا۔" اس کی آواز میں درد جاگا۔

"میں ایک بہت ہی غریب آدمی ہوں خان۔ بینک میں کیشیئر کی جاب ہے میری۔ میرے چھوٹے بیٹے کے گردے خراب تھے۔ اس کی تکلیف مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی لیکن علاج بھی میرے بس سے باہر تھا۔

اس دن میں اپنے بینک کے مینیجر سے کچھ رقم ادھار مانگنے ان کے کیبن گیا۔ جہاں زمان خان بھی پہلے سے موجود تھے۔ ہمارے سر بہت اچھے آدمی ہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ نقد رقم دی اور بینک سے قرضہ

دلوانے کا بھی وعدہ کیا۔ میں وہاں سے خوش خوش واپس اپنی سیٹ پہ آبیٹھا۔

چھٹی کے وقت باہر نکلتے ہی زمان کا ایک آدمی مجھے ان کی گاڑی میں لے آیا۔ جہاں زمان خان میرے منتظر تھے۔ وہاں زمان نے مجھے ایک ایسی پیش کش کی کہ میں دنگ رہ گیا۔" وہ چند لمحے کے لیے خاموش ہوا اور آدم کے لیے یہ چند لمحے گزارنا مشکل ہو گئے۔

"زمان نے مجھے دو لاکھ روپے نقد اور میرے بیٹے کے مکمل علاج کا وعدہ کیا اور پتا ہے اس کے بدلے میں مجھے ایک چھوٹا سا کام دیا گیا۔" "چھوٹا سا کام؟" آدم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھے گیا۔

"زمان نے مجھے بتایا کہ اس کی سابقہ معشوقہ نے اس کے چھوٹے بھائی کو اپنے جال میں پھنسا کر اس سے شادی کر لی ہے اور اب مسلسل انہیں بلیک میل کر رہی ہے۔ میں صرف ایسا کچھ کروں کہ وہ اس کے بھائی کی نظروں سے گر جائے۔" آدم کو لگا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین سرکنے لگی تھی۔

"اپنے بیٹے کی تکلیف کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے فوراً" ہامی بھر لی۔ ویسے بھی یہ ایک نیک کام تھا۔ کسی نیک آدمی کو ایک بری فطرت کی لڑکی سے نجات دلانا۔ لیکن میں غلط تھا خان۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس لڑکی کو دیکھنے کے بعد ہوا۔ اس لڑکی کو دیکھتے ہی مجھے کچھ برا ہونے کا احساس ہوا۔

وہ کہتے ہیں نا کہ دل خدا کا گھر ہے۔ اسی دل نے مجھ سے چیخ چیخ کر کہا کہ تمہیں سچ بتا دوں۔ اپنے وعدے سے مکر جاؤں۔ شاید خدا مجھے اس گناہ سے بچانے کے لیے راستہ دے رہا تھا مگر میں نے دل کی نہ سنی۔ نیکی میرے دل میں چیختی رہ گئی اور برائی غالب آگئی اور میں خدا کو بھول کر اس بلکتی لڑکی کا خطاوار بن گیا۔

زمان لالا نے مجھے ساری رقم اسی دن ادا کر کے بحفاظت شہر پہنچا دیا تھا۔ اس سے اگلے ہی روز میرے بیٹے کو اسلام آباد کے ایک بہترین اسپتال میں داخل ہونا تھا خان مگر پتا ہے خان کیا ہوا؟" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آدم خان گاڑی کا سہارا لیتے بے یقین نظروں سے اسے دیکھے گیا۔

"میری پکڑ ہو گئی خان بہت جلدی۔ قدرت نے مجھے موقع دیا تھا سنبھلنے کا۔ مگر میں نے ضائع کر دیا۔ سو قدرت نے مجھے پکڑ لیا۔ اس سے ٹھیک تیسرے دن میرا دوسرا بیٹا صحت مند بیٹا رات کو ایسا سویا کہ صبح اٹھ ہی نہ پایا اور گردوں کی تکلیف میں مبتلا بیٹا میرے سامنے تڑپتا مجھے خون کے آنسو رلاتا رہا۔ زمان کے آدمی میرے پاس آئے، میرے بیٹے کا علاج کرنے کے لیے، مگر میں نے توبہ کرتے ہوئے ان سے معذرت کر لی۔

زمان مجھے دھمکیاں دینے لگے۔ میں نے انہیں اطمینان دلا دیا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ اپنے بیمار بیٹے کی موت کے بعد سے میں ہر جگہ تمہیں ڈھونڈتا رہا۔ تاکہ سچی گواہی دے سکوں اس پاک دامن عورت کی۔ شاید کہ اس سے میرا گناہ کم ہو سکے۔ میری خواہش پوری ہو گئی آدم خان۔ تم اگر اب چاہو تو مجھے اس بوجھ جیسی زندگی سے چھٹکارا دے دو۔ میں تمہارا مشکور رہوں گا۔" اس شخص نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں اور آدم کی طرف بڑھا۔ معاً" آدم کی نظر کچھ دور کھیتوں کے پاس کھڑے اپنے آدمیوں پہ پڑی۔ جو بندوق سے اس شخص کا نشانہ لے رہے تھے۔

"نے۔۔۔" آدم خان ہاتھ اٹھا کر چلایا تھا۔ مگر اسی وقت ایک آدمی نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ آدم کے سامنے کھڑا شخص اچھل کے زمین بوس ہو گیا۔ آدم جھک کر فوراً" اسے بری طرح جھنجھوڑنے لگا۔ مگر وہ ساکت ہو چکا تھا۔

"کیوں مارا اسے؟" آدمی نزدیک چلے آئے تھے۔ آدم چلانے لگا۔

"خان جی۔۔۔ ہمیں لگا یہ آپ کو نقصان پہنچانے لگا ہے۔" ان کے لہجے میں شرمندگی تھی اور آدم کی سمجھ میں نہ آیا کہ پہرے دار کی غلطی پہ اسے مار ڈالے یا اس مجبور آدمی کی خواہش اتنی جلد پوری ہونے پہ خوشی منائے۔

☆ ☆ ☆

پھر اس دن کے بعد آدم علی خان حویلی واپس نہیں گیا۔ اسفندیار کو بلوانے کے بعد وہ واپس پشاور چلا آیا تھا۔ اس نے اپنی جائیداد الگ کرنے کے بعد اس حویلی اور اس کے مکینوں سے مکمل طور پہ رشتہ توڑ لیا۔ اسفندیار کو سنبھالنے میں اسے وقت تو ہوئی، مگر جلد ہی وہ اس سب کا عادی ہو گیا۔

اب وہ کسی ایک جگہ نہ ٹک سکا۔ دیس دیس پھرتا اپنی جنت کو ڈھونڈنے لگا۔ ہر چہرے میں ایک ہی چہرہ تلاشتا اور خدا سے معافی کے ساتھ اپنی جنت سے ملنے کی دعا کرتا۔ لیکن بیس بائیس برس کے طویل سفر کے بعد اب جب وہ بالکل مایوس ہو گیا تھا۔ تو وہ کتنی اچانک اس کے سامنے چلی آئی تھی۔ صرف چالیس، پینتالیس سال کی عمر میں وہ بے حد نحیف اور کمزور سی جنت پچاس سے اوپر کی نظر آئی۔ وہ اس کی جنت تو نہ تھی۔ وہ تو برباد، بے حال جنت تھی۔ جو اس حال کو اس کی وجہ سے ہی پہنچی تھی۔

اسفندیار نے جب انہیں اپنی شادی کا سرپرائز دیا تھا تو وہ حقیقی معنوں میں اتنے سالوں بعد پہلی مرتبہ دل سے کوئی خوشی محسوس کر سکے تھے۔ انہیں اندازہ بھی نہیں تھا کہ اسفندیار کے سرپرائز میں ہی قدرت نے ان کے لیے کتنے بڑے سرپرائز کا انتظام کر رکھا تھا۔ نکاح ہو چکا تھا۔ تب ہی وہ اچانک ان کے سامنے آگئی تھیں۔ ان کا دل چاہا کہ وہ ان کو پکاریں۔ مگر جنت نے ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ وہ تو سیدھی اسفندیار کے قریب چلی آئیں۔ آدم کو پہچان لینے کے بعد انہیں دل کی گواہی پہ مکمل یقین ہو چلا تھا کہ اسفندیار ہی ان کا بیٹا ہے۔

"اگر آپ ینگ ہوتیں تو بالکل میری ماں کی تصویر ہوتیں۔"

ان کا دل واقعی جھوٹا نہ تھا۔ وہ ان کا اپنا اسفندیار تھا۔ بائیں بازو میں پھیلتا درد نڈھال کرنے لگا۔ وہ تیزی سے اسفندیار کی طرف بڑھیں۔

انہیں کتنی حسرت تھی کہ وہ اسفندیار کو دولہا بنے دیکھتیں۔ اللہ نے انہیں مایوس نہیں کیا تھا۔ ابھی چند لمحے پہلے ان کا اپنا بیٹا ان کی عزیز از جان بھتیجی کے ساتھ شادی جیسے مقدس بندھن میں بندھا تھا۔

"اسفندیار۔۔۔" وہ بالکل اس کے پیروں میں آکے بیٹھ گئیں۔ اسفندیار ان کی اس بے خود حالت پہ گڑبڑا گیا۔

"میرے بچے، میرے لال، میں ہی تمہاری بدنصیب ماں ہوں بیٹا۔" انہوں نے بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی گود میں سر رکھ دیا۔ اسفندیار نے حیرت سے نظریں اٹھا کے باپ کی طرف دیکھا جو صرف اثبات میں سر ہلا کے رہ گئے۔

"بیوٹی فل لیڈی۔" جنت نے بند ہوتی آنکھوں سے اسفندیار کو مسکراتے ہوئے کہتے دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پھوپھو۔۔۔" نہ جانے کتنی دیر بعد انہیں ہوش آیا تھا۔ مختلف قسم کی مشینوں میں جکڑے وجود کے ساتھ انہوں نے ایک بے بس سی نگاہ ساتھ کھڑے ثمو اور اسفندیار پہ ڈالی تھی۔ ثمو کا لال چہرہ اور متورم آنکھیں اس کی مسلسل بے آرامی کی چغلی کھا رہی تھیں۔ اسفندیار بھی کافی مضمحل لگ رہا تھا۔ نکاح کے وقت والی ساری خوشی اور تازگی اس کے چہرے سے غائب تھی۔

"اسفندیار۔۔۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے بیٹا، مجھے تم سے کچھ چاہیے۔"

"پلیز پھوپھو، ایسے تو نہ کہیں۔" ثمو مزید بلکنے لگی۔ اسفندیار نے اسے خود سے لگاتے ہوئے تسلی دی اور ماں کے قریب ہو گیا۔

"بولیں امی۔۔۔ آپ کا ہر حکم سر آنکھوں پر۔" اس نے عقیدت سے ماں کا چہرہ اپنی آنکھوں میں سموتے ہوئے کہا۔

"میری ثمو میری امانت ہے تمہارے پاس۔ اس کا خیال رکھنا اسفندیار۔ اس کے ساتھ مل کر وہ جنت بنانا جس کی مجھے خواہش تھی مگر میں ہمیشہ اس جنت کے لیے ترستی رہی۔" وہ ٹوٹے پھوٹے لہجے میں بولیں۔ اسفندیار کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ آج صبح ہی تو آدم نے اپنے بیٹے کے سامنے اعتراف جرم کیا تھا۔ سب کچھ آشکار کر دیا تھا اسفندیار پہ۔ وہ اپنی ماں کے کرب کو سمجھ سکتا تھا۔ تب ہی آدم علی خان اندر آئے تھے۔

"اور ہاں اپنے پاپا کو کہنا میں نے انہیں معاف کر دیا۔ مگر میرا ظرف اتنا بڑا نہیں کہ ان کی آنکھوں میں اپنی دفنائی ہوئی محبت کی مسمار ہوئی قبر دیکھ سکوں۔ انہیں کہنا اسفندیار انہوں نے بہت دیر کر دی، بہت دیر۔" دروازے کے قریب کھڑے آدم خان کی آنکھیں جلنے لگیں۔

"اسفندیار۔۔۔ میرے قریب آؤ بیٹا۔ میں تمہیں محسوس کرنا چاہتی ہوں۔" اسفندیار نے ان کے بالکل پاس آکر ان کا کمزور سا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ ثمو کے رونے میں تیزی آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جنت چلی گئی۔ آدم کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے کے بعد آدم سے بہت دور۔ اسفندیار اور ثمو کی ہمراہی میں آدم خان گنڈہ پور ایک بے حد مطمئن زندگی گزار رہا ہے۔ کبھی کبھی پرانی محبت کی کسک دل میں جاگتی ہے۔ مگر ثمو اور اسفندیار کی محبتیں اسے دھندلا دیتی ہیں۔ آدم تو گھاٹے میں نہ رہا مگر جنت، ساری عمر ایک ناکردہ گناہ کی سزا چپ چاپ سہتی رہی اور اپنے بیٹے سے دوری بھی۔ کیونکہ وہ ایسا کرنے پہ مجبور تھی۔ نہ صرف اس نے اپنے نصیب کے آگے سر جھکا دیا، بلکہ ہمیشہ کی طرح خلوص و وفا کی روایت نبھاتے ہوئے آدم کے لیے پھر بھی آسانی کر گئی۔ اس نے نہ تو گلہ کیا، نہ شکایت، بلکہ اپنی پرانی محبت کے بدلے میں بنا مانگے ہی اسے معافی بخش گئی۔ اس کی سزا کم کر گئی اور خود امر ہو گئی۔

سر توقیر نے آدم علی خان گنڈہ پور کی زندگی ان سب کی خواہش پہ ان کے سامنے بیان کر دی تھی اور تب سے وہ بار بار اس کہانی کا تجزیہ کرنے میں لگی رہتیں۔

"آج ہمارا آخری دن ہے اس جامعہ میں۔" نور نے اداسی سے کہا۔

"ہم ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔" فضا تڑپی۔

"پتا نہیں اب ہماری اگلی زندگی کیسی ہو۔" شیتل کی آنکھوں میں نمی اتری۔

"بہت اچھی ہو گی یار، آخر ہم آدم کی بیٹیاں ہیں۔" بے فکری زارا نے مکھی اڑائی۔

"اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ میری جان کہ ہم آدم کی بیٹیاں ہیں اور دنیا ہے آدم کے بیٹوں کی۔" نور ان سب میں بہت حساس تھی۔

"ابن آدم کے آگے بھلا ہم عورتوں کی کب چل سکی ہے۔ لڑکوں کو ہر شعبے میں پیچھے چھوڑ دینے کے باوجود عزت نفس کو ترستی، احساس کمتری کی ماری ہوئی ہم آدم کی بیٹیاں۔ جنہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ابن آدم اپنے فائدے کے لیے ونی، کاری اور بدلے جیسی رسومات کے بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ ہم۔۔۔ آدم کی بیٹیاں۔" نور العارفین نے تلخی سے حقیقت بیان کی۔

"جو بھی ہو۔۔۔ ہمیں حالات سے لڑنا ہے۔ عورت کو اس کے حق سے آگاہ کرنا ہے۔ ہم میں شعور ہے، حوصلہ ہے اور منزل تک جانے کے لیے ان دو چیزوں کا ہونا کافی۔" ان سب نے ابن آدم کی اس دنیا میں خود کو ثابت کرنے کا عہد کیا تھا اور اپنے اپنے راستوں پہ چل نکلی تھیں۔

ویسے آپ کو کیا لگتا ہے۔ کیا واقعی مردوں کی اس دنیا میں اپنا آپ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گی یہ آدم کی بیٹیاں۔۔۔؟

آپ کے جواب کی منتظر۔

آدم کی بیٹی۔

☼ ☼

آگئے

فرحین اظفر

مکمل ناول

مغرب کے جھٹپٹے پر پُراسراریت کے پنجے گڑے تھے اور اداسی بال بکھرائے اونگھ رہی تھی۔ سرمئی آسمان کے نیچے سر جھکائے کھڑی ٹنڈ منڈ درختوں کی برہنہ شاخیں اسی کی طرح اپنی بربادی پر ماتم کناں تھیں۔ دھیمی سرگوشی کرتی ہوا نوحہ لکھ رہی تھی۔ اس کی تنہائی کا' رسوائی کا' بربادی کا۔

آس پاس پھیلی قبروں کے کتبوں پر لمبے سائے ہولناکی بڑھا رہے تھے۔

بے جان ٹانگیں آگے کی سمت پھیلا کر اس نے نیم مردہ نظروں سے ایک نظر اس ماحول پر ڈالی۔ "میں نے خود ہی اپنے لیے یہ جگہ منتخب کی ہے۔ جہاں جلد یا بدیر مجھے پہنچنا ہی تھا۔" کمر میں اٹھتی درد کی ناقابل برداشت ٹیس کو دانت بھینچ کر روکتے ہوئے اس نے آخری بات سوچی۔

اس کی مٹھیاں کس چکی تھیں اور درد برداشت سے باہر ہوا جا رہا تھا۔

مختل حواس مجتمع کرنے کی آخری کوشش میں ناکام ہو کر اس نے قریبی قبر کے کنارے پڑے بڑے سے پتھر پر سر گرا دیا۔ درد کا احساس وہاں بھی ہوا تھا۔ لیکن وجود سے اٹھتی ان نوکیلی لہروں سے کہیں مدھم۔

چند ہی لمحوں میں اس کا سر لڑھک چکا تھا۔ آسمان کے کنارے سرخ تھے۔ فضاؤں میں گھر لوٹتے پرندوں کا شور تھا اور زردی مائل خوف۔

خاموشی دبے پاؤں قبروں کے درمیان ٹہل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج انہیں پھر بری طرح دورہ پڑا تھا۔

پیٹ کی رگیں کھنچ کر حلق میں چلی آئی تھیں۔ پوری طاقت لگا کر بھی اپنے نیم مردہ وجود میں سانس بھرنے سے قاصر ان کے پھیپھڑے بے بس تھے۔ انہوں نے پھر زور لگایا۔ ان کی پسلیاں ذرا کی ذرا پھولیں' اگلے ہی لمحے پھر نمایاں ہو گئیں۔ پچکے ہوئے پیٹ کی ڈھیلی لٹکی ہوئی کھال کمر سے جا لگی تھی۔

آنکھیں دبی رہی تھیں۔ ہونٹ تھرا رہے تھے۔

"امی۔ امی یہ لیں۔" کسی نے بے قراری سے ان ہیلر ان کے منہ سے لگا کر بٹن دبایا۔ پف سے پھوار نکلی اور اس پھوار نے ان کے تن مردہ میں زندگی پھونک دی۔ ہچکولے کھاتا وجود تھمنے لگا اور پھولتے پچکتے پیٹ کے جھٹکے دھیمے پڑنے لگے۔ پھڑپھڑاتے نتھنوں کو قرار سا آگیا۔

سامنے کھڑا وجود شناسا سا تھا۔ یہ کمرہ' یہ بوسیدہ بستر سب جانا پہچانا۔ پھر بھی انجان سا لگ رہا تھا۔

"امی۔ اب کیسی ہے طبیعت۔" زرد' خوفزدہ نظریں ان پر جمی تھیں۔

"اور۔ اور ان آنکھوں کا آخری واحد سہارا امی ہی تو ہوں۔ اور میرا سہارا ہے۔" انہوں نے نڈھال سا ہو کر آنکھیں بند کر کے ذرا کی ذرا سر ہلایا۔ سامنے کھڑا وجود مطمئن ہو کر کمرے سے باہر جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
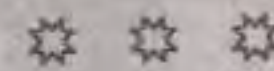
یہ ایک گرلز کالج کے گراؤنڈ کا منظر ہے۔ بے فکری' خوش باش لڑکیوں اور ان کی شوخ چہکاروں سے پورے گراؤنڈ میں شور مچا ہوا ہے۔ مشرقی کونے میں لگے بڑے سارے پیپل کے درخت تلے لگی ہوئی پتھر کی بینچ پر دو لڑکیاں سموسوں اور چٹنی سے شغل کرنے میں مصروف ہیں۔

"ہائے ہے۔ سچ یہ دیکھو ذرا۔" ایک لڑکی نے انگلی سے سموسوں کی چٹنی کا آخری چٹخارا لے کر اخبار کا وہ ٹکڑا ذرا سا پھیلا کر پوری طرح غور سے دیکھا۔ ابھی اسی ٹکڑے پر رکھے سموسے اس نے ختم کیے تھے۔ چٹنی کو انگلی پھیر پھیر کر صاف کیا تھا۔

"کیا ہے؟" دوسری لڑکی نے ایک اچٹتی نظر اخبار کے تراشے پر ڈالی۔
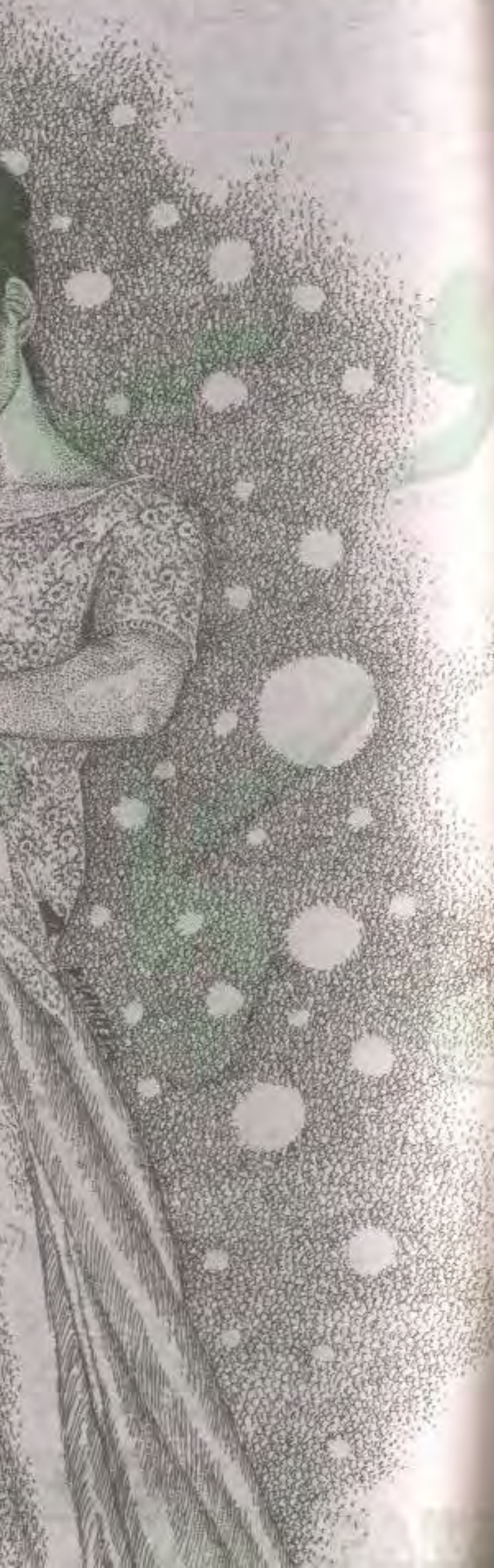
"کسی لڑکی کی سوسائیڈ نیوز ہے۔ کیا شکل ہو گئی بے چاری کی۔" پہلی لڑکی کو اس سے زیادہ ہی ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ غور سے نیچے لکھی چند سطروں پر مشتمل خبر پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کال گرل تھی۔" آخر میں اس کے چہرے پر نمایاں ہمدردانہ تاثرات کراہیت میں بدل گئے۔

"جبھی تو۔" دوسری لڑکی نے فوراً" سرہلایا۔

"اپنے منہ پر تیزاب ڈال لیا' اس سے پہلے اپنی کلائیاں کاٹ لیں۔"

"توبہ ہے۔" دوسری نے تصویر دیکھ کر بے اختیار جھرجھری لی۔ اخبار کا تراشہ چٹنی کی نمی سے ٹرانس پیرنٹ سا ہو رہا تھا اور خستہ حالی سے تقریباً" پھٹنے والا تھا۔

"ایسی لڑکیوں کا یہ ہی انجام ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی گولی سے مرتی ہیں' کبھی خودکشی سے اور کبھی ایڈز کا شکار ہو کر۔"

پہلی لڑکی نے بلاتکلف اپنی رائے دی۔ پھر اخبار کا تراشہ توڑ موڑ کر دور پڑے ڈسٹ بن کا نشانہ لے کر اچھال دیا۔

☼ ☼ ☼

ڈرائنگ روم سے باتوں اور ہنسی کی تیز ملی جلی آوازیں آرہی تھیں۔ قدرے بلند آواز میں میوزک بج رہا تھا۔ ملی جلی خوشبوئیں' سگریٹ' پرفیوم اور قیمتی کپڑوں کی سرسراہٹ۔

سلطان احمد کی جدید طرز کی بنی اس رہائشی کوٹھی میں گھر کے افراد کم تھے بلکہ بہت ہی کم۔ ہاں البتہ نوکروں کی تعداد قابل ذکر تھی یا پھر کمروں کی۔

ان ہی کمروں میں سے ایک میں وہ تھی۔ جس کے بے چین قدم مشرق و مغرب کی دیواروں کے درمیان فاصلہ ناپتے تھک چکے تھے۔

دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس نے دو' تین جھٹکے دیے۔

"اف! میرے خدا' کس گناہوں کی سزا ہے یہ۔" اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"یقیناً" ایک معصوم دل توڑنے کی' کسی کی حق تلفی کی سزا ہے یہ۔"

اس کے اندر سے آواز ابھری۔ وہ دھیان لگا کر سننے لگی۔

ایک لمحے کے لیے یہ پیراستہ کمرا اور آرام دہ جہازی سائز بستر سب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ لیکن وہ منظر میں پوری طرح ڈوبنے نہیں پائی تھی کہ دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے دیکھتی کھڑی ہو گئی۔

"تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔" دروازے میں کھڑا وجود غصیلی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"بس جا رہی ہوں تیار ہونے۔" زبانی احتجاج اپنی موت آپ مر گیا۔ تھوک نگلتے ہوئے اس کی زبان سے فقط یہی الفاظ نکل سکے۔

☼ ☼ ☼

سنولائے ہوئے ہاتھ پیر اور جھکی لرزتی پلکوں والی وہ کمزور سی لڑکی آفس کے ایک کونے میں زمین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنے موڑ کر ان پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ اور ایک بڑی سی اوڑھنی سے اپنا وجود ڈھانپا ہوا تھا۔

"کون ہے یہ" اس نے اس پر سے نظریں ہٹا کر فضل داد سے پوچھا۔ جو اسے لے کے آیا تھا۔

"سائیں غریب لڑکی ہے۔ کام مانگنے آئی تھی میں یہاں لے آیا۔"

"کیا کام۔"

"کوئی بھی کام سائیں۔ مانی جے لائے" اس کا سندھی لہجہ ہمدردانہ تھا۔ اس نے ہنکارا بھر کے پھر اسے دیکھا۔

این جی او آفس کی طرف ایسے لوگوں کی آمد کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ خاص طور پر سیلاب سے ہونے والی تباہ کاریوں کے بعد۔

"چھانالو آھی بابا۔" (کیا نام ہے تمہارا)۔ اب کے اس نے براہ راست دیکھا۔ جواب ندارد تھا۔

"شمائل نام ہے جی۔"

"گھر وارا کتھے آہیں" (گھر والے کہاں ہیں)

"گھر وار کوئی نہ ہو۔ حک بابا ھو۔ جیکو بوڑ کا نبوئے مری ویو ڈھنگی کارن" (گھر والے کوئی نہیں ہیں۔ ایک باپ تھا جو سیلاب میں مر گیا۔ ڈھنگی کے باعث) اس کی طرف سے جواب کی تمام تر ذمہ داری فضل داد نے نبھائی۔

"سلائی' کڑھائی وغیرہ آتی ہے۔ پوچھو اس سے۔"

فضل داد نے اس لڑکی کی طرف رخ پھیر کر اس سے پوچھا۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ وہ صرف خوف کی وجہ سے اس سے بات کرنے سے گھبرا رہی تھی۔ اسے کڑھائی کا کام آتا تھا بلکہ وہ بتا رہی تھی اسے سب کام آتا ہے یونہی اس کی بات سننے' اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے اسے رباب آنٹی کی بات یاد آگئی۔ انہوں نے اس سے کسی کام والی کے بارے میں کہا تھا۔ انہیں ایک فل ٹائم میڈ کی ضرورت تھی۔

"شہر ویندو کم جے لائے۔" (شہر جاؤ گی کام کے لیے؟) اس نے بے اختیار پوچھ لیا۔ جواب میں وہ بات ادھوری چھوڑ کر خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"گھر ملے گا۔ کپڑا' روٹی سب" اس نے لڑکی کی تسلی کے لیے کہا تھا۔ جواب میں اس نے زور سے سر نفی میں ہلا کر خود کو مزید سمیٹ لیا۔

"دیکھو یہاں تمہیں کوئی یہ سلائی کڑھائی وغیرہ کا کام نہیں دے گا۔ کسی کو یہاں اس کام کی ضرورت نہیں۔ شہر میں ایک سے ایک اچھا کام مل جاتا ہے۔ تم سے تو لوگ کام کروانے کے بجائے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ باقی بات منہ میں دبالی۔

"کام پر لگا دیں گے۔" فضل داد دبی آواز میں بول کے ہنسا۔

اس کی موٹی آنکھوں میں عیارانہ چمک در آئی تھی۔ اسی دم فون کی بیل بجی۔ اس نے دو منٹ سن کر فضل داد کو دیکھا۔

"اسے سمجھاؤ میں ابھی آتا ہوں۔" وہ بولتے ہوئے اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے قریب آتے دیکھ کر لڑکی نے زمین کو چھوتا پلو سمیٹ کر گود میں رکھ لیا۔

اس کے ہاتھوں میں اضطراب تھا وہ یقیناً" بہت خوف زدہ تھی۔

وہ اس کے قریب رکا پھر پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

"مانی کھاتیندی۔ بوکھ لگی ہوندی۔" اس نے جواب نہیں دیا وہ' زمین کو گھور رہی تھی۔

"فضل!" اس نے واپس کھڑے ہو کر پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے۔

"جی سائیں۔" فضل مودب سا کھڑا تھا۔

"کھانا کھلاؤ اسے اور بتاؤ کہ شہر جانے میں بہت فائدہ ہے۔" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

چائے کے کپ میں چینی ڈالتے ہوئے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سکینہ بوا امی کے پیروں پر مالش کر رہی تھیں۔ ساتھ دھیرے دھیرے کچھ بول بھی رہی تھیں۔ امی کے زردی مائل چہرے پر غم کے آثار تھے۔ اس نے سر جھٹک کر چہرہ موڑ لیا۔

وہ یقیناً" کسی نئے رشتے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔

"کاش میں آپ کی سگی بیٹی ہوتی پھر میں آپ سے پوچھتی۔ ایسے رنگ برنگے لوگوں کے سامنے بیٹی کی نمائش کتنی تکلیف دیتی ہے۔"

اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اسے رونا نہیں آتا تھا کسی بھی تکلیف پر نہیں۔

نمو کی وداعی کے وقت بھی امی جھوٹ موٹ میں اتنا زور زور سے روئی تھیں کہ اسے ہنسی آنے لگی تھی۔

ایک تمسخرانہ مسکراہٹ اس وقت بھی اس کے لبوں پر دم توڑ گئی۔ وہ میکانکی انداز میں کپ اٹھا کر بوا کے سر پر پہنچ گئی۔

"امی کو کس نئے رشتے کے بارے میں بتانے کی ضرورت نہیں بوا" اس کی آواز کافی پاٹ دار ہو چلی تھی۔

"اے کیوں؟ باؤلی تو نہیں۔"

امی گھبرا سی گئیں۔ اب وہ بہت جلد گھبرا جاتی تھیں اور تھک بھی جاتی تھیں۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں امی۔ میں چلی گئی تو آپ

کا خیال کون رکھے گا۔" سپاٹ لہجے میں اپنی بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں، کمرے سے نکل گئی تھی۔ سکینہ بوا نے یوں سر جھٹکا گویا۔ "جھلی نہ ہو تو۔"

☼ ☼ ☼

"بی بی جی صاحب نے کہا ہے جلدی آجائیں۔"
سیاہ ستاروں کی جھلمل کرتی ساڑھی میں اس کا وجود کھل سا گیا تھا۔ شوخ رنگ کے میک اپ کی تہہ میں چھپا چہرہ بے تاثر تھا۔ مودب ملازمہ کے آگے آگے قدم اٹھاتی وہ ڈرائنگ روم کی سمت چل پڑی۔
جیسے جیسے ڈرائنگ روم سے اس کے قدم قریب ہو رہے تھے۔ دل کی کیفیت عجیب ہوتی جارہی تھی۔ اندر سے اڑتے باتوں کے شور میں عورتوں اور مردوں کی گھلی ملی آوازیں تھیں۔ نتھنوں سے ٹکراتی پرفیومز کے ساتھ ساتھ سفر کرتی، تلخ ناگوار بو دروازے تک پہنچ کر اس کے اعصاب چٹخانے لگی۔ ایک لمحہ رک کر اس نے تمام تر حواس مجتمع کر کے دھیان اندر کی سمت لگایا اور کامیاب ہو کر اندر قدم رکھ دیا۔
"آیئے آیئے۔" سامنے بیٹھے ایک موٹی توند والے شخص نے فوراً" اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ اس کے ہونٹ مشینی انداز میں پھیل گئے۔
"وہ آئے محفل میں اتنا تو ہم نے دیکھا آہ۔" ایک ادا سے شعر پڑھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھا۔
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔"
اس کے منہ سے اٹھتے بو کے ناگوار بھبکے ناقابل برداشت تھے۔ بے ساختہ بالکل نامحسوس انداز میں اسے ہاتھ سے پکڑتے ہوئے وہ سامنے بیٹھے شخص کے پہلو میں جلوہ افروز ہو گئی۔
برابر میں بیٹھا مرد کھسک کر پرے ہونے کے بجائے مزید نزدیک ہو گیا۔
اس نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ملایا پھر دیکھا۔ دائیں طرف اس کا شوہر بے باک عورتوں میں گھرا ستائشی انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔

نظر ملنے پر اس نے اپنا اطمینان رخصت ہوتا محسوس کیا۔ اس کے خاوند بابر سلطان احمد کے برابر بیٹھی وہ بے ہودہ آنٹی ٹائپ عورت اٹھ کر اس کے نزدیک آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

آئمہ نیازی بہت انہماک سے کسی اخبار کے اداریہ میں گم تھی۔ دروازے پر کسی نے ناک کیا۔
"ارے وہاں کیوں کھڑے ہو اندر آؤ بھئی۔"
آئمہ اسے دیکھ کر مخصوص گرم جوشی سے بول اٹھی۔
"یہ دیکھو میں ایک کالم پڑھ رہی تھی تو اس پر نظر پڑ گئی۔ بڑا دلچسپ پوائنٹ لکھا ہے۔ بھئی یہ کارٹونسٹ برادری بھی کمال کی قلم کار ہے۔ لو دیکھو" اس نے اخبار آگے کیا۔ وہ یونہی اس کا دل رکھنے کی خاطر انہماک سے پڑھنے لگا۔ ورنہ وہ جانتا تھا اسے خاص طور پر یوں بلانے کی وجہ وہ نہیں جو نظر آرہی ہے۔
"لو مٹھائی کھاؤ۔" تازہ گلاب جامن سے بھری پلیٹ سامنے تھی۔ اور اسے بلانے کی وجہ بھی۔
"خیریت یہ کس لیے بھئی۔"
"لائبہ کے ایم بی اے کا رزلٹ آگیا ہے اور۔"
"اس نے فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن لی ہے۔" اس نے آئمہ نیازی کی بات اچک لی۔
"ارے ہاؤ ڈو یو نو دیٹ۔" آئمہ نے جانتے بوجھتے حیرت دکھائی۔
"اس میں نیا کیا ہے بھئی۔ وہ تو ہمیشہ سے ہی آؤٹ اسٹینڈنگ رہی ہے۔" اس نے گلاب جامن کا ٹکڑا منہ میں ڈالا۔ دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ آنے والا فضل تھا۔ آئمہ اسے دیکھ کر سخت بدمزا ہو گئی۔ اسے موقع مل گیا۔
"آؤ آؤ فضل داد تم بھی مٹھائی کھاؤ۔"
فضل داد ہمیشہ کی طرح پوری بتیسی کی نمائش کرتا اندر گھس آیا۔
"سائیں کس بات کی مٹھائی ہے یہ۔" اس نے

پورا گلاب جامن منہ میں ٹھونسا۔
"تمہیں کیا بس تم جلدی سے کھاؤ اور جاؤ۔"
"لیکن مس صاحبہ میں تو۔" اس سے بھرے منہ سے بات نہیں کی جارہی تھی۔
"اوفوہ اپہلے یہ تو ختم کر لو۔" آئمہ شدید کوفت کا شکار ہو گئی۔
"سر جی۔" اس نے قمیص کی سائیڈ والی جیب سے رومال نکال کر منہ صاف کیا۔ وہ آئمہ کی شکل دیکھ دیکھ کر حظ اٹھاتا رہا۔
"ارے یہ بھی تو یہاں کا ملازم ہے میری اور تمہاری طرح۔ اسے کیوں ایسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی ہو۔ بھئی فضل داد۔" وہ بات مکمل کر کے اس کی طرف مڑا۔
"نئی آئمہ بی بی کی چھوٹی بہن، بڑے امتحان میں پاس ہو گئی ہیں۔ اس کی مٹھائی ہے یہ"
"اچھا مبارک ہو مس صاحبہ۔" اس کی بتیسی پھر نمایاں ہو گئی۔
"ہونہہ!" آئمہ اس سے بہت چڑتی تھی۔
"ہاں خیر مبارک۔ اب کھالی نا مٹھائی اب جاؤ۔"
اس فضل کے بچے نے اس کا اچھا بھلا موڈ خراب کر کے رکھ دیا تھا۔
"ارے ایسے کیسے جاؤ۔ وہ کسی کام سے آیا ہو گا نا۔ مٹھائی تو اسے تمہاری وجہ سے کھانی پڑی۔"
"او گاڈ۔" آئمہ کا بس نہیں چل رہا تھا۔
"میری وجہ سے۔"
"ہاں۔ بولو فضل داد میں سن رہی ہوں۔" اس کے مزاج کی شگفتگی عروج پر تھی۔
"سائیں، مجھے مس سے نہیں آپ سے کام ہے۔"
"مجھ سے کیا؟"
"سائیں وہ لڑکی۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔ جبکہ آئمہ چونک پڑی تھی۔
"اچھا تم چلو اور سنو باقی اسٹاف اور اس کے لیے یہ مٹھائی لیتے جاؤ۔" وہ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔

"کہاں چلے اور یہ کس لڑکی کی بات کر رہا ہے؟"
"یار آج تم میرے ساتھ گھر چلنا میں ڈراپ کر دوں گا۔ راستے میں گپ شپ بھی ہو جائے گی اور میں لائبہ کو مبارکباد بھی دے دوں گا۔"
اس نے تیزی سے بات ختم کی۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا۔ آئمہ کا دھیان فوری طور پر اس لڑکی اور فضل داد کی طرف سے ہٹ گیا۔ اس کی دی ہوئی آفر اتنی پرکشش تھی کہ اس کی آنکھیں بھی جگمگا گئیں اور چہرہ بھی کھل اٹھا۔

☼ ☼ ☼

چھوٹے سے صحن میں پھیلی سرما کی دھوپ دم توڑ رہی تھی۔
اس نے اپنی سوراخ دار جرابوں سے جھانکتی پھٹی ایڑیوں پر نظر ڈالی۔ کبھی یہ ایڑیاں نرم، ملائم اور گلابی ہوتی تھیں۔
"بس کرو کتنا رگڑو گی۔ قد چھوٹا ہو جائے گا تمہارا۔"
عذرا اس کی صفائی ستھرائی سے بہت چڑتی تھی۔
"کس کو دکھانی ہیں یہ کلائیاں یہ پاؤں۔" اس کی جلی کٹی وہ دن بھر مسکرا کر سنتی تھی۔ اس کی نظر اپنی دھبے دار کھردری، سوکھی، سنولائی کلائی پر بھٹک رہی تھی۔
"سی۔۔ ی۔۔ ی۔" ایک بار اس کلائی پر جلتے تیل کی چھینٹ آپڑی تھی۔ اور ایک مردانہ گرفت میں اس کی کلائی مچل اٹھی تھی۔
"کچھ نہیں ہوا نا۔ معمولی سی چھینٹ ہے۔"
"دیکھنے تو دو۔ کیسی سرخ ہو رہی ہے۔"
"اچھا میں کچھ لگاتی ہوں۔"
اس نے مسکرا کر تسلی دی تھی۔ اسے علم نہ تھا اس کا لہجہ کسی کے دل پر جلتے چھینٹے ڈال گیا تھا۔ اس نے دروازے سے امی کو تکتے دیکھا اور ڈر گئی تھی۔
"ہونہہ۔" ایک تلخ مسکراہٹ لبوں پر دم توڑ گئی۔
" کیا چیز ہوتا ہے ڈر۔ انسان کو جانور بنا کر رکھ دیتا

ہے۔ ڈرپوک جانور۔" وہ بے دردی سے ایڑیوں سے ادھڑتی۔ سخت کھردری کھال نوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"بیوٹی فل" وہ عورت اس کی ٹھوڑی چھو کر بولی تھی۔ اس نے ناسمجھی کے سے انداز میں اپنے خاوند کو دیکھا۔

"اوہ ڈارلنگ یو آر ریئلی ویری بیوٹی فل۔" اس کی نظروں اور چہرے پر ستائش تھی۔ کمرے میں موجود باقی لوگ یوں خوش ہوئے جیسے یہ تعریف ان کی شان میں کی گئی ہو۔

ان کے بے باک جسم نے بڑھ کے اسے بانہوں میں بھرلیا۔ وہ بے اختیار کھڑے ہونے پر مجبور ہوگئی۔

"واہ۔ عورت ہو تو تمہارے جیسی۔" اس نے پھر ناسمجھی سے اس تعریف کو قبول کیا۔

"یہ سانچے میں ڈھلا خوب صورت جسم۔ یہ گوری رنگت، یہ گداز، یہ نرمی۔" کمرے میں یکدم خاموشی چھاگئی۔ سب اس قصیدے کو سننے میں محو تھے۔

"تم ہماری پارٹیز اٹینڈ کیوں نہیں کرتیں جان یہ حسن کوئی چھپا کے رکھنے کی چیز ہے۔" اس نے ایک ادا سے ساری کے پلو کو کندھے سے ہٹادیا۔ وہ ششدر رہ گئی اور سب لوگ یوں قہقہہ لگا کے ہنسے۔ جیسے یہ حرکت پہلے سے ان کے علم میں تھی۔

پلو سمیٹ کر واپس شانے پر ٹکاتے۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ نیم عریاں، چست لباس پہنی عورتوں کے درمیان بیٹھے قہقہے لگاتے شوہر کو دیکھ کر اس کے ہاتھ کپکپاگئے۔

☼ ☼ ☼

کوریڈور میں تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے وہ فضل داد کے برابر میں آگیا۔

"ہاں فضل، کیڑی رپورٹ اے۔" (کیا رپورٹ ہے)

"سائیں۔ کھانا تو کھالیا۔ پر شہر والی بات ماننے کو تیار نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔ تو ادھر ہی کہیں پوچھو۔ کہیں کلم والی کی ضرورت ہو تو۔"

"سائیں یہاں کون اتنا رئیس ہے کہ یہ ٹھاٹ باٹ رکھے۔"

"تو یہ بات تو وہ نہیں سمجھ رہی نا۔ تم کوشش کرو۔"

"تب تک سائیں؟"

"تب تک وہ اپنے کیمپ میں ہی رہے جاکر۔ آفس کی صفائی وغیرہ کروالیا کرو۔ میں دیہاڑی دے دوں گا۔" وہ آفس کے اندر گم ہوگیا۔

"سدا جیوے سائیں۔" فضل داد کو معلوم تھا وہ ایک ضرورت مند کو بالکل صحیح جگہ لایا تھا۔

"اور سنو۔" لڑکی آفس سے نکل کر آئی تھی۔ پیچھے پیچھے وہ خود تھا۔

"اسے کیمپ سٹی تک چھوڑ آؤ اور جلدی اس کا کسی گھر میں بندوبست کرو روز روز ادھر آنا ٹھیک نہیں۔"

اس نے لڑکی سے نظریں ہٹا کر فضل داد پر جمائیں۔ وہ گڑبڑا کر چل دیا۔

"تم نہیں جانتے فضل داد۔ عورت کی عزت کتنا نازک آبگینہ ہوتی ہے۔ ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہوجاتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں فضل داد سے مخاطب تھا۔ نظریں جاتی ہوئی لڑکی کی میلی ایڑیوں پر جمی تھیں۔ سیاہ پڑتی، پھٹی، ادھڑی ہوئی ایڑیاں، کسی کی نرم گلابی ایڑیوں میں بدل رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سامنے بیٹھی طرح دار لڑکی اپنے ناخن فائل کرتی، مسز رباب بختیار کھر کو مسلسل زچ کررہی تھی۔

"آخر تمہیں اعتراض کس بات پر ہے۔"

"مجھے وہ شخص پسند نہیں ہے بس۔" ایک شان بے نیازی اس کے انداز میں تھی۔

"کیوں آخر؟ راتوں رات اس میں کون سی برائی دیکھ لی تم نے۔"

"اس میں اچھائی کیا ہے آنٹی۔" مسز رباب نے

ایک آتاتی ہوئی نظر اس پر ڈالی۔

"تو کیا تم کسی سے ملتے وقت اس کی اچھائیاں دیکھتی ہو۔" ان کی آواز میں زہر بھرا تھا۔

"اوفوہ آنٹی میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" اس کا لہجہ حد درجہ بےزار تھا۔

"ایک دم اجڈ گوار جاہل شخص ہے وہ۔ نہ ایٹی کیٹس نہ مینرز۔"

"تو تم کس لیے ہو۔"

"او کم آن آنٹی۔ اب کیا میں اسے بیٹھ کر یہ سکھاؤں۔ آپ بھول رہی ہیں شاید میں کوئی ٹیچر نہیں ہوں۔" وہ کھل گئی۔

"میں کچھ نہیں بھول رہی۔ بہتر ہوگا تم بھی مت بھولو کہ تم اصل میں ہو کیا۔" بات کے اختتام پر جاتے ہوئے وہ چلائیں۔

سامنے براجمان لڑکی کی بے نیازی اڑن چھو ہوگئی۔ اس کے چہرے پر خوف اڈ آیا۔

"اور تمہیں کچھ سکھانے کی ضرورت نہیں نہ اسے نہ مجھے۔"

وہ سخت لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بولتی اس کے سر پر جا پہنچیں۔

"آج میں تمہاری جگہ ریٹا کو بھیج رہی ہوں۔ بٹ نیکسٹ ٹائم ڈونٹ فورگیٹ اٹ ہو آئی ایم۔" اس نے ٹھنڈی ہتھیلی میں نیل فائلر دبایا۔

"مجھے تم جیسی اڑیل گھوڑیوں کو سدھارنے اور ان کی چمڑی کسوانے کا فن بہت خوب آتا ہے۔" ان کے سرد لہجے کی سفاکی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

"اب تم اوپر جاسکتی ہو۔ وہاں کوئی تمہارا انتظار کررہا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر اوپر کی طرف بڑھ گئی۔ اس جہنمی زندگی میں سکون اور آرام کا ایک راستہ 'اپنی سو کالڈ آنٹی کے حکم کی بجا آوری کی صورت میں ہی نکلتا تھا۔ اوپر اس کا منتظر کون تھا وہ نہیں جانتی تھی لیکن وہ چاہتا کیا تھا یہ اسے بخوبی علم تھا۔

☼ ☼ ☼

سرماکی مریل سی دھوپ میں امی کے پیروں پر تیل کی مالش کرتے اس نے سر اٹھا کر داہنی طرف کی دیوار کو دیکھا۔

سدابہار کے اکلوتے پودے پر پھولوں کا نام و نشان نہ تھا۔

"یہ کیسا پودا ہے؟ اس پر پھول کیوں نہیں آتے؟ اس کا نام سدابہار کیوں ہے؟" اس کے دھیان کی رو بھٹک کر کہیں سے کہیں جانکلی۔

"سارا سال پھول آتے ہیں۔ ہر موسم میں بہار کا موسم۔ سچ پوچھو نا۔ تو یہ پودا بالکل تم جیسا ہے۔" کسی کی یاد بھی تو سدابہار تھی اس کے لیے۔

"شاید ماحول کا اثر ہوگیا ہے۔ اس پر۔" اس نے خود کلامی کی۔

"آئے کیا کہہ رہی ہے۔" امی نے ہاتھ کا چھجا بنا کر مندی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کہہ رہی ہوں اس گھر میں تو سدابہار کے پودے پر بھی بہار نہیں آتی۔" اس نے بات کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"مجھے تو تو پاگل لگنے لگی ہے۔ سارا دن دیواریں تکتی ہے۔ اب کیا ان سے باتیں بھی شروع کردیں۔"

"کیوں؟ میں نے کیا کہا ہے۔ چھوڑیں۔ میں کچھ کہوں گی تو شکایت ہوگی۔"

امی نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا۔ وہ جانتی تھیں انہوں نے کیا کیا تھا۔

"اب کہاں چلی۔ دو گھڑی میرے پاس بھی بیٹھ جایا کر۔"

چپل اڑستے وہ ذرا کی ذرا ٹھہری۔

"میں نہیں بیٹھ سکتی آپ کے پاس۔ مجھے وحشت ہوتی ہے۔" وہ اٹھ کر اندر چلی گئی۔ پیچھے وہ بڑبڑاتی رہیں۔

"چل دفع دور میں کون سا مر رہی ہوں تجھے پاس بٹھانے کو۔ ہائے نمو میری بیٹی۔ تو جانے کہاں چلی گئی۔ تیری جگہ تو میں اس کرموں جلی کو ہی بیاہ دیتی اس کلموہے موٹے سانڈ سے تو ہی بہتر رہتا۔"

ان کی آنکھوں سے اکلوتی بیٹی کی یاد میں آنسو بہہ کر

کنپٹی میں جذب ہونے لگے۔

☼ ☼ ☼

قیمتی فرنیچر اور بیش قیمت ڈیکوریشن پیسز سے سجا وسیع و عریض لاؤنج صاحب خانہ کے عمدہ ذوق کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

مہنگی ترین لکڑی سے بنا وہ منقش بیل کھایا صوفہ جس کے ایک کونے پر وہ سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس وقت پوری طرح آرام دہ ہونے کے باوجود اسے سخت بے آرام لگ رہا تھا۔

"نعیمہ گل۔"

"واٹ رب‌ش نعیمہ گل۔ نوما کہا کرو خود کو سمجھیں؟"

"نوما!" اس نے حیرت سے خود سے پوچھا تھا۔ مسز رباب کچھ اور سمجھیں۔

"ٹیس گڈ۔"

یہ وہی خوب صورت عورت تھی۔ جسے اس نے چند دن پہلے ہی اپنی کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں اپنی تعریفوں کے پل باندھتے دیکھا تھا۔ اور اب آج بابر سلطان اس کا شوہر اسے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا۔

"وہ یہ انگریزی کی گٹ پٹ اسے کہاں سمجھ آئے گی۔" وہیں ایک صوفے پر ٹانگیں پسارے وہ خود بھی براجمان تھا۔

"سب آجائے گی تم فکر مت کر۔ میں سب سکھا دوں گی اس کو۔" وہ قربان ہو جانے والی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"جب ہی تو لایا ہوں تمہارے پاس۔"

وہ اپنے مخصوص بے ڈھنگے انداز میں ہنسا۔ وہ عورت بھی ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔ لاؤنج میں اب خاموشی تھی۔ اس نے جھجکی نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھا۔ گہرے سرمئی رنگ کا قیمتی سوٹ اس کی موٹی توند اور گھنی مونچھوں والے بڑے سارے منہ کے ساتھ ذرا سا بھی میچ نہیں کر رہا تھا۔

اس کی ساری شخصیت میں ایک بھونڈا پن نمایاں تھا۔

"مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟"

کولڈ ڈرنک کا گلاس اس کے لبوں تک جاتے جاتے رک گیا۔

"مجھ سے کچھ کہا۔" اس کی بناوٹی اداکاری بھی اس کی طرح بھونڈی تھی۔

"پوچھ رہی ہوں یہاں کیوں لائے ہیں مجھے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز سے معمولی سی تلخی جھلک پڑی۔

"گھر چلیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔" اس نے بے چینی سے منت کی جانتی تو تھی۔ یہاں نہ سوال کرنے کی اجازت تھی نہ انکار کرنے کی۔

"ٹکی بیٹھی رہ جھلی نہ ہو تو۔"

اور وہ اس کی تو ترش سے پہلے ہی خائف اور عاجز رہتی تھی۔ اس وقت بھی دبک سی گئی۔ اسی وقت مسز رباب بختیار کمرے نے دوبارہ وہاں قدم رکھا تو ان کے ساتھ ایک الٹرا ماڈ قسم کی لڑکی تھی۔

"اوہ! لکنگ پریٹی۔ میک اوور کرنا ہے۔" وہ سوالیہ انداز میں اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز اور آواز بھی اس کی طرح الٹرا ماڈ تھے۔

"ہاں اسے لے جاؤ اور سنو۔ پلیز بی کیئر فل ہاں۔"

وہ خاصے مصروف انداز میں اس سے مخاطب تھی۔ آخر میں اس کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ وہ خوف زدہ سی اپنی جگہ سے اٹھی لیکن اس سے پہلے کہ ساری صورت حال کو سمجھتی یا سامنے لاپروائی سے بیٹھے اپنے شوہر سے کچھ سوال کرتی۔ جو پورے کمرے میں اس کا واحد شناسا تھا۔ بیوٹیشن نے اس کا بازو تھاما اور باہر کی طرف بڑھ گئی۔

وہ کچھ نا سمجھی اور کچھ تذبذب کے عالم میں اس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

دودھ کی دیگچی خالی تھی۔

اسے یاد آیا۔ دودھ کی قیمت میں مسلسل ہوتے اضافے سے گھبرا کے اس نے کل ہی دودھ والے کو منع کر دیا تھا کہ اب آنے کی تکلیف نہ کرے۔ لیکن اب وہ کرے کیا۔

وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔

"امی دروازہ بند کر لیں۔" وہ کہہ کر دروازے کی سمت لپک گئی۔

تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے وہ دل میں عہد کر رہی تھی کہ پہلی تنخواہ ملتے ہی اپنے لیے ایک عدد سوئیٹر خرید لے گی۔ یہ پتلی سی شال بھلا اس سردی کا کیا بگاڑے گی۔ حالانکہ یہ اس کی خام خیالی ہی تھی کہ اسے صرف سوئیٹر کی ضرورت ہے۔

پہلی تنخواہ اس کے لیے ایک سہانا خواب تھا جو انٹرویو کے لیے درخواست لکھنے سے بھی پہلے اس کی آنکھوں میں آن سمایا تھا۔

ابھی اس خواب کے شرمندہ تعبیر ہونے میں۔ پورے انتیس دن باقی تھے۔ تب تک ضروریات کی فہرست یقیناً طویل سے طویل تر ہو جانی تھی۔ لیکن اس نے بھی سوچ لیا تھا۔ اس بار وہ اپنی کمائی گھر اور گھر والوں پر بعد میں، بلکہ بالکل آخر میں خرچ کرے گی۔ تب جب اس کی اپنی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ جتنے کم گھر کے افراد تھے۔ اتنی ہی زیادہ اس کی ضروریات تھیں۔ اس نوکری سے ہی منسلک کتنی اشیاء کی اسے فوری ضرورت تھی۔ ایک گھڑی، سوئیٹر، چند نئے جوڑے، جوتے۔ بننے سنورنے کا شوق اسے پہلے بھی بہت زیادہ نہیں تھا لیکن۔

"سی۔ ی۔" بے ساختہ ٹھٹھر کر اس نے ہاتھ کی خشک پھٹتی ہوئی جلد کو سہلایا ایک کولڈ کریم تو "فوراً" ہی لینا چاہیے۔

اور اس "فوراً" کے حاشیے میں کتنی ضروریات کھڑی دہائی دے رہی تھیں۔ کتنی ہی چیزیں ایسی تھیں جن کا ذکر وہ صرف اپنی ماں سے ہی کر سکتی تھی۔ لیکن کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بھلا وہ اس کی ماں تھیں ہی کب، وہ تو صرف نمو کی ماں تھیں۔

"نمو، نعیمہ کی ماں۔ نمو کی یاد نے گھنٹی کیا بجائی، دل میں جیسے اس سے جڑی کتنی ہی یادوں نے یلغار کر دی۔ نمو سے زریاب اور زریاب سے۔

کئی سال پہلے تک سردیوں میں اس کے کتنے کام آتا تھا۔ وہ کہتا تھا روشی کی خودداری اسے اس سے بڑھ کر عزیز ہے۔

اس کے ہاتھ میں اپنی جرابیں اور ایک استعمال شدہ پل اوور تھا۔

"نئے لاتا تو تمہیں اعتراض ہوتا۔" اس نے اس کے ہاتھوں میں دونوں چیزیں تھمائیں۔

"اور اپنے اس لیے لایا ہوں کیونکہ تم پہنو گی بھی شوق سے۔ اور میری یاد بھی آتی رہے گی۔" اس کے لبوں پر بڑی میٹھی مسکراہٹ تھی۔ اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا وہ اس کے دل تک رسائی رکھتا ہے۔ اس کی آنکھیں پڑھ سکتا ہے۔

"وہ زبان سے کہتی ہی کب ہے اسے کس چیز کی ضرورت ہے۔"

"اوہو! تو تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے۔" نمو اس کی باتوں پر جل اٹھی تھی۔

"مجھے؟" وہ ہنس دیتا۔

"بس ہو جاتی ہے دل کو دل کی خبر۔" ایک سرد آہ نے زمانے بھر سے چھپ کر فریاد کی۔

"کاش تمہارے دل کو خبر ہو جائے زریاب۔ مجھے تمہاری کتنی ضرورت ہے تمہیں پتا چل سکے۔" اسکول کی عمارت سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس نے سب سوچیں، یادیں ذہن کے کونے میں دھر دیں اور احاطے میں ایک نئے عزم کے ساتھ قدم رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"سائیں وہ شامل بی بی آئی ہے۔"

"کون شامل؟" وہ اس وقت بے انتہا مصروف تھا۔

"سائیں وہی کیمپ والی لڑکی۔"

"اوہاں کیا ہوا تم نے پتا کیا تھا اس کے کام کے لیے۔ صفائی وغیرہ تو کرتی ہے نا وہ۔" اس کی نظریں کمپیوٹر پر تھیں۔

"تم اسے دس ساڑی دیتے ہو نا روز کے روز۔"
"جی سائیں۔"
"تو پھر کوئی مسئلہ ہے۔" وہ بے دھیانی سے پوچھ رہا تھا۔
"جی سائیں وہ کہتی ہے اسے وہاں نہیں رہنا کیمپ میں۔"
"کیوں؟" وہ ایک دم چونک گیا۔
"پتا نہیں' اس کا کوئی ماما شاما آگیا تھا اس کا پتا کرتا ہوا۔"
"تو پھر۔" اب کی بار اس نے مانیٹر سے نظریں ہٹائیں۔
"وہ اس سے ڈری ہوئی ہے۔ کہتی ہے وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔"
وہ چند لمحے یونہی فضل داد کو دیکھتا رہا۔
"بلاؤ۔" وہ پھر سے اسکرین کی طرف گھوم گیا۔
"ہاں بھئی کیا مسئلہ ہے؟"
اس دن کی بہ نسبت وہ آج قدرے بہتر حلیے میں تھی۔ لیکن پہلے سے زیادہ ڈری سہمی۔
"سائیں میرے کو شہر بھیج دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔
"کل تک تو تم منع کر رہی تھیں پھر آج اچانک۔"
"سائیں اور میرا ماما آگیا ہے۔ وہ بوت کھراب آدمی ہے۔ میرے کو ادھر ادھر کردے گا۔"
"ادھر ادھر کردے گا مطلب۔" اب کی بار وہ پہلے سے زیادہ چونک گیا۔
"وہ اپنے ساتھ کسی جاننے والے کو لایا ہے۔ اس سے پیسے لے کر مجھے اس کے ساتھ چلتا کردے گا۔" اس کی آواز روہانسی ہو رہی تھی۔
"سائیں آپ بڑے لوگ ہو۔ کسی سے کہہ سن کر مجھے نکلوا دو ادر سے۔ وہ ٹھیک بندہ نہیں ہے۔ اور وہ عورت بھی ٹھیک نہیں تھی۔" وہ اردو سے اپنی زبان میں بات کرتے ہوئے بے اختیار رونے لگی۔
"اچھا۔ تم رو مت۔ میں تمہیں بھجوادوں گا۔ گھبراؤ مت سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
"سدا جیو سائیں مولا سکھی رکھے۔"
وہ بے اختیار آنسو صاف کرکے دعائیں دیتے پلٹی تب زریاب نے دیکھا اس کے پیروں میں آج بھی چپل نہیں تھی۔ موسم کی شدت دیکھتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے کپکپا سا گیا۔
"فضل داد اسے سوئیٹر' موزے اور ایک جوڑی چپل لے دو۔"
فضل سر ہلاتا باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"لاؤ نکالو میرا مال۔" مسز رباب کو واپس آتا دیکھ کر نشے میں بدمست بابر سلطان ہوشیار ہو گیا۔
"پہلے تم نکالو۔" وہ اطمینان سے سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے بیٹھ گئیں۔
"میں۔ کیا؟" اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔
"ڈائیورس پیپر اور کیا اور کتنی بار کہا ہے اتنی مت پیا کرو دن میں بھی ادھر سے ادھر لڑھکتے رہتے ہو بدبودار آدمی۔" وہ کراہیت سے نیچی آواز میں بڑبڑائیں۔
"ہی ہی ہی۔" وہ اپنے بھونڈے انداز میں ہنسنے لگا۔ مسز رباب کے تیور "مال" وصول کرتے ہی بدل گئے تھے اب وہ خاصے اکتاہٹ بھرے انداز میں اس کے اگلے قدم کی منتظر تھیں۔
اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک لفافہ برآمد کرکے ان کی طرف بڑھا دیا مسز رباب نے لفافہ کھول کر سکون سے پورا متن پڑھا۔
"ہوں ٹھیک ہے۔" انہوں نے بیگ سے اس کا لفافہ نکال کر اسے دے دیا۔ وہ تھامتے ہی اٹھ گیا۔
"نکال کر چیک تو کرو اماؤنٹ پورا ہی ہے کہ نہیں۔" وہ کھڑی ہو چکی تھیں۔
"یہ غیروں والا سلوک تم ہمارے ساتھ کرتی ہو جانم ہم نہیں ہمیں تمہاری زبان پر بھروسا ہے۔" وہ پاس آکر ایک لگاوٹ بھرے انداز میں ان کی لٹ انگلی

پر لپیٹ کر بولا مسز رباب نے بے زاری سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔
"چلو اب چلتے پھرتے نظر آؤ اور سنو آئندہ ذرا صاف ستھرے ہو کر آنا۔" ان کا کام ہو چکا تھا انہیں اس پر مزید نثار ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ حیرت زدہ سی آئینے میں اپنا بدلا ہوا روپ دیکھ رہی تھی۔
بیوٹیشن کے ماہرانہ ہاتھوں نے اسے سرتاپا بدل ڈالا تھا۔ ہیئر کٹنگ' میک اپ اور اسٹائلش کپڑے جن میں وہ اس وقت قدرے بے آرامی محسوس کر رہی تھی۔ اس وقت اس کے متناسب جسم پر خوب سج تھے۔
"ہاؤ ڈو یو تھنک ناؤ۔" بیوٹیشن مسکرائی۔
"جی!" اس نے چونک کر اسے دیکھا۔
"کیسا لگ رہا ہے اپنا آپ۔"
"یقین نہیں ہوتا میں اتنی خوب صورت بھی لگ سکتی ہوں۔" بیوٹیشن مسکرا کر اپنا سامان سمیٹنے لگی۔
"او مائی ڈارلنگ یو آر لکنگ ویری پریٹی۔" مسز رباب اندر آکر اس سے مخصوص انداز میں کہہ رہی تھیں۔ وہ تھوڑا سا شرما گئی۔
"چلو آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لاؤنج میں لے آئیں لاؤنج خالی تھا۔
"وہ۔ وہ بابر۔" وہ خالی لاؤنج دیکھ کر گھبرا گئی۔
"بابر!" خراماں خراماں سی مسز رباب ایک دم کچھ اٹک سی گئیں۔
"ہاں وہ ابھی چولی اسے ایک میٹنگ میں جانا پڑ گیا بالکل اچانک۔ بٹ یو ڈونٹ وری۔ تم آج کا دن ہمارے ساتھ گزارو۔ بہت انجوائے کرو گی۔ شام میں تو وہ ہمیں جوائن کر ہی لے گا۔"
ان کا انداز ابھی بھی ویسا ہی پیار بھرا تھا مگر اسے یک دم بے چینی نے آگھیرا یہ گھر اور گھر کے لوگ' یہ ماحول سب ایک دم اجنبی اور پرایا لگنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں دو دن کے لیے کراچی جا رہا ہوں۔"
"اوہ نو زریاب یہ کیا بات ہوئی تم اس دن بھی دروازے سے ڈراپ کرکے چلے گئے تھے۔" اسے پتا تھا آئمہ ناراض ہوگی مگر اس کا کام زیادہ ضروری تھا۔
آج صبح آفس آتے ہی اسے خبر ملی تھی کہ کیمپ میں شاہل کے ساتھ رات میں کسی نے دست درازی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے شور مچانے پر سب سے پہلے اس کا ماما ہی وہاں پہنچا تھا شاہل اس وقت وہاں سے نکل کر اس کے آفس آگئی تھی۔ متاثرین سیلاب کے لیے لگائے گئے کیمپ سٹی سے اس کی این جی او کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا شاہل نے پوری رات وہیں ٹھنڈے برآمدے کے فرش پر بیٹھ کر روتے ہوئے گزاردی تھی اور شاہل کا کہنا تھا کہ کیمپ میں اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے والا وہ شخص اس کے ماما کا ہی بھیجا ہوا تھا۔ اس کا ماما اسے خوف زدہ کرکے اپنے ساتھ لے جانے پر رضامند کرنا چاہتا تھا۔
زریاب واقعے کی تفصیل سن کر اتنا ڈسٹرب ہوا کہ اس نے فوراً" اسے اپنے ساتھ کراچی لے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ چونکہ یہ فیصلہ اس نے ہنگامی بنیادوں پر کیا تھا۔ اس لیے آئمہ نے اس کے حصے کا آج کا سارا کام بھی نبٹانا تھا اور اسی وجہ سے وہ اس کے ساتھ ایک خوب صورت سفر سے محروم رہ جانے والی تھی۔
مضافاتی دیہاتوں میں غربت کی لکیر اور خواندگی کی شرح پر کی جانے والی ریسرچ کی سروے رپورٹ اسے کل ہر حال میں فائنل کرکے دینی تھی اور کام اتنا زیادہ تھا کہ کل پر ٹالا نہیں جاسکتا تھا جو مسئلہ ابھی اس کے سر پر پڑا وہ اپنی جگہ پر اہم تھا اور وہ ایک دن میں کراچی سے واپس بھی نہیں آسکتا تھا۔ آئمہ یہ سب سمجھتی تھی جب ہی اس سے ناراض تو تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔
"آئمہ ڈونٹ بی اینگری پلیز انڈر اسٹینڈ۔"
"یس آئی کین۔" اس نے جتایا۔
"ناراض تو نہیں ہونا۔ دیکھو اگر یہ سروے رپورٹ

کا مسئلہ نہیں ہوتا تو میں تمہیں ضرور ساتھ لے کر چلتا۔ ایک تم ہی تو میری فرینڈ ہو اور تم جانتی ہو میں ہمیشہ تمہاری کمپنی انجوائے کرتا ہوں۔"

"اٹس او کے یار میں نہیں ہوں ناراض بس جلدی آجانا او کے۔" وہ مسکرا دی تھی۔ جانتی تھی زریاب جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔

وہ واقعی اس کا بہت اچھا دوست تھا اور وہ خود بھی اس کی بہترین دوست تھی اور اس دوستی کو اپنی چھوٹی بہن کے حوالے سے رشتہ داری میں بدلنا بھی چاہتی تھی۔

"اور سنو تمہاری ریورٹس تیار کر کے میں پاس تک پہنچا دوں گی۔" اس نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں پہلا دن توقع کے مطابق اچھا ہی گزرا تھا۔ پرنسپل کا انداز مشفق تھا تو اسٹاف کا دوستانہ۔ یہ کوئی بہت بڑا انگلش میڈیم اسکول نہیں تھا۔

درمیانے درجے کا ایک معمولی سا تنگ گلیوں کے مقابلے میں کھلے میدان میں کھلنے والا اسکول تھا۔ میٹرک تک کلاسز تھیں۔ انگلش بولنے کی پابندی نہ تھی بلکہ بعض ٹیچر معمولی سی انگلش بولنے سے بھی قاصر تھیں۔ ایسے میں اس کے منہ سے نکلنے والے انگریزی کے چھوٹے چھوٹے فقروں نے اسے تمام اسٹاف کی نظر میں اچانک بہت "پڑھا لکھا" بنا دیا تھا۔

وہ تھی بھی انگلش اور سائنس کی ٹیچر۔ اس لیے دوسرے مضامین کی ٹیچرز کے مقابلے میں اسے امتیازی حیثیت پہلے دن سے ہی حاصل ہو گئی تھی۔ جو سائنسی مضامین اور نہم، دہم جماعت پڑھانے والے اساتذہ کی تھی۔

اسے اپنے آپ کو پہلے ہی دن ملنے والی اس اہمیت کا اندازہ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ "یعنی اتنے دن گزرنے کے بعد بھی میں بالکل ناکارہ نہیں ہوئی ہوں۔" سارا دن ایک خوش کن احساس اس کے گرد اپنا گھیرا تنگ کرتا رہا اور وہ اس کی گرفت میں برضا و رغبت جھومتی

رہی۔ چھٹی کے وقت گھر کی طرف اٹھنے والے قدموں کی تھکاوٹ کی اوٹ سے ایک نیا جوش و جذبہ جھلک رہا تھا اسے یقین تھا وہ اپنے شاگردوں میں بھی اپنے حسن سلوک کی بدولت بہت جلد مقبولیت حاصل کر لے گی۔

اسے یاد تھا جب وہ خود میٹرک میں تھی تو اپنا خرچ خود اٹھانے کی غرض سے ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی تو بچے زریاب کی بہ نسبت اسے زیادہ پسند کرتے تھے۔

زریاب اور اس نے اکٹھے ہی ٹیوشنز شروع کی تھیں اور زریاب۔۔۔ سبک خرامی سے اٹھتے قدموں میں پہلا بریک آیا تھا۔

"میں زریاب کو یاد کرنا کب چھوڑوں گی۔ اللہ جانے چھوڑ بھی سکوں گی یا نہیں۔" دروازہ بجاتے ہوئے یہی آخری خیال تھا۔

☼ ☼ ☼

آدھی رات گزر چکی تھی اور پارٹی اپنے عروج پر تھی۔

اس کلاس میں ڈرنک کرنا معمول کی بات تھی اسے شادی کے شروع کے دنوں میں اگر کبھی حیرت یا پریشانی یا کراہیت ہوئی بھی تھی تو اب تک سب محسوسات ایک سرد اور جامد کیفیت میں بدل گئے تھے۔

شادی ایک جوا ہے اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ وہ یہ جوا بری طرح ہار چکی تھی۔ تھوڑے دن غم منانے کے بعد اس نے یہ ہار قبول کر لی تھی۔ لیکن ابھی اسے صحیح طرح سے علم نہ تھا کہ وہ کیا کچھ ہار چکی ہے اور کیا کچھ ہے جو ابھی قبول کرنا باقی ہے۔

اس کا شوہر ابھی تک اسے لینے نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔

"ارے یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو۔" مسز رباب بڑی دیر بعد اسے ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

"نہیں کچھ نہیں بس وہ تھکن سی ہو رہی تھی۔" وہ سخت بے آرام تھی۔

"ارے ابھی سے تھکن ڈارلنگ، ڈونٹ وری میں

ابھی تمہیں اندر بھجواتی ہوں۔ امین ادھر آؤ۔" انہوں نے پاس کھڑے ملازم کو آواز دی۔

"وہ بابر۔۔۔ نہیں آئے۔"

"ہاں۔" وہ ایک دم چونک گئیں۔

"آجائے گا کہیں پھنس گیا ہو گا۔ تم پریشان مت ہو جانی تم میرے ساتھ ہو۔ بالکل اپنوں کی طرح۔" وہ اس کے گال تھپتھپا کے بولیں۔

"اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ بیگم صاب کو ان کا بیڈ روم دکھا دو۔" وہ مصروف سے انداز میں کہہ کر کسی اور طرف بڑھ گئیں۔

اسے اس طرح کی مخلوط محفلوں میں شرکت کی ابھی تک عادت نہیں پڑی تھی۔ وہ فوراً جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتی اس ملازم کے پیچھے چل پڑی۔ اس بے باک محفل سے اس کی طبیعت گھبرا رہی تھی جہاں عورتیں ناکافی لباس میں مردوں کے گلے کے ہار بنی جا رہی تھیں رنگین مشروب کے نشے میں ڈوبے سب ہی حال سے بے حال تھے۔

"مسز رباب کو پتا تھا بابر آج نہیں آئیں گے۔ جب ہی میرے لیے پہلے سے بیڈ روم تیار ہے لیکن وہ یہ بات مجھے بتا بھی تو سکتی تھیں۔ چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔"

ایک نوکیلی سوچ مستقل اسے چبھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کراچی آنے میں تھوڑا ہی وقت باقی تھا۔

سورج مغرب کی سمت سفر کر رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی صبح اسے شامل کو لے کر آفس سے نکلنے میں دیر ہو چکی تھی۔ مسلسل ڈرائیونگ سے جسم تھک کر چور ہو گیا تھا۔ یہاں اکیلے آنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فضل داد کو بھی شامل کے اگلے ٹھکانے کا علم ہو۔

"آج تمہیں میرے گھر رکنا ہو گا۔" اس نے جواب نہیں دیا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ وہ سن رہی ہے۔

"فکر مت کرنا میرے گھر میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہو گا۔ تم مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو۔" اس نے بلا وجہ تسلی دینے کی کوشش کی۔

"تعلیم کتنی ہے تمہاری؟ کچھ پڑھی لکھی بھی ہو یا چٹی ان پڑھ۔"

اسے مسلسل خاموشی سے الجھن ہونے لگی تھی۔ وہ اس سے بات کر کے کچھ ریلیکس ہونا چاہتا تھا۔ جب ہی گاڑی ایک سائیڈ پر پارک کر کے اس سے یونہی پوچھ بیٹھا۔ جواب توقع کے برعکس تھا۔

"تم میٹرک پاس ہو۔ ویری اسٹرینج" وہ کافی حیران ہوا۔

"کس نے دی تمہیں اتنا پڑھنے کی اجازت۔"

"میرے بابا سائیں نے۔"

"اوہ!" وہ کچھ سوچنے لگا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ میں کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ تم کچھ کھاؤ گی؟"

اس نے حسب توقع نفی میں سر ہلا دیا پھر بھی جب وہ واپس آیا تو اس کے پاس شامل کے لیے بھی برگر اور کولڈ ڈرنک تھی۔

"مجھے پتا ہے تم بھوکی ہو کھا لو۔"

اس نے جھجکتے ہوئے اپنے سانولے ہاتھ بڑھا دیے۔

چیزیں لیتے ہوئے اس کی انگلیاں زریاب سے مس ہو گئیں۔ ان کی نرمی کا احساس اسے ہولے سے چھو گیا اور ساتھ ہی کسی کی یاد بھی۔

وہ جانتا تھا اب نہ یہ یاد ٹلے گی نہ اس کی جان چھوڑے گی۔

وہ اگلے کئی گھنٹوں کے لیے جاگنے کو تیار تھا اور اگلے کئی گھنٹوں تک کوئی قابل غور کام کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ اب اسے ڈرائیونگ پر پہلے سے زیادہ توجہ دینی تھی اور تھکاوٹ مسلسل بڑھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تین دن گزر گئے تھے۔ بابر سلطان کو آنا تھا نہ آیا۔ اس کے وجود میں بے کلی کے شرارے سے دوڑنے

لگے تھے۔ مسز رباب جتنی اپنائیت دکھا رہی تھیں۔ اتنی ہی اجنبی ہوتی جارہی تھیں ان کے مسکراتے چہرے میں کیسے بھید چھپے تھے وہ پہلے دن سے اب تک جبکہ وہ ایک بن بلائے مہمان سے بلائے جان بن چکی تھی اب تک ان سے نظر ملا کر بات کرنے میں ہچکچاتی تھی۔

اور پچھلے تین دن میں وہ تین بار بھی تو اس کے سامنے نہیں آئی تھیں۔ اسے چائے اور تینوں وقت کا کھانا پہنچانے والے ملازم بابر سلطان اور مسز رباب دونوں ہی کی غیر موجودگی اور آمدورفت کے اوقات سے مکمل طور پر انجان تھے۔

مسز رباب نہیں تھیں تو ان کی "آجائے گا نا" جیسی کھوکھلی تسلی بھی نہ تھی۔ وہ بالکل روہانسی ہوچکی تھی جس جگہ وہ محض کچھ گھنٹے گزار کر واپس جانے والی تھی اب تین دن سے وہیں مقیم تھی اسے بالکل یوں لگ رہا تھا کسی نے اسے گھر جیسی جیل میں قید کر ڈالا ہے اس کے کمرے سے باہر آنے جانے پر کوئی پابندی تو نہ تھی پھر بھی۔

بابر سلطان احمد کو ایسی کیا آفت آن پڑی کہ اس کے پاس اس کی خیریت دریافت کرنا تو دور اپنی خیریت کی اطلاع دینے کا بھی وقت نہیں تھا۔ موبائل استعمال کرنا اسے نہیں آتا تھا اس کے شوہر نے کبھی دلایا بھی نہیں اسے ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی تھی۔

"امی! امی کہاں ہیں آپ؟ پتا نہیں کیسی ہوں گی؟ میں کہاں پھنس گئی ہوں۔" ہر بچے کی طرح، ہر اولاد کی طرح اس کے لبوں پر بھی مشکل وقت میں ماں کی پکار تھی۔

وہ اس وقت خود کو سخت بے بس محسوس کرتی صرف بابر سلطان کا انتظار کرنے پر مجبور تھی۔

☆ ☆ ☆

رات اتنی طویل نہیں تھی جتنی اس کے لیے بن گئی تھی۔ ماضی کی سنہری، رنگین اور زہریلی یادیں۔ اپنے نوکیلے پنجے اس کے دماغ میں گاڑے قطرہ قطرہ اس کی نیند چوستی رہی تھیں۔ اور وہ مجبور تھا اسے یاد کرنے پر۔ جس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھے تھے۔ جس کے سنگ ہر خوشی اور ہر غم کا سامنا کیا تھا۔

"روشنی، رشنا میری جان۔۔۔ اوہ۔۔۔ اوہ آئی ایم سوری۔" الفاظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے بے آواز فضا میں تحلیل ہورہے تھے۔ انگلیوں میں دبا سگریٹ جلتے جلتے پوروں تک پہنچا تو احساس ہوا۔ وہ پچھلے کئی گھنٹوں سے ایک ہی زاویے پر بیٹھا اسے سوچ رہا تھا۔ سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر جلتی آنکھوں کو رگڑا۔ اسی پل دروازہ کھول کر کسی نے اسے پکارا۔

"بھائی!" اس نے پلٹ کر دیکھا اور کھڑا ہوگیا۔

"بھائی کب آئے آپ؟" دروازے میں کھڑا وجود بے تابانہ اس سے لپٹ گیا تھا۔

"بہت دیر ہوگئی۔ تم کہیں باہر گئی تھیں۔"

"ہاں وہ آج۔" وہ کچھ رک کر بولی۔

"ویڈنگ اینورسری تھی۔"

"اوہ۔ واہ بھئی کلے کلے کیک کھالیا، ہیں۔"

"جی نہیں میں نے پرسوں آپ کو بتایا تھا۔ آپ نے فون کرکے منع کردیا تھا۔" وہ دھم سے بیڈ پر بیٹھی اس کی آواز میں خفگی تھی۔

"ہاں یار ایمرجنسی میں آنا پڑا۔" وہ اس کی شکل دیکھ کر ہنس پڑا۔

"ڈونٹ ٹیل می! آپ ابھی بھی اپنے کام سے ہی آئے ہیں۔"

"اوہ ہو رابی! آپ خوش ہونا اپنے ہی کے ساتھ۔ انجوائے کیا ڈنر۔" اس نے برابر میں بیٹھ کر اس کے شانے پر بازو پھیلالیا۔

"تو سمجھو میں بھی بہت خوش ہوں۔ میرے ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"آپ کو نہیں لیکن ہمیں فرق پڑتا ہے، مجھے اور آپی کو۔"

"ہاں وہ سمیعہ کیسی ہے؟" رابعہ جواب دیے بنا اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ مسلسل جگار سے ستا ہوا

تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے گندمی رنگت سے میل نہیں کھا رہے تھے۔ مضبوط ہاتھوں کی نرم جلد بھی کھردری ہوچلی تھی۔ وہ بدل گیا تھا، بکھر گیا تھا اور کوئی سمیٹنے والا نہ تھا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کرتے بھائی۔" اس کی بات غیر متوقع تھی، مگر نئی یا انوکھی نہیں۔ اس کا بازو بے ارادہ رابی کے شانوں سے سمٹ کر اپنی گود میں آگرا۔

"آپ بھول کیوں نہیں جاتے ان کو۔" جواب ندارد۔

"اگر خالہ جان یا ہمارے والدین میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہوتا تو اس طرح نہیں ہوتا جس طرح ہوا۔"

"ہاں، شاید تب کسی اور طرح ہوتا۔" اس کی آواز مضمحل تھی۔

"ہاں نا، تب کوئی آپ کو اتنا آگے نہ بڑھنے دیتا۔ شروع میں ہی روک دیتا۔" اس کی گود میں دھرے ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھ گئیں۔

"اب ایک بات جو ممکن ہی نہیں ہے، آپ کیا ساری زندگی اسے۔۔۔"

"رابعہ پلیز! میں اس ٹاپک پر بات نہیں کرسکتا۔" وہ اٹھ کر وارڈروب کے پاس چلا گیا۔

"بات نہیں کرسکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔"

"کر ہی نہیں سکتا میں بے بس ہوں بہت۔۔۔" رابعہ سمجھتی تھی وہ کسی کام سے نہیں محض چہرہ چھپانے کی خاطر وارڈروب کھولے کھڑا ہے۔

"صرف اس معاملے میں بے بس ہیں نا اور یہ بے بسی آپ کی اپنی طاری کی ہوئی ہے۔ کیوں نہیں سامنا کرتے حقیقت کا ایک بار اعتراف کرلیں کہ آپ غلط تھے۔ انجانے میں ہی سہی لیکن۔۔۔"

"رابعہ!" وہ اتنی زور سے دھاڑا کہ رابعہ سہم کر کھڑی ہوگئی اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"ہزار بار منع کرچکا ہوں۔ تم کیوں ہر بار یہ تکلیف دہ بات شروع کردیتی ہو، کیوں؟" اب کی بار وہ پلٹ کر تیزی سے اس کے سامنے آیا۔

"نہیں دینا چاہتی نا اذیت، بچانا چاہتی ہونا مجھے تکلیف سے تو آئندہ کبھی میرے سامنے اس کا ذکر مت کرنا۔" اس نے رابعہ کے دبوچے ہوئے بازو جھنجھوڑ ڈالے۔ رابعہ چند لمحے خوف زدہ سی اسے دیکھتی رہی پھر ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کے لبوں نے بے آواز جنبش کی۔

"آئی ایم سوری۔" زریاب کو فوراً ہی اپنے رویے کی بدصورتی کا احساس ہوگیا۔ اگلے ہی پل اس نے اپنی بہن کے بازو چھوڑ کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور سینے سے لگالیا۔ رابعہ کی آنکھوں میں ٹھہرے آنسو اس کے فراخ سینے میں جذب ہوگئے۔

☆ ☆ ☆

جانے کتنی دیر گزری تھی، کتنے گھنٹے وہ سوئی تھی۔ کوئی اسے جگانے بھی نہیں آیا۔ اس نے مندی آنکھوں سے ٹائم دیکھا۔

"ارے! بارہ بج گئے۔" وہ حیرت زدہ سی اٹھ بیٹھی۔ بڑی بڑی کھڑکیوں پر پڑے نفیس بھاری پردوں کے باعث وقت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔

وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی کے پاس گئی اور پردے سمیٹ دیے۔

نرم ملائم سرما کی دھوپ کمرے میں بھری تو حدت اور تازگی کا ایک الگ سا احساس ہوا۔ اتنا سو کر بھی سر بھاری اور جسم کچھ سست سا لگ رہا تھا۔ شاید یہ رات بھر رونے کا اثر ہے۔ رات کے ساتھ ہی اسے اپنی پریشانی یاد آئی اور بابر سلطان بھی۔

اس نے واش روم میں جاکر پانی کے چھینٹے منہ پر مارے اور رباب آنٹی سے بات کرنے باہر نکلی۔

"یہ کیا چکر چلایا ہوا ہے ان دونوں نے مل کر۔ میں اپنے گھر کب جاؤں گی۔" گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی فکر بڑھ رہی تھی۔

"بڑی بی بی تو نہیں ہیں۔ کوئی صاحب آئے تھے ان کے ساتھ باہر گئی ہیں۔" اس کے جوش پر پانی پھر گیا۔

"آپ ناشتا یہیں کریں گی یا کمرے میں۔" وہ وہیں

کھڑے کھڑے سوچ میں ڈوب گئی تھی۔ ملازمہ نے پھر اسے آواز دی۔

"ناشتا کمرے میں لے آؤں جی۔"

"ہاں کمرے میں۔" بے ربط انداز میں بولی وہ پھر واپس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ کمرہ ویسا ہی تھا سجا سجایا اور خاموش، لیکن اس وقت کسی جیل سے کم نہیں لگا۔ ملازمہ ناشتا رکھ کر جا چکی تھی۔ لیکن اس کی توجہ اس وقت ناشتے کی طرف نہیں اس لفافے کی طرف تھی جو سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھاتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کی کہ لفافہ رات میں یہاں تھا یا نہیں۔

"یقیناً" نہیں۔" وہ فیصلے پر پہنچی۔ ورنہ اسے ضرور نظر آجاتا۔

اسے کھول کر اندر موجود کاغذات نکالتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس میں کاغذات نہیں ایٹم بم رکھا ہے۔

وہ طلاق کے کاغذات تھے۔ اس کے اعصاب کے پرخچے ایک دھماکے سے اڑ گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

وہ بہت انہماک سے سبزی کاٹنے میں مصروف تھی۔

چولہے پر چائے چڑھی تھی۔ اس نے بہت عرصے بعد دل سے کھانا پکانے کا سوچا تھا۔ گلی سے سبزی والا گزرا تو اس نے بینگن، آلو، پیاز اور اس جیسی دو تین سبزیاں ـــ خرید لیں۔ گوشت تو خیر اب صرف بقر عید پر ملتا تھا یا آس پڑوس سے آجائے تو، لیکن اب وہ اتنی گئی گزری حالت میں بھی نہ تھی کہ چند ایک سبزیاں بھی خرید نہ سکے۔

موسم میں بڑھتی ہوئی سردی کی شدت اور اس کے کپڑوں اور جوتوں کی خستہ حالی کو دیکھتے ہوئے ایک ہمدرد دل رکھنے والی کولیگ نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے اس کی مالی مدد کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کے ہاتھ سے روپے پکڑتے ہوئے زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ خودداری اور عزت نفس کیسے کچوکے لگاتی ہے۔ انسان اف تک نہیں ... اس کی پلکیں جھک گئی تھیں، مگر لب انکار سے ... تھے۔

"دیکھو میں جانتی ہوں تم ابھی مجھے اپنی اتنی ... دوست نہیں سمجھتیں کہ اس طرح مجھ سے رقم ... مگر یقین کرو میں تمہیں کبھی احساس نہیں دلاؤں گی ... زندگی میں کبھی میں نے تمہیں کچھ دیا تھا اور اگر تم ... تو ادھار سمجھ کر رکھ لو سیلری ملے تو واپس کر دینا، مگر ... اپنے لیے شوز لے لو ابھی۔ نہیں تو تمہارے پیروں ... حشر نشر ہو جائے گا۔" اس کا خلوص اس کے لہجے میں بول رہا تھا۔

وہ تو صرف شوز لینے کا کہہ رہی تھی، مگر اتنا جانتی تھی صرف شوز کی مد میں دی جانے والی رقم اتنی زیادہ تھی کہ وہ اس سے اپنی اور بھی بہت سی ضرورت کی چیزیں لے سکتی تھی۔ پتی کا ڈبا خالی تھا، اس نے تین دن سے ایک کپ چائے نہیں پی تھی، سبزی کی ٹوکری اجڑ چکی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس بھر کر وہ روپے اپنے بیگ میں ڈال لیے وہی خستہ حال بیگ، جس کی زپ اس نے کل ہی پلاس سے دبا کر ٹھیک کی تھی اور جس کی تمام اندرونی جیبیں ادھڑ چکی تھیں۔

کپ میں چائے انڈیلتے ہوئے اس کو کسی غیر معمولی احساس نے چھوا تھا اس نے یونہی پلٹ کر کمرے میں نگاہ ڈالی اور چائے کا برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ امی بے تابی سے ہاتھ پیر پٹختی کب سے اسے پکار رہی تھیں۔

ان کے منہ سے ڈھنگ سے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔ جانے کب ان کو اٹیک ہوا اپنی سوچوں میں گم ہو کر اسے پتا تک نہ چلا۔

کانپتے ہاتھوں سے دراز کھول کر اس نے ادھر ادھر مارا۔ خدا جانے ان ہیلر کہاں چلا گیا تھا۔ اس قدر ضرورت کی چیز۔ وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں ان ہیلر تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ امی کی حالت بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ وہ بری طرح تڑپتے ہوئے سانس کھینچ

رہی تھیں۔

"یا اللہ! کہاں چلا گیا۔"

کارنس پر رکھا سامان الٹ پلٹ کرتے ہوئے وہ بری طرح رو دی۔ جب ہی آنسوؤں کی دھند کے پار زمین پر بے یارو مددگار کھلونے کی طرح ان ہیلر پڑا دکھائی دیا۔ اس نے تیر کی طرح لپک کر ان ہیلر اٹھایا تھا۔

☆ ☆ ☆

"اوہ! زریاب کیسے ہو تم؟" حسب توقع رباب آنٹی اسے دیکھ کر خوش ہو گئی تھیں۔

"کتنے دن بعد شکل دکھائی ہے تم نے۔ لگتا ہے ہمیں بھول ہی گئے۔" وہ ان کی اپنائیت اور شکوے کے جواب میں بس مسکرا دیا۔

"یہ کون ہے۔" ان کی نظر کونے میں زمین پر بیٹھی لڑکی پر پڑ چکی تھی۔ ان کا چونکنا فطری تھا۔

"یہ بے سہارا لڑکی ہے کام چاہیے اسے۔ آپ کو میڈ کی ضرورت تھی آپ نے ذکر کیا تھا مجھ سے۔"

"او... ہاں۔" انہیں یاد آچکا تھا۔

"تو تم اسے لے کر آئے ہو۔"

"بس مجھے ٹھیک لگی۔ اکیلی ہے اس کے گھر والے تو ہیں نہیں۔ میں نے سوچا آپ کے پاس رہ بھی لے گی اور آپ کا بھی پرابلم سولو ہو جائے گا۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے معین!" ان کا ذاتی ملازم بوتل کے جن کی طرح حاضر ہوا۔

"اسے رسولن کے پاس لے جاؤ، یہ کچن میں کام وغیرہ دیکھ لے گی اور اب یہیں رہے گی۔" وہ اٹھ کر مودب سی معین کے پیچھے باہر نکلنے لگی۔

"کوئی فکر کی ضرورت نہیں آنٹی بہت اچھی ہیں تمہارا خیال رکھیں گی میں بھی آتا رہوں گا۔"

وہ سر ہلا کر باہر نکل گئی۔ مسز رباب نے بہت دھیان سے اس کے تسلی بھرے انداز کا نوٹس لیا تھا۔ بے سہارا غریب اور جوان لڑکیوں میں انہیں خاصی دلچسپی ہوتی تھی اور پھر ایسی لڑکی جو ان کا پسندیدہ شخص ان کے پاس لے کے آیا تھا۔ وہ زریاب کو بے حد پسند کرتی تھیں۔

ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو کر جب وہ بالکل موت کے دہانے پر پہنچ چکی تھیں تو زریاب نے ہی ان کو اسپتال پہنچایا تھا۔ یہ سالوں پہلے کا واقعہ تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد جب انہیں زریاب کا پتا چلا تو انہوں نے محض اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے اپنے پاس بلایا تھا۔ لیکن اس کی حالت اور اکیلے پن کے بارے میں جان کر نہ صرف اس کے بالانہ اخراجات کے لیے کچھ رقم بھی مخصوص کر دی تھی۔ بلکہ اس کی تعلیمی اخراجات بھی اپنے ذمے لے لیے تھے۔ زریاب ان دنوں رشتوں سے ناتا ٹوٹنے کے بعد بالکل مضمحل سا ہو گیا تھا وسائل کی کمی نے تعلیم کا سلسلہ منقطع کر رکھا تھا۔ تو دل ٹوٹ جانے کے بعد روزگار کا سلسلہ بھی بحالت مجبوری جیسے تیسے جاری رکھا ہوا تھا۔

مسز رباب کی حوصلہ افزائی سے اس نے ایک نئے عزم و عہد کے ساتھ دوبارہ ایڈمیشن لیا۔ گریجویشن کے بعد انہوں نے ہی اس کو جاب دلوائی تھی اور اس سے چھوٹی دونوں بہنوں کی شادیوں کے سلسلے میں بھی اس کی بہت مدد کی تھی۔ ان کے بقول زریاب نے ان کی جان بچا کر ساری زندگی کے لیے انہیں اپنا احسان مند کر لیا تھا۔ جواب میں انہوں نے زریاب پر جو احسانات کیے تھے وہ ساری زندگی نہیں چکا سکتا تھا۔

صاف ستھرے بزنس کی آڑ میں سیاہ دھندا کرنے والی مسز رباب کی شخصیت میں اگر کوئی انسانیت کا پہلو تھا تو وہ یہ کہ وہ دل کی امیر اور اپنے ملازموں کے ساتھ بہت اچھی تھیں اور زریاب پر تو ان کی خاص نظر کرم تھی۔ اگر آج وہ شان و شوکت کی زندگی جی رہی تھیں تو اس میں تھوڑا بہت ہاتھ یقیناً" زریاب کا ہی تھا جس نے انہیں اس ایکسیڈنٹ کے بعد بروقت اسپتال پہنچایا تھا۔

"چلو اگر تم بزی نہیں ہو تو میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"کچھ شاپنگ کرنی ہے تم سے گپ شپ بھی

ہوجائے گی۔"

"مجھے بھی رابی کے لیے گفٹ لینا ہے۔ کل اس کی ویڈنگ اینور سری تھی۔"

"اچھا کیسی ہیں تمہاری سسٹرز۔ چلو باقی باتیں راستے میں کریں گے اور سناؤ ناشتا کرلیا تم نے پہلے کچھ کھالیں گے۔ میں نے ناشتا نہیں کیا ہے اور ابھی مارکیٹس کھلی بھی نہیں ہوں گی۔" دونوں باتیں کرتے باہر کی سمت بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

امی پرسکون ہوچکی تھیں' اب نڈھال سی سر ڈالے پڑی تھیں۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر ٹھنڈے فرش پر بیٹھ گئی۔

ناہموار تیز تنفس کی آوازیں اس کی کانوں میں گونج رہی تھیں۔ بے بسی کے شدید احساس تلے اس کی آنکھیں چھت کو چھوتی زمین تک آئیں اور آنسوؤں سے بھر گئیں۔ چند ہی لمحوں بعد وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ مسہری پر پڑے تھکے ماندے وجود نے بمشکل سر اٹھا کے اسے دیکھا۔

"اب کیوں رو رہی ہے؟ اب ٹھیک ہوں میں چل چپ ہوجا۔" پھولی سانسوں کے درمیان وہ ٹھہر ٹھہر کر بات مکمل کرپائیں۔ اس نے جواب نہیں دیا اور بدستور رو رہی تھی۔

"ارے کیا ہوگیا ہے آج تجھے پاگل ہوگئی ہے کیا۔"

"ہاں پاگل ہوگئی ہوں میں۔" وہ ایک دم سر اٹھا کر چیخی۔

"پاگل ہوگئی ہوں میں پاگل۔" وہ پھر سے سر ہاتھوں میں گرا کر رو رہی تھی۔

"اور مجھے پاگل کرنے والی ہیں آپ۔"

"میں! اولاویں میں نے کیا کیا ہے۔"

"آپ نے مجھے اکیلا کردیا' بے سہارا کردیا مجھے۔ زریاب کو چھین لیا آپ نے مجھ سے۔ آپ نے ہی کہا ہوگا اس سے کچھ' مجھے یقین ہے اس لیے وہ پلٹ کر نہیں آیا سب کیا دھرا آپ کا ہے۔" اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ کتنے دنوں کا منہ بند آتش فشاں آج پھٹ پڑا تھا۔

"کبھی میری ماں بن کر نہیں سوچا۔ ہر بار ہر جگہ اپنی بٹی کو مجھ پر فوقیت دی۔ اب اگر آج آپ کو کچھ ہوگیا تو کیا بنے گا میرا' کہاں جاؤں گی' کیا کروں گی' کبھی سوچا آپ نے۔" دل کے کسی کونے میں سر جھکا کر بیٹھا خوف باہر امڈ آیا تھا۔

"اور جو تو بھی چلی جاتی مجھے چھوڑ کے تو میں۔۔۔ میں تو۔۔۔" امی کی کمزور آواز سناٹے کو بے ربط کرگئی۔

"تو یہاں بھی اپنا ہی سوچا نا۔ میرا تو نہیں۔"

"تو تو کون سا سوچتی میرے بارے میں۔ چلی جاتی اس کے سنگ مجھے چھوڑ کر یہاں ارے جب میری اپنی سگی اولاد نے پلٹ کر خبر نہ لی تو تو کہاں سے رکتی۔"

"میں رک جاتی امی میں کہاں جاتی' مجھے کہاں جانا تھا۔" اس کی آواز اور آنسو دونوں دھیمے پڑ گئے تھے۔

"ساری زندگی اولاد کی طرح پالا' لیکن اولاد نہیں سمجھا جب ہی تو بھروسہ نہیں کیا مجھ پر۔" اس کی آواز اب خود کلامی میں ڈھل رہی تھی۔

"کچھ بھی ہو' لیکن آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ بہت برا کیا۔"

آنسو پونچھ کر اٹھتی وہ واپس باورچی خانے میں چلی گئی۔ ٹھنڈی چائے دوبارہ سے چولہے پر چڑھاتے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

کبھی اداس موسم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ
دکھوں میں ہم تو گم سم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ

تمہارے بعد کیسی رونقیں اب دل کی بستی میں
سبھی چراغ مدھم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ

تمہاری یاد اس دل کو بہت تکلیف دیتی ہے
نگاہیں بھی تو پر نم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ

لگے ہیں زخم کتنے بے بہا دل پر محبت میں
تمہارے لفظ مرہم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ

نجانے کب یہ لڑکی ہار دے سانسوں کی بازی کو
اسے لاحق تیرے غم ہیں کبھی ملنے چلے آؤ

☼ ☼ ☼

شاپنگ سے واپسی پر اس کا موڈ رات کی نسبت بہت بہتر تھا۔ مسز رباب نے پہلے اسے اپنے فیورٹ ریسٹورنٹ سے ناشتا کروایا۔ پھر رابعہ کے لیے اپنی طرف سے بھی گفٹ خرید کردیا۔ وہ ان کا بے حد ممنون تھا۔

رابعہ کو گفٹ دیتے وقت اس نے اس کے چہرے پر جو خوشیوں کے رنگ دیکھے' دل میں بہت گہرائی تک اطمینان اتر گیا۔

ایک وقت تھا جب وہ ایک ایک روپیہ دانتوں سے پکڑ کر خرچ کرتا تھا۔ ماں اور بہنوں کے ساتھ ساتھ اپنی ضرورتوں سے بھی آنکھیں چراتا۔ ان کے ساتھ مل بیٹھنے سے گریز کرتا۔ ان کی سوال کرتی نگاہوں کا سامنا دن بدن مشکل ہوتا جارہا تھا۔

مسز رباب کی مہربانی سے اس کی پہلی جاب لگی تو وہ اس وقت ایک مکمل گریجویٹ بھی نہیں تھا۔ گریجویشن کرتے ہی زندگی میں آنے والی دو بڑی آسائشیں اسی گز کا فلیٹ اور آر سی سی کی گاڑی تھی۔ جو کچھ مسز رباب کی سفارش اور کچھ اس کی اپنی دن رات کی محنت سے بنائی گئی ریپوٹیشن کا ثمر تھی۔

گزرتے وقت نے جہاں اس کے ہاتھ میں ایم بی اے کی ڈگری تھمائی وہیں موجودہ کمپنی کے مالکان اور اسٹاف سمیت ماحول تک سب کچھ تبدیل ہوچکا تھا۔ ایسے میں این جی او سے آنے والی آفر کو وہ ٹھکرا نہیں سکا۔ اس کمپنی کے جی ایم کی حوصلہ افزائی اور مسلسل محنت کا یہ نتیجہ تھا کہ آج وہ 80 گز کے کمپنی کے فلیٹ سے دو سو اسی گز کے ذاتی گھر اور آٹھ سو کے بجائے اٹھارہ سو سی سی گاڑی کا مالک تھا۔ وہ آج بھی اپنے آفس میں اپنی محنت اور خدا ترس فطرت کی وجہ سے پہچانا جاتا تھا۔ لوگ اس کے کام کو مانتے بھی تھے اور عزت کی نگاہ سے بھی دیکھتے تھے۔ وہ اپنے رب کا جتنا بھی شکر گزار ہوتا کم تھا۔

☼ ☼ ☼

بہتے آنسو' رخساروں پر ثبت انگلیوں کے ابھرے ہوئے نشانوں سے پھسلتے' ان کی جلن میں اضافہ کررہے تھے۔ اس کے جبڑوں میں اب بھی دکھن باقی تھی۔

اور یہ جلن دکھن اس مزاحمت کا نتیجہ تھی جو مسز رباب کے میٹھے لہجے کا بھید کھل جانے پر اس نے کی تھی۔ بدگمانی اور وسوسوں کی آخری حد پر جاکر بھی اس نے یہ سب نہیں سوچا تھا جو اس کے ساتھ یہاں ہوگیا تھا۔

اس کا شوہر بدکردار تھا' وہ چپ چاپ سہہ گئی۔ شرابی تھا' زانی تھا۔ اس نے برداشت کیا۔ اسے اپنے کردار کو بچانا تھا خود کو صاف ستھرا رکھنا تھا۔ لیکن یہ سب کیسے ہوگیا یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

اس کا شوہر' اس کا شوہر تھا ہی نہیں' نکاح' نکاح تھا ہی نہیں' شوہر ایک مہرہ تھا' شکاری تھا۔ نکاح ایک ایگری منٹ تھا۔ باعزت اور قانونی اغوا کی طرح بلکہ بقول مسز رباب چھ مہینے اپنے نکاح میں رکھ کر اس نے مفت کے مزے لوٹے تھے۔ اب ان کی باری تھی اور انہیں اس کی چکائی گئی قیمت سود سمیت وصول کرنی تھی اور کیسے کرنی تھی' وہ بخوبی جانتی تھیں۔

پیسے کی لالچ میں اپنی سے دگنی عمر کے ایک بالکل انجان آدمی سے شادی کرتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ فقط چھ مہینے میں اس کا دل بھر جائے گا اور وہ اپنی عزت کی دلالی پر اتر آئے گا۔ ایک سیاہ کار عورت کے ہاتھوں بیچ کر چلا جائے گا اور اسے کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ وہی سجا سنورا کمرہ تھا جو کچھ دیر پہلے جیل نما لگ رہا تھا اب جہنم کی طرح دہک اٹھا تھا۔ آنسو بے آواز بہہ کر گریبان میں جذب ہورہے تھے۔

طلاق کے کاغذات اب اس کے پاس نہیں تھے۔

مسز رباب اپنے قبضے میں لے چکی تھیں۔ اس نے اپنے خالی ہاتھ دیکھے۔ اسے لگ رہا تھا اس کے پاس کچھ باقی نہیں بچا طلاق کے کاغذات سمیت مسز رباب ہر چیز پر قابض ہو چکی تھیں۔ اس کی زندگی، وجود، خوشیاں، یہاں تک کہ آتی جاتی سانسوں پر بھی۔

"کیا ہو گیا یہ سب کیا ہو گیا؟ میرے اللہ، میرے مالک مجھے بچالے۔ یہ میں کہاں آگئی ہوں، کہاں پھنس گئی ہوں۔"

خود کلامی کرتے کرتے اس کی آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

سردیوں کے موسم میں اسکول سے واپسی پر سر پر چڑھے سورج کی تپش راستے میں بڑا مزا دیتی تھی۔ لیکن اسے احساس تھا۔ گرمیوں میں یہی راستہ اس کے لیے بہت کٹھن ہو جائے گا۔

یوں ہی سوچوں میں ڈوبتے ابھرتے اس نے گھر کا دروازہ کھول کر صحن میں قدم رکھا تو امی کے ساتھ چارپائی پر کسی کو بیٹھے دیکھا۔

وہ انتہائی ضعیف اور جھریوں بھرا بوڑھا چہرہ اسے دیکھ کر مسکرایا اور وہ پہچان کے مراحل ایک لمحے میں طے کرتی ہوئی بھاگ کر اس مہربان وجود کی بانہوں میں سما گئی۔

"عظمت بوا، عظمت بوا۔"

وہ کتنی چاہت سے پکار رہی تھی اور وہ مہربان وجود اپنے پر حدت لبوں سے محبت کی گرمی اس کے چہرے پر لکھ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا آج شاید آنسو بہانے کا آخری دن ہے۔

زریاب سے وابستہ کسی بھی شخص کو اس نے کتنی مدت بعد دیکھا تھا۔ اسے لگا وہ تپتی دھوپ سے ایکدم ٹھنڈی چھاؤں میں آگئی ہے۔ وہ زریاب کی پیدائش سے بھی پہلے سے ان کی پڑوسن تھیں۔ ہر وقت کا آنا جانا تھا۔

زریاب اور رشا دونوں کی ماؤں کو انہوں نے اپنی منہ بولی بہن بنایا بھی تھا اور جتایا بھی تھا۔ جب تک زریاب اس گھر میں رہا ان کا یہاں آنا جانا بھی تواتر سے جاری رہا مگر زریاب کی والدہ کے انتقال کے بعد اس میں کمی آگئی تھی۔ یوں بھی یہاں وہ صرف رشا سے ملنے آتی تھیں۔ اس کی پیدائش کے وقت انتقال کر جانے والی ماں کو یاد کرنے۔ پھر ان ہی کی زبانی سے پتا چلا کہ زریاب اپنی بہنوں کو لے کر وہ گھر چھوڑ کر کہیں چلا گیا۔

کہاں ہے؟ یہ کسی کو پتا نہیں تھا۔ اس نے جاتے وقت بوا سے بھی ملنا گوارا نہیں کیا اور رشا کو تو اسے دیکھے بہت دن گزر چکے تھے۔ آخری بار بوا تب ہی آئی تھیں۔ اس کے بعد تو سب کچھ جیسے وقت اور حالات کی چکی میں پس کر نگاہوں سے اوجھل ہی ہو گیا۔

وہ جلدی سے دکان سے بیسن لے کر آئی۔ بوا کو محبت اور اصرار سے گرما گرم بیسنی روٹیاں کھلائیں۔ بوا اسے دعائیں دیتی نہ تھکتی تھیں اور خود تو وہ ایسے خوش تھی جیسے خزانہ مل گیا۔ کھانے کے بعد امی اونگھنے لگیں اور وہ ڈھیروں باتوں کی لالچ میں بوا کو لے کر ڈھلتی دھوپ میں پلنگ کھسکا کر فرصت سے آ بیٹھی۔

"بوا... مجھ سے... زریاب کی باتیں کریں نا۔" کافی دیر پرانا وقت یاد کرنے کے بعد اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ بوا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں..." ایک گہری سانس ان کے لبوں سے نکلی۔

"میں بھی اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا... کیا بات؟" اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"پہلے سوچا وقت گزر گیا اب کیا فائدہ، مگر دل پر بہت بوجھ ہے شاید کم ہو سکے۔"

"کیسا بوجھ بوا؟" اس کی دھڑکن بڑھ گئی۔

"پہلے یہ بتا، تیرا کوئی رشتہ وشتہ آیا؟" انہوں نے یکدم موضوع پلٹا۔ وہ جھنجلا گئی۔

"ارے نہیں آیا، آپ بتائیں نا کیا کہہ رہی تھیں۔"

"چل چھوڑ کیا کرے گی جان کر اب تو وہ چلا گیا جانے کہاں۔"

"بوا خدا کے لیے کچھ تو کہیں۔ آپ کو پتا ہے نا کیوں چلا گیا وہ یہاں سے سب چھوڑ کر۔ مجھے چھوڑ کر۔ آپ کو پتا ہے بوا، بتائیں نا آپ کو میری قسم۔" وہ باقاعدہ منتوں پر اتر آئی۔

"وہ تیری بہن کہاں ہے؟" انہیں اب اس کی یاد آئی۔

"شادی ہو گئی اس کی۔" اس نے بات نمٹائی۔

"ہیں... کس سے... کب؟"

"ایک بہت امیر کبیر آدمی کا رشتہ لائی تھی صفن خالہ۔ چپ چاپ نکاح کر کے روانہ کر دیا۔ بہت کم لوگ آئے تھے۔"

"ملنے آتی ہے، خوش تو ہے۔"

"ہاں ہاں خوش ہے۔ مہینوں بعد کبھی آتی ہے۔" اس نے جان چھڑائی۔

"دیکھ میری دھی۔ جو بات میں تجھے بتانے جا رہی ہوں وعدہ کر خود تک رکھے گی۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں دے گی۔"

"ہاں، ہاں نہیں دوں گی۔" اس نے جلدی سے شرائط و ضوابط نمٹائے۔ پیٹ میں بگولے سے اٹھ رہے تھے۔

"مجھ سے گھر چھوڑتے وقت رابعہ نے کہا تھا کہ تیری یہ جو چچی ہے، جو تیری ماں بن گئی ہے۔ اس نے اس سے کہا تھا کہ تو اور وہ آپس میں دودھ شریک بہنیں ہیں۔"

"کیا؟" اس کا منہ کھل گیا۔

"ایسا تیری ماں نے زریاب سے کہا تھا کہ تو اس کی بھی بہن لگتی ہے۔ تم دونوں کی آپس میں شادی نہیں ہو سکتی۔"

اس کے سر پر ہفت آسمان ٹوٹ پڑے۔ کہاں تو دھڑکنیں سینہ توڑ کر باہر آنے کو تھیں اور کہاں اب یہ لگتا تھا کہ مدھم ہوتے ہوتے تھم جائیں گی۔

"پر اصل بات یہ ہے کہ تیری ماں نے زریاب سے جھوٹ بولا تھا۔" اس نے بے اختیار منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو دبایا۔

"ایسی کوئی بات نہیں میرے سامنے کی تم دونوں کی پیدائش ہے۔ میں گواہ ہوں اس بات کی۔ جب میں نے ان کے جانے کے بعد آکر اس سے پوچھ تاچھ کی تو خدا رسول کے واسطے دے کر ہاتھ پیر جوڑ کر اس نے مجھے چپ کرا دیا۔ وہ اپنی نمو کو زریاب سے بیاہنا چاہتی تھی۔ پر ہوا کیا؟ اس نمانی کی عقل تو گھاس چرنے چلی گئی تھی۔ تیرا بھی نہیں ہو سکا۔ اسے بھی نہیں اپنایا۔ خدا جانے کہاں گیا زمانے کی خاک چھاننے۔ کہاں ہو گا، کیسا ہو گا؟" بوا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انہوں نے دوپٹا منہ پر رکھ لیا۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ بچی۔

"اصل میں تو میں بھی تیری مجرم ہوں۔ اگر اسی وقت رابعہ کو ساری بات سچ بتا دیتی تو آج تو اکیلے نہ ہوتی ایسے۔ پر مجھے کیا پتا تھا کہ اس کے جانے کے بعد تیری ماں تجھے کہیں اور بھی نہیں بیاہے گی۔ اسے صرف اپنی دھی کی فکر تھی اسے بیاہ دیا اس نے۔ تیرا کہیں کوئی ذکر ہی نہیں۔ تو مجھے معاف کر دے دھی رانی۔ تاکہ رب سوہنا بھی مجھے معاف کر دے۔"

وہ اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر سسک پڑیں۔

"میری راتوں کی نیندیں دل کے بوجھ نے حرام کر دی ہیں۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا وہ ایسے غائب ہو جائے گا اور تیری ماں نمو کی شادی کر کے تجھے بھول جائے گی۔" اس کی نظریں بوا کے بندھے ہاتھوں پر جم گئیں۔

"وہ مجھے بھول ہی تو نہیں سکیں بوا۔ امی کو میں ہمیشہ یاد رہی۔ امی جو میری سگی ماں تھیں نہ سوتیلی، میری ماں تو نہ بن سکیں۔ لیکن نمو کی ماں ہونے کا فرض خوب نبھایا انہوں نے۔" ڈبڈبائی آنکھوں سے سوچتی وہ کہاں سے کہاں نکل گئی تھی۔

"اور میں... میں چلی جاتی تو ان کا سہارا کون بنتا۔ مجھے کوئی اور مل جاتا تو میں انہیں چھوڑ دیتی۔ اس لیے

میرے آگے بڑھنے کا راستہ بند کر دیا انہوں نے۔ میری بیساکھیاں چھین کر مجھے بے سہارا کر دیا۔ وہ مجھے کبھی نہیں بھول سکیں بوا۔ بھول سکتی ہی نہیں تھیں۔ بس اس پاک ذات کو بھلا دیا انہوں نے۔ جو سب کا سب سے بڑا سہارا ہے۔"

وہ بوا کے ہاتھوں پر چہرہ ٹکا کر رو پڑی۔

"آپ نے تو کچھ نہیں کیا بوا۔ مجھے شرمندہ مت کریں۔"

☆ ☆ ☆

صبح کا اجالا پوری طرح پھیلا نہیں تھا۔ ہر چیز موسم کی شدت کی لپیٹ میں تھی۔ کہر زدہ اشجار، اداس رستے، ویران راہیں، اسے ڈرائیونگ کرتے دو گھنٹے ہونے والے تھے۔

جب وہ اپنے شہر کی حدود میں داخل ہوا تو آنکھوں میں سرخی کے ہلکے سے ڈورے تھے۔ اس نے گاڑی کچھ سوچ کر جانے بوجھے رستوں پر ڈال دی۔ کال بیل پر انگلی رکھتے وقت کسی کا حیران چہرہ نگاہوں میں تھا۔

"زریاب! اف زریاب کے بچے اتنی صبح۔" آئمہ کی چیخ نما آواز سے پورا فلیٹ گونج کر رہ گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور پانی کی بوندیں چہرے پر چمک رہی تھیں۔ لائبہ ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ ان کی امی بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گئیں۔

"میں نے سوچا سرپرائز دے دوں۔"

"بہت اچھا کیا۔" وہ اسی حلیے میں اس کے ساتھ ناشتا کرنے بیٹھ گئی۔ گرما گرم خستہ پراٹھوں اور سنہری آملیٹ کے ساتھ بھاپ اڑاتی چائے کی مٹھاس بھری خوشبو نے اس کی آدھی تھکن تو ویسے ہی اتار دی تھی۔

لائبہ شرماتی ہوئی اس کے آگے چیزیں رکھتی رہی اور وہ دونوں بہنوں کو دیکھتا سوچتا رہا کہ بہت جلد دو ٹوک بات کرنی پڑے گی۔

☆ ☆ ☆

نہایت آرام دہ اور عمدہ ڈیزائن سے مزین جہازی سائز بیڈ پر بیٹھی وہ اپنے ریشمی گاؤن کے ربن سہلا رہی تھیں۔ نگاہوں میں کسی سوچ کی گہری پرچھائیں تھیں۔ سامنے کھڑی ملازمہ خاص ان کی اگلی بات کی منتظر تھی۔ کافی دیر بعد انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"ٹھیک ہے۔ آج کھانا دینے کی ضرورت نہیں۔ کل شام تک دیکھو پھر بھری ہوئی ٹرالی لے جانا۔ اس کا باپ بھی بھوکے کتوں کی طرح ٹوٹ پڑے گا۔" ملازمہ شکایت لے کر آئی تھی کہ مسز بابر سلطان جو اب پھر سے نعیمہ گل بن چکی ہے۔ کھانا کھانے کو تیار نہیں۔ وہ احتجاجاً کھانے سے منہ موڑے بیٹھی تھی۔

دو دن تک مسلسل بھوکے رہنے سے دوسرے دن رات تک اس کی آنتیں بری طرح بل کھا گئی تھیں اور تیسرے دن صبح تک وہ اپنی بھوک سے بالکل ہار چکی تھی۔ جبھی گرما گرم ناشتا دیکھ کر اس سے رہا نہیں گیا۔ مسز رباب تک تمام رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے سنتی رہیں۔

"ٹھیک ہے اسے پیٹ بھر کے کھانے دو۔ ڈسٹرب نہیں کرنا درمیان میں۔" کچھ دیر بعد ملازمہ انہیں اطلاع فراہم کر چکی تھی کہ اس نے ناشتا برضا و رغبت ختم کر لیا ہے۔

"ہم اس کے کمرے میں جا رہے ہیں۔ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے۔ ضروری بات کرنی ہے۔" وہ بڑے پر تمکنت اور فیصلہ کن انداز میں بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆ ☆ ☆

اسکول میں اس کی غیر حاضر دماغی کو سب ہی نے نوٹ کیا تھا۔ دو بار اس نے ایک ہی سوال کا غلط جواب لکھ ڈالا۔ اس کے دھیان کے پرندے بار بار احتیاط کا جال کتر کر پرواز پکڑ لیتے تھے۔ بچے اس کے سامنے کھڑے سوال کرتے رہتے اور وہ ان کا چہرہ تکتی رہ جاتی۔ اصل میں تو ہر چہرے کے پیچھے ایک ہی چہرہ تھا۔ ہر آواز کی اوٹ سے ایک ہی آواز جھانک رہی تھی۔ بریک ختم ہونے پر بیل بجی تو ساتھی کولیگ کو باقاعدہ

اس کا شانہ ہلا کر ہوش میں لانا پڑا۔ باقی کا سارا وقت وہ اپنے آپ کو حواسوں میں رہنے کی تلقین کرتی رہی۔

چھٹی کے بعد گھر پہنچ کر اس نے جوں ہی صحن میں قدم رکھا تو سارا صحن جیسے سرما کی سنہری دھوپ کے بجائے گرما کی آگ اگلتی، چبھتی تپش سے بھر گیا۔ وہ محلے کی کسی خاتون سے امی کی کہلوائی گئی بات کہنے گئی تھی انہوں نے اصرار کر کے چائے پینے بٹھا لیا اور جب اس کی واپسی ہوئی تو...

وہیں صحن میں نعیمہ کھڑی تھی۔ گم سم سی کسی دھیان کا سرا پکڑے۔

"کیا ہوا انمو؟"

"کچھ نہیں۔" اس کا انداز صاف ٹالنے والا تھا۔

"زریاب آیا تھا کیا؟"

"تمہیں کیسے پتا۔" وہ اندر کی سمت بڑھ گئی۔

"اس کا مطلب ہے آیا تھا۔"

"ہاں آیا تھا، امی سے کچھ بات کرنے، تمہیں کیسے پتا چلا اس کے آنے کا۔" اب کی بار وہ کچھ جھنجلائی تھی۔ شاید یہ کہنا چاہ رہی تھی کہ "تمہیں کیوں پتا چل گیا اس کے آنے کا۔"

"وہ مجھ سے کہہ کر گیا تھا۔ آج آنے کا مگر..." وہ الجھی۔

"اتنی جلدی کیوں چلا گیا؟"

"مجھے کیا پتا۔" وہ تنک گئی۔ اس کا یہ انداز اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ مزید اس موضوع، بلکہ کسی بھی موضوع پر اس سے بات نہ کی جائے۔

"امی زریاب آیا تھا۔ اتنی جلدی کیوں چلا گیا۔" اب وہ ان کے سر پر سوار تھی۔

"کہہ رہا تھا اسے کہیں جانا ہے۔" وہ سلائی مشین میں دھاگہ ڈال رہی تھیں۔

"آپ سے کیا بات ہوئی۔" اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ اس سے ملے بغیر بھی جا سکتا ہے۔

"کچھ خاص نہیں بچیوں نے سلام کہلوایا تھا اور..."

"اور..." وہ مشین پر جھکا ان کا چہرہ کھوج رہی تھی۔ انہوں نے سیدھا ہو کر اسے دیکھا۔

"اور کیا کچھ نہیں، کیا کوئی خاص بات کرنی تھی اسے مجھ سے؟" وہ الٹا اسی سے پوچھنے لگیں۔ اس نے گڑبڑا کر گہری سانس لی۔

"مجھے کیا پتا میں تو خود آپ سے پوچھ رہی ہوں۔" وہ ذرا تیز ہوئی۔

"تو تمہیں اتنی کھدبد لگی ہے میں سمجھی کرنی ہو گی کوئی بات۔" امی کان پر سے مکھی اڑا کر پھر مشین پر جھک چکی تھیں۔ وہ الجھن بھرے انداز میں دھیرے سے اٹھی۔

"اتنی جلدی کیوں چلا گیا وہ بھی مجھ سے ملے بغیر۔" امی نے کن انکھیوں سے اسے جاتے دیکھا پھر پکار بیٹھیں۔

"سن۔" وہ یوں ہی بے خیالی میں پلٹی۔

"ذرا یہ سوئی میں دھاگہ تو ڈال دے۔" وہ یوں ہی چلتی ہوئی ان تک آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

زریاب جانتا تھا آئمہ اسے اپنی بہن لائبہ کے لیے پسند کرتی ہے۔

آئمہ اس کی بہت اچھی دوست تھی اور ایک کولیگ سے دوست اور پھر بہت اچھی یا سب سے اچھی دوست بننے کے لیے زیادہ تر کوشش خود اسی نے کی تھی۔

وہ آفس میں شروع سے کافی لیے دیے انداز میں رہتا تھا۔

خوش اخلاق تو وہ تھا لیکن کسی سے اتنا فری نہیں ہوتا تھا کہ غلطی سے بھی کسی کو اس کے ماضی میں جھانکنے یا ذاتیات میں دخل اندازی کا موقع مل سکے۔

آئمہ کی بے تکلفی پر پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کے بادل تب چھٹے، جب آئمہ نے خود اسے بتایا کہ وہ کہیں انگیجڈ ہے اور جلد یا بدیر شادی کے بعد بیرون ملک چلی جائے گی۔ دل و دماغ سے دھند چھٹی تو آپس کی بے تکلفی بڑھی اور ایک اچھی دوستی میں بدل گئی۔

وہ خود بھی کئی سال تک اکیلے پن کا عذاب جھیلتے تھک چکا تھا۔ مسز رباب کی اس کے لیے حیثیت ایک دوست یا محسن کی طرح تھی۔ عمر کا فرق بھی واضح پہلو تھا۔ ایسے میں آئمہ کی بے غرض دوستی نعمت خداوندی سے کم نہ تھی۔

جس دن زریاب کی پروموشن ہوئی اور وہ اس کے کولیگ کے ساتھ ساتھ اس کے افسران میں شامل ہوا' اسی دن آئمہ کو اسے بہنوئی بنانے کا خیال سوجھا تھا۔ اس نے نہ صرف گھر میں ذکر کردیا بلکہ زریاب کو بھی فوراً "ہم خیال" بنانے میں دیر نہ کی۔

زریاب کی دوستی پر اسے بہت بھروسا تھا۔ اسے یقین تھا زریاب کبھی انکار نہیں کرے گا۔ لیکن اس کے یقین کو ٹھیس پہنچی۔ زریاب نے نہ صرف انکار کردیا' بلکہ آئندہ اس قسم کی کوئی بھی بات کرنے سے معذرت بھی کرلی تھی۔ اس کا لہجہ سخت اور بے لچک تھا کہ آئمہ اس سے اس کی وجہ تک نہ پوچھ سکی۔ مگر بہرحال اسے اپنی حدود کا اندازہ ہوگیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم اچھی طرح سوچ لو۔" کمرے میں ان کی نرم اور بظاہر پرخلوص آواز گونج رہی تھی۔ اتنے دن سے اس کا چیخنا' چلانا' مزاحمت احتجاج اور بھوک ہڑتال سب ہی کچھ بے کار گیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ بظاہر جیسے نظر آرہے تھے یہ سب لوگ ویسے تھے نہیں۔ نہ اتنے رحمل' نہ پرخلوص' نہ سچے نہ سیدھے اور نہ ہی شریف۔

"حالانکہ میں اتنا ٹائم ضائع کرنے کے حق میں نہیں۔ لیکن تمہیں سنبھلنے کے لیے وقت دینا چاہتی ہوں۔ عدت بھی ہوجائے گی کیونکہ راستہ بہرحال ایک ہی ہے اور تمہارے سامنے ہے۔" خاموشی کے وقفے میں اس کی دم توڑتی سسکیاں سناٹا چیر رہی تھیں۔

"فیصلہ تمہیں وہی کرنا ہے جو ہم نے کروانا ہے۔ جلد یا بدیر اور ہوسکتا ہے زیادہ دیر لگانے پر ہمیں تمہارے اوپر اپنا فیصلہ ٹھونسنا پڑے۔ میں ایسا نہیں چاہتی۔ ہمیں زور زبردستی اور تشدد پسند نہیں۔ بہتر ہوگا تم خود ہی اپنے لیے بہتر فیصلہ کرلو۔ بھول جاؤ تمہارا کوئی ماضی تھا' گھر تھا' شوہر تھا۔ یوں سمجھو وہ بدطینت بدکردار' بدمست آدمی اور وہ غربت بھری زندگی جو تم نے شادی سے پہلے گزاری' سب کچھ ایک بھیانک خواب تھا۔"

وہ بہت دلفریبی سے لفاظی کا سنہری جال اس کے گرد بن رہی تھیں۔

"اور خوابوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ آنکھ کھلی اور ختم۔ بعض اوقات تو یاد بھی نہیں۔۔۔" ان کی بات ادھوری رہ گئی تھی وہ اٹھ کر گرنے کے انداز میں ان کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

"اللہ کے واسطے' رسول کے واسطے' اگر تمہاری کوئی اولاد ہے' کوئی بیٹی ہے یا تم خود کسی کی بیٹی ہو تو واسطہ ہے تمہیں اس رشتے کا۔ مجھے جانے دو' میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ مجھے جانے دو' میں وہ سب نہیں کرسکتی جو تم چاہتی ہو' خدا کے لیے۔"

وہ ان کے پیر پکڑے بلک رہی تھی۔ مسز رباب کے لیے یہ التجائیں اور منتیں' کچھ بھی نیا نہ تھا۔ کتنی ہی لڑکیاں ان کے پیروں میں گر کر روئیں تھیں' گڑگڑائی تھیں۔ وہ پہلی لڑکی تھی نہ آخری۔ انہوں نے دھیرے سے پیر پیچھے کیے۔

"بے کار میں وقت ضائع کررہی ہو۔ اتنا کیوں رو رہی ہو میری جان۔" انہوں نے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی اونچی کرکے سسکتا' سرخ چہرہ دیکھا۔

"دیکھو تو کیا حال کرلیا اور میں تمہیں جانے بھی دوں تو کہاں جاؤ گی ہاں۔" وہ بدستور سسک رہی تھی۔

"اٹھو اٹھو!" بے مثال ہمدردانہ اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے انہوں نے اسے بستر پر بٹھادیا۔

"تم اپنے گھر نہیں جاسکتیں کیونکہ تمہارا شوہر تو اب تک تمہیں کسی فارن کنٹری میں فوڈ پوائزنگ کرواکے مار چکا ہوگا بلکہ اب تک تو تمہاری تدفین بھی ہوچکی ہوگی۔ ایک ایسے قبرستان میں جہاں تمہاری بوڑھی دمے کی مریضہ ماں کبھی نہیں پہنچ سکتی۔ ایک ایسی قبر میں جس کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں اور جس کا کتبہ تمہارا کوئی نام لیوا کبھی نہیں پڑھ سکتا۔"

اس کا چہرہ دیکھ کر انہوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔

اس لمحے وہ نعیمہ کو بالکل خون آشام ڈائن کی طرح لگیں' جو اپنے نوکیلے پنجوں سے اس کا وجود کھسوٹنے اور خون پینے کے لیے بالکل تیار بیٹھی تھی۔

"ان کے لیے تم مرچکی ہو ڈارلنگ۔ وہ تو تمہاری ان دیکھی صورت پر رو دھو کر صبر کرچکے ہوں گے۔ بلکہ اب تک تو تمہارے قل کے چنے بھی بٹ چکے ہوں گے۔" وہ پھر سے بلند و بانگ قہقہے لگارہی تھیں۔

نعیمہ نے بے حد نفرت سے ان کا مکروہ چہرہ دیکھا۔

اک پل کو اس کا جی چاہا اس خوب صورت چڑیل کا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ کر اتنا بھیانک کردے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ لیکن وہ جانتی تھی وہ ایسا نہیں کرسکتی۔ کم از کم انہیں دھکا دے کر یہاں سے نکل بھاگے۔ لیکن یہ بھی ممکن نہ تھا۔ اسے اپنے کمرے سے لے کر بیرونی دروازے کا راستہ بھی ٹھیک سے معلوم نہ تھا اور فاصلہ کتنا تھا' یہ بھی نہیں پتا تھا' پتا ہوتا بھی تو کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ اس محل کی ملکہ کے پالے ہوئے دیوہیکل باڈی گارڈز اور ڈھیروں ملازم ایک پل میں اسے چت کرکے بے بس کرسکتے تھے۔ ایک پل میں وہ ممکنات اور ناممکنات کا سفر دور تک طے کر آئی تھی۔

بلکہ۔۔۔ بلکہ وہ تو۔۔۔ اس عورت کے اشاروں پر چلتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ بھی۔۔۔ آگے سوچنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اسے پورے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼
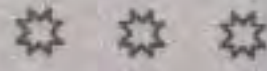
فضا میں سوگواریت کی باس کے ساتھ اگربتیوں کی خوشبو گھل مل رہی تھی۔ گھر کے اکلوتے کمرے میں بچھی چاندنی پر دس بارہ عورتیں بیٹھی سیپارہ پڑھ رہی تھیں۔

ایک کونے میں سلمیٰ بیگم رشنا کی بانہوں میں سمٹی سسک رہی تھیں۔ ہر تھوڑی دیر بعد وہ بے قابو ہو کر پچھاڑیں کھانے لگتیں۔

"نمو۔۔۔ ہائے میری نمو۔۔۔ کہاں چلی گئی تو نمو۔" ایسے میں رندھے گلے سے ان کو صبر کی تلقین کرتی رشنا کو خود بھی یقین نہ آتا تھا کہ نمو اب اس دنیا میں نہیں رہی۔

"امی! امی طبیعت خراب ہوجائے گی۔ خدا کے لیے سنبھالیں خود کو۔" دائیں طرف بیٹھی عظمت بوا بھی دلاسا دینے میں ناکام تھیں۔ خبر تھی ہی اتنی غیر متوقع اور اندوہناک۔ عورتیں ترحم بھرے انداز میں بین کرتی سلمیٰ بیگم کو دیکھتیں اور نم آنکھیں پونچھ کر سیپارہ پڑھنے لگتیں۔

"خدا کے لیے امی خود کو سنبھالیں۔ اللہ سے اس کے ایصال ثواب کے لیے دعا کریں نا۔" وہ خود جیسے اس دکھ کے بوجھ سے عاجز آکر بکھر چکی تھی۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ اندر سے کتنی کمزور ہوچکی ہے۔ کل جب پڑوس سے بابر سلطان احمد کے فون کی خبر آئی تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اسے کیا خبر سنانے والا ہے۔

اپنے اندازوں کی آخری حد سے باہر نکل کر ناممکنات تک پہنچ کر بھی وہ نمو کی موت کے بارے میں نہیں سوچ سکتی تھی۔ وہ صدمے سے گنگ سی ہوگئی تھی۔

"لیکن اتنی اچانک کیسے؟" اس کے منہ سے آواز ہی نکل پارہی تھی۔

"بس جب اللہ بلالے تو بندے تو کچھ نہیں کرسکتے نا جی۔" پتا نہیں وہ کون تھا اور بابر سلطان کا کیا لگتا تھا۔

"بہت بڑا ایکسیڈنٹ تھا جی بھابھی جی تو پہچانی نہیں جارہی تھیں۔ بابر بھائی کی حالت بھی نازک ہے۔ وہیں دبئی کے اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ آپ دعا کیجیے گا جی۔ اللہ انہیں بہتر کرے اور بھابھی جی کی مغفرت کرے۔ ڈیڈ باڈی کی حالت بہت خراب تھی۔ پاکستان لانے کا ٹائم نہیں ہے۔ اس لیے یہیں تدفین کروا رہے ہیں۔" فون کرنے والا خود بھی رو رہا تھا اور

اس کی اپنی حالت تو دیدنی تھی۔ فون سن کر وہ وہیں اتنا تڑپ تڑپ کر روئی کہ سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ شگفتہ بیگم تو پھر ماں تھیں۔ ان سے صبر کی امید رکھنا ہی بے وقوفی ہی تھی۔

"بے چاری کی ایک ہی لڑکی تھی، وہ بھی چلی گئی چھوڑ کے۔"

"بے سوچے سمجھے، پیسے کی لالچ میں ایسے انجان لوگوں میں بیاہ دیا اب کیا کرے گی۔"

"ہائے نہ جانے کہاں جا کے اس کا آخری ٹیم آنا تھا۔ آخری دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔"

"چچ چچ۔ کوئی لڑکا ہی ہوتا بڑھاپے کا سہارا۔" تعزیت کے لیے آئی تمام ہی محلے کی عورتوں کو ان سے ہمدردی تھی لیکن اپنے اپنے انداز کی۔

☆ ☆ ☆

"ایک تو اسے اردو نہیں آتی۔" مسز رباب اس سے بہت پریشان تھیں۔

"تم اسے سکھانے کی کوشش کرو اسے اردو آجائے تو اچھا ہے۔" وہ بے زار نظروں سے سامنے بیٹھی شائل کو دیکھ رہی تھیں۔

"یہ زریاب بھی کیا چیز اٹھا کے لایا ہے۔" بات نہ سمجھ پانے کے باعث وہ یہاں کے دوسرے ملازمین کے لیے مسئلہ بن رہی تھی۔ یہ بات بہت جلد مسز رباب کے علم میں آگئی تھی۔

"اچھا۔ ایسا کرو۔" وہ کچھ سوچ کر سکینہ سے مخاطب ہوئیں۔

"اسے مٹھل کے پاس لے جاؤ کہنا اسے تھوڑی سی اردو سکھا دو۔ سندھی اس کو آتی ہے۔ کچھ نہ کچھ تو یہ بھی سمجھتی ہوگی۔" انہوں نے اپنے ڈرائیور کا نام لیا۔ ملازمہ سر ہلا کر اسے لے کر چلی گئی۔

"اب میرے کرنے کو کوئی کام نہیں بچا تا، جو یہ کھٹ راگ سمیٹوں بیٹھ کے۔" بے زاری سے بڑبڑاتی ہوئی وہ سیل پر کوئی نمبر ملانے لگیں۔

☆ ☆ ☆

زندگی گزارنے کے سبھی راستے مسدود ہو چکے تھے سوائے ایک کے۔ صرف ایک راستہ کھلا تھا۔ گناہ کی دلدل کا، غلیظ اور گندگی میں لتھڑا ہوا۔ اسے اس گندگی میں اترنا ہی تھا۔ بہت مشکل تھا اس کے لیے خود کو آمادہ کرنا، لیکن مسز رباب کو اس مشکل کو آسان بنانا اچھی طرح آتا تھا۔ دیر سے ہی سہی لیکن اپنے خوب صورت چہرے پر سجا دوستانہ نقاب اتار کر وہ ایک بار پھر اس کے روبرو تھیں۔

"دیکھو میں آخری بار پوچھنے آئی ہوں تم سے۔"

"میرا جواب پتا ہے آپ کو میں۔۔۔" اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ وہ خائف تھی۔ تب ہی لہجے میں انکار تو تھا لیکن دم ندارد۔

"میں نے سوچا، شاید تم نے اپنا فیصلہ بدل لیا ہو۔" اس نے جواب نہیں دیا۔

"کیوں خود سے دشمنی پر اتر آئی ہو تم۔" انہوں نے اپنے تئیں اسے سمجھانے کی آخری ہمدردانہ کوشش کی۔ پھر تھک کر دروازے سے کسی کو آواز دی۔

"مٹھل۔۔۔ او مٹھل۔" چند لمحوں بعد دروازے سے دیو ہیکل ڈراؤنا سا چہرہ نمودار ہوا۔ نوک دار مونچھیں بڑھ کر کانوں کی لو میں چھو رہی تھیں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے اور نظریں ندیدوں کی طرح اس پر سرسرا رہی تھیں۔

"لو بھئی مٹھل! سنبھالو اب خود ہی۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دونوں کو دیکھتی سرہانے سے چپٹ سی گئی تھی۔ مسز رباب ترحم آمیز انداز میں اسے دیکھتی اٹھ کر دروازہ بند کرتی باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

دن ایک ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے کتنے آگے نکل گئے تھے۔ شائل اردو بولنا سیکھ رہی تھی۔ اسے کپڑے پہننے کی تمیز آگئی تھی، اس کے ہاتھ میں ذائقہ تھا۔ مسز رباب گھر پر خاص طور پر اس سے کھانا پکوا کر کھانے لگی تھیں۔ مٹھل سے نعیمہ کی عزت کی

دھجیاں اڑوانے کے بعد اسے اپنے راستے سے لگانا بہت سہل ہو گیا تھا۔

اس کے اندر یقیناً "دوبارہ" کسی مٹھل کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں بچی تھی۔ ایک ہفتے تک اس کے چہرے پر دردناک سوجن چڑھی رہی تھی۔ جسم کا ایک ایک انگ دکھتا رہا۔ نوکیلے ناخنوں کی کھرونچوں سے خون رستا رہا۔ جبڑے اپنی جگہ سے ہل گئے تھے، ٹانگیں اینٹھ چکی تھیں۔

دو دن تک وہ بستر پر کروٹ بدلنے کے لیے بھی دوسروں کی محتاج رہی۔

ایک ہفتے بعد جب اس کے چہرے کی سیاہی مائل نیلاہٹیں، ہلکی زردی میں بدل رہی تھیں تو وہ ایک بار پھر اس کے کمرے میں موجود تھیں۔

اس بار صرف وہ بولتی رہیں اور نعیمہ نفرت سے انہیں دیکھتی رہی۔

"عدت گزار لو پھر لیلیٰ آئے گی تو تمہیں ڈریسنگ اور میک اپ کی تمیز بھی سکھا دے گی۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر دروازے کی طرف مڑیں، پھر کچھ سوچ کر پلٹیں اور اس تک آئیں۔

"بے فکر رہو میری جان اب مٹھل جیسے وحشی سے تمہارا سامنا نہیں ہوگا۔" انہوں نے مسکرا کر اس کی ٹھوڑی چھوئی۔

"اور اگر آئندہ بھی میرے کہنے پر چلتی رہیں تو میں تمہارا خاص خیال رکھوں گی۔" اس نے نفرت سے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ ہنستی ہوئی باہر نکل گئیں۔

☆ ☆ ☆

ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں اپنے پر تپش عکس سے گہرے پانیوں کو بھی نارنجی جلا بخش رہی تھیں۔ وہ کراچی آتا تو اکثر ہی یہاں آتا رہتا تھا۔ لیکن اسے کراچی نہیں آنا تھا۔ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ پھر بھی وہ یہاں آگیا تھا۔ جانے کیا کرنے۔ وہ خود بھی بے خبر تھا۔ اپنے مستقبل سے لاعلم۔ حال سے انجان، صرف ماضی کے سیاہ و سفید اوراق پلٹتا۔ ان رنگوں میں، ان یادوں میں ڈوبتا ابھرتا رہتا۔ ان گلیوں میں بھٹکتا رہتا۔ جہاں اس کا شرارتی بچپن، امنگوں بھرا لڑکپن اور خوابوں سے سجی جوانی گزری تھی۔ شوریدہ سر لہریں اس کے شکستہ قدموں سے ٹکرا کر پلٹتی رہیں۔ وہ جھکے کندھوں کے ساتھ رکے رکے قدم لیے ساحلوں کی تنہائی بانٹتا رہا۔ کبھی کوئی آواز پل بھر کو اس کے قدم تھام لیتی۔

"وہ تمہاری بہن ہے۔ رضاعی بہن۔ تم نے اس کے بارے میں سوچا بھی کیسے۔" اس کی رگوں میں کوئی انگارے دہکا گیا۔ لفظوں کے کانچ ٹوٹ کر سماعتوں میں پیوست ہو جاتے۔ پگھلے سیسے انڈیلتے سفاک الفاظ بھری ہوئی سوچوں کا شور شرابا چیر کر اس تک پہنچتے رہے۔ جن کی آنکھوں کے سرخ ڈورے گہرے ہوتے چلے گئے۔ اور ناکام تھکے ماندے پیر جوتوں کی نوک سے پتھر اڑا رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

راتیں جاگ اٹھی تھیں۔ تلخ جام حلق سے اتارتے، ابکائیاں لینے کے بعد بے دریغ لنڈھانے کی عادت بھی پڑ ہی گئی۔ میک اپ کی موٹی تہوں میں چہرے پر پڑی اذیت نے سر چھپا لیا۔

بڑی سی چادر کی اوٹ میں ڈھکا رہنے والا جسم کھلی دعوت عام کا روپ دھار گیا۔ لمبی لمبی گاڑیاں جن کے دروازوں میں لگے آٹومیٹک لاک کبھی کھولنا اس کے بس کی بات تھی نہ بند کرنا۔ اب وہ ان کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کی پریکٹس میں تھی۔ کمر کو چھوتے لمبے بال، سلکی اسٹریٹ شولڈر لیئرز میں بدل گئے۔ رنگ برنگے لینس کے پیچھے بلتجی آنکھوں کا رنگ کیا تھا خود اسے بھی یاد نہ رہا تھا، ہیروں اور سچے پتھروں سے مزین انگوٹھیوں سے سجی انگلیاں گواہ تھیں۔ ان ہاتھوں نے کبھی دس بیس روپے سے زیادہ مہنگا نقلی زیور تک نہ پہنا تھا۔

سوکھی سنولائی کلائیاں، صحت مند ہو کر جتنی سڈول اور پرکشش ہوتی گئیں۔ انہیں تھامنے، موڑنے

والوں کی تعداد میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کبھی ایک بڑی سی چادر اوڑھے وہ گھر کے اندر اور باہر کے کتنے ہی کام نبٹا لیتی اور کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ اب اس کے لیے بالشت بھر کا اسکارف سنبھالنا مسئلہ تھا۔

نیا نام' نیا چہرہ' شناخت' شناختی کارڈ اور اب پاسپورٹ بھی۔

"پاکستان میں تمہارے ڈھنگ کے قدر دان نہیں ہیں ڈارلنگ' تمہیں تو وہاں ہونا چاہیے جہاں دن رات دولت کے انبار تم پر سے صدقہ کیے جائیں اور تمہارے حسن کو خراج ملتا رہے۔ صبح شام تمہاری اور تمہاری خوب صورتی کی نظر اتاری جائے۔"

"لیکن کیا میں اکیلی جاؤں گی؟ آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" اندر کہیں ان ہی تنگ و تاریک گلیوں میں پروان چڑھنے والی لڑکی آج بھی چھپی بیٹھی تھی۔

"میں کیا کروں گی جا کے کام تمہارا ہے جانا بھی تم ہی کو ہوگا جانی۔" مسز رباب کی اداؤں کا وہی عالم تھا۔

☼ ☼ ☼

اماوس کی راتیں اور جاڑے کا موسم مل کے' راتوں کو کچھ اور بھی تنہا بنا دیتے ہیں اسے بھی اداسی پورے کمرے میں چکراتی ہوئی لگ رہی تھی۔ آج رسولن' بڑی بیگم کے ساتھ ہی کہیں گئی تھی۔ کہیں دعوت میں کسی کام والی کی ضرورت تھی اس سے پہلے اسے کمرے میں کبھی رات کو اکیلے رکنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ان کی خادمہ خاص' جو اندرونی و بیرونی معاملات اور دوسرے نوکروں کی نگرانی پر معمور تھی۔ وہ اور اس جیسے دوسرے ملازمین جو مسز رباب کے خاص اور قریبی لوگ تھے۔ گھر کی سب سے اوپری منزل پر رہائش پذیر تھے۔ وہ یہاں سرونٹ کوارٹرز میں نہیں رہتے تھے۔ گھر کے مکینوں کو حاصل پر تعیش بیڈ رومز کی چند ایک آسائشات ان کو بھی حاصل تھیں۔ جیسے چھوٹا سا سہی لیکن ذاتی کمرہ' اچھی قسم کا فرنیچر۔ بیڈ روم سیٹ جس میں وارڈ روب اور ڈریسنگ بھی شامل تھی۔

شاہل یہاں آ کے کافی خوش بھی تھی اور مطمئن بھی۔

تیز ٹھنڈی ہوا دروازے کے پٹ دھڑ دھڑا رہی تھی۔ اس کو ان آوازوں سے ڈر محسوس ہو رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے دور تھی۔

وہ گھبرا کر دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ لان میں بیرونی دروازے کے قریب چند ایک لائٹس جل رہی تھیں۔

اس نے دور چوکیدار کی کرسی کے کیبن میں مٹھل کو بیٹھے دیکھا۔ شاید آج اس کی گاڑی کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ انگلیوں کے بیچ دبی سگریٹ کا شعلہ دہک رہا تھا۔ وہ شاہل کو دیکھ کر کھڑا ہوا تھا اور تیز قدموں سے چلتا اس کے پاس آیا۔

"کیا بات ہے۔" اسے سندھی آتی تھی لیکن بیگم صاحبہ کی ہدایت تھی کہ اس سے اردو بولی جائے۔

"رسولن کب آئے گی؟ میرے کو ادھر اکیلے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے تو اکیلی ہے۔"

"ہاں رسولن بیگم صاب کے ساتھ گئی ہے۔"

اسے بتاتے وقت اندازہ نہیں تھا کہ رسولن کے ساتھ' ساتھ دوسری لڑکیاں بھی جا چکی ہیں۔ گھر پر چند ایک ملازمین کے سوا کوئی نہیں۔ اور وہ بھی سب سے اوپری منزل پر سردی کی شدت سے کمروں میں دبکے پڑے ہیں۔

لیکن مٹھل تو یہ بات جانتا تھا۔ اور یہ بھی کہ آج شاہل کی خوشی اور اطمینان کی آخری رات تھی۔

☼ ☼ ☼

اس طرح کے فنکشنز میں مسز رباب اسے انوائٹ نہیں کرتی تھیں مگر اس بار ان کا موڈ ہی کچھ اور تھا۔ ایک بہت بڑی بزنس ڈیل جو پچھلے کئی مہینوں سے مختلف مسائل اور رکاوٹوں کا شکار تھی اسی مہینے فائنل ہوئی تھی۔

آرڈر اتنا بڑا تھا کہ ان کے بزنس کو اس کمپلیشن کے ساتھ ایک بہت بڑا بریک ملنے والا تھا۔ وہ بے انتہا خوش تھیں۔ اور پارٹی میں زریاب کو آتے دیکھ کر بے

اختیار اس کی طرف بڑھ کر اس کے گال سے گال ملا کر' اپنی گرم جوشی کا اظہار کر گئیں۔ ورنہ عام طور پر اس کے سامنے بہت سنبھل کر رہتی تھیں۔

"کیا بات ہے آج تو آپ بہت ہاٹ لگ رہی ہیں۔" اس نے بھی ذرا کھلے ڈلے انداز میں تعریف کر ڈالی۔ بلیک جارجٹ کی ساڑھی ان کی متناسب جسامت پر خوب جچ رہی تھی۔ پر اعتماد اور بے باک انداز انہیں بہت بولڈ بنا رہا تھا۔

"اوہ! یو ناٹی بوائے۔" انہوں نے مسکرا کر ایک ناز سے اس کے شانے پر ہلکے سے مکا مارا۔

"تم نے مجھے کبھی فل فارم میں دیکھا ہی کہاں ہے۔" اب ان کے لہجے میں فخر بول رہا تھا۔

"آؤ میں تمہیں اپنے سرکل کے دوسرے لوگوں سے ملواؤں۔" وہ بہت اسٹائل سے اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھیں۔ ان کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا۔ طرح طرح کے لوگ' بزنس مین اور سرکاری عہدیداران شامل تھے۔ ابھی وہ ان سے مل کر ٹھیک طرح سے مرعوب بھی نہیں ہو پایا تھا کہ روشنیوں سے چمکتے ہال کے ایک کونے میں اس کی نگاہ پڑی اور پھر وہیں جم کر رہ گئی۔ اگر وہ نہیں تھی جسے وہ' ماضی میں کبھی جانتا تھا تب بھی اس سے غضب کی مشابہت رکھتی تھی۔

"کیا اتنا بھی کوئی شکل و صورت میں کسی سے مل سکتا ہے۔" اس کا لباس اور انداز چیخ چیخ کر بزبان خود بتا رہے تھے کہ سماج کے کس گھٹیا طبقے سے اس کا تعلق ہے۔ وہ یقین کر کے بھی یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دو تین مردوں میں کھڑی قہقہے لگاتی' بے باک عورت۔

"نعیمہ۔" اس کے لبوں کی جنبش سے ادا ہونے والا لفظ ہی اتنا ہی ڈانواڈول تھا جتنا کہ وہ خود۔

"نہیں' وہ یہاں کہاں۔" انتہائی سرسری انداز میں سر جھٹک کر بھی' بے اختیار اس کی جانب بڑھتے قدموں کو روک نہ سکا۔

"زریاب!"

کسی جاننے والے نے روک کر کوئی بات کی۔ لیکن اس کا دھیان اسی سمت تھا۔ جہاں وہ لڑکی بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ جم چکی تھی۔ وہ بات سنے بغیر دو قدم آگے بڑھا اور' اس نے اس لڑکی کو دو قدم پیچھے ہٹتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنا ہی خوف بکھر گیا جتنا زریاب کی نظر میں حیرانی اور تعجب۔ زریاب کے قدموں میں تیزی آئی اور اس نے خود سے بھی زیادہ تیزی سے اس لڑکی کو پلٹ کر ہال سے باہر جاتے دیکھا۔

☼ ☼ ☼

اماوس کی تاریکی کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی اور بڑھ کے اس کی باقی ماندہ زندگی پر چھا گئی تھی۔ جلتی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر' اس نے اس تاریکی میں آئندہ کے لیے کوئی روشن دریچہ ڈھونڈنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی۔

بدنامی اور رسوائی کا عفریت منہ پھاڑے اسے نگلنے کو تیار بیٹھا تھا۔ وہ بے بسی سے اس کے لمبے لمبے دانتوں سے ٹپکتا اپنی عزت کا لہو دیکھ رہی تھی۔ کوئی بھی تو والی وارث نہ تھا۔ اس بڑے سارے شہر میں وہ صرف اس پاک ذات کے بھروسے ہی تو آئی تھی اس پر گزرنے والے حادثے کا علم رسولن کو ہو چکا تھا۔ فضا میں گونجتی اذانوں کی آواز سنتی اور جواب دیتی وہ بھڑے ہوئے کواڑ کو دھکیلتی اندر آئی تو' چارپائی پر پڑا شاہل کا بے بس وجود اپنے اوپر گزری داستان کا بزبان خود گواہ تھا۔

"ہائے میں مر گئی۔" اس نے زور سے سینے پر دو ہتڑ مارے اور بڑی بیگم کو بتانے بھاگی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔

سب جانتے تھے یہ مٹھل کا کارنامہ ہے۔ گھر میں اس رات اس کے سوا کوئی نہ تھا۔ مسز رباب بذات خود چل کر اس کے کمرے تک آئیں۔ اس کی حالت دیکھی تسلی دی کہ وہ مٹھل سے خود جواب دہی کریں گی۔

اس محل نما گھر میں بسنے والے ملازمین ان پڑھ ہوں یا جاہل۔ مگر پاگل نہیں تھے۔ سب ہی دیکھ رہے تھے کہ مٹھل اسی آزادی کے ساتھ گھر کے اندر باہر آتا جاتا

تھا جو اسے بیگم رباب کی طرف سے خاص طور پر ملی ہوئی تھی۔ کوئی بھی تو بیگم رباب سے سوال کر سکتا تھا نہ ان کے ڈر کی وجہ سے مٹھل کو کچھ کہہ سکتا تھا۔

"تیرا دماغ تو ٹھیک ہے مٹھل۔ اس لیے تجھے اتنی آزادی دی میں نے' اس دن کے لیے۔" معمولی سی ہی سہی تشویش تو مسز رباب کو بھی تھی کہ آنے والی ملازمہ کے پیچھے زریاب کا حوالہ جڑا تھا۔

"خدا نہ کرے اگر اسے لانے والے کو اس کی خبر گیری کا خیال آگیا تو کیا جواب دوں گی میں اسے۔ جانتا ہے تو کون لایا تھا اسے نہیں نا ۔وہ بھی نہیں جانتا کیا کھیل ہوتے رہتے ہیں یہاں۔

"معافی دے دیں بیگم صاب۔ بس اس رات بڑی بھول ہوگئی۔ میں بھگتنے کے لیے تیار ہوں' میں اس سے شادی کرلوں گا۔"

"چل بکواس نہ کر تجھ جیسے نیم پاگل' ادھیڑ عمر گنوار سے تو میں کبھی اس کی شادی نہ کروں۔" انہوں نے ناک سکیڑ کر ناگواری سے کہا۔

مٹھل نے بڑے صبر اور ضبط سے ان کی صاف گوئی کو برداشت کیا ایک یہی برداشت کرنا اس کی مجبوری تھی۔ باقی اپنی کوئی خواہش دبانا یا برداشت کرنا تو اس نے چھوڑ ہی دیا تھا۔

"تو پھر اب میں کیا کروں؟"

"کرنا کیا ہے تو نے' چپکا بیٹھا رہ اور کیا۔" انہوں نے آرام سے قصہ نمٹایا۔

"اور اگر آئندہ میں نے تجھے اس کے کوارٹر کے پاس بھی دیکھ لیا نا تو ٹانگیں تڑوا دوں گی۔"

"معافی بی بی سائیں معافی دے دیو۔" وہ مکارانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر جانے کے لیے پلٹا۔

"اور سن۔" کچھ سوچ کر انہوں نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک نوٹ نکالا۔

"دل پشوری کے لیے اپنا ہی ٹھکانہ ملا ہے تجھے۔ آئندہ بھوک لگے تو باہر جا کے کھانا سمجھا کہ نہیں۔" انہوں نے کہتے ہوئے نرمی سے نوٹ اس کی جانب اچھال دیا۔ مٹھل کے منہ سے دعاؤں کے پھول جھڑ رہے تھے۔ کہنے کی بات نہیں تھی۔ وہ اپنے ملازمین کے لیے ہمیشہ سے نرم دل تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ہال کے استقبالیہ سے باہر آکر اس گاڑی کو نقطے کی طرح معدوم ہوتی دیکھ رہا تھا وہ لڑکی اسی گاڑی میں بیٹھ کر تیزی سے اسے نکال لے گئی تھی۔

پتا نہیں وہ نعیمہ تھی بھی یا نہیں۔ اور اگر وہ نعیمہ نہیں تھی تو' اس طرح کیوں گئی۔ جانے کب تک وہ وہیں گم سم کھڑا رہتا مسز رباب آگئیں۔

"کیا بات ہے زریاب! یہاں ایسے کیوں کھڑے ہو؟" وہ چونک گیا۔

"مجھے کچھ پوچھنا ہے آپ سے۔" تیز روشنیوں میں ان کا چکا چوند وجود' یہ محفل' خوشبوئیں' یہ رنگ و بو کی ملاوٹیں' دل لبھاتی اور نگاہوں کو گرماتی سب جیسے اوجھل سا ہو گیا۔

"یہاں میں نے ایک لڑکی کو دیکھا وہ نعیمہ تھی۔ آپ جانتی ہیں اسے؟" اس کا انداز بھی اتنا ہی بے ربط اور گم سم سا تھا۔ جتنا اس وقت وہ خود' مسز رباب کو اس کی دماغی حالت سے قطع نظر' اس بات کی قطعاً" توقع نہیں تھی کہ وہ ان لڑکیوں میں سے کسی کو جان بھی سکتا ہے۔ لمحے کے ہزارویں حصے میں ان کی سوچ تمام ممکنات اور غیر ممکنات کو کھنگال کر واپس پلٹی تھی حتمی نتیجے کے ساتھ۔

"ارے یہاں ہزار' بارہ سو کی پبلک میں ایک لڑکی کا پوچھ رہے ہو۔" انہوں نے ہنس کر اس کی عقل پر ماتم کیا اور بات ٹال دی مگر وہ یوں ہی سنجیدہ سا کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔

"میں نہیں جانتی' اس نام کی کسی لڑکی کو۔ ہو سکتا ہے وہ میرے کسی فرینڈ کے ساتھ آئی ہو۔" زریاب چند لمحے انہیں دیکھتا رہا۔ وہ ابھی بھی پوری طرح حاضر نہ تھا۔

"کم۔۔۔ لیٹس انجوائے دا پارٹی۔" وہ اس کا بازو تھام کر مسکراتی ہوئی اندر کی طرف جا رہی تھیں اور وہ کسی بے جان بت کی مانند کھنچا چلا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اندھیری راتوں پر ڈراؤنے ہیولوں کی پرچھائیاں قابض تھیں۔ اب اس تیز ہوا سے دھڑ دھڑاتے کواڑوں سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ ایک بہت بڑے ہوس کے جن نے اس کی سینت سینت کر رکھی عمر بھر کی کمائی کو چند لمحوں میں ڈکار لیا تھا۔ خشک پیپل کے چمکتے تنے پر لدے بے بس پتوں کے جھنڈ' اس کی بے بسی پر تالیاں بجاتے۔

جو رسولن کی نظر پڑ جاتی تو مٹھل کے لیے بددعاؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ وہ اس کی نسلوں' پشتوں کو کوستی اور جی بھر کے گالیاں دیتی۔ شاہل اسے اپنی اولاد کی طرح پیاری ہو گئی تھی۔ وہ تھی بھی اتنی نیک اطوار بچی۔ صبح سے شام تک ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں بڑی سی چادر لپیٹے کام میں جتی رہتی' مگر ماتھے پر ایک شکن نہ لاتی تھی' سیدھے انداز اور سادا چہرہ۔ وہ اس کی شادی کے خواب بہت جلدی دیکھنے لگی تھی۔ وہ سوچتی تھی اپنی بیگم صاب سے کہہ سن کر کسی جاننے والے کے گھر کے ملازم ڈرائیور' خانساماں یا چوکیدار' کوئی بھی مناسب عمر کا آدمی دیکھ کر اس کا بیاہ کروا دے گی۔

لیکن واہ ری قسمت' غریبوں کو اتنے چھوٹے خواب دیکھنے کی بھی اجازت نہیں کیا۔ بھلا کیا جاتا کسی کا جو وہ کسی کی عزت بن جاتی اور بیگم صاب۔ سب جانتے بوجھتے آنکھیں اور کان' منہ بند کر کے بیٹھ گئیں۔ ٹھیک ہے اندر اندر مٹھل کا معاملہ اور تھا۔ وہ ان کا ڈرائیور ہی نہیں کچھ خاص قسم کا ملازم تھا۔ مگر۔۔۔ ایسی بھی کیا بے حسی۔ وہ مالکان اور ملازمین سب سے شکوہ کناں تھی۔ اس نے ایک ہاری ہوئی سانس کھینچ کر گھٹنوں پر ہتھیلیوں سے پورے جسم کا بوجھ ڈالا پھر دھیرے دھیرے چلتی اس کے پاس آگئی۔

"دھی رانی۔۔۔ شاہو' تو نے دوائی کھالی۔" اس کی بے جان' بے رنگ آنکھوں میں لمحے بھر کو زندگی جاگی۔ پھر اثبات میں سر ہلا کر آسمان تکنے لگی۔ رسولن کے سینے میں ماتم برپا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

محفل کی جولانی اپنے عروج پر تھی۔ وہ سارا وقت مسز رباب کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔ وہ اسے لیے لیے ساری محفل میں یہاں سے وہاں پھر رہی تھیں۔ زریاب نے جو کچھ چند لمحے پہلے دیکھا۔ وہ دل شکن سہی اب اتنے بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے کے لیے اسے سر سے جھٹکنا ہی تھا۔ چاہے مکمل طور پر نہ سہی پھر بھی وہ نعیمہ اور اس سے جڑے خدشے کو پورے ذہن سے سمیٹ کر ایک کونے تک لے جانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ اب وہ شوخ و چنچل لڑکیوں کے ایک غول کے پاس کھڑی' ان سے زریاب کے بارے میں شوخ کمنٹس سن کر لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ تب ہی ان کے موبائل کی بیپ ہوئی۔ بڑے انداز سے انہوں نے ہیلو کہا تھا۔ مگر دوسری طرف جانے کون تھا۔ پل بھر میں ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"واٹ! اوہ نو۔۔۔ مائی گاڈ۔" لوگ ان کی جانب متوجہ ہونے لگے۔

"او کے۔۔۔ او کے۔۔۔ آئی ایم کمنگ۔" بہت جلدی میں انہوں نے سیل بند کر کے اسے دیکھا۔

"زریاب بیٹا میری ایک بہت قریبی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔ مجھے فوراً" پہنچنا ہو گا۔" زریاب کے ذہن میں پھر وہی لڑکی گھوم گئی۔

"میں آپ کو لے چلوں۔"

"ہاں۔۔۔" انہوں نے بے ساختہ خود کو سنبھالا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔ تم انجوائے کرو یہاں۔" وہ اس کا گال تھپک کر آگے بڑھ گئیں۔ زریاب نے محض چند ہی منٹ ان کے جانے کے بعد وہاں انتظار کیا۔

"یہ کون سی دوست تھی جو اس گرینڈ فنکشن میں مدعو نہیں کی گئی۔" کچھ ہی دیر بعد اس کی گاڑی مسز رباب کی گاڑی کا پیچھا کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

بوا نے اس روز اس حقیقت سے پردہ نہ اٹھایا ہوتا تو وہ کبھی جان نہ پاتی۔ میں اور زریاب کی بہن اُف! کیسی شرمندگی اور اذیت میں لپٹا جھوٹ۔ یقیناً" زریاب میں بھی اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں بچی ہوگی۔ جب ہی وہ چپ چاپ چلا گیا اپنی بہنوں کو لے کر۔

اس کی نمازوں میں پابندی اور سجدوں میں طوالت آگئی۔ لیکن جانے والا پھر پلٹ کر نہیں آیا۔ انتظار کی گھڑیاں اتنی طویل ہو گئیں کہ سالوں گزرنے کے بعد بھی مختصر ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔

یہی صحن تھا جہاں وہ زریاب کو سوچوں میں بسائے تتلی کی مانند اڑتی پھرتی تھی۔ یہاں سے وہاں اور آج، اس صحن میں صحراؤں کی سی وسعت اتر آئی تھی۔ اماوس کی تاریکی میں جاگتا ہوا ریگستان، اس کی زندگی کی طرح۔ جہاں نہ کوئی سمت تھی نہ کوئی روشنی۔ نہ کوئی اندازہ، نہ کنارہ۔

☼ ☼ ☼

یہ کوئی بہت بڑا نامور ہاسپٹل نہ تھا۔ اسے جلد ہی تمام معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ اس کا خدشہ ٹھیک تھا وہ لڑکی اپنی بوکھلاہٹ اور تیز رفتاری کے باعث حادثے کا شکار ہو گئی تھی۔

"یا اللہ۔

جو بھی ہو بس نعیمہ نہ ہو۔" اس کے لب قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے۔

اسے گاڑی میں ہی انتظار کرنا تھا کیونکہ وہ مسز رباب یا ان کے کسی جاننے والے کی نظروں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

صرف ایک موہوم سے خدشے اور بے پناہ مشابہت نے اس کی نیند اجاڑ کر رکھ دی تھی۔ اس کے خطرے سے باہر آجانے کی اطلاع تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔

ذہن میں شور مچاتے سوالات کی تعداد اتنی زیادہ اور نوعیت اتنی گمبھیر تھی کہ وہ اپنے آپ کو ان جوابات کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

الجھے ہوئے ریشم کو کسی نے درمیان سے گھسیٹ کر اس کی انگلی میں اٹکا دیا تھا۔ اور وہ اسے سلجھانے کی جتنی کوشش کرتا وہ اتنی ہی اور الجھتی جاتی۔

☼ ☼ ☼

آفس میں اس سے رات بھر جاگنے کے باعث کام نہیں کیا گیا۔ سر درد نے حالت خراب کر ڈالی تھی۔ سخت ترین ذہنی مشقت کے بعد وہ آفس ورک کا اہل نہیں رہا تھا۔ اس لیے آفس ٹائمنگ آف ہونے سے پہلے ہی اٹھتے ہوئے دو دن کی لیو لے چکا تھا۔

گو کہ یہ دو دن کی چھٹی اس نے ذہنی آرام کے لیے لی تھی۔ اور فون کر کے رابعہ کو کراچی سے اپنے پاس بلوا لیا تھا۔ مگر دونوں دن، الٹی سیدھی سوچوں نے اس کے گرد اپنا جال بنائے رکھا۔ وہ لڑکی جو بھی تھی نعیمہ کی یاد دلا گئی تھی۔ اور اگر نعیمہ ہی تھی تو بھلا یہاں کیا کر رہی تھی۔ مسز رباب نے اسے پہچاننے سے انکار کیوں کیا۔ بعد میں وہ اسے اپنی قریبی دوست بتانے لگی تھیں۔ اگر وہ ان کے پیچھے نہ جاتا تو بات شاید پوشیدہ ہی رہ جاتی۔ اس کا سر دکھتا رہتا۔ انگلیوں کے بیچ سگریٹ سلگتی رہتی۔ اسے ایک رازداں، ایک دوست کی ضرورت تھی۔ لیکن وہ ایک دم سے کسی کا اعتبار کرے بھی تو کیسے۔

☼ ☼ ☼

"ایک آدمی آرہا ہے میرے پاس، تو ایسا کر شمائل کو کچن سے نکال۔ میں اس کے لیے کپڑے بھجواتی ہوں۔ ذرا ڈھنگ سے کنگھی چوٹی کر کے اوپر کی منزل پر بھیج دینا۔"

وہ رسولن سے بڑی مصروفیت میں بات کر رہی تھیں۔ جس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ مگر وہ فون میں مصروف تھیں۔ اس لیے دیکھ نہیں پائیں۔

"اب کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے۔ جا جلدی کر ابھی آتا ہوگا۔" رسولن چپ چاپ پلٹ کر شمائل کو پیغام دینے چل پڑی۔ اس سے کسی بھی قسم کی ہمدردی رکھنا خود کو روگ لگانے کے برابر تھا۔ یہ کھیل تو یہاں چلتے ہی رہتے تھے۔ کون اس کھیل میں اپنا کردار کس طرح ادا کرتا ہے یہ اس کی قسمت۔ شمائل نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہی پھر باہر نکل گئی۔ رسولن نے ایک بار بھی اس سے نگاہ نہیں ملائی تھی۔ اور وہ خود بھی تو کسی سے نگاہ ملانے کے قابل نہیں رہی تھی۔

ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہونے والی لڑکی "توما" جسے بیگم صاحب نے بیٹھل کے ذریعے سدھایا تھا۔ اب خطرے سے باہر تھی۔ بڑی بیگم کو یہاں جانا تھا۔ ہر لڑکی اس کے لیے "دھن رانی" تھی اور اس گھر کے مکینوں کے لیے "مال" "بولی لگنے والا" خریدا اور بیچا جانے والا۔

"بچ گئی بد بخت۔ ابھی زندگی بھی باقی اور آزمائش بھی۔"

رسولن کی جان کو کوئی ایک غم تھا۔

☼ ☼ ☼

سردیوں کا اختتام اور بہار کی آمد، سدا بہار کے پودا اس کی زندگی کی طرح بنجر پڑا تھا۔ امی کی حالت قدرے بہتر تھی۔ یوں بھی سردیوں میں ان کا سانس کا مرض زور پکڑ لیتا تھا۔ موسم بدلنے کے ساتھ اس میں بہتری آنے لگتی تھی۔

اب وہ اس کے آنے تک کھانا پکا کر رکھ دیتی تھیں۔ گھر بھی صاف ستھرا ملتا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی شکر گزاری کے جذبات زور پکڑ لیتے وہ ضعیف تھیں، بیمار تھیں۔ اس کی چڑچڑاہٹ البتہ قائم و دائم تھی۔

سالانہ امتحانات کے اختتام پر اسے ایک نئی استاد کی حیثیت سے بہتر کارکردگی دکھانے پر انعام ملا۔ گو کہ وہ اس مقابلے میں تیسرے نمبر پر ہی آسکی تھی مگر اس کے لیے یہی بہت تھا کیونکہ نوکری شروع کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔

یہ انعام جو ایک عدد تعریفی سرٹیفکیٹ اور کچھ نقد

رقم پر مشتمل تھا۔ وصول کرتے وقت اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اور احساس ہو رہا تھا کہ وہ زریاب کو بڑی شدت سے یاد کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ کہیں آس پاس ہی موجود ہے اور تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا ہے۔

یہ احساس اتنا زور آور تھا کہ تمام راستہ اسے اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ لیکن دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی کہیں معدوم ہو گیا۔ جیسے کوئی سنہرا خواب ایک چھناکے سے ٹوٹا۔ باتھ روم میں پانی کے ساتھ اس نے کتنے ہی آنسو بہا ڈالے۔ آج اس یاد میں نمو بھی حصہ دار تھی۔

☆ ☆ ☆

سال کے اختتام پر ہونے والا کلوزنگ کا کام اتنا طول پکڑ گیا کہ دو مہینے کھینچ لے گیا۔ اوپر سے اس کی الجھتی ہوئی ذہنی حالت کے ہاتھوں رپورٹس اور فگوز میں بار بار ہائی لائٹ ہونے والی غلطیاں۔ آئمہ تک سخت عاجز آ گئی۔

اسے پہلی بار باس سے تعریف کے بجائے جھڑکیاں سننے کو ملیں۔ اس کے ہاتھوں میں وہ پھرتی اور طبیعت میں وہ چستی تھی ہی نہیں، جو اس کا خاصہ تھی۔ اس کے ذہن سے وہ لڑکی، اس کا ایکسیڈنٹ اور رباب آنٹی کا جھوٹ نکالے نہیں نکل سکا۔ ایک دو بار فون پر اس نے باتوں باتوں میں ان سے ان کی دوست کی خیریت معلوم کرنی چاہی۔ تو انہوں نے بہت سرسری سا جواب دے کر موضوع ہی بدل دیا۔

"میں تم سے ایک بات کہنا چاہتی ہوں زریاب! پلیز تم مائنڈ مت کرنا۔"

آج ویک اینڈ کے بعد اس کی طبیعت بہتر تھی۔

"میرا خیال ہے تمہیں شادی کر لینی چاہیے۔"

وہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔ مگر زریاب جانتا تھا وہ ابھی کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے۔

"اور ضروری نہیں کہ تم کسی پڑھی لکھی نوکری پیشہ یا اعلا نسب حسب والی لڑکی سے شادی کرو کوئی بھی عام سی لڑکی ہو۔"

وہ ٹھہر گئی ایک پل کو سمجھ نہیں آیا کہ بات کو کیسے سمیٹے۔

"بس جلد سے جلد۔ جس طرح ممکن ہو تم شادی کر لو۔" زریاب نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔

"تم جانتی ہو وہ لڑکی لائبہ نہیں ہو گی۔" آئمہ نے تیسری بار اپنے دوست کے منہ سے اپنی دیرینہ خواہش کو ورد ہوتے سنا۔

"یس آئی نو اینڈ آئی ڈونٹ مائنڈ۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"مگر اسے اپنے دوست کا مشورہ سمجھ کر عمل کر لو پلیز شادی کر لو۔ تم مینٹلی بہت ڈسٹرب رہے ہو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہو گا۔"

"آئمہ میں کسی ایسی لڑکی کو اپنا ہم سفر بنانا چاہتا ہوں، جو شکل و صورت، تعلیم اور خاندان میں بھلے مجھ سے کمتر ہو مگر میرے ماضی سے مکمل طور پر آگاہ ہو۔ ماضی کے حوالے سے میرے جذبات کی قدر کرے۔ اور سب سے بڑی بات کہ میں شادی کر کے اس کا سہارا بن سکوں۔ اس کی زندگی میں کوئی بہتر تبدیلی لا سکوں۔

شکریہ۔ آئمہ تم ایک بہت اچھی دوست ہو اور میں تمہارا مشورہ ضرور مانوں گا، بہت جلد تم کوئی اچھی خبر سنو گی۔"

اس کے ذہن میں کسی کا چہرہ تروتازہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا آئمہ بے خبر ہے اور اتنی آسانی سے یہ بات قبول بھی نہیں کرے گی۔ مگر اسے اپنے فیصلے پر عمل کرنا تھا۔ کسی کی زندگی محض اس کے ایک قدم کی وجہ سے سنور سکتی تھی۔ تو وہ یہ قدم اٹھانے کے لیے تیار تھا۔ یوں بھی اس کا دل اپنے جذبات تو کسی کے لیے گروی رکھ چکا تھا۔ اب اس کی شریک حیات تو کوئی ایسی لڑکی ہونی چاہیے تھی جو دل کے علاوہ اس کی

طرف سے دی جانے والی ہر چیز کو اپنے لیے کافی سمجھے۔ جس کے لیے زریاب کا وجود، اس کی توجہ اور احساس، ذمہ داری اتنا کافی ہو کہ وہ اس سے محبت کی طلب نہ کر سکے۔ اور ایسی لڑکی، ایسی لڑکی تھی۔ اسے مل بھی سکتی تھی۔ اس نے اپنے ارادے پر پختگی کی مہر لگائی۔ اسے جلد سے جلد کراچی جانا تھا۔

☆ ☆ ☆

"بخت کی سیاہی پھیل کر منہ کالا کر جاتی ہے رسولن۔ تجھے کیا پتا۔" اس کا رندھا ہوا گلا دل کی تکلیف کا آئینہ دار تھا۔

"اور کچھ گھاؤ روح میں پڑ جاتے ہیں۔ پوری زندگی گزار کر ان کا مرہم نہیں ملتا۔" فقط چند راتیں گزار کر ہی وہ فلسفہ بولنے لگی تھی۔

"زندگی اتنی تکلیف دہ میرے لیے کیوں ہو گئی۔" آنسو اب اس کے رخساروں پر پھیلتے جا رہے تھے۔

رسولن کے دل کو جیسے کسی نے مسل ڈالا تھا۔

"پہلے سیلاب میں میرے گھر والے ختم ہو گئے۔ ایک باپ تھا وہ بھی چھوڑ گیا۔ کیا تھا میرے پاس ایک عزت کے سوا۔ سارے جہان سے بچاتی چھپاتی ادھر سے ادھر بھاگتی پھری۔ اور جہاں آ کر چھت ملی تو وہ ہی میری چادر کو سر سے کھینچ لے گئے۔" بے بسی کے شدید احساس تلے وہ بری طرح رو پڑی تھی۔

"میں مری کیوں نہیں رسولن مر کیوں نہیں گئی میں۔" رسولن نے اسے سینے سے لگا لیا، وہ بری طرح بلک رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بہت تیزی سے امپروو کیا تم نے ویل ڈن۔ میں تو بہت ڈر گئی تھی۔" مسز رباب بہت خوش تھیں۔ ان کا مخاطب نعیمہ تھی۔

"جب تمہارے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی۔ میرے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے۔ جب تمہیں ٹھیک سے ڈرائیونگ نہیں آتی تھی تو کیا ضرورت تھی یوں گاڑی لے کر نکلنے کی۔"

وہ خاموشی سے سامنے رکھی ٹرے میں سے ڈبل روٹی کا پیس اٹھا کر کتر رہی تھی۔

"آئندہ کوئی تنگ کرے یا کوئی پرابلم ہو تو مجھ سے کہنا۔" اس کے ہاتھ ایک لمحے کے لیے تھم کر پھر سے رواں ہو گئے۔

"اس طرح کا رسک لینے کی ضرورت نہیں۔" وہ اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر اندر ہی اندر بل کھا رہی تھیں۔

"خدا نہ کرے!" انہوں نے بڑے انداز سے دایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھا۔

"اگر تمہیں کچھ ہو جائے فرہ کلی اپنی ٹائپ آف سیریس انجری تو پھر۔" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر اس کے چہرے پر ابھرتی کڑوی مسکراہٹ دیکھی۔

"اور کچھ نہیں تو تمہارے فیس پر ہی کوئی مارک آ جاتا۔ او مائی گاڈ! آئی کانٹ امیجن۔۔۔۔" کھلی کھڑکی سے چھن کر آتی دھوپ کمرے کے درجہ حرارت کو

بڑھا رہی تھی۔ روشن کھلا کمرہ' صبح کا وقت اور گرما گرم ناشتا۔ طبیعت کو بہلانے کے لیے بڑا ہی خوش خیال منظر سامنے تھا۔ لیکن مسز رباب اور ان کی بناوٹی باتیں اس کی برداشت کو مسلسل آزما رہی تھیں۔

"تم جانتی نہیں ہو کتنا خوفناک ایکسیڈنٹ تھا۔ کوئی میریکل (معجزہ) ہی تھا جو جان بچ گئی ورنہ تم جان سے جا بھی سکتی تھیں۔"

انہیں اندازہ تھا وہ جب سے کمرے میں آئی ہیں' مسلسل بولے جا رہی ہیں۔ مزید بک بک فضول لگی۔

"خیر میں تو یہ بتانے آئی تھی سیٹ کنفرم ہو گئی ہے۔ پرسوں تم دبئی کے لیے فلائی کر رہی ہو۔" وہ بات سمیٹ کر اٹھ گئیں۔

"آنٹی" یہ پہلا لفظ تھا جو اتنی دیر میں اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ جب وہ دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھ چکی تھیں۔

"پلین کریش ہو جائے تو سب مر جاتے ہیں نا۔ اس میں تو کوئی بھی باقی نہیں بچتا۔" اس کی آواز بڑی پراسرار تھی' اس کی مسکراہٹ کی طرح۔ مسز رباب کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ گزرا۔

☼ ☼ ☼

اسے ایک ڈیلی گیشن کے ساتھ' دبئی ہیڈ آفس وزٹ کے لیے بھیجا جا رہا تھا۔ وہ خود تو خوش تھا ہی' آئمہ بھی اس کی خوشی میں برابر کی شریک تھی۔ دیگر اسٹاف یہاں تک کہ فضل داد کی طرف سے بھی اسے مبارکباد موصول ہوئی۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے این جی او کے مینجمنٹ ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھنے کے باوجود اس وفد میں شامل کیا گیا۔ جس میں سب ہی شرکا اس سے دو یا تین گنا زیادہ اسکیل کی پوسٹ پر تھے۔ اور این جی او کے اہم ارکان سمجھے جاتے تھے۔ اپنے سینئرز کے ساتھ بیرون ملک کا دورہ اس کے لیے ایک ایسا خواب تھا جو بنا دیکھے ہی شرمندہ تعبیر ہو گیا۔

آئمہ اس کے جانے سے اداس تو تھی لیکن مستقبل میں اس اقدام سے جڑی پروموشن زریاب کی منتظر تھی' اسے ملنے کی خوشی اس اداسی پر غالب آ گئی تھی۔

اس نے خود زریاب کے ساتھ جا کے اس ٹور کے لیے شاپنگ کی تھی۔ گھنٹوں بازار میں اس کے کپڑوں کی سلیکشن کے لیے خوار ہوئی تھی۔

اس ٹرپ سے پہلے آئمہ کے ساتھ گزارا وقت اس نے حقیقتاً" بہت انجوائے کیا اور وہ اس کے لیے یادگار بن گیا۔

اپنے دبئی جانے سے پہلے وہ رابعہ اور خاص طور پر شامل سے ملنے کراچی آیا۔ رباب آنٹی تو گھر پر نہیں تھیں لیکن' شامل کو اس نے دور ہی سے کمرے کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا۔ اسے شامل کو دیکھ کر ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ بہت بدل گئی تھی شاید' سر سے پاؤں تک ہی۔

گولڈن ڈائی کیے ہوئے بال اس قدر مختصر تھے کہ کس کر باندھی گئی پونی کے آس پاس بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے کاٹن کا بہت اچھا سوٹ پہن رکھا تھا جو اس کی شخصیت پر بالکل سوٹ نہیں کر رہا تھا۔ ہونٹوں پر شوخ رنگ کی لپ اسٹک کی تہہ جما رکھی تھی۔ اور پیر فی الحال کسی چپل کی قید سے آزاد تھے۔ یوں لگتا تھا کسی نے گاؤں کی مٹیار گنوار کو شہری گیٹ اپ دے دیا ہو۔ اس کے گہرے سانولے رنگ پر نہ وہ' چبھتے ہوئے رنگ کا عمدہ کاٹن کا سوٹ اچھا لگ رہا تھا اور نہ ہی وہ میک اپ۔ اور نہ ہی بے دردی سے کتر دیئے جانے والے سنہری بال۔

اس کے حلیے سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ اس نے زریاب کو آتے دیکھا تو بھاگ کر کمرے میں چلی گئی اور کمرے کا دروازہ سختی سے بند کر لیا۔

زریاب نے دو تین بار اسے بلایا مگر وہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ہار مان کر بالآخر وہ اس سے کوئی بات کیے بنا ہی واپس چلا آیا۔

"وہ ایسی کیوں ہو گئی؟ اسے مجھ سے کیا شکایت ہو سکتی ہے؟ اسے کیا ضرورت تھی' اس طرح کا حلیہ بنانے کی؟" سوالوں کا جم غفیر اس کے چاروں جانب کھڑا تھا۔

اس کے پاس ان سوالوں کے جواب تھے نہ ہی کھوجنے کا وقت۔

☼ ☼ ☼

دو ہفتے وہ ڈیلی گیشن کے ساتھ آفس ورک میں بزی رہا۔ اس کے بعد آخری ہفتہ انہیں گھومنے پھرنے اور تفریح کے لیے دے دیا گیا۔

اسی ہفتے میں ان کے لیے دو نائٹ فنکشنز اور ایک الوداعی پارٹی بھی ارینج کی گئی جو دوسری آرگنائزیشن کی جانب سے تعلقات بڑھانے اور اپنی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے ارینج کی گئی تھی۔

مسلسل ایک ہفتے کے آرام اور ایک نئی اور انجان جگہ کی سیر اور تفریحی پروگراموں نے اس کی طبیعت اور مزاج پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔

اپنے آفیسرز کے ساتھ آفس کے پروفیشنل ماحول سے نکل کر دوستانہ انداز میں گھومنے پھرنے اور خاص کر اوور نائٹ فنکشنز اٹینڈ کرنے میں اسے بہت مزا آیا اور اس نے اس وقت کو خوب انجوائے کیا۔

اس سارے ٹور میں ایک ذرا سا جو افسوس ناک پہلو تھا وہ اس وقت سامنے آیا جب' اس نے نائٹ پارٹیز میں اپنے کولیگ کو پینے پلانے کا شغل کرتے دیکھا۔ غیر ملکی حسینائیں' جو خاص طور پر ان ہی کی دل لگی کے لیے بلوائی گئی تھیں۔ کی بانہوں میں جھولتے ہوئے انہیں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے دیکھا۔

یہ رات دبئی میں ان کی آخری رات تھی۔ کل سہ پہر میں انہیں پاکستان فلائی کرنا تھا۔ وہ افسوس بھری نظروں سے اپنے ان آفیسرز کو' ان دو ٹکے کی عورتوں پر نثار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جو اپنے ملک میں ایک نام' ایک پہچان رکھتے تھے اور بہت باعزت روزگار سے منسلک تھے۔ ان میں سے اکثر آفیسرز کی نہ صرف فیملیز بلکہ لائف پارٹنرز بھی' معاشرے کا ایک باعزت اور کارآمد حصہ تھیں۔

اس نے ایک گہری سانس بھر کر ان بوجھل سوچوں کو اپنے قریب آنے سے روکنے کی خاطر' ہال میں اس طرف نظر ڈالی جہاں نوعمر' شوخ اور بے باک لڑکیوں کا ایک گروپ چونچالی میں مصروف تھا۔ آنکھوں کو سینکنے کی حد تک بے ایمان تو وہ خود بھی تھا۔ اس لیے بڑی فرصت سے مسکراتے ہوئے ان چمکتے چہروں اور نازک ڈال کی طرح لچکتے جسموں کو دیکھے گیا۔

قدرت نے ان کی صناعی میں اگر کوئی کمی رکھی بھی تو وہ ان کی اپنی محنت سے دور ہو چکی تھی۔ وہ خود چونکہ دوسرے مردوں کی طرح ہوش و حواس سے بیگانہ نہیں تھا اور اس وقت ہال میں قدرے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔ اس لیے جلد ہی ان کی نظروں میں آ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر ہاتھ ہلانے اور مسکرانے لگیں۔

اسے ایک دم سے ہنسی آ گئی۔ اور وہ یونہی ہنس کر اپنا منہ پھیر لینا چاہتا تھا مگر ایسا نہیں کر سکا۔ اسی گروپ سے ایک لڑکی نکل کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سکڑ گئی اور جسم و جاں میں بجلی بھر گئی۔

لمحے سے بھی کم وقت میں وہ اڑتا ہوا' اس لڑکی کے سر پر جا پہنچا تھا۔ جو خود بھی برق رفتاری سے وہاں سے نکل رہی تھی۔

اس نے ایک جھٹکے سے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تھا۔

"لیوی۔" وہ درشتی سے بولی۔

ان مصنوعی رنگوں والی آنکھوں میں پہچان کے رنگ بالکل اصلی تھے۔ اور وہ تو حیرت اور صدمے سے گنگ اس کی شکل ہی دیکھتا رہ گیا۔

"آئی سیڈ۔ جسٹ لیوی۔" وہ اور سختی سے بول کر جھنجلائی تھی۔

"ہو آر یو۔" زریاب کا لہجہ بے انتہا سرد تھا۔

"ویٹس نن آف یور بزنس۔" وہ اس کے چہرے کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"فہیمہ!" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

"کیا کر رہی ہو تم یہاں؟" وہ زیادہ دیر برف نہیں رہ

سکا۔

"واٹ ربش یو آر ٹاکنگ مین۔ جسٹ لیو می آئی سیڈ۔" اس نے امریکن لہجے میں جھنجلا کر اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر وہ زریاب کی سخت گرفت میں تھا۔

"او یو بلڈی۔" اس کے منہ سے ایک گالی نکلی مگر زریاب کے چہرے پر چھائی کیفیت بالکل پتھر تھی۔ اور نظریں نوکیلی۔

"چھوڑو۔ چھوڑ دو مجھے زریاب پلیز۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور اس کی مزاحمت ختم ہوگئی۔ زریاب کے ہاتھ سے اس کا بازو چھوٹ گیا۔

شاید وہ ابھی تک کسی انہونی مشابہت یا نظر کے دھوکے کا خواہش مند تھا۔ آس پاس کھڑے لوگ، بیک گراؤنڈ میں چلتا میوزک، لوگوں کی آوازیں باتیں قہقہے سب اس ایک لمحے کے دکھ میں اپنی حقیقت کھو بیٹھے۔

بے یقینی کے ایک گہرے حصار میں صرف وہ دونوں کھڑے رہ گئے۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، باقی سب معدوم ہوگیا۔

چند لمحوں بعد اس کی نیلی آنکھوں میں نمی ابھری اور اس نے پلٹ کر اسے مرے قدموں سے ہال سے باہر جاتے دیکھا۔

چند لمحے پہلے جب وہ دوڑ کر ہال سے باہر جارہی تھی تو وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے اس کے پاس جا پہنچا تھا۔ اور اب جبکہ اس کے قدم نڈھال اور شکستہ ہوچکے تھے۔ زریاب کو اسے روکنے یا اس کے پاس جانے کی کوئی خواہش باقی نہیں بچی تھی۔

تھوڑا بہت ابہام تھا سو دور ہوا۔

وہ نعیمہ ہی تھی، لیکن کیوں تھی یہاں کیوں تھی؟ وہاں کیوں نہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا باہر نکلنے سے پہلے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر زریاب کو نہیں دیکھا شاید زریاب بھی یہی چاہتا تھا کہ اب وہ مڑ کر نہ دیکھے ورنہ۔۔۔ کیا ہو جاتا۔ پتا نہیں۔۔۔

☆ ☆ ☆

اسکول میں نئی کلاسز کا آغاز ہوچکا تھا۔ وہ اپنی پوری محنت اور جانفشانی سے اسکول اور طالب علموں کو وقت دے رہی تھی۔ کب دن نکلتا کب ڈھل جاتا اور رات سر پر آن کھڑی ہوتی خود فراموشی کے عالم میں پتا ہی نہ چلتا۔ جینے کا ڈھنگ اگر یہی تھا تو یوں ہی سہی۔ یادیں اب بھی جان سے چمٹی تھیں مگر جونک کی مانند نہیں۔ بمشکل خود پر اور ماحول پر طاری کیے گئے سکون میں ابتری کا پتھر آپڑا۔

"عظمت بوا آئی تھیں۔ اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر تیرے لیے۔" وہ سن سی کھڑی رہ گئی۔

"بہو فوت ہوگئی بے چاری کی ایک بچی ہے دو سال کی۔ ایک ابھی پیدا ہوئی ہے اس کی پیدائش پر۔۔۔" امی کچھ اور بھی تفصیلات بتا رہی تھیں۔

اس نے زیادہ دھیان دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ بیگ پھینک کر واش روم چلی گئی دروازہ جس قدر زور سے مارا گیا تھا اس کی طرف سے ناراضی کے اظہار کے لیے کافی تھا۔ سلمیٰ بیگم کی چلتی زبان کو ایک دم بریک لگا وہ بے بسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں۔

"کیا اتنی عمر ہوگئی میری کہ ایک شادی شدہ دو بچوں کے باپ کا رشتہ آیا۔ کیا میں بھی دو بچوں کی ماں نظر آنے لگی ہوں۔" مذاق اڑاتی سوچیں اس کے پیچھے پیچھے تھیں۔

☆ ☆ ☆

نیم روشن کمرے میں خنکی اور خاموشی کا راج تھا۔ بہت زیادہ رونے کے بعد آنکھوں میں شدید جلن اور سوزش پیدا ہوگئی تھی۔ عریاں بازو صوفے پر بے ترتیبی سے دائیں بائیں گرے ہوئے تھے۔

دائیں ہاتھ میں سگریٹ تھی اور بائیں ہاتھ میں تھاما گلاس اس نے صوفے پر لڑھکا دیا تھا۔ دھواں دھواں ہوتے ماحول میں کتنے ہی چہرے اس کے سامنے بنتے بگڑتے جارہے تھے۔

"ارے کچھ پہن تو لے پاؤں میں، نہیں تو ٹھنڈ بیٹھ جائے گی۔" یہ چہرہ اس کی ماں کا تھا۔

"دیکھو کیسے کھوں کھوں کر رہی ہو امی ٹھیک ہی کہتی ہیں تمہیں اپنی بالکل پروا نہیں۔" یہ اس کی بہن جائی تھی جس کے ساتھ اس نے بڑی زیادتی کی تھی ہمیشہ کے لیے اس کو تنہا کر ڈالا تھا۔

"تم میرے لیے بالکل بہن جیسی ہو نعیمہ، حیرت ہے تم نے ایسا سوچنا کیوں شروع کردیا۔" یہ چہرہ ہاں یہ بھی جانا پہچانا آشنا سا محبوب چہرہ تھا دھوئیں کے بنتے مٹتے مرغولوں میں کتنے ہی روشن، چمکتے، بجھتے بھیانک، مکروہ چہرے اس کے سامنے تھے۔

"بے فکر رہو آئندہ تمہارا سامنا مٹھل سے نہیں ہوگا۔" ایک مجرم کا چہرہ۔

"لے تو پہلے بتا دیتی میں تیرے لیے پہلے دن سے گجرے لا دیتا۔" مکروہ، موقع پرست مطلبی چہرہ۔

"خبردار جو آواز نکالی ٹوٹے کردوں گا۔" موٹی موٹی آنکھوں والا سرخ بھیانک چہرہ۔ سگریٹ کا سرخ جلتا شعلہ اس کی انگلیوں کے بیچ پہنچ گیا پھر سرے تک اس نے بے خیالی میں اسے جھٹکا چند لمحے طائرانہ نگاہوں سے کھڑکی کے باہر کا منظر ملاحظہ کیا اسے پورا یقین تھا وہ اس دنیا کو آج آخری بار دیکھ رہی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک بار پھر شاہل کے روبرو تھا۔ کتنے دن لگے تھے اسے چند ہفتے یا پھر۔۔۔ فقط ایک یا دو مہینے۔ دبئی سے ڈیلی گیشن کے ساتھ واپسی پر اس کی حالت پہلے سے زیادہ ابتر تھی آفس ورک کو پورے دھیان سے نبٹانے کے باوجود آئمہ کو دکھا کر اطمینان کرنا ضروری ہوجاتا کہ اس میں کوئی غلطی نہیں ہے اور ہر بار ہی کوئی نہ کوئی غلطی اس کا منہ چڑا رہی ہوتی۔

"مجھے کراچی جانا ہوگا۔" اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ چھٹیاں ملنے میں تاخیر ہوتی گئی اور اس کی بے تابی بڑھتی گئی اس نے کراچی آکر دم لیا آنے سے پہلے رباب آنٹی کو مطلع کرنا اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ وہ چاہتا تھا ان کی غیر موجودگی میں شاہل سے ملے اور اس کی احتیاط بے کار نہیں گئی تھی۔ وہ اس کے مدمقابل سر جھکائے بیٹھی تھی حلیہ وہی تھا مگر چہرہ سپاٹ۔

"تم بہت بدل گئی ہو۔" اس نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"کیا ضرورت تھی یہ بدلسی انداز اپنانے کی۔" اس نے سر نہیں اٹھایا۔

"اور مجھے رسولن نے بتایا تم اردو بہت صاف بولنے لگی ہو۔ کس نے سکھائی تمہیں۔" زریاب کو اس کی خاموشی سے الجھن ہو رہی تھی۔

(مجھے کس کس نے کیا کیا سکھایا ہے صاب مت پوچھو) اس نے اپنے بڑے سارے دوپٹے کو چاروں طرف لپیٹا ہوا تھا۔

"میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں۔ پتا نہیں کیسی لگے تمہیں۔ شاید بری یا بہت عجیب مگر میرے لیے یہ بات بالکل عجیب نہیں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے اور کہاں پر ختم۔ جس بات کو، جس کام کو وہ بہت آسان سمجھ رہا تھا وہ اتنا بھی آسان نہیں تھا۔ ایک گنوار، غریب لاوارث لڑکی سے نکاح کی خواہش یقیناً" بہت سے لوگوں کی نظر میں مضحکہ خیز بھی ہوتی اور ناقابل معافی بھی۔

"شاہل میں۔۔۔" اس نے رک کر گلا کھنکارا۔ اس کا جھکا ہوا سر اب تک نہ اٹھا تھا۔

"مجھ سے شادی کروگی تم۔۔۔ میں۔۔۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ جس حیرت کی وہ اس سے توقع کر رہا تھا۔ وہ خود اس کے چہرے پر چمکنے لگی۔

"تم نے جواب نہیں دیا، کچھ تو کہو۔" اس نے اپنا جھکا سر اٹھا کے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کیا تھا ان آنکھوں میں؟ شاید بلا کی ویرانی۔ زریاب کو اپنے وجود میں بے چینی محسوس ہونے لگی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔ بولو چلوگی میرے ساتھ۔" وہ پھر سر جھکا چکی تھی۔

"کتنے دن کے لیے صاب۔" جواب اس کی توقعات سے کوسوں پرے کھڑا تھا۔

"کیا... کیا مطلب کتنے دن کے لیے؟" وہ واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"شادی کرنے کا کہہ رہا ہوں تم سے۔" اس نے شاہل کو اپنی بات سمجھانی چاہی۔

"کیا کرو گے شادی کر کے صاب۔ میں ساتھ چلنے کو تیار ہوں جو کرنا ہو ایسے ہی کر لینا۔" ایک لمحے کو وہ اس کی بات میں الجھا پھر۔

"دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔" وہ بدک گیا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو۔" اسے لگا اس سے بات نہیں کی جائے گی مزید۔

"کیا... کیا ایسا لگتا ہوں میں۔" اسے شاہل کی بات سے حقیقتاً" دکھ پہنچا تھا۔

"کیا میں کر سکتا ہوں تمہارے ساتھ ایسا۔ ایسا کیوں لگا تمہیں؟" وہ اب دھیما پڑ چکا تھا۔

"آپ نہیں کر سکتے تو کیا ہوا۔ کرنے والے اور بہت ہیں۔" اس کی آواز ٹھہری ہوئی تھی۔

"تم کیا کہہ رہی ہو؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" اس نے جواب نہیں دیا۔ بس چند لمحے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سر سے دوپٹہ کھینچا اور زمین پر ڈال دیا۔

زریاب اس کے وجود کو دیکھتا' اپنی جگہ سن ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں خاموشی تھی۔ موت کا سناٹا' موت سے پہلے یوں کہ جیسے آنکھیں چاروں اور گاڑھ کے بیٹھا تھا۔ جیسے ویرانے میں پڑے نیم مردہ وجود پر گدھ پہلے سے منڈلانے لگتے ہیں۔ دم توڑتے وجود کی بے بسی کا مذاق اڑاتے اس کے سرہانے آبیٹھتے ہیں۔ بیڈ کی چادر بے شکن تھی۔

سمٹے ہوئے پردے اور سرنیہوڑائے پڑی زندگی بے بسی سے اس کے مردہ وجود کی سانسیں گن رہی تھی۔

کمرے کے دروازے کے عین سامنے اور وسط میں پڑے غالیچے پر بے ہنگم انداز میں گرا ہوا اس کا وجود' زندگی کے بے ثباتی اور فنا کی تصویر تھا۔

تربوزی رنگ کے دبیز قالین پر جگہ جگہ خون کے باریک دھبے پڑ چکے تھے یہ خون اس کی کٹی ہوئی کلائیوں سے نکلا تھا۔

عریاں بازو چھپ چکے تھے اور برہنہ ٹانگیں ڈھانپ لی گئی تھیں۔ اس نے یہ بہادرانہ قدم اٹھانے سے پہلے فل سلیوز کی شرٹ اور ٹراؤزر زیب تن کر لیا تھا۔

نیم وا مردہ آنکھوں سے جینے کی خواہش نچڑ چکی تھی۔ یوں جیسے پیاسا پرندہ' ایک صحرا پر سراب کی صورت چمکتے پانی کی تلاش میں پرواز کرتے کرتے تھک کر وہیں کہیں جا گرے۔

خشک پپڑی زدہ ادھ کھلے ہونٹ یوں تھے۔ گویا سسک سسک کر کلمہ حق ادا کرتے' اس آخری گناہ پر خدا کے حضور معافی کے طلب گار ہوں پورا وجود کرب واذیت کی آماجگاہ تھا۔ معاً" دروازے پر دستک ہوئی۔

ایک بار دوبارہ لگاتار پھر کوئی ناب تھما کر اندر آیا۔

"نوما!... نوما او مائی گاڈ۔"

اندر داخل ہونے والی کوئی لڑکی تھی جو تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"نوما!" زمین پر گرے وجود کو سیدھا کرتے اس کے وہم و گمان میں ہی نہ تھا کہ آگے کیا منظر اس کا منتظر ہے۔

"نوما!" وہ نوما نہیں تھی۔ ایک بھیانک' مسخ شدہ چہرہ اس کے سامنے تھا۔ ایک لمحے کو اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔ دل کسی سہمی چڑیا کی طرح سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے پورا فلور اس کی دردناک چیخوں سے گونج اٹھا۔

☆ ☆ ☆

اس کا وجود خود پر بیتی سیاہ راتوں کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ لیکن وہ اتنی جلدی یقین کر لینے کے قابل نہیں تھا۔

"تم!" اس کے منہ سے سرسراتی ہوئی آواز نکلی۔

"تم... شاہل" اس کی آواز ایک سرگوشی سے زیادہ نہیں تھی۔

"ہاں میں ماں بننے والی ہوں۔" وہ اس کے سامنے کھڑی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہی تھی۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔

"تمہاری شادی ہو گئی مجھے کسی نے بتایا تک نہیں۔" اس کے لہجے کی بے یقینی' دل میں اٹھتے وسوسوں کی چور تھی۔ اس نے دھیرے سے قدموں میں گرا دوپٹہ اٹھا کر اس کے سر پر ڈالا۔

"میری شادی نہیں ہوئی صاب۔" شاہل نے بھی دھیرے سے اس کے سر پر بم دے مارا۔

"کیا۔" اسے لگا سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

"ہاں صاب! میری شادی نہیں ہوئی۔"

اس کی آنکھوں میں وحشت کا جنگل اگ آیا اور خوبصورت سجے ہوئے کمرے میں جنگل کی اداسی آگری۔

"میری شادی نہیں ہوئی پھر بھی میں ماں بننے والی ہوں۔"

اس کی آنکھیں بے قراری سے دائیں بائیں بھٹک رہی تھیں۔

جیسے گھپ اندھیرے میں اپنی رہائی کے لیے کوئی روزن تلاش کر رہی ہوں۔ اس کا کانپتا لرزتا لہجہ لحظہ لحظہ تیز ہوتا تنفس۔

زریاب کو اپنے سینے میں دھمک محسوس ہونے لگی۔

"اور میں' میں نہیں جانتی اس بچے کا باپ کون ہے۔"

زریاب کو اپنا وجود منوں وزنی بوجھ تلے دبتا ہوا محسوس ہوا۔

پھٹی ہوئی آنکھوں میں قیامت کا خوف آن سمایا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں بال جکڑ لیے۔

"میں نہیں جانتی' میں نہیں جانتی۔" اس کی کیفیت یکسر بدل چکی تھی۔ وہ اب جنونی انداز میں بال نوچ رہی تھی۔

"میں نہیں جانتی' مجھے نہیں پتا' مجھے نہیں پتا۔" اس کی آواز تیز چیخوں میں بدل گئی۔

باہر سے رسولن کے دوڑنے کی آواز آئی۔ اس نے دروازے سے ہی شاہل کو بے حال ہوتے دیکھ لیا تھا۔ زریاب اپنی جگہ ساکن کھڑا تھا۔

"مجھے نہیں پتا اس کا باپ کون ہے۔ میں نہیں جانتی۔" رسولن کے بوڑھے وجود نے اپنے نحیف بازوؤں میں بھر کے اسے باہر کی سمت دھکیل دیا۔ اس کے بال بکھر چکے تھے۔ اوڑھنی گر گئی تھی۔

رسولن اسے باہر لے جانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ کمرے میں اب خاموشی تھی۔ شاہل کی آوازیں دور ہوتی جا رہی تھیں۔ اسے لگا اگر وہ چند لمحے وہیں کھڑا رہا تو یقیناً" پیرالائز ہو جائے گا۔ اس نے تھوک نگل کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔ پھر گہری سانس بھر کر اپنے زندہ ہونے کا یقین کیا۔ اور تیز تیز قدم اٹھاتا وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

اسے لگ رہا تھا جیسے ایک ساتھ کئی بد روحیں اس کے پیچھے لگ گئی ہیں۔ اس نے رک کر دیکھا تو اسے پتھر کا بنا دیں گی۔ ضبط ہوتے حواس کو بمشکل مجتمع کر کے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایکسی لیٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

مسز رباب بے حد ماؤف ذہن کے ساتھ سر کو ہاتھوں میں تھامے بیٹھی تھیں۔ آج ان کی شخصیت میں وہ مخصوص دبنگ مفقود تھی جو' دیکھنے والے کو پہلی نظر میں متاثر کر دیتی تھی۔ وہ بار بار اضطراب سے بالوں میں انگلیاں چلاتیں' انہیں سنوارنے کی کوشش میں اور بگاڑ چکی تھیں۔

"ایک تو وہ ذلیل میری جان کو رو رہی ہے بیٹھ کر اور اب یہ دوسری منحوسیت۔" ان کے انداز ان کی پریشانی کو چیخ چیخ کر بیان کر رہے تھے۔

وہ نعیمہ عرف نوما پر بہت بھروسا کرنے لگی تھیں۔ اور ویسے بھی ایک بار "لائن پکڑنے" کے بعد اس نے

انہیں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔

وہ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھیں کہ وہ ایسی بھیانک جرات بھی کر سکتی ہے۔ اگر انہیں ایک فیصد بھی شک ہوتا تو شاید کبھی اسے اکیلا نہ چھوڑتیں۔

دوسری طرف شانل نے انہیں پریشان کرڈالا تھا۔ وہ پریگننٹ ہو گئی تھی اور اس بات کو سن کر وہ ٹھیک ٹھاک چراغ پا ہو گئی تھیں۔ یقیناً" وہ ان کی مخصوص لیڈی ڈاکٹر کی دی ہوئی میڈیسن لینے میں ہیرا پھیری کرتی رہی تھی۔ رسولن تک اس بات سے مکمل انجان تھی۔ اور اب ان کی اور خود اس کی کرنیوں کا پھل اس صورت میں ان کے سامنے آنے والا تھا۔ اوپر سے رسولن نے جب انہیں بتایا کہ زریاب آیا تھا اور شانل نے اسے سب حقیقت بتادی ہے تو انہیں زمین آسمان گھومتے ہوئے لگ رہے تھے۔

ابھی نعیمہ والا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑا تھا۔ انہوں نے اپنے سارے تعلقات اور پاکستانی حکومتی کئی عہدیداران تک ممکنہ اختیارات استعمال کر کے دبئی اعلیٰ حکام کے ذریعے اس کیس کو پولیس کیس بننے سے بچایا تھا۔

وہ اپنے ملک میں جو چاہے کرتی پھرتیں، مگر بیرون ملک میں یقیناً" کسی اسکینڈل کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔ ان کے کاروبار اور کاروباری ساکھ کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا تھا۔ اس واقعے کی دھول ابھی بیٹھی نہیں تھی کہ زریاب کے ان کے پاس فون پر فون آنے لگے۔ اس کی صرف ایک ہی ڈیمانڈ تھی، وہ ان سے ملنا چاہتا تھا فوراً"۔ ابھی انہیں اس کے سامنے اپنی پوزیشن کلیئر کرنی تھی۔ اور شانل کے لیے بھی ایک نئی کہانی تیار کرنی تھی۔

ایک ایسی کہانی جس میں وہ بے گناہ ثابت ہوں اور شانل کے ساتھ ہونے والی زیادتی بلکہ زیادتیوں کی تفصیل بھی نہ بتانی پڑے۔

سیل کی بجتی ہوئی ٹیون نے انہیں سوچوں کے سمندر سے نکالا۔ دکھتا ہوا سر اٹھا کر انہوں نے سیل اسکرین کو دیکھا۔ زریاب کی کال آرہی تھی۔

"او مائی گاڈ۔" وہ بہت بار مصروفیت کا بہانہ بنا کر اسے ٹال چکی تھیں۔ لیکن آخر کب تک۔ انہوں نے لائن کاٹ کر سیل آف کردیا۔ انہیں سر کے درد میں اضافے کا احساس ہو رہا تھا۔ چند لمحے بعد انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے ان کی سیکریٹری کھڑی تھی۔ گلاس ٹاپ جہازی سائز ٹیبل کے پیچھے سے نکل کر وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

"رائنہ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج کی تمام اپائنٹمنٹس کینسل کردو۔ آئی ایم گوئنگ ٹو ہوم۔"

"اوکے میم۔" وہ تابعداری سے بولی۔

"اور سنو!" انہوں نے کچھ سوچ کر اسے مخاطب کیا۔

"ہماری تمام پاکستانی ڈیلنگ گرلز میں یہ بات پھیلادو کہ نعیمہ کی ڈیتھ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ہوئی ہے۔ اور کچھ دشمن عناصر زبردستی اسے سوسائیڈ کیس بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس گروپ کی دوسری تمام لڑکیوں اور انچارج انیلا رضوی کو بھی ہدایات جاری کردو۔"

"بس میم!"

"میں نہیں چاہتی کہ اس کی اس حرکت سے شہہ پا کر ہماری دوسری گرلز میں یہ رجحان زور پکڑ جائے۔ ورنہ بہت پرابلم ہو سکتی ہے۔" انہوں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کیا اور مضبوط قدم اٹھاتی باہر نکل گئیں۔

☼ ☼ ☼

صبح کا اجالا پوری طرح پھیل چکا تھا۔

اس وقت صبح کے ساتھ بجے تھے۔ زریاب نے جان بوجھ کر یہ وقت منتخب کیا تھا۔ اسے محسوس ہو گیا تھا کہ رباب آنٹی اس سے ملنے سے کترا رہی ہیں۔ اور وہ صاف منع نہیں کر پا رہیں۔

سوجی آنکھوں کو بمشکل کھولے وہ بڑے مرے مرے قدم اٹھاتی ساڑھے آٹھ بجے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھیں۔ حالانکہ ملازمہ نے سات بجے جب ان کو زریاب کی آمد کی اطلاع دی تھی۔ ان کی نیند تب ہی اڑ گئی تھی۔

"تم نے اسے بتادیا کہ میں گھر پہ ہوں۔"

"جی بیگم صاحبہ۔" انہوں نے جواب سن کر دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نواز ا پھر بولیں۔

"کہہ دو میں سو رہی ہوں ایک بجے تک اٹھوں گی۔ تب آجائے گا۔" انہوں نے کہلوا کر اطمینان کا سانس بھی نہ لیا تھا کہ ملازمہ الٹے پیروں واپس آگئی۔

"وہ کہہ رہے ہیں۔ میں انتظار کرلوں گا اور تب تک شانل سے بھی مل لوں گا۔" ان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔

"کہاں ہے وہ ابھی ڈرائنگ روم میں ہے نا۔ گیا تو نہیں اس کے کمرے کی طرف۔" ان کی آواز تک سے گھبراہٹ مترشح تھی۔

"اچھا تم ایسا کرو۔ مٹھل کو جگاؤ اور اس سے کہو کہ اس منحوس کو لے کر ابھی گاؤں نکل جائے اپنے۔" ملازمہ نے سمجھ کر سرہلایا۔

"اور سنو!" انہوں نے مزید تانے بانے بنے۔

"زریاب کو ناشتا دو وہ اٹھ کر باہر نہ جانے پائے اور مٹھل سے کہنا۔ بیگم صاحبہ نے کہا ہے پانچ منٹ بعد اس گھر میں دکھائی نہ دے۔"

"جی" ملازمہ پلٹی۔

"اور سنو!" انہیں جیسے مزید کچھ اور یاد آیا۔

"آ۔۔۔ آ۔۔۔ زریاب سے کہو۔ بیگم صاحبہ تھوڑی دیر سے اٹھیں گی۔ اتنی جلدی ان سے اٹھا نہیں جا رہا اور وہ اطمینان سے ناشتا وغیرہ کرے اور۔۔۔ ر اگر وہ شانل کا پوچھے تو کہنا کہ بیگم صاحبہ نے اس کی شادی کروادی اور اس کے سسرال بھجوادیا گاؤں۔" ملازمہ چلی گئی۔ وہ بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگیں۔

وہ کسی قیمت پر زریاب سے ملنا نہیں چاہتی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر اس پیشی کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ ان کا خیال تھا زریاب کچھ دیر انتظار کرکے وہاں سے چلا جائے گا پھر بھی وہ اسے مطمئن کرنے کے لیے ایک بہت مربوط کہانی، شانل کے لیے تیار کر رہی تھیں۔ اب نیند کس کم بخت کو آنی تھی۔

ملازمہ نے ساڑھے آٹھ بجے بے حد حوصلہ شکن رپورٹ دی۔ زریاب نے ناشتا نہیں کیا وہ گھر سے کرکے آیا ہے اور ابھی تک ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہا ہے۔ انہوں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کیا۔

"اوکے! اس سے کہو میں آتی ہوں۔" بہت تھوڑے وقت میں انہوں نے خود کو تیار کرلیا تھا۔ اس کے سوالوں کا سامنا کرنے کے لیے۔۔۔۔

منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر انہوں نے باقی حلیے کو یونہی بکھرا رہنے دیا تھا۔ وہ اپنی شخصیت سے یہ تاثر دینا چاہتی تھیں کہ وہ صرف اس کے انتظار کی وجہ سے کچی نیند میں سے اٹھ کر آئی ہیں ورنہ حقیقت یہ تھی کہ زریاب نے صبح سات بجے ہی ان کی نیند اڑا دی تھی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے انہوں نے پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی کی غیر موجودگی کا یقین کیا۔ مٹھل یقیناً" شانل کو لے کر وہاں سے نکل چکا تھا۔

"کیا زریاب۔۔۔ اتنی سی بات اس پاگل کے لیے پریشان تھے تم۔" وہ یوں ہو گئیں گویا جس بات نے تمہاری نیندیں اڑا رکھی ہیں وہ تو کوئی بات ہی نہیں۔

"یہ اتنی سی بات ہے نہ وہ لڑکی پاگل ہے۔" وہ انہیں کچھ ناراض ناراض سا لگا۔ یقیناً" شانل کی بربادی کا ذمہ دار وہ ان ہی کو سمجھ رہا تھا جو کہ حقیقت میں بالکل غلط نہ تھا۔

"دیکھو زریاب میں سیدھی اور دوٹوک بات کروں گی۔ تاکہ نہ میرا وقت ضائع ہو نہ تمہارا۔" انہوں نے لہجے میں حد درجے سنجیدگی اور قدرے بیگانگی بھرلی کہ وہ بے اختیار انہیں دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔

"جیسا تم سوچ رہے ہو ویسا کچھ نہیں ہے۔" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"شانل کی اس حالت کی ذمہ دار میں نہیں وہ خود

ہے۔" وہ نا سمجھی سے دیکھتا رہا۔

"معاشقہ چل رہا تھا اس کا میرے نئے ملازم کے ساتھ بلکہ میرے لیے تو دونوں ہی نئے تھے۔" انہوں نے بات میں ایک ڈرامائی وقفہ دیا تھا۔

"میں بغیر چھان بین کے اسی لیے کسی کو اپنے پاس نہیں رکھتی۔ شائل کو تم لے کر آئے تھے۔ اس لیے میں نے کوئی آبجیکشن نہیں کیا اسے روٹی' کپڑا' چھت' روزگار سب دیا۔" انہوں نے زریاب پر احسان جتانے کی کوشش کی۔

"مگر ایک تو وہ لڑکا کم عمر تھا شائل کے برابر ہوگا۔ دوسرے اس کا تعلق بھی انٹیریئر کے ہی کسی پسماندہ گاؤں سے تھا۔ دونوں ہی جوان تھے اور ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے۔ مگر مجھے کیا پتا تھا کہ یہ کھیل کھیلنے لگیں گے اس نے دیا ہوگا شادی کا جھانسا' یہ محترمہ آگئیں دام میں۔" انہوں نے شکل ایسی کرلی جیسے انہیں کبھی شائل سے یہ امید نہیں تھی۔ کن انکھیوں سے زریاب کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ اس پر اس کہانی کا اثر ہو رہا ہے یا نہیں۔

"مجھے تو تب پتا چلا جب وہ چھٹیاں لے کر نکل گیا گاؤں اور واپس ہی نہیں پلٹا۔" اداکاری میں ان سے کوئی جیت سکتا تھا بھلا۔

"پھر۔" زریاب گومگو کی کیفیت میں گھر گیا تھا۔

"پھر کیا مجھے پتا چلا تو میں نے تو شامت بلا دی اس کی۔" وہ جیسے رام کہانی مکمل کر کے ریلیکس ہو بیٹھیں۔ زریاب سر جھکا کے سوچ میں ڈوب گیا۔ شائل کی حالت کچھ اور کہتی تھی اور رباب آنٹی کی کہانی کچھ اور۔

"مجھے ابھی آپ کی میڈ نے بتایا ہے کہ آپ نے اس کی شادی کردی۔" اس کی آواز میں ابھی بھی شک بھرا تھا۔

"تو اور کیا کرتی پھر؟ اتنے اثر و رسوخ والی عورت ہوں۔ ایک معمولی سے بندے کا پتا لگانا میرے لیے مشکل تھا کیا اوفوہ زریاب۔" انہوں نے اکتانے کی جاندار اداکاری کی۔

"تم اتنے فکر مند کیوں ہو گئے۔ پاگل تھی وہ جانے لگی تھی اسے' ذہنی حالت بگڑتی جارہی تھی اس کی تم ملے تو تمہیں اندازہ ہوا تو ہوگا تمہیں۔" انہوں نے یہ بات کہتے وقت بہت دھیان سے اس کا چہرہ جانچا۔

"ہوں۔۔۔ں۔" وہ پرسوچ انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"مجھے دکھ ہوتا تھا اسے دیکھ کر میں نے تو کہا ابارشن کراؤ جان چھڑاؤ مگر وہ مانی ہی نہیں۔ اوپر سے اس کی بہکی بہکی باتیں اور اتنی رف کنڈیشن مجھے ڈر تھا وہ کہیں اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچالے۔" انہیں اندازہ تھا۔ شائل سے ہمدردی ہی ان کے لیے سود مند رہے گی۔

"بہت ڈھیٹ لڑکا تھا مان ہی نہیں رہا تھا کسی طرح وہ تو جب اس کی ایسی خراب حالت کا پتا چلا تو اللہ نے پتا نہیں کیسے اس کے دل میں رحم ڈالا۔ ارے معافی مانگی مجھ سے بھیج دیا میں نے نکاح پڑھا کے قصہ ختم۔" انہیں خود بھی اپنی صلاحیتوں پر بہت بھروسا تھا۔

زریاب تو یوں بھی دل و ذہن کا صاف اور شریف آدمی تھا اوپر سے رباب آنٹی پر اس کا اعتبار کوئی ایک دو دن کا نہیں کئی سالوں پرانا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر' خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مسز رباب عقابی نظروں سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کررہی تھیں۔

"دیکھو زریاب۔" وہ بہت ہمدردی سے اٹھ کر اس کے نزدیک آبیٹھیں۔

"تم میرے لیے بیٹے جیسے ہو۔" انہوں نے آستین سے مبرا ہاتھ اس کے کندھے پر ٹکایا۔

"اللہ نہ کرے۔" زریاب کے دل سے بے اختیار صدا نکلی۔ وہ ابھی تک اپنی نائٹی میں ملبوس تھیں۔ زریاب سے نگاہ اٹھانا محال ہو رہا تھا۔

"اس لیے بہت خلوص سے تمہیں مشورہ دے رہی ہوں۔ کسی کے دکھ میں اس سے ہمدردی کرنا اچھی بات ہے' لیکن دوسروں کے مسائل کو اتنا سر پر سوار مت کیا کرو کہ جینا مشکل ہو جائے۔ زندگی میں ویسے ہی اپنے دکھ کیا کم ہیں جو تم دوسروں کے روگ بھی پال لیتے ہو۔" زریاب بنا کچھ کہے اپنے ہاتھوں کو گھورتا رہا۔

☼ ☼ ☼

عظمت بوا دوپہر کے کھانے کے بعد بڑے فرصت بھرے انداز میں اس کے پاس آکر بیٹھی تھیں۔ امی آرام کرنے چلی گئیں۔

وہ دوپہر میں کھانے کے بعد قیلولہ کرنے کی عادی تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک اس کی بھی یہی روٹین تھی۔ پھر اسکول کی مصروفیات نے اس سے آرام اور سکون کے چند گھنٹے بھی چھڑوا دیے۔ جب وہ بے حد فرصت سے بچھڑے ہوؤں کو یاد کرکے دل ہی دل میں ان سے ڈھیروں باتیں' گلے شکوے کرتی تھی۔ اسے اپنی تنہائی پیاری ہو چلی تھی۔ جہاں اس سے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی یادیں' جو دل کے کسی کونے میں دفن تھیں۔ ایک دم جاگ اٹھتی تھیں اور پھیل کر پورے دل پر قابض ہو جاتی تھیں۔ پوری نگری میں ان کا سکہ چلتا۔ ان کی حکمرانی ہوتی وہ چاہتیں تو ہنسا دیتیں۔ اور وہ چاہتیں تو اسے رلا رلا دیتیں۔

اس وقت بھی وہ کاپیاں سامنے پھیلائے کسی خوب صورت چہرے کو سوچ رہی تھی کہ بوا عظمت نے ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

اس کی آنکھوں میں نمی کی بے حد معمولی چمک تھی اور لبوں پر مدھم مسکان۔ ان کے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ جی چاہا یونہی یادوں میں گم اسے چھوڑ کر دور چلی جائیں۔ تنہائی ہی سہی اس نے دوست تو بنا لیا تھا۔ اکیلے ہی سہی وہ جینے کا ڈھنگ تو سیکھ رہی تھی۔

مگر زندگی یوں بنا سہارے کے بھی تو نہیں کاٹی جاسکتی نا اور وہ زندگی جس کا سہارا صرف یادیں ہوں۔ چلے جانے والوں کی یادیں جن میں واپسی کی کوئی امید اس کا کوئی دیا نہ تھا۔

"روشنی دھی!" وہ اپنی سوچوں سے گھبرا کر اسے پکار بیٹھی تھیں۔ وہ بہت چونک کر جیسے بہت دور سے واپس پلٹی تھی۔ پھر بوا کو سامنے دیکھ کر اس کے چہرے پر ناگواری کی واضح لکیریں کھنچ گئیں۔ بوا کو ان لکیروں کو نظرانداز کرنا ہی تھا۔

"تیری ماں نے تجھ سے کچھ بات کی ہوگی۔"

"اوفوہ!" وہ جی بھر کے بے زار ہوئی۔

"ہاں کی تھی پھر؟"

"کیا سوچا تو نے۔" وہ جھجک کر پوچھ رہی تھیں۔

"دیکھیں بوا جی میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ ماں جیسا سمجھتی ہوں آپ کو" اب دو ٹوک بات کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس کا ناجائز فائدہ اٹھائیں۔"

"نہ نہ' میری دھی۔" بوا نے کچھ کہنا چاہا' مگر اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

"آپ اچھی طرح جانتی ہیں میرا جواب کیا ہوگا۔ پھر بھی آپ نے سب کچھ جانتے بوجھتے امی سے ایسی بات کی۔ باؤلی ہو گئی ہیں وہ آپ کی بات سن کے۔" اس نے ناراضی سے انہیں دیکھا بوا نے پھر منہ کھولا۔

"ایک منٹ ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ میرا جواب نا ہے' نا تھا اور نا ہی رہے گا۔ میں زریاب کے علاوہ اور کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اور جبکہ میں تمام حقیقت سے باخبر ہو چکی ہوں تو اب آپ نے بھی اس طرح کیوں سوچا۔" اس کا انداز اور لہجہ اتنا سخت تھا کہ بوا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ چند لمحے ان کی گومگو کیفیت دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ آج بہت دن بعد اپنا لاکر صاف کروا رہا تھا۔ پچھلے چند مہینے اتنے اپ سیٹ گزرے تھے کہ اپنے آفس روم' کیبنٹس اور لاکرز کی طرف دھیان ہی نہیں گیا تھا جس چیز کی ضرورت ہوتی فضل نکال کر دے دیتا۔

آج میز پر فائلوں' لفافوں اور دستاویزات کے ڈھیر کو افسوس سے دیکھ رہا تھا۔

"سر جی آپ پہلے حکم کر دیتے تو میں پہلے ہی صاف کر دیتا پر سوچا کوئی ضروری کاغذ ضائع نہ ہو جائے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ ایک اور بکھیڑا ہے۔" وہ اکتا کر کرسی پر بیٹھا۔ تب ہی فضل داد نے اسے ایک لفافہ پکڑایا۔

"یہ آپ کے نام آیا تھا جی۔ بہت دن ہوگئے باہر مولوک (ملک) سے۔" اس نے سرسری انداز میں دیکھا پھر چونک گیا۔ دبئی کی اسٹیمپ۔
"کب آیا؟ مجھے بتایا کیوں نہیں۔" وہ اب تیزی سے لفافہ چاک کر رہا تھا۔
"آپ کراچی میں تھے تو۔۔۔" وہ آگے بھی کچھ کہہ رہا تھا۔ زریاب اس کی بات سن نہیں پایا۔ اندر موجود تحریر تھی ہی اتنی توجہ طلب۔
میرے، بہت اچھے دوست زریاب!
یہ میں ہی ہوں نعیمہ!
جب تم یہ خط پڑھ رہے ہوگے میں اس دنیا سے جا چکی ہوں گی۔ میں نے یہ خط صرف تمہیں یہ بتانے کے لیے لکھا ہے کہ زریاب! ہوسکے تو مجھے اور امی کو معاف کردینا۔ انہوں نے تم سے جھوٹ بولا تھا رشنا تمہاری بہن نہیں ہے نہ سگی نہ رضاعی۔ وہ صرف تمہاری خالہ زاد تھی۔ جس سے تمہاری پسندیدگی، محبت اور شادی۔۔۔ نہ کوئی جرم تھی نہ نکاح کوئی گناہ۔
تم جانتے ہی ہوگے یہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ امی کا اور میرا۔ مقصد تو پورا نہ ہوسکا، مگر اس جھوٹ کی سزا، زندگی مجھے اتنی بھیانک شکل میں دے گی اگر، مجھے پتا ہوتا تو کبھی یہ جھوٹ نہ بولتی۔
تم نے مجھے پہچان لیا، میری بدقسمتی پر لگنے والی آخری مہر۔ وہ پہچان کے رنگ تھے جو تمہاری آنکھوں میں، میں نے اسی وقت دیکھ لیے تھے۔ جب تمہاری نظر مسز رباب کی پارٹی میں مجھ پر پڑی تھی۔
مسز رباب سے میرا کیا رشتہ تھا؟ میں وہاں تک کیسے پہنچی اور کیوں یہ ایک الگ کہانی ہے۔ میں نے جو انکشاف اس خط کے ذریعے تم پر کیا ہے۔ میں نہیں سمجھتی اسے جان لینے کے بعد تم مزید کوئی آگہی برداشت کرنے کے متحمل ہوسکو گے تو میری بحث کو لاحاصل جان کر یہیں ختم کردو اور بھول جاؤ کہ زندگی میں کوئی نعیمہ نام کی لڑکی بھی تھی۔ اماں کو میری حیثیت کا علم نہیں۔ وہ تو مجھے رو دھو کر صبر کر چکی ہوں گی جو بھی کہانی سنائیں، یقین کرلینا اور۔۔۔ مجھے معاف کرنے میں جلدی کرنا۔ شاید کہ قبر کا عذاب کچھ کم ہوسکے خدارا۔
ایک گناہ گار لیکن پشیمان لڑکی۔
کاغذ اس کے ہاتھ میں اٹکا رہ گیا۔ رونگٹے کھڑے کردینے والی کیفیت نے اسے پتھرا سا دیا تھا۔ اس نے دھیرے دھیرے منظر کو دھندلا ہوتے دیکھا پھر اپنے گالوں پر نمی محسوس کی۔
"سائیں۔۔۔ سائیں۔" فضل داد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، لیکن وہ اس وقت وہاں موجود نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"اوہ مائی گاڈ!" آئمہ اخبار کا پہلا صفحہ کھول کر بیٹھی تھی اور وہ اسے اپنے کراچی جانے کا بتانے آیا تھا۔
"کیا ہوا؟"
"مسز رباب کو ان کی کسی ورکر نے گولیاں مار کر ہلاک کردیا۔"
"واٹ!" وہ اپنی بات بھول کر آئمہ کا منہ تکنے لگا۔
"ہاں۔۔۔ اس نے خود ہی گرفتاری دے کر اقبالِ جرم بھی کرلیا اور انکشاف کیا کہ مسز رباب غیر قانونی اور غیر اخلاقی کاموں میں ملوث تھیں۔۔۔ بے شمار پیشہ ور لڑکیاں ان کی زیر نگرانی۔۔۔ بقیہ صفحہ نمبر ۸"
آئمہ نے بے تابی سے صفحے پلٹے۔ مگر وہ آگے مزید کچھ سنے بغیر باہر نکل آیا۔ اس نے آتے آتے آئمہ کی آواز بھی نہیں سنی۔ جو اسے پوری خبر سنانے کے لیے بے تاب تھی وہ جانتی تھی وہ مسز رباب سے ملتا رہتا ہے۔
اور ڈھیلے قدموں سے گاڑی کی سمت جاتا ہوا زریاب سوچ رہا تھا کہ اس کے دل کی گواہی جھوٹی نہیں تھی۔ شائل کے ساتھ یقیناً" انہوں نے ہی کچھ غلط کیا تھا۔
"تو نعیمہ! تم نے جانے میں جلدی کی ورنہ اسیری کے دن تمام ہونے ہی والے تھے۔" دل ہی دل میں اسے مخاطب کرتے اسے لگا۔ اگنیشن میں چابی گھماتے

اس کے ہاتھوں میں لرزش سی اتر آئی ہے۔
"اوئے فضل داد۔" بے ساختہ اس نے سامنے کھڑے فضل داد کو پکارا۔
"چل مجھے کراچی لے چل یار۔" اس نے چابی فضل داد کے حوالے کرکے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا لیا۔ اپنی ہی سوچوں میں گم اس نے بنا پوچھے دروازہ کھول دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ؟" سامنے کھڑے بابر سلطان کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔
"میں اندر آسکتا ہوں۔" اس کا لہجہ بہت مہذب اور سنجیدہ تھا۔ اس نے ایک طرف ہٹ کے اسے راستہ دیا اور ان کو بتانے چل دی۔ وہ اسے دیکھ کر شدید تذبذب کا شکار ہوگئی تھی۔ بنا کچھ کہے امی کو روتا ہوا چھوڑ کر چولہے پر چائے کا پانی چڑھایا۔ بہرحال وہ ماضی میں ہی سہی، کبھی اس گھر کا اکلوتا داماد تھا۔ امی اسے دیکھ کر ٹھیک ٹھاک جذباتی ہوچکی تھیں۔ بظاہر تو وہ بھی بڑا مغموم نظر آرہا تھا۔
"کیا بتاؤں بس، میں تو خود ابھی تک شاکڈ ہوں۔ یقین ہی نہیں آتا کہ وہ اتنی جلدی اس قدر اچانک چلی جائے گی۔ سچ ہی کہا ہے کسی نے کہ رب کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔" وہ بجھے بجھے انداز میں انہیں تسلیاں دے رہا تھا۔
"ہائے! میں تو اپنی بچی کی شکل بھی نہ دیکھ سکی۔"
"غم مت کریں آنٹی یہی حال میرا ہے۔ میں خود کون سا اسے دیکھ سکا آخری ٹائم میں۔ میں ہاسپٹلائز تھا کب اس کی ڈیڈ باڈی گئی کب اس کی تدفین کردی۔ کچھ پتا نہیں چلا بس میں ہوش آیا تو پتا چلا کہ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ میت کو زیادہ دیر تک رکھ نہیں سکتے تھے اور پاکستان لے کر کون آتا۔ مجھے تو اپنا ہی ہوش نہ تھا۔" وہ سر جھکائے دھیرے دھیرے بول رہا تھا۔ رشنا ساری تفصیل فون پر سن چکی تھی۔
"آپ کو کتنے دن ہوئے پاکستان آئے؟" اس نے بہت اچانک ہی سوال کر ڈالا۔ اس نے سنبھل کر روشی کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہیں گویا جم کر رہ گئیں۔
"میں کل ہی تو پہنچا ہوں۔ پندرہ دن پہلے ڈسچارج ہوا پھر کچھ دن بیڈ ریسٹ کیا۔" اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اس کی گہری نگاہیں اپنے وجود پر محسوس کرکے الجھ رہی تھی۔
"لیکن سچ بولوں تو ایک بے چینی سی لگ گئی تھی دل کو کہ جب تک آپ سے نہ مل لوں چین نہیں پڑے گا دل کو۔" وہ چائے کا خالی کپ میز پر ٹکا کر پھیل کر بیٹھ گیا۔ رشنا کچھ جز بز سی ہوگئی۔ یقیناً" اس کا ابھی مزید بیٹھنے کا ارادہ تھا، مگر وہ اس کی آرپار ہوتی نظریں زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ جانے پہچانے راستوں پر کچھ پرانی منزلیں اس کے انتظار میں تھیں۔
وہ تقریباً" ایک ہفتے بعد کراچی کی جانب محو سفر تھا۔ جس دن مسز رباب کی قتل کی خبر اخبار میں پڑھی اس کے بعد سے شہر کے حالات بہت مخدوش تھے۔ آئمہ نے اسے حیدرآباد کی حدود سے نکلنے سے پہلے ہی واپس بلا لیا تھا۔
آئمہ ہی کی زبانی اسے مزید آنے والے دنوں میں مسز رباب کا کچا چٹھا معلوم ہوا۔ اور وہ اپنی بے خبری پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اتنی معروف و مصروف این جی او سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ ان کے بارے میں اتنا ہی جان سکا تھا۔ جتنا خود انہوں نے اسے بتایا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کی طبیعت کی سادگی اور فطرت کی سچائی اسے کسی کے بارے میں غیر ضروری تجسس میں مبتلا نہیں کرتی تھی۔
"ایسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے اور کیا۔ کبھی کسی فلیٹ میں دو دن کی سڑتی ہوئی لاش ملتی ہے تو کبھی کوئی تیزاب پھینک دیتا ہے اور کبھی کوئی یوں۔۔۔"
آئمہ نے اپنا بے رحمانہ تجزیہ بہت سکون سے بیان

کیا تھا۔ زریاب کو اس وقت جانے کن یادوں کی جلن اپنے سینے میں محسوس ہوئی تھی۔ جس نے اس وقت بھی اس کی آنکھوں کی دہلیز نم کردی تھی۔

دل کا موسم بالکل جدا تھا۔ خوشی اس طرح پر پھیلائے کھڑی تھی گویا آنسوؤں کی ایک بوند بھی دل کی ہریالی کھیتی پر گرنے نہ دے گی۔ ماضی میں گزرا ایک ایک پل اس کی نگاہوں میں کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔ سورج کی وداعی کا منظر تھا وہ مغرب میں ڈوبتے نارنجی گولے کی شعاعوں کی خوب صورتی بھی دل پر محسوس کررہا تھا۔ فضا میں مغرب کے بعد اندھیرا ابھرتا جارہا تھا جب رونے کی ننھی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔

جس طرح وہ سن کر ایک دم چونکا تھا۔ اسی طرح فضل داد کا پاؤں بھی بے اختیار بریک پر جا پڑا۔ یہ کسی چھوٹے سے گاؤں کی حدود تھیں۔ کچے گھروں کی رسوئیوں سے خوشبودار دھواں اٹھ کر فضاؤں میں گھل مل رہا تھا۔

"تم بھی یہ آواز سن رہے ہونا فضل۔"

"جی سائیں۔۔۔ پر۔" اس کا انداز رکا رکا سا تھا۔

"سائیں یہ قبرستان کی پرلی طرف والی دیوار ہے اور مغرب کا وقت ہے۔ ایسے وقتوں میں' ایسی جگہوں پر۔۔۔" وہ سمجھ گیا تھا۔ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

"ڈونٹ بھی سلی اندر چلو گاڑی گھماؤ جلدی۔"

گاڑی گھما کے وہ دروازے کے سامنے لایا اور فضل کو ساتھ لے کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

قبرستان بہت بڑے رقبے پر نہیں تھا اس لحاظ سے انہیں آواز کے منبع تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی اور۔۔۔ اور وہاں جو منظر ان کا منتظر تھا اس کے حواس سلب کرنے کے لیے بہت کافی تھا۔ فضل کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اللہ اکبر۔" پھر اس نے تیزی اور احتیاط کے ساتھ بچے کو اٹھا کر اپنی اجرک میں لپیٹ لیا وہ ہارے ہوئے جواری کی مانند گھٹنے ٹکا کر زمین پر گر سا گیا۔ ایک زندگی کی حرارت سے آزاد مجبور لیکن معصوم چہرہ خدا کے حضور زندگی کی اس بے وفائی پر شکوہ کناں تھا۔

اس نے اس کا بے جان' لاچار وجود اپنی بانہوں میں سمیٹا۔

"کیسے۔۔۔ کیسے۔ معافی مانگوں گا میں تم سے شائل۔" ضبط کی لاکھ کوششوں کے بعد بھی ایک زخمی آہ اس کے دل سے نکل کر لبوں تک آہی گئی قریبی گاؤں کا کوئی شخص شائل کی شناخت نہ کرسکا۔ وہ ان کے گاؤں کی تھی ہی نہیں ہاں زریاب کی شخصیت سے مرعوب ہو کر اور اس کی درخواست پر اس کے لیے کفن دفن اور غسل کا انتظام کردیا گیا تھا۔

اس نے خود کانپتے ہاتھوں سے اس معصوم لڑکی کو سپرد خاک کیا۔ جو شہر جانے سے ڈرتی تھی اور شہری درندوں ہی کی سفاکی کا نوالہ بن گئی تھی۔ مسز رباب اب اس دنیا میں نہیں تھیں۔ ایک بہت سخت بددعا دل کی گہرائیوں سے نکلی جس کا اس نے بڑی مشکل سے لبوں پر راستہ روکا۔

"تمہاری اور تم جیسی کتنی بے گناہ معصوم لڑکیوں کی جان یونہی رائیگاں نہیں گئی۔۔۔ بے شک اللہ بہترین منصف ہے۔" اس نے دل ہی دل میں کئی بار شائل اور نعیمہ کو مخاطب کیا۔ فضل داد نے اپنے "سائیں" کو آج سے پہلے کبھی اتنا مغموم نہیں دیکھا جتنا ان چند دنوں میں دیکھ چکا تھا۔ وہ بار بار نم آنکھوں کو صاف کرتا اور بار بار ان میں دھند بھر جاتی۔

☼ ☼ ☼
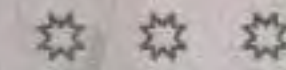
"تو اب اس میں کیا برائی ہے۔"

"کیا برائی ہے؟" اس نے تعجب سے اپنی ماں کو دیکھا۔

"میں پوچھتی ہوں اچھائی کیا ہے۔"

"یہ اچھائی کیا کم ہے کہ وہ ایک بار پھر چلا آیا یہیں۔" وہ چند لمحے ماتم کرتی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔

"اس چلے آنے نے ہی تو کھٹکا دیا ہے مجھے۔"

"اس میں کھٹکنے کی کیا بات ہے۔"

"کھٹکنے کی بات ہے امی۔ اتنا امیر کبیر آدمی بھلا ایک ایسی غریب لڑکی سے شادی کرنا ہی کیوں چاہتا تھا جس کے پاس نہ خوب صورتی تھی نہ تعلیم نہ اس کی کلاس کے ادب آداب۔ میں نے تو نعیمہ کے رشتے کے وقت بھی آپ کو کہا تھا' مگر آپ نے میری ایک نہ سنی۔ چلو میں نے مانا کہ ایک بار نیکی کرنے کا خیال اس کے دل میں آگیا یا اس کا سر پھر گیا ٹھیک۔" اس نے جتانے والے انداز میں انہیں دیکھا۔

"دوسرا اندازہ زیادہ ٹھیک لگتا ہے تو اب وہ دوبارہ اس کے گزر جانے کے بعد پھر اسی بے نام و نشان گھر کی دوسری لڑکی سے شادی رچانے آگیا۔ کچھ تو عقل کے ناخن لیں امی' انسان ایک بار کیچڑ میں گرا کنول اٹھا سکتا ہے لیکن بار بار نہ تو وہ سارے کنول اٹھا سکتا ہے اور نہ ہی کوٹ میں سجا سکتا ہے۔"

"کہنا کیا چاہ رہی ہے تو۔"

"صرف اتنا کہ وہ اتنا بھی سیدھا اور بیبا نہیں جتنا آپ کو لگتا ہے۔"

"چل مان لیا پھر؟"

"پھر یہ کہ اس کے دوبارہ یہاں آنے میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہے۔ جو مجھے فی الحال نظر نہیں آرہی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس بار بھی سب اس کی مرضی کے مطابق ہوتا رہے گا۔"

"کیا مطلب؟" امی ٹھٹک گئیں۔

"مطلب یہ کہ شادی تو دور کی بات' میں اسے کبھی اتنی اجازت نہیں دوں گی کہ وہ اتنی بے تکلفی سے جب چاہے یہاں کا راستہ ناپتا پھرے۔" اس کا لہجہ حد درجے تیز تھا۔

"اب اس کا آنا بھی کھلنے لگا۔"

"ہاں کیونکہ محلے والے باتیں بناتے ہیں کسی کو نہیں بخشتے۔" وہ ناگواری سے بول رہی تھی۔

"اور میں اتنی گئی گزری بہرحال نہیں ہوں کہ مفت میں اس کے لیے بدنامیاں مول لیتی پھروں۔"

"کون بنائے گا باتیں۔ دنیا جانتی ہے کہ داماد ہے وہ میرا۔"

"ہے نہیں تھا۔ اور دنیا جانتی ہے تو جانے میرے لیے وہ انجان ہی ہے اور مجھے اس سے کوئی جان پہچان رکھنی بھی نہیں کان کھول کر سن لیں آپ۔" آخر میں وہ زور سے چیخ کر بولی اور بالٹی میں رکھے کپڑے زور زور سے جھٹک کر تار پر ڈالنے لگی۔ امی کی بڑبڑاہٹیں شروع ہوچکی تھیں مگر اسے پروا نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

شہر قائد کی حدود کچھ ہی دور رہ گئی تھیں۔ وہی سفر تھا' مگر ایک ننھے وجود کے اضافے کے ساتھ جو اس وقت گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کے طفیل مالش اور غسل کے بعد گہری نیند کے مزے لے رہا تھا۔ زریاب نے بانہوں میں دبکے اس کے معصوم چہرے کو دیکھا اور دھیرے سے اس کی پیشانی چوم لی۔

ابھی اسے رابعہ کو فون کرکے اس حقیقت سے آگاہ کرنا تھا۔ جو اس کی زندگی کا سب سے بڑا روگ بن گئی تھی۔ اس ننھی معصوم جان اور اس کی ماں پر بیتنے والی ناانصافی اور ظلم کے بارے میں بتانا تھا۔ گو کہ ظالم کے ساتھ انصاف ہوچکا تھا۔ وہ کیفر کردار تک پہنچایا جاچکا تھا' لیکن اس کی پھیلائی ہوئی بے حیائی اور توڑے گئے ظلم و جبر کے اثرات کیا اتنی جلدی زائل ہوسکتے تھے۔ کیا وہ آنگن پھر سے آباد ہوسکتے تھے۔ جن میں چہکنے والی کتنی ہی بلبلوں کے پر نوچ لیے گئے تھے۔ عصمت دری کی مہذب وارداتوں نے کتنی بے گناہ جانوں کو دنیا میں جہنم جھیلنے پر مجبور کردیا تھا اور ان ہی بے گناہ جانوں میں ایک نعیمہ بھی تھی۔ اس نے بے اختیار لب بھینچ کر دل میں اٹھتی ٹیس کو دبایا۔

وہ سمجھتا تھا شائل کے لیے بنی کہانی میں کہیں نہ کہیں جھول ضرور ہے' مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کہانی کا حقیقت سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ حقیقت کیا تھی شاید کبھی پتا نہ چلتا تھا اور کچھ رازوں کا پوشیدہ رہنا ہی بہتر ہوتا ہے جبکہ یہ تو کوئی ایسا راز بھی نہ تھا۔ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ شائل کی حالت کے پیچھے کیا عوامل کارفرما رہے ہوں گے۔ دل میں بار بار جیسے کوئی بھالا سا

اتار دیتا تھا اور اسے اپنے آفس میں سخت سردی میں ٹھنڈے فرش پر رات گزار کر اپنی عزت بچانے والی لڑکی یاد آتی تھی۔ ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ تھی تو آنکھوں میں چمکتی نمی۔ کب سوچا تھا اس نے کسی دن اچانک اسے...... اور اگر...... اگر نعیمہ جاتے جاتے مجھ پر یہ احسان نہ کر جاتی تو...... اس سے آگے وہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

فضل نے اس کے کہنے پر ایک بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے سامنے گاڑی روکی۔ شائل نے جو ذمہ داری اس کے سپرد کی تھی اسے وہ پوری ذمہ داری اور محبت سے نبھانے کا عہد کر چکا تھا۔

اپنی پچھلی زندگی کے گزارے گئے ویران ماہ و سال اس کے اجڑے دل میں اڑتی جدائی کی دھول کے گواہ تھے۔ وہ دھول جو دن رات کے کسی بھی لمحے میں آنکھوں میں جا پڑتی اور اسے سب سے نظریں چرا کے آنکھیں صاف کرنی پڑتیں۔ اداسی کا ایک لمحہ بہت چپکے سے دل کے کسی کونے سے نکل کر فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس نے دھیان سے موڑ کاٹا۔ وہی زنگ آلود، رنگ اڑا دروازہ کچھ اور بھی خستہ حالت میں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ چند لمحے اس نے اس دروازے کو تکتے ہوئے گزار دیے۔ داہنے ہاتھ سے ذرا اوپر کبھی کال بیل ہوتی تھی۔ وہ دن رات اس سے ٹھیک کرنے کو کہتی رہتی اور وہ ٹالتا رہتا۔ پھر شاید کوئی اس پر انگلی رکھنے والا نہ آیا نہ گھر کے مکینوں کو کسی کی آمد کی اطلاع کی ضرورت رہی اس نے سوچوں سے پیچھا چھڑا کر کھٹکھٹایا۔

☼ ☼ ☼

اب تو اس کا آنا روز کا معمول بن چکا تھا۔ امی کی شہہ ملی تو وہ بدو شادی کی بات کرنے آن بیٹھا۔ رشنا کا دل چاہا سامنے پڑی ٹرے اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔

"دیکھیں میں آل ریڈی کمٹڈ ہوں۔ آپ سے شادی نہیں کر سکتی نہ کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے بہت تحمل سے بات مکمل کی۔

"ہو لیکن کوئی وجہ بھی تو ہو آپ کی کمٹمنٹ کی حقیقت سے تو میں واقف ہوں۔" اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

"میری مرضی اس سے بہتر جواب نہیں ہے میرے پاس۔"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں۔" وہ حد درجہ ریلیکس تھا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا سوال۔" اس نے یک دم ہی اخلاقیات کی حدود پھلانگیں۔ امی کی ہائیں ہائیں شروع۔

ایک پل کے لیے بابر سلطان کی آنکھوں میں سفاکانہ چمک لہرائی۔ وہ جو نڈر ہوئی کھڑی تھی ڈر سی گئی مگر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"براہ مہربانی روز مت آیا کرو یہاں۔ میرا دماغ خراب ہوتا ہے اور ریپوٹیشن بھی۔" اس کی ادھوری بات ہونٹوں میں رہ گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی امی اٹھ کر دیکھنے گئیں۔ بابر سلطان نے اسی تنہائی کا فائدہ اٹھا کر لمحے بھر میں اس کی کلائی دبوچ لی۔ وہ حق دق رہ گئی گرفت ایسی آہنی تھی کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"ریپوٹیشن کس چڑیا کا نام ہے۔ تمہیں پتا ہے۔" اس کا لہجہ اس کی حرکت اور گرفت کے برعکس بالکل برف تھا۔ اس کی سانس تک رک چکی تھی۔ خوف زدہ نظریں اس کی سفاک آنکھوں میں اٹک گئی تھیں۔

"ایک بار میرے پاس آجاؤ اچھے سے سمجھادوں گا میری ننھی چڑیا۔" وہ ابھی بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا اس کی رکی ہوئی سانس اٹک اٹک کر نکلی عین اس وقت کسی نے کمرے کے دروازے پر قدم رکھا۔

☼ ☼ ☼

یادوں کی ڈور گرہ گرہ بندھی اس کے دھیان کی

پتنگ کو تصور کے آسمان پر ڈھیل دیتی جا رہی تھی۔ کتنے ہی خوشیوں بھرے انمول لمحات ایک دوجے کے بانہوں میں ہاتھ ڈالے یادوں کے تاج محل کی محرابوں سے جھانک رہے تھے۔

"زریاب" ایک بوڑھا مگر جانا پہچانا چہرہ سامنے تھا۔ ان کے لہجے میں بے یقینی بھر گئی۔ دھوپ کی چمک میں مسکراتا چہرہ وہ کیسے بھول سکتی تھیں۔ اس کے مسکراتے لبوں سے مسکراہٹ انہوں نے ہی تو چھینی تھی۔ ایک لمحے میں خوشی اور غم کے کتنے ہی موسم ان گدلی آنکھوں میں لہرا گئے وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں۔ عجیب عالم خود فراموشی ان پر طاری تھا۔ پھر اس مسکراتے ہوئے چہرے نے بڑھ کر انہیں اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ خود فراموشی کا طلسم ٹوٹا تو وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ دیر تک ان کا سر تھپکتا رہا۔

"روشنی اندر ہے۔" تھوڑی دیر بعد وہ خود ہی الگ ہو کر بولتے وقت بالکل بھول گئیں کہ روشنی اندر ہے مگر اکیلی نہیں ہے۔

ڈھیروں آرزوئیں لبوں سے پھوٹتی انوکھی ہنسی اور دل میں اترتا گدگدی کا انوکھا احساس لیے وہ اندر بڑھا اور کمرے کی دہلیز پر قدم رکھا لیکن وہاں کا منظر اس کے گمان سے بہت دور تھا۔

ایک اجنبی مرد اور استحقاق سے جکڑی اس کی کلائی۔ اس کا دل ایک لمحے میں پوری زندگی بھلا کر سکڑا۔ سہمی چڑیا کی طرح خوف زدہ نگاہوں سے اسے دیکھتی وہ...... رشنا، اس کی زندگی، حاصل زیست، سرمایہ حیات۔ رشنا کی نگاہیں سامنے کھڑے مرد کی بھوکی نظروں سے ہٹ کر اس پر پڑیں۔

"زریاب۔" بے آواز، بے یقین سرگوشی ہونٹوں سے نکلی فضا میں پھیل گئی۔ آدمی نے اس کی کلائی چھوڑی اور وہ جیسے کسی خواب سے آزاد ہو گئی۔

"زریاب!" اب کی بار پکار یوں تھی گویا "یہ تم ہی ہو۔" بالآخر وہ تمام مصلحتیں بھلا کر بے طرح چیختی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور زریاب نے کسی متاع جاں کی طرح اسے سمیٹ لیا۔

اس کا نام تسبیح کے ورد کی طرح لبوں پر جاری تھا اور وہ بری طرح بلک رہی تھی۔ زریاب بجائے اسے خاموش کرانے کے محض آنکھیں موندے کھڑا تھا۔ برسوں سے جلتے ہوئے سینے پر گویا کسی نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تھے۔

کمرے کے اندر کھڑا آدمی بالکل نامحسوس انداز میں ایکسکیوز می کہتا باہر کو نکلا۔ وہ تیزی سے باہر کھڑی اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا کیونکہ وہ زریاب کو جانتا تھا اور مسز رباب سے اس کے تعلق کو بھی یوں بھی مسز رباب کے قتل کا واقعہ ابھی اتنا پرانا نہیں ہوا تھا۔ کہ وہ کوئی رسک لے سکتا۔ وہ جانتا تھا۔ وہ یہاں سے بھی واپس نہ آنے کے لیے نکلا ہے۔

"اب بھی کیوں آئے ہو۔ میرے مرنے کا انتظار تو کرتے۔" وہ ابھی بھی سسک رہی تھی۔

"آج تو یہ بات کہہ دی مگر آئندہ مت کہنا۔"

"کیوں۔" وہ اس سے خفا تھی۔

"کیوں کہ بہت سے پیاروں کی دائمی جدائی دیکھ چکا ہوں۔ بنا انتظار اور خواہش کے اب کسی اور کو کھونے کی سکت نہیں ہے۔" اس کی آواز میں انجانے دکھ بول رہے تھے۔

"مجھ میں بھی نہیں۔" دونوں کی آنکھیں نم تھیں مگر وجود محبت بھری ہنسی کی گیلی پھوار میں بھیگ رہے تھے۔

☼ ☼

مکمل ناول

حرمِ دل کے مکین

فرح بخاری

ٹرین رکنے سے گرمی محسوس ہوئی تو عرینہ کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے باہر نظر ڈالی پھر گھڑی کی طرف دیکھا صبح کے چھ بجے تھے اور باہر ابھی بھی روشنی ہو رہی تھی۔ پیاس سے گلا خشک ہو رہا تھا اس نے امی کی طرف دیکھا۔

"پانی ہو گا امی....؟"

"نہیں بیٹا.... پانی کی بوتل رات ہی ختم ہو گئی تھی۔ ابھی جیا بھی اٹھ کر مانگے گی۔ ایسا کرو باہر سے بھر لاؤ وہ دیکھو سامنے ہینڈ پمپ نظر آ رہا ہے۔"

"میں اکیلی....؟" وہ جھجک سی گئی۔

"ارے کچھ نہیں ہو گا۔ دیکھو اور بھی لوگ نیچے اترے ہوئے ہیں۔ پھر میں بھی یہاں سے دیکھ رہی ہوں۔" انہوں نے تسلی دی تو عرینہ بوتل لیے نیچے آ گئی۔ ٹرین سے ہینڈ پمپ واقعی قریب لگ رہا تھا لیکن نیچے اترنے پر تو قدم جیسے من من بھر کے ہو رہے تھے۔ ہمت کر کے نل تک آئی اور جونہی ہینڈ پمپ چلانے کے لیے ہتھے پہ ہاتھ رکھا کوئی اچانک ہی نل پہ جھکا۔

"ذرا چلانے کی تکلیف کریں گی؟" کمان سی بھنویں اٹھا کر اس نے عرینہ کو دیکھا تو وہ گھبرا کر نل چلانے لگی۔

"تھینکس...." آستین سے منہ صاف کرتے ہوئے وہ اپنے پورے قد سے کھڑا ہوا لیکن عرینہ ماتھے پہ بل ڈالے اپنی بوتل بھرتی رہی۔

"ایک تکلیف اور کریں گی....؟" اس نے درخواست کے انداز میں کہا تو عرینہ نے محض دیکھنے پر اکتفا کیا۔

"وہ اندر میرے ڈبے میں ایک بابا جی نے مجھ سے پانی کا کہا تھا لیکن میرے پاس لے جانے کے لیے کچھ نہیں ہے آپ اگر اپنی بوتل کا یہ کپ دے دیں تو...."

"ہوں" عرینہ نے بنا کچھ کہے کپ تھمایا اور واپس آ گئی۔

"کون تھا؟" فاطمہ نے پانی پیتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا نہیں...." وہ بے زاری سے کہتی ہوئی سامنے بیٹھ گئی۔

"کیا کہہ رہا تھا؟" فاطمہ نے اس کے چہرے پہ نظر ڈالی۔

"ارے کچھ نہیں امی.... پہلے خود پانی پیا پھر کسی بابا جی کو دینے کے لیے مجھ سے کپ مانگ۔" وہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر ہاتھوں سے اپنا ماتھا دبانے لگی۔

"کیا ہوا.... سر میں درد ہے؟" فاطمہ نے تشویش سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ادھر میرے پاس آؤ...." انہوں نے بلایا تو وہ اٹھ کر قریب آ گئی اور ان کی گود میں سر رکھ کر سیٹ پر لیٹ گئی۔ رات پوری بہت ڈسٹرب گزری تھی کیونکہ اس وقت بوگی میں کافی رش تھا لیکن اب صبح ہونے تک کافی مسافر اتر گئے تھے۔ اب ان کے علاوہ وہاں صرف ایک بزرگ جوڑا تھا وہ بھی نیند میں، فاطمہ نے آہستہ آہستہ اس کا سر دبانا شروع کیا۔

"امی ممتاز خالہ اچھی تو ہیں نا...." عرینہ کا لہجہ کئی خدشوں سے بھرا ہوا تھا۔

فاطمہ کے دل کو کچھ ہوا۔ اتنی سی عمر میں اس کی معصوم بچیوں کو کیسی کیسی مصیبتیں جھیلنا پڑ رہی تھیں بلکہ ان سے زیادہ تو ان بچیوں کی ہمت تھی جو آج وہ

جان بچا کر گھر سے نکلنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ انہوں نے پیار سے عرینہ کے بال سہلائے۔

"ہاں وہ بہت اچھی ہے ممتاز صرف میری خالہ زاد ہی نہیں بہت گہری دوست بھی ہے پریشان کیوں ہو رہی ہو تم بھی جانتی ہو انہیں...."

"جانتی تو ہوں امی لیکن عام حالات میں ملنا اور جاننا الگ بات ہے۔ اب تو ہم بنا کسی اطلاع کے ان کے گھر رہنے جا رہے ہیں، وہ بھی کتنی مدت کے لیے خود ہم بھی نہیں جانتے۔"

"اتنا مت سوچو اللہ مدد کرنے والا ہے مجھے تو بس یہ فکر ہے کہ آگے کا گزارا کیسے ہو گا کہاں تو لاکھوں میں کھیلے اور کہاں آج ایسی بے سرو سامانی اتنا نقدی زیور گھر میں ہی پڑا تھا جلدی میں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔"

فاطمہ نے ایک سرد آہ کھینچی تو عرینہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور

مسکراتے ہوئے ان کا ہاتھ تھاما۔

"ہاں لیکن میں کچھ نہیں بھولی۔ آپ کیا سمجھتی ہیں میں وہ سب اپنے باپ کے قاتلوں کو دے کر آجاتی ۔ رات کو ڈبے میں رش تھا اس لیے احتیاطاً" آپ سے بات نہیں کی۔" وہ کہہ کر اٹھی اور اپنی سیٹ کے نیچے ۔ بڑے بیگ میں سے اپنا چھوٹا ہینڈ بیگ نکالا۔

"میں نے نکلنے سے دس منٹ پہلے ہی سب کچھ لے لیا تھا۔ چچا کے حصے میں صرف خالی لاکر آئے گا۔" اس نے بیگ ماں کی گود میں رکھا تو فاطمہ نے حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت سے عرینہ کو دیکھا۔ جیا بھی اب اٹھ چکی تھی۔ اس کی حالت بھی ماں سے کچھ کم مختلف نہیں تھی۔

باہر اب اچھی خاصی روشنی ہو چکی تھی۔ تقریباً" آٹھ بجے ٹرین راولپنڈی اسٹیشن پہنچی عرینہ سامان سنبھالتی جونہی نیچے اتری بری طرح کسی سے ٹکرائی سر پکڑ کر شدید غصے سے نظر اٹھائی تو وہی صبح والا لڑکا اپنا سینہ سہلاتا نظر آیا۔

"کاش ہمارا تیرا سامنا مسکراتے ہوئے ہو۔" وہ ہلکے سے بڑبڑایا۔

"اللہ اس کی نوبت نہ آئے۔" وہ نتھنے پھلا کر کہتی ہوئی پاس سے گزر گئی۔

ریلوے اسٹیشن سے وہ لوگ سیدھے بس اسٹینڈ آئے۔ مانسہرہ جانے والی بس نے آدھے گھنٹے بعد روانہ ہونا تھا۔ وہ بس کے اندر ہی بیٹھ کر چلنے کا انتظار کرنے لگیں۔ آہستہ آہستہ مسافر بھرنا شروع ہوئے اور ٹھیک ٹائم پر سفر کا آغاز ہو گیا تینوں کا ذہن اس وقت عجیب عجیب سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

فاطمہ کو سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اگر ممتاز اپنے پرانے ایڈریس پر نہ ملی تو کیا ہو گا۔ پچھلے تین سال سے ان کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ممتاز کے بھائی نے والدین کی وفات کے بعد بہاولپور کا گھر بیچ کر پشاور میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے ممتاز جب بھی اپنے میکے آتی تھی تو دونوں کی ضرور ملاقات ہوتی۔ اب بھائی کے پشاور چلے جانے کی وجہ سے ممتاز کا بہاولپور آنا بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ فون پر ایک آدھ بار بات ہوئی تو تب بھی فاطمہ کو اس کے شوہر شیر زمان نے نمبر ملا کر دیا تھا۔ لیکن اب نہ شیر زمان رہا تھا اور نہ ہی نمبر کا کچھ اتا پتا تھا۔ فاطمہ خود کوئی اٹھارہ سال پہلے ایک بار ہی مانسہرہ گئی تھی۔ اس وقت عرینہ چار سال کی اور روجینہ دو سال کی تھی۔ وہ اور شیر زمان ممتاز کے گھر میں ہی رہے تھے۔ ویسے تو اسے پوری امید تھی کہ ممتاز ابھی تک اسی گھر میں ہو گی لیکن بلاوجہ ایک دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اگر ایسا نہ ہوا تو کیا ہو گا۔

دوسری طرف عرینہ اور جیا یہ سوچ رہی تھیں کہ ان کے حالات سن کر خالہ اور ان کے بچوں کا کیا ردعمل ہو گا۔ دونوں کی طبیعت پر ایک عجیب سی بے چینی اور بوجھل پن کی کیفیت سوار تھی۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن سچ ہے کہ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور چھپی ہوتی ہے۔ تقدیر کا ان کو یہاں لانا یونہی نہیں تھا۔ جوں جوں سفر آگے بڑھ رہا تھا۔ ان کی طبیعت پر چھائی کسالت خود بخود مٹنے لگی علاقے کے حسین مناظر موڈ بدلنے میں نہایت مددگار ثابت ہو رہے تھے۔

بچپن کا آنا تو ظاہر ہے کہ انہیں یاد نہیں تھا۔ ان کے نزدیک تو یہی پہلا سفر تھا۔ یہاں کا حسن اب سے پہلے صرف تصویروں اور ٹی وی میں دیکھا تھا۔ قدرت کے دور دور تک پھیلے نظارے بالکل نئے محسوسات سے آشنا کروا رہے تھے۔ پہاڑی راستہ شروع ہوا تو دونوں کے جوش خروش میں مزید اضافہ ہوا۔ فاطمہ نے ان کے کھلے چہروں پر نظر ڈال کر اطمینان کا سانس لیا۔ دل سے بے ساختہ ان کے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا نکلی۔

دوپہر کے قریب وہ لوگ مانسہرہ پہنچے ٹیکسی والے کو فاطمہ نے کاغذ پہ لکھا ایڈریس سمجھایا۔ دروازہ کسی آدمی نے کھولا فاطمہ پہچان گئی وہ ممتاز کا چھوٹا سا بیٹا واصف تھا۔ وہ بھی فاطمہ کو پہچان گیا اس نے بیگ ان سے لے کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔ ممتاز اسے اچانک

سامنے دیکھ کر بہت حیران ہوئی۔ اسے تو شیر زمان کی وفات کا بھی علم نہیں تھا ان کی موت کا حال سناتے فاطمہ کو پھر سے رونا آگیا۔ ممتاز کی بہوویں اندر ملنے کے لیے آئیں تو فاطمہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ اپنی کہانی سنانے کے لیے تو بہت وقت پڑا تھا۔ اس نے شفقت سے دونوں کو پاس بلایا ممتاز نے جیا اور عرینہ سے ان سب کا تعارف کروانا شروع کیا۔ ممتاز کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ دونوں بیٹوں واصف اور جمال کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ان کی بیویاں ثمینہ اور نگینہ آپس میں بہنیں تھیں۔

جمال اور واصف کے بعد شبنم تھی۔ اس کی شادی ممتاز نے اپنے جیٹھ کے بیٹے سے کی تھی اور وہ کاغان میں رہتی تھی۔ سب سے چھوٹی نیلم تھی وہ جیا اور عرینہ کی ہم عمر تھی۔ ممتاز کے شوہر کا سات سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ جمال کا مین بازار میں کرائے کا جنرل اسٹور تھا اور واصف جنگلات کے محکمے میں ملازم تھا۔

اس مہنگائی کے دور میں اتنی بڑی فیملی کی کفالت اگرچہ مشکل کام تھا لیکن واصف اور جمال نہایت خندہ پیشانی سے مل جل کر یہ ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ گھر کی تعمیر اور ان کا رہن سہن انتہائی سادہ سا تھا۔ نیلم نے بڑی خوشی خوشی ان دونوں کا سامان اپنے کمرے میں رکھ کر انہیں فریش ہونے کو کہا ممتاز نے بہوؤں کو کھانا لگانے کو کہا۔ کھانے کے بعد ہی فاطمہ نے اپنے ساتھ پیش آنے والے حالات تفصیل سے ممتاز کو بتائے۔ نیلم ان دونوں کو آرام کرنے کے لیے اپنے کمرے میں لے آئی۔ چند گھنٹے سو کر واقعی بہت آرام ملا تھا۔

شام کو صحن میں چارپائیاں ڈال کر وہ سب باہر آ بیٹھے۔ ثمینہ بھابھی چائے لے آئیں اور سب ہلکے پھلکے انداز میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ چائے کے بعد نیلم انہیں چھت پر لے آئی۔ اوپر ایک ہی کمرا تھا۔ جس کی بالکونی سے سامنے پھیلا مانسہرہ صاف دکھائی دیتا تھا۔ پہاڑوں پر پھیلے بے شمار گھروں کی روشنیاں ستاروں کی طرح چمکنے لگیں۔ عرینہ کے لیے یہ ایک اور حیران کرنے والا منظر تھا۔ وہ مبہوت سی دیکھے گئی۔

"تم لوگوں کا شہر بہت خوب صورت ہے نیلم میں نے ایک ساتھ اتنا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" وہ حیرت سے منہ پہ ہاتھ رکھ کر بولی تو نیلم ہنس پڑی۔

"لگتا ہے تم نے بہاولپور سے باہر کی دنیا کبھی نہیں دیکھی۔"

"ہاں سچ کہا در اصل ہمارے ابا سفر وغیرہ سے بہت گھبراتے تھے۔ میں اپنی پوری زندگی میں سوائے دو بار لاہور جانے کے کہیں نہیں گئی۔ امی بتاتی تو ہیں کہ بچپن میں ہمیں ایک بار یہاں لائی تھیں۔ لیکن وہ تو ہمیں یاد ہی نہیں ہے۔"

"سچ کہوں تو جو خوب صورتی تم نے اب تک کے سفر میں دیکھی وہ اس کا چوتھائی بھی نہیں جو اس سے آگے وادی میں پھیلی ہوئی ہے۔ ہماری باجی کاغان میں رہتی ہیں ان کا شہر اور اس سے آگے ناران تک کا سفر کرو گی تب تمہیں وادی کے حسن کا صحیح معنوں میں پتا چلے گا۔"

"چلو اچھا ہے اس طرح خوب صورتی کے جھٹکے ذرا سنبھل کر لگیں گے۔" عرینہ ہنس پڑی تو نیلم اسے بغور دیکھنے لگی۔

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ عرینہ... فاطمہ خالہ بتا رہی تھیں تم لوگوں کو چوری چھپے نکلنا پڑا۔"

"ہوں...." عرینہ اس کے سوال پر یوں چونکی جیسے کسی نے خواب سے اچانک جگا دیا ہو۔ نئی جگہ، نئے لوگوں اور ماحول نے وقتی طور پر واقعی اپنا دکھ بھلا دیا تھا۔ اب نیلم نے پوچھا تو پھر سے زخم ہرے ہونے لگے۔ نیلم نے اس کے چہرے کے بدلتے رنگ کو واضح طور پر نوٹ کیا اور اپنے سوال پر خاصی شرمندگی محسوس کی۔

"سوری عرینہ، میرا مقصد تمہارا دل دکھانا نہیں تھا۔"

"ارے نہیں بس اچانک خیال بدلا تو۔"

"اتنا تو مجھے اندازہ ہے کہ تم لوگ کسی بہت بڑی مصیبت سے جان بچا کر نکلے ہو لیکن یہ نہیں جانتی کہ در حقیقت ہوا کیا.... ؟ میں چاہتی ہوں تم آج کھل کر

اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لو تاکہ آنے والی یہاں کی پہلی صبح تمہارے لیے بالکل نئی ہو۔ ابھی تو تمہاری ہنسی بھی تمہارے چہرے کا ساتھ نہیں دیتی۔"

"بوجھ ہلکا کرنے سے غم ختم ہو جاتے تو دنیا میں کوئی دکھی نظر نہ آتا۔" وہ پھیکا سا ہنسی تو نیلم اس کے قریب آبیٹھی اور محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

"ہاں یہ سچ ہے بانٹنے سے دکھ ختم نہیں ہو جاتے لیکن تکلیف میں انسان کو کسی ایسے مخلص کا بڑا سہارا ہوتا ہے، جو اس کے آنسو اپنے دامن میں جمع کرے یا تسلی کے دو بولوں سے اس کی مایوسی کو امید میں بدل دے۔" نیلم نے پورے خلوص سے عرینہ کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا تو وہ حیرت سے اس نئی دوست کو دیکھنے لگی جو دوستی کے پہلے ہی مرحلے میں اس کے غم کی شریک بننا چاہ رہی تھی۔ عرینہ بے اختیار مسکرا دی۔

"ہاں اور دل کا بوجھ ہلکا نہ بھی ہو تو یہی کیا کم ہے کہ کسی نے درد بانٹنے کی کوشش تو کی۔۔۔!"

☆ ☆ ☆

رستم علی خان تقسیم ہند کے وقت اپنے والد کے ساتھ بہاولپور ہجرت کر کے آئے۔ آگرہ میں وہ بہت بڑی جاگیر چھوڑ کر آئے تھے جس کے بدلے انہیں یہاں بھی اچھی خاصی زمین ملی۔ ان کے والد آگرہ میں کپڑے کے بہت بڑے بیوپاری تھے۔ یہاں بھی دونوں نے مل کر وہی کاروبار جمایا اور پانچ سال بعد جب بزنس میں قدم پوری طرح مضبوط ہو گئے تو اپنے لیے ایک شاندار حویلی تعمیر کرائی ان کا شمار اس وقت بہاولپور کے چند گنے چنے امیروں میں ہوتا تھا۔

حویلی کی شان و شوکت ایسی تھی کہ اس کے سامنے سے گزرنے والا ایک بار رک کر ضرور دیکھتا تھا۔ رستم خان کا بیاہ والد نے وہیں بہاولپور کی ایک پٹھان فیملی میں کر دیا۔ ان کی بیوی سلطان پری ایک بہت خوب صورت اور پیار کرنے والی خاتون تھیں۔ رستم خان اپنی بیوی سے بے حد پیار کرتا تھا لیکن نہ جانے کیوں قدرت کو یہ ساتھ زیادہ دنوں تک منظور نہیں تھا۔ تبھی پہلے بچے کی ولادت پر ہی وہ اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں رستم خان کے لیے اس دکھ کو برداشت کرنا بہت مشکل تھا۔ نومولود شیر زمان کو اس کے دادا نے آیا کی مدد سے پالا اور بہو کی پہلی برسی گزر جانے بعد رستم خان کو دوسرے بیاہ کے لیے مجبور کیا۔ اگرچہ اس کے لیے فی الحال یہ بات سوچنا بھی ناممکنات میں سے تھا لیکن باپ نے اپنی بیماری اور شیر زمان کی پرورش کی خاطر ان سے دوسری شادی کی بات منوا ہی لی۔ دوسری بیوی جمیلہ خاتون بھی بہت اچھی ثابت ہوئی۔ اس نے شیر زمان کو اپنی اولاد کی طرح پالا اور دو سال بعد جب اپنی گود میں ایک بیٹا آگیا تب بھی شیر زمان سے اپنا رویہ تبدیل نہیں کیا۔

وقت گزرتا گیا رستم خان کے والد دنیا سے رخصت ہو گئے دونوں بچے بھی بڑے ہو گئے۔ شیر زمان بہت ہی سنجیدہ طبیعت کا اور ذمہ دار نکلا جبکہ جہانزیب بالکل اس کے برعکس ثابت ہوا شیر زمان نے بہت ابتدا سے ہی باپ کے ساتھ کاروبار میں ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے ان کی بازار میں دو دکانیں تھیں جو بعد میں شیر زمان کی محنت اور سوجھ بوجھ سے پانچ میں تبدیل ہو گئیں۔ کاروبار پھیلا تو توجہ بھی زیادہ درکار ہوئی رستم خان اور شیر زمان دونوں نے جہانزیب کو اس طرف راغب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ اس کا کام صرف باپ اور بھائی سے پیسہ بٹورنا اور پورے حق کے ساتھ اسے اڑانا تھا۔ اس کی ساری ہمدردیاں صرف اپنی ماں کے لیے تھیں بچپن سے ہی اسے یہی محسوس ہوا کہ باپ کی ساری شفقت صرف شیر زمان کے لیے ہے اور اس کے ساتھ باپ کا رویہ بالکل سوتیلوں جیسا ہے۔

حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ شیر زمان اپنی سلجھی طبیعت کے باعث باپ کو نسبتاً" زیادہ عزیز تھا۔ دوسرے سگی ماں کی محرومی کو کم کرنے کے لیے بھی وہ اسے زیادہ تر اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ لیکن اس ذرا سے فرق نے جہانزیب کے دل میں ہمیشہ کے لیے گرہ ڈال

دی وہ خوامخواہ شیر زمان سے نفرت محسوس کرنے لگا۔ اگرچہ باپ کے خوف سے کھلم کھلا اس کا اظہار نہیں کرتا تھا لیکن جب رستم خان بھی دنیا سے منہ موڑ گئے تو جہانزیب نے اپنے رنگ ڈھنگ دکھانا شروع کر دیے جمیلہ اپنی طرف سے سمجھانے کی بہت کوشش کرتی لیکن اس پر بالکل کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جمیلہ نے اپنی جاننے والی ایک فیملی میں دونوں کے رشتے طے کیے۔ شیر زمان نے ماں کا حکم مانتے ہوئے فرمانبرداری سے فاطمہ کے ساتھ شادی کر لی لیکن جہانزیب نے ماں کے طے کیے ہوئے رشتے کو ٹھکرا کر اپنے لیے ایک بالکل غیر لڑکی پسند کی' جمیلہ نے اس کی ضد دیکھتے ہوئے مجبوراً" رشتہ توڑ کر اس کی شادی قدسیہ سے کر دی۔ دونوں کی شادیوں کے کچھ ہی سال بعد جمیلہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

اب حویلی کے آدھے حصے میں شیر زمان اور آدھے میں جہانزیب اپنے اپنے بیوی بچوں سمیت رہنے لگے جہانزیب کا آج بھی وہی وطیرہ تھا یعنی بھائی سے رقم مانگ کر اپنا گھر چلاتا اور شیر زمان بھی بنا کسی بحث میں پڑے رقم اسے دے دیا کرتا پھر اچانک جانے جہانزیب کے دل میں کیا آئی کہ اسے امریکہ جانے کی دھن سوار ہو گئی۔ اس کا ایک سالا پہلے سے وہیں آباد تھا شاید اس کے ایما پر جہانزیب نے اپنا ذہن بنایا اور باہر جانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کا پروگرام بڑے دو بیٹوں کی شادی کر کے انہیں بھی ساتھ لے جانے کا تھا۔

اللہ نے اسے تین بیٹے دیے تھے اور شیر زمان کو دو بیٹیاں۔۔۔ شیر زمان کو اولاد شادی کے بہت سال بعد عطا ہوئی اس لیے جہانزیب کے بچوں اور شیر زمان کے بچوں کی عمروں میں کافی فرق آگیا تھا۔ البتہ سب سے چھوٹا ثمر' عرینہ کا ہم عمر تھا۔ جس وقت وہ لوگ امریکہ سیٹل ہوئے عرینہ دسویں جماعت میں اور جیا آٹھویں میں پڑھتی تھیں۔

جہانزیب نے دو بیٹوں یاسر اور عابد کی شادیاں اپنی بیوی قدسیہ کے رشتہ داروں میں کر دیں اور باہر جانے کی تیاریاں کرنے لگا لیکن پھر ایک عجیب بات ہوئی ان کے خاندانی وکیل وقار عثمانی نے شیر زمان کو بتایا کہ جہانزیب آج کل حویلی کے اپنے والے حصے کو بیچنے کے لیے لوگوں سے رابطے کر رہا ہے۔ شیر زمان فوری طور پر دکھ اور صدمے سے جیسے کچھ بول ہی نہیں سکے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ آدھی حویلی کیسے بک سکتی تھی۔۔؟ انہوں نے جہانزیب سے پوچھا تو اس نے نہایت اطمینان سے کہا کہ اسے پوری فیملی کو امریکہ سیٹل کرنے اور وہاں ذاتی بزنس شروع کرنے کے لیے بہت ساری رقم کی ضرورت ہے۔ جس کے لیے گھر بیچنا بہت ضروری ہے۔ البتہ اگر شیر زمان نہیں چاہتا کہ آدھی حویلی کسی اور کو بیچی جائے تو مطلوبہ رقم وہ خود ادا کر کے پوری حویلی کے مالک بن جائیں۔ شیر زمان عجیب مخمصے میں پھنس گیا تھا۔ جس رقم کا جہانزیب مطالبہ کر رہا تھا وہ یک مشت اس کے پاس موجود نہیں تھی اور نہ ہی جہانزیب اسے زیادہ وقت دینے کو تیار تھا۔ مجبوراً" اسے آدھے حصے سے دستبردار ہونا پڑا اور جہانزیب نے آدھی حویلی کسی حمید اللہ خان کو بیچ دی اور چند ہفتوں کے اندر اندر پوری فیملی سمیت امریکہ سدھار گیا۔

حویلی کے بیچوں بیچ دیوار آگئی اور باہر سے بظاہر ایک نظر آنے والا مکان اب اندر سے دو بالکل مختلف خاندانوں کا مسکن بن گیا۔ حویلی دو حصے ہو جانے کے واقعے نے ان سب کو اس قدر افسردہ کیا ہوا تھا کہ انہوں نے نئے آنے والوں سے ملنے جلنے میں ذرہ برابر دلچسپی نہیں لی۔ لیکن چند روز بعد حمید اللہ ـــــ کی بیگم رابعہ اپنی بہو سائرہ کے ساتھ خود ہی ملنے آگئیں۔ وہ بہت ہی ہنس مکھ اور ملنسار خاتون تھیں۔ دیر تک بیٹھی اپنے بارے میں بتاتی اور ان کے بارے میں پوچھتی رہیں۔

ان کے دو بیٹے تھے بڑا سہیل اور چھوٹا اسد اور ایک بیٹی تھی سعدیہ جو ان کے رشتہ داروں میں بیاہی ہوئی تھی۔ جاتے وقت وہ انہیں اپنے ہاں مدعو بھی کر گئیں۔ فاطمہ نے شوہر سے ان کی آمد کا تذکرہ کیا اور دعوت کے بارے میں بتایا۔ شیر زمان نے کہا کہ اگر وہ

گھر بلا رہے ہیں تو ضرور جانا چاہیے۔

یوں پہلی بار وہ اپنے نئے پڑوسیوں سے ملنے ان کے ہاں گئے۔ سائرہ بھابی اور رابعہ آنٹی سے تو دوسری ملاقات تھی اس لیے جھجک ذرا کم تھی لیکن گھر کے تین مردوں سے پہلی بار ان کا تعارف ہوا۔ سائرہ بھابی کے شوہر سہیل سوفٹ ویئر انجینئر تھے اور اسد یونیورسٹی میں فائنل ایئر کا طالب علم تھا اور ایم اے اکنامکس کر رہا تھا۔ عرینہ کو جانے کیوں پہلی نظر میں ہی اسد بہت اچھا لگا تھا۔ اس کی پرکشش مسکراہٹ نے عرینہ کا دل موہ لیا تھا۔

سائرہ بھابی سے ان کی کافی اچھی دوستی ہو گئی تھی اس لیے اکثر ہی شام کو وہ اور جیا بھابی سے ملنے ان کی طرف آجاتے بلکہ اب تو شیر زمان اور عبداللہ صاحب کی بھی آپس میں بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ بھی شام کا اخبار لے کر شیر زمان کی طرف آجاتے۔ عرینہ بھابی کے ساتھ کام کروانے اور باتوں کے دوران چھپکے چھپکے اسد کو بھی دیکھ لیتی۔ وہ فطرتاً" بڑا شرارتی اور لاابالی سا تھا۔ عرینہ کو جانے کیوں ایسا لگتا کہ اسد اس کے دل کا حال جانتا ہے لیکن جان بوجھ کر اگنور کرتا ہے۔ عرینہ بھی یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنی جانب سے پہل کرے۔ لڑکی ہونے کے ناتے اسے اپنی انا بہت پیاری تھی۔ لیکن اس کا دل کہتا تھا کہ ایک دن اسد ضرور پہل کرے گا۔ ایک روز وہ بہت بن کر عرینہ سے سوال کرنے لگا۔

"تم صرف سہیل کو ہی بھائی کیوں کہتی ہو؟" انداز نہایت چڑانے والا اور آنکھیں شرارت سے بھری تھیں۔ عرینہ کا تو مارے خفت کے برا حال ہو گیا۔

"وہ تو.... عمر کی وجہ سے!" وہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

"ہوں.... ہوں پتا ہے۔" وہ اس کی بات کاٹ کر گنگناتا ہوا چلا گیا اور وہ اس کی پشت دیکھتی رہ گئی۔ اسد اکثر ہی ایسے ذو معنی جملے پھینکتا رہتا تھا لیکن وہ جواباً" سنجیدہ ہی رہتی۔ اس طرح دل کی بات دل میں چھپائے وہ بی اے تک آپہنچی گزرے چار سالوں میں نہ تو اسد کی طرف سے کوئی بڑھاوا ملا اور نہ ہی اس کی خود سے کبھی کچھ کہنے کی ہمت ہوئی۔ وہ بی اے کے پیپرز دے کر بمشکل ہی سکون کا سانس لے پائی تھی جب جھیل میں پہلا پتھر گرا۔ امریکہ سے جہانزیب چچا کا فون آیا انہوں نے شیر زمان کو بتایا کہ پندرہ دن بعد وہ لوگ ہمیشہ کے لیے وطن واپس آرہے ہیں وہاں وہ اپنے سالوں کے توسط سے جس کمپنی سے منسلک ہو کر کام کر رہے تھے وہ مکمل دیوالیہ ہو چکی تھی اور پچھلا کچھ عرصہ نہایت مشکل حالات سے دوچار رہنے کے بعد انہوں نے وطن واپسی کا ارادہ کر لیا ہے۔

فون سن کر شیر زمان نے فاطمہ کو مختصراً" سارا احوال بتایا اور جا کر اپنے کمرے میں لیٹ گئے ان کی سنجیدگی اور خاموشی کا مطلب فاطمہ صاف سمجھ رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ حویلی کا اپنے والا آدھا حصہ گنوا چکنے کے بعد شیر زمان کو اپنی واپسی کی اطلاع دینے کا مقصد انہی کے گھر آکر ٹھہرنا تھا۔ فاطمہ نے بچیوں کی مدد سے ان لوگوں کے لیے تین کمرے سیٹ کیے اور اپنا سامان باقی کے دو کمروں میں کسی طرح ایڈجسٹ کر لیا شوہر کو بھی تسلی دی کہ فی الحال چونکہ ان لوگوں کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اس لیے چند دن صبر سے گزار لیں جلد ہی یقیناً" وہ اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں گے۔

شیر زمان نے جواباً" بنا کچھ کہے سر ہلا دیا۔ بات یہ نہیں تھی کہ وہ مشکل میں بھائی کا ساتھ نہیں دینا چاہتے تھے بلکہ اس کی آمد پر وہ ہر ممکن مدد کرنے کو تیار تھے، لیکن انہیں جہانزیب کی کچھ عادات پر اعتراض تھا جن میں سب سے بڑھ کر اس کی ہٹ دھرمی تھی وہ کوئی بھی کام بنا مشورے کے کرنے کا عادی تھا اور ہوا بھی یہی۔ جہانزیب نے آتے ہی بڑے دو بیٹوں کو دکان کی دیکھ بھال پر لگا دیا۔ حالانکہ خود شیر زمان کا بھی یہی خیال تھا کہ وہ جہانزیب اور اس کے لڑکوں کو اپنے ساتھ کاروبار کی طرف راغب کریں گے لیکن وہی کام جہانزیب نے الٹے ڈھنگ سے شروع کیا جس پر شیر زمان نے بمشکل ضبط کیا تاکہ جہانزیب ان کی ناراضی کو کوئی اور رنگ نہ دے۔

ان کی لمبی چوڑی فیملی بڑے ٹھاٹ سے گھر میں

پھیل گئی تھی۔ دونوں بھابیاں بمع قدسیہ چچی کے انتہا درجے کی ست قوم ثابت ہوتی تھی ان سب کی خدمت کا ٹھیکا بھی فاطمہ، جیا اور عرینہ نے لیا ہوا تھا۔ گھر پر تسلط مالکوں کی طرح اور خدمتیں مہمانوں کی طرح کروائی جا رہی تھیں۔ سب سے چھوٹے ثمر کے رنگ ڈھنگ تو سب سے نرالے تھے۔ بھائیوں کے ساتھ کام میں اس نے ذرہ برابر دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی سارا دن صوفے پر لیٹا ٹی وی دیکھتا رہتا اور وہاں سے بور ہو کر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ جاتا۔ ایک طرح سے ٹی وی لاؤنج پر مستقل اس کا قبضہ تھا۔ جیا اور عرینہ کو کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں بند ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ آتے جاتے اس کی گھورتی نگاہوں کا سامنا دونوں کے لیے ہی انتہائی کوفت کا باعث تھا۔

ان لوگوں کو آئے پندرہ سولہ دن ہو چکے تھے، لیکن کسی نے بھی کہیں اور گھر وغیرہ لینے کی بات نہیں کی تھی اور کرتے بھی کیوں.... ان کے پلانز تو کچھ اور ہی تھے یہ عقدہ بھی حل ہوا۔ جہانزیب نے ثمر کے لیے عرینہ کا ہاتھ مانگ لیا۔ شیر زمان نے فوری طور پر یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ فی الحال ان کا عرینہ کی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے، لیکن جہانزیب پر اس انکار کا کوئی اثر نہیں ہوا اس لیے چند روز بعد پھر وہی درخواست لے کر آبیٹھا۔ اس بار شیر زمان نے بھی واضح جواب دینا مناسب سمجھا اور صاف کہہ دیا کہ وہ ثمر کی شادی کہیں اور کر دیں۔

رات کو فاطمہ کاموں سے فارغ ہو کر کمرے میں آئی تو شوہر کو کمرے میں یہاں سے وہاں ٹہلتے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

"خیریت تو ہے.... ؟ آپ لیٹ جائیں آپ کی طبیعت ویسے بھی ٹھیک نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر آگے بڑھی۔

"تم بیٹھو کچھ بات کرنی ہے۔" وہ خود بھی پلنگ کے کنارے پر بیٹھ گئے۔

"جی.... کیا بات ہے؟"

"پچھلے دنوں جہانزیب نے مجھ سے عرینہ اور ثمر کی شادی کی بات کی تھی تب میں نے انکار کر دیا تھا، لیکن وہ آج پھر وہی بات لے بیٹھا ہے۔"

"ہائے.... پر اس نے تو وہاں کسی انگریز لڑکی سے شادی کر رکھی تھی نا۔"

"ہاں میں نے کہا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ گرین کارڈ کے لیے اس نے وہ شادی کی تھی اور اب اس کو چھوڑ چکا ہے۔ لیکن خیر ہمیں اس سے کیا لینا جب عرینہ کی اس سے شادی ہی نہیں کرنی۔"

"لیکن آپ کے انکار کے باوجود وہ پیچھے کیوں پڑا ہے۔" فاطمہ کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔

"اس کی وجہ تو صاف ظاہر ہے۔ حویلی بیچ کر جو غلطی اس نے کی تھی اب اس کو سدھارنے کا سب سے آسان حل یہی ہے کہ ثمر اور عرینہ کی شادی کر دی جائے تاکہ وہ مستقل ہمارے ہاں ڈیرہ جما سکیں۔"

"تو اب ہم کیا کریں۔" فاطمہ نے پریشانی سے شوہر کا چہرہ دیکھا۔

"گھبراؤ مت.... بس اتنا یاد رکھو کہ کل کو مجھے کچھ ہو جائے تو جہانزیب سمیت اس گھر کے کسی فرد پر اعتبار مت کرنا۔"

"اللہ نہ کرے.... کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" فاطمہ دہل گئی۔

"زندگی کا کیا بھروسا.... پھر تم جانتی ہو میں دل کا مریض ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ پلنگ پر لیٹ گئے۔

"ان شاء اللہ آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔" فاطمہ نے تسلی کے انداز میں ان کا ہاتھ تھاما۔

"ہاں لیکن اب اس مسئلے کا کچھ تو حل نکالنا ہی پڑے گا۔"

"جیسے.... ؟"

"کل تم حمید بھائی اور بھابی سے مل کر ان کا عندیہ لو اگر وہ اسد کی عرینہ سے شادی پر تیار ہو جائیں تو ہم جلد از جلد منگنی یا نکاح کی رسم ادا کر دیں۔"

"اسد اور عرینہ...." فاطمہ سوچ میں پڑ گئی۔ "لیکن لڑکی والے ہو کر خود بات کرنا...."

"مناسب تو مجھے بھی نہیں لگتا، لیکن جہانزیب کو

چپ کرانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ اور مجھے خاندان میں دور نزدیک کوئی ایسا لڑکا دکھائی نہیں دے رہا۔"
"خاندان ہی کتنا ہے۔" فاطمہ نے آہ بھری۔
"اللہ نے مجھے ہی کوئی سگا بھائی بہن دیا ہوتا۔۔۔ خیر آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اسد ہر لحاظ سے ہماری عرینہ کے لیے بہت اچھا ہے، میں کل ہی ملتی ہوں ان لوگوں سے۔" وہ انہیں تسلی دیتی اٹھ کھڑی ہوئی۔
اگلے روز فاطمہ صبح کے وقت حمید بھائی کے ہاں گئیں۔ اس وقت عموماً" باقی سب کام کاج پر گئے ہوتے تھے۔ فاطمہ نے موقع مناسب دیکھ کر بات چھیڑ دی اور یہ دیکھ کر تو اس کی خوشی کی کوانتہا ہی نہیں رہی کہ وہ دونوں ہی بہت خوش ہوئے تھے۔ رابعہ بھابھی نے کہا کہ عرینہ انہیں شروع سے بہت پسند ہے، لیکن انہیں اسد کی رائے جاننے کے لیے کچھ وقت درکار ہے۔ فاطمہ بڑے خوشگوار موڈ میں واپس آئی اور آتے ہی یہ خوشخبری شیر زمان کو سنادی۔ یہ جانے بغیر کہ اس خوشی کی مدت بہت مختصر ہے۔ کیونکہ رات کو رابعہ بھابھی کا فون آیا تو انہوں نے کہا کہ اسد ابھی شادی کے لیے تیار نہیں جواب صاف تھا کہ اب یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ فاطمہ نے خاموشی سے فون رکھ دیا۔ شوہر کی طبیعت کے خیال سے خوب سنبھل سنبھل کر بتانا شروع کیا۔
کمرے میں آتی عرینہ اپنا اور اسد کا نام سن کر ٹھٹک گئی۔ پوری بات سن لینے کے بعد بھی کچھ سمجھ آیا کچھ نہیں، اس لیے رات کو خود ہی امی سے پوچھ لیا جواباً" فاطمہ نے پوری تفصیل بتادی۔ عرینہ نے بہت مشکل سے اپنی اندرونی کیفیت ماں سے چھپائی، لیکن اندر بہت دور کہیں کچھ ٹوٹ سا گیا۔
وہ امی کے ساتھ مل کر دوپہر کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ شیر زمان جیا سے پانی مانگ کر کمرے میں جالیٹے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ گزرے تھے کہ اچانک لاؤنج سے جہانزیب چچا کے زور زور سے چلانے کی آواز آئی۔ وہ دونوں تیزی سے باہر آئے۔
"جلدی آئیں۔۔۔ جانے بھائی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔" وہ کہہ کر واپس پلٹے۔ فاطمہ سینے پہ ہاتھ مار کر پیچھے دوڑی۔ عرینہ بھی ان کے پیچھے تھی، لیکن کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی ٹھٹک کر رک گئی۔
کمرے کی کھڑکی کے باہر والی دیوار کے ساتھ جیا نیم بے ہوش سی بیٹھی تھی وہ فوراً" اس کی طرف بڑھی اور تقریباً" گھسیٹتے ہوئے ساتھ والے کمرے میں لے آئی۔ پلنگ پر لٹا کر پہلے ایک، دو تھپڑ گالوں پر لگائے، پھر پانی کے چھینٹے مارے اور جیسے ہی اس کی پلکیں ذرا سا کپکپائیں۔۔۔ وہ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر ابا کے کمرے میں آئی، لیکن یہاں کا منظر ہرگز تسلی بخش نہیں تھا۔ امی ان کے سینے پہ سر رکھے دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر چچا کی طرف دیکھا تو آہستہ سے سرہلا کر انہوں نے عرینہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔
"نہیں۔۔۔" وہ دوڑتی ہوئی ابا کے قریب آئی۔ پہلے نبض چیک کی پھر دل کے مقام پر کان لگا کر دھڑکن سننے کی کوشش کی، لیکن بے سود۔۔۔ ابا واقعی زندگی ہار بیٹھے تھے۔ عرینہ نڈھال سی ان پر گر گئی۔ لوگوں کو کس نے بتایا۔۔۔ کون کون آیا۔۔۔ وہ ہر چیز سے بے خبر تھی۔ چچا نے ہی شام، پانچ بجے جنازہ اٹھنے کا اعلان کیا اور جوں ہی ابا کا جنازہ اٹھا، عرینہ کو یک لخت ہوش آیا۔
"جیا۔۔۔" وہ پاگلوں کی طرح اندر دوڑی۔
"ہائے میری معصوم بہن۔۔۔" اس نے تو ابا کا چہرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ اندر آئی تو جیا ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ عرینہ نے ماتھا چھوا تو تیز بخار محسوس ہوا۔۔۔ آنے والے تین دنوں میں اس کی حالت یہ تھی کہ وقفے وقفے سے ہوش میں آتی اور پھر نڈھال ہو جاتی۔۔۔ فاطمہ اور عرینہ زبردستی اسے جوس وغیرہ پلا دیتے چوتھی صبح بخار مکمل طور پر اتر چکا تھا۔ وہ کافی بہتر حالت میں تھی۔ نارمل انداز میں اٹھ کر بیٹھتے ہی اس نے سب سے پہلے ابا کا پوچھا۔ عرینہ سے جھوٹ نہیں بولا گیا۔ اس لیے نرمی سے ہاتھ تھام کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔
"ابا نہیں رہے جیا۔"
جواباً" جیا نے آنکھیں بند کر کے کرب سے ہونٹ

چبائے۔ "انہیں مار آگیا ہے۔"
"کیا۔۔۔؟" عرینہ کو اپنی سماعت پر دھوکا سا ہوا۔
"ہاں۔۔۔ انہیں جہانزیب چچا نے مارا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔"
"کیا دیکھا تم نے۔" فاطمہ نے بے چینی سے اس کا بازو پکڑا۔
"ابا مجھ سے پانی مانگ کر کمرے میں جالیٹے۔ میں کمرے میں کھڑی فون سن رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے جہانزیب چچا کو مشکوک انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ابا کے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ جب میں پانی کا گلاس لیے دروازے پر آئی اور ہلکا سا دبایا تو اندر سے بند ملا۔ تب میں کھڑکی کے قریب آئی۔ آپ تو جانتی ہیں کہ کھڑکی کے اندر کی طرف الماری کی وجہ سے صرف ایک کونے سے ہی اندر کا منظر دکھائی دیتا ہے مجھے کمرے کی ہلکی روشنی میں جہانزیب چچا دکھائی دیے۔ وہ ابا پر جھکے ہوئے تھے۔ میں نے مزید دھیان لگایا تو پہلے نظر ابا کے حرکت کرتے پیروں پر پڑی۔ وہ زور، زور سے ٹانگیں مار رہے تھے اور پھر مجھے سب صاف صاف نظر آنے لگا۔ چچا کے ہاتھ میں تکیہ تھا۔ جس سے وہ ابا کا منہ دبا رہے تھے۔ مجھے جوں ہی بات کی سمجھ آئی میں فوراً" سیدھی آئی تاکہ دروازہ بجاؤں، لیکن جانے ایک دم کیا ہوا۔ دل مارے گھبراہٹ کے جیسے سکڑ سا گیا۔ ٹانگیں بری طرح لڑکھڑائیں اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔" وہ کہتے کہتے رو پڑی۔
"کاش میں انہیں بچالیتی۔۔۔" جیا روئی تو فاطمہ بھی حوصلہ ہار بیٹھیں۔ عرینہ نے جلدی سے ماں کو لٹا دیا اور زبردستی نیند کی گولی کھلا دی۔ تاکہ وہ زیادہ سوچیں نہیں۔ ابھی پہلے صدمے کا دکھ بھی کم نہیں ہوا تھا کہ ایک اور پریشانی نے گھیر لیا تھا۔
"ہم اس وقت بہت خطرے میں ہیں جیا۔۔۔" عرینہ نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے تفکر سے جیا کو دیکھا تو "کیا اب یہ ہمیں بھی مار دیں گے۔" جیا نے خوف بھری نظروں سے عرینہ کو دیکھا تو وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھی اور پیار سے گلے لگایا۔
"ڈرو مت۔۔۔ اب جان لینے سے ان کا مقصد حل نہیں ہو گا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اب انہیں حویلی چاہیے اور اس کے لیے وہ کسی بھی قیمت پر میری شادی ہمیر سے کروانا چاہیں گے۔ ان کی بے خوفی کا عالم تو ہم دیکھ ہی چکے ہیں۔ سب گھر والوں کی موجودگی میں کس دیدہ دلیری سے انہوں نے ابا کا قتل کیا۔۔۔ لیکن خیر۔۔۔ فی الحال ہم محفوظ ہیں، کیونکہ ابا کو فوت ہوئے محض چار دن ہوئے ہیں۔ اب وہ اتنے بے وقوف بھی نہیں کہ ایسے حالات میں شادی کی بات چھیڑیں۔"
"اس دوران اگر ہم چچا کے خلاف قتل کی رپورٹ درج کر دیں تو۔۔۔" جیا نے مشورے کے انداز میں پوچھا۔
"رپورٹ بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن ایسا کوئی بھی قدم عجلت میں نہیں اٹھایا جاسکتا۔ اس کے لیے مجھے وقار انکل سے مشورہ کرنا پڑے گا۔"
"لیکن وقار انکل اور آنٹی تو ابھی پچھلے ہفتے دبئی گئے ہیں اپنے بیٹے سے ملنے۔"
"اوہاں۔۔۔" عرینہ نے پیشانی مسلی۔ "پھر تو سوائے چپ رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ ہم بس بالکل نارمل رہیں گے اور اپنے رویے سے انہیں کسی قسم کے شک میں نہیں ڈالیں گے سمجھ گئیں نا۔ وقار انکل کے آنے تک یہی کرنا ہو گا۔"
"ہوں۔۔۔" جیا نے بھی سرہلا دیا۔
آنے والے دنوں میں چچا سمیت پوری فیملی کے رویے میں نمایاں تبدیلی یہ آئی کہ اب وہ خود کو گھر کا مالک تصور کرنے لگے تھے۔ چچا نے مکمل طور پر نہ صرف دکانوں پر قبضہ کر لیا تھا بلکہ وہاں سے آنے والی رقم کا بھی کوئی حساب کتاب دینے کی زحمت نہیں کی۔ سب کچھ اپنے پاس رکھنا شروع کر دیا۔ ایک دن عرینہ سے بڑی لگاوٹ کے ساتھ لاکر کی چابی مانگی۔ عرینہ نے دماغ کا استعمال کرتے ہوئے فوری طور پر یہی کہہ دیا کہ وہ خود بھی کئی روز سے چابی ڈھونڈ رہی ہے اور جیسے ہی ملے گی ان کے حوالے کر دے گی۔ لیکن پھر احتیاط سے

چابی کو مزید محفوظ جگہ پر چھپا دیا۔

ثمر زمان کا چالیسواں گزرا تو اس کے محض ہفتے بھر بعد ہی جہانزیب، عرینہ کے پاس آئے، وہ اس وقت لان میں بیٹھی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے؟" وہ کافی خوشگوار موڈ میں اس کے سامنے بیٹھے تو عرینہ نے قدرے چونک کر انہیں دیکھا۔

"جی بس۔۔۔ اخبار دیکھ رہی تھی۔"

"بیٹا میں چاہتا ہوں اب تمہاری اور ثمر کی شادی میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

"جی۔۔۔؟" وہ ٹھٹک سی گئی۔

"بھئی۔۔۔ گھر کی تو بات ہے۔ پھر کون سا دھوم دھڑکا کرنا ہے۔ سادگی سے رسم ادا کر دیں گے۔" سازشی مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ عرینہ کو زہر لگے۔

"لیکن ابا تو آپ کو انکار کر چکے تھے۔"

"ارے نہیں۔۔۔ وہ تو پرانی بات ہے۔ بعد میں تو مان گئے تھے۔ حیرت ہے تمہیں نہیں پتا۔۔۔" اعتماد سے جھوٹ بول کر وہ بغور عرینہ کو دیکھنے لگے۔

"بعد میں کب؟ جب آپ آخری بار ان کے کمرے میں گئے تھے۔" عرینہ کے لہجے میں محسوس کی جانے والی چبھن تھی۔ جہانزیب نے ایک تیز عقابی نظر سے جیسے کچھ جانچنے کی کوشش کی۔ "کیا مطلب؟"

"آ۔۔۔ آپ کو امی سے بات کرنی چاہیے۔" وہ فوراً سنبھلی۔ "باقی جہاں تک میری مرضی کا سوال ہے تو مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" وہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہوں۔۔۔" جہانزیب ایک ہنکارا بھر کر اٹھے۔

"بھابھی جی سے بھی بات کر لیتے ہیں، لیکن سن لو لڑکی کہ تمہاری مرضی سے مجھے کوئی سروکار نہیں ہے۔ شادی تو تمہیں کرنا ہی ہوگی۔ کل صبح دس بجے تم ماں، بیٹیاں تیار رہنا۔ قاضی صاحب اور چند ایک قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں تمہارا ثمر سے نکاح ہے۔" وہ حتمی انداز میں کہہ کر پلٹ گئے۔

عرینہ کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئیں۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ عرینہ نے وہیں کھڑے کھڑے کچھ سوچا اور اندر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ پہلے نماز پڑھی، پھر معمول کے مطابق ان سب کے ساتھ کھانے میں شریک ہوئی۔ جہانزیب نے اس کے نارمل رویے پر کافی سکون اور خوشی محسوس کی اور یہی عرینہ چاہتی تھی۔ برتن سمیٹنے کے دوران اس نے جیا اور امی کو کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور جب باقی سب بھی اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے تو اس نے اندر آکر چٹخنی چڑھا دی۔ جیا اور فاطمہ نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا۔

"میری بات دھیان سے سنیں۔ ہمیں آج رات کسی بھی صورت یہاں سے نکلنا ہے۔" اس نے تمہید باندھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

"کیا مطلب۔۔۔ کہاں۔۔۔ اور کیوں؟"

"جہانزیب چچا کل میری ثمر سے زبردستی شادی کروا رہے ہیں۔ میں نے انکار بھی کیا۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔"

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" جیا کا مارے گھبراہٹ کے حلق خشک ہونے لگا۔

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی۔ لیکن ہمارے پاس سوائے بھاگنے کے کوئی راستہ نہیں۔ ہم اس وقت بالکل اکیلے ہیں اور دشمن کے ساتھ ایک ہی چھت کے نیچے موجود ہیں۔"

"ہمیں حمید انکل سے مدد لینی چاہیے۔" جیا نے مشورہ دیا تو عرینہ نے فوراً" نفی میں سر ہلایا۔

"ان سے مدد مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو اپنے بیٹے کو قائل نہیں کر سکے۔ ہمارے کسی کام کیا آئیں گے۔ امی پلیز، کوئی ایسی جگہ سوچیں جہاں جہانزیب چچا ہم تک نہ پہنچ سکیں۔"

"مجھے تو بار بار صرف وقار بھائی کا خیال آ رہا ہے اور وہ یہاں ہیں نہیں۔ باقی رشتہ داروں میں تو کوئی بھی ایسا نہیں جس سے مدد مانگی جا سکے۔"

"امی آپ کا ذہن بہاولپور کے اندر ہی گھوم رہا ہے۔ ذرا باہر نکل کر سوچیں۔" وہ جھنجلائی۔

"باہر۔۔۔" فاطمہ نے دہرایا۔ "پھر تو ایک ہی جگہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

"مانسہرہ۔۔۔ میری خالہ زاد ممتاز کے پاس۔"

"مانسہرہ۔۔۔ اتنی دور۔۔۔" جیا نے آنکھیں نکالیں، جبکہ عرینہ نے طمانیت کا سانس لیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اٹھی اور اسی وقت دروازہ بجا۔ تینوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ جیا نے چٹخنی گرائی۔ سامنے عابد بھائی کا بیٹا کھڑا تھا۔

"فاطمہ آنٹی کو دادا اور دادی اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔" وہ کہہ کر بھاگ نکلا۔

"امی خیال سے۔۔۔" عرینہ فوراً" ان کے قریب آئی۔ "چچا نے یقیناً" شادی کی بات کرنے کے لیے بلایا ہوگا۔ آپ بس نارمل سی حیل و حجت کے بعد مان جائیں اور کل کے فنکشن کے لیے بھی رضامندی ظاہر کریں تاکہ وہ مطمئن ہو جائیں اور ہم پر کوئی نظر نہ رکھے۔"

"ہوں۔۔۔" وہ سر ہلا کر باہر نکل گئیں۔

"چلو جیا۔۔۔ ہم ذرا سامان اکٹھا کر لیں۔ میرے خیال میں تین بیگ ہم با آسانی اٹھا سکتے ہیں۔ بس دھیان رکھنا کہ باہر سے زیادہ چیزیں نہ اٹھانا پڑیں۔"

"فکر مت کرو، ہمارا سب سامان اسی کمرے میں ہے۔" جیا فوراً" حرکت میں آگئی۔ اسٹور روم کا دروازہ کمرے کے اندر ہی کھلتا تھا۔ جیا نے بیگ نکال کر کپڑے رکھنا شروع کر دیے۔ عرینہ نے باہر نکل کر دیکھا تو کوئی نظر نہیں آیا۔ واپس آکر عرینہ نے وارڈروب سے ہینڈ بیگ نکالا۔

"غیر ضروری چیزیں مت ڈالنا۔ بس ہم تینوں کے کپڑے، جوتے اور چھوٹا موٹا ضروری سامان رکھنا۔ میں ابھی آتی ہوں۔" وہ جیا کو سمجھا کر باہر نکل آئی۔

اس کا رخ ابا کے کمرے کی طرف تھا۔ ان کے کمرے میں آکر بنا لائٹ آن کیے وہ لاکر کی طرف بڑھی۔ اندھیرے میں ہی احتیاط سے لاکر کھول کر ساری نقدی اور زیور اندازے سے ہینڈ بیگ میں ڈالا اور دوبارہ سے لاک کر کے واپس آگئی۔ امی ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ البتہ جیا نے تینوں بیگ تیار کر لیے تھے۔

"جگہ بہت تھی، میں نے گرم کپڑے بھی رکھ لیے۔"

"گڈ۔۔۔ ویسے بھی نہیں پتا ہم وہاں کب تک رہیں۔ اچھا اب ذرا لان اور گیٹ کا ایریا چیک کر کے آؤ۔ اس طرف کوئی ہے تو نہیں؟ اور ہاں باہر کی لائٹ بھی آف کرتی آنا۔"

"او کے۔۔۔" وہ باہر نکل گئی اور پانچ ہی منٹ میں واپس بھی آگئی۔

"اس طرف کوئی نہیں ہے۔ لائٹ بھی میں نے آف کر دی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر ہم ایک ایک کر کے بیگ گیٹ کے پاس رکھنا شروع کرتے ہیں۔"

"ابھی سے کیوں۔۔۔" جیا حیران ہو گئی۔ "امی کو تو آنے دو، ویسے بھی سب جاگ رہے ہیں ابھی۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ اگر رات والی ٹرین نکل گئی تو صبح تک اسٹیشن پر بیٹھنا پڑے گا اور بس سے میں جانا نہیں چاہتی، کیونکہ اگر انہیں ہماری غیر موجودگی کا جلدی علم ہو گیا اور یہ لوگ ہمیں ڈھونڈنے نکل کھڑے ہوئے تو بس اسٹینڈ پر نظر میں آنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔ جبکہ ریلوے اسٹیشن پر اس کا امکان کم ہے۔ خیر تم باہر جھانکو میں بیگ اٹھاتی ہوں۔"

انہیں زیادہ پرابلم نہیں ہوئی۔ اس وقت کمروں میں رہنا ان سب کی روز کی روٹین تھی۔ جیا اور عرینہ نے دو چکروں میں تینوں بیگ گیٹ کے اندھیرے کونے میں چھپا دیے۔ فاطمہ بھی اتنے میں واپس آگئی۔ جہانزیب نے ۔۔۔ شادی کی بات کرنے کے لیے ہی بلایا تھا۔ عرینہ نے ماں کو تازہ ترین صورت حال بتائی۔ قرآن

پاک آنکھوں سے لگا کر تینوں نے دعا مانگی اور کمرے کی لائٹ آف کر کے دروازہ بند کیا اور دھڑکتے دل کے ساتھ گیٹ کی طرف آئے۔ قسمت بھی خوب ساتھ دے رہی تھی۔ گیٹ تک کا سفر بھی کامیابی سے طے پا گیا۔ تینوں نے بیگز اٹھائے اور ایک محتاط نظر پیچھے ڈال کر باہر نکل آئے۔

اپنی گلی میں تو سرے تک تنہائی اور سناٹے کا راج تھا۔ سڑک پر آئے تو اکا دکا ٹریفک آ جا رہی تھی۔ ٹیکسی ملنے تک وہ سڑک کنارے چلتے ہی گئے۔ تاکہ جلد از جلد گھر سے دور ہو جائیں۔ اسٹیشن پر آئے تو تینوں ٹکٹ باآسانی مل گئے۔ ٹرین جانے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ فاطمہ نے تسبیح پڑھنا شروع کر دی۔ ایک ایک لمحہ بہت بھاری گزر رہا تھا۔ ٹرین جیسے ہی آئی وہ اس میں سوار ہو گئے۔ جوں ہی وسل بجی اور ٹرین نے آہستہ آہستہ اسٹیشن چھوڑنا شروع کیا۔ ان تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک طمانیت بھرا سانس لیا۔

☼ ☼ ☼

"ممتاز اگر تم جمال سے کہہ کر ہمیں آس پاس کوئی کرائے کا امکان دلوا دو تو ہم ذرا سیٹ ہو جائیں۔" فاطمہ نے اپنی طرف سے بہت جھجک کر بات کا آغاز کیا، لیکن ممتاز پھر بھی برا مان گئی۔

"جب میرا گھر تم تینوں پر چھوٹا پڑ جائے گا تو میں خود ہی چھوڑ آؤں گی کرائے کے گھر۔"

"یہ بات نہیں ہے ممتاز۔۔۔ دیکھو جن حالات میں ہم لوگ آئے ہیں تو فی الحال مہینوں واپس جانے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ پھر ہمارے پاس اچھی خاصی نقدی اور زیور ہے۔"

"رقم اور زیور بینک کے لاکر میں رکھوا دو۔۔۔ اور سنو، یہاں حالات ایسے نہیں ہیں کہ تین اکیلی عورتوں کو الگ گھر میں رہنے دیا جائے۔ آئندہ کہیں جانے کی بات مت کرنا۔"

"بالکل ٹھیک کہا خالہ۔" عرینہ بھی ان کی باتیں سنتی ہوئی آ گئی۔ وہ بھی بہت دنوں سے پیسوں اور زیورات کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ خالہ کا آئیڈیا اچھا تھا۔ استعمال کی کچھ رقم اپنے پاس رکھ کر باقی پیسے اور زیور بینک میں رکھوا دینا ہی بہتر تھا۔ اس کا اپنا ارادہ تو یہ بھی تھا کہ ہر مہینے ایک معقول رقم وہ خالہ کو بھی دے دیا کرے۔ لیکن جیسا ان کا مزاج تھا۔ عرینہ کو بہت سوچ سمجھ کر اپنے آئیڈیے کو عملی جامہ پہنانا تھا۔ کیونکہ ایسی غیریت برتنے والی باتوں پر خالہ بہت برا مان جایا کرتی تھیں۔

کاغان سے ممتاز خالہ کی بڑی بیٹی شبنم کا فون آیا تھا۔ وہ ان سب کو اپنے ہاں بلا رہی تھی۔ عرینہ اور جیا سے بھی اس نے بات کی اور اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ خالہ نے اسے بتایا کہ واصف اور جمال ابھی بالکل فارغ نہیں ہیں۔ اس لیے فی الحال ان کا آنا بہت مشکل ہے۔ اس وقت تو شبنم خاموش ہو گئی۔ لیکن دو دن سے زیادہ آرام سے نہ بیٹھ سکی اور اپنے دیور کو انہیں لینے بھیج دیا۔ ممتاز تو اسفند کو اچانک سامنے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ اسفند نے ہنستے ہوئے شبنم کا نمبر ملایا اور ان کی بات کروا دی۔

"امی اب اور کوئی بہانہ نہیں۔ بس آپ فوراً" ان سب کو بھیج دیں۔ مجھے سخت بوریت ہوتی ہے سارا دن۔" شبنم نے حتمی انداز میں کہہ کر فون رکھ دیا۔

"اور ہاں یہ نیلم بی بی کہاں ہیں۔ وہ بھی پروگرام میں پوری پوری شامل تھیں۔" اسفند کہتا ہوا جیسے ہی نیلم کے کمرے میں داخل ہوا اپنے سامنے عرینہ کو دیکھ کر ایک دم ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔

"مس بے زار۔۔۔ یہاں۔" جملہ اس کے منہ میں ہی تھا۔ جب نیلم بھی پیچھے سے داخل ہوئی۔

"توبہ ہے اسفند بھائی۔۔۔ یہ عرینہ ہے، ہماری کزن۔"

"سوری ڈیئر۔۔۔ ویسے اطلاعاً" عرض ہے کہ یہ ہمارا دوسرا سامنا ہے۔ بلکہ تیسرا۔" وہ ٹرین کی اگلی صبح والی ٹکر یاد کر کے مسکرا دیا۔

"اچھا۔۔۔؟" نیلم نے حیران ہو کر عرینہ کو دیکھا۔

لیکن اس نے بنا کچھ کہے نظر پھیر لی۔

"برے گمان مت کرو لڑکی، ہفتہ بھر پہلے ٹرین میں اتفاقاً" سامنا ہوا تھا۔" وہ شوخی سے بولے جا رہا تھا، نیلم بھی ہنس پڑی۔

"لیکن آپ نے اسے مس بے زار کیوں کہا؟"

"ارے میرا کیا قصور۔۔۔ جب دیکھو منہ پہ بارہ بجے ہوتے ہیں، بس پھسل گیا منہ سے۔" اسفند نے آہستہ آواز سے کہا۔ لیکن عرینہ نے سن لیا اور خاموشی سے باہر نکل گئی۔

"ذرا سوچ کر بولا کریں اسفند بھائی۔ جانتے بھی ہیں یہ لوگ کتنی بڑی ٹریجڈی سے گزر کر آئے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ واقعی حیران ہو گیا۔ شبنم بھابھی کی زبانی مہمانوں کی آمد کا سن کر وہ یہی سمجھا کہ ان کے کوئی رشتہ دار گرمی کی چھٹیاں منانے آئے ہوئے ہیں نیلم نے مختصراً" ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات سے آگاہ کیا تو اسے اپنے سابقہ رویے پر خاصی شرمندگی محسوس ہوئی۔

"ایک منٹ۔" وہ نیلم سے اجازت لے کر باہر آیا۔ عرینہ ستون سے ٹیک لگائے باہر ہی کھڑی تھی۔

"معذرت چاہتا ہوں۔۔۔ دراصل مجھے بنا سوچے کچھ بھی بول دینے کی بری عادت ہے۔ امید ہے آپ نے مائنڈ نہیں کیا ہو گا۔ ایک بار پھر سوری۔"

"اٹس اوکے۔" وہ ہنوز منہ دوسری طرف کیے کھڑی رہی تو اسفند مسکرا دیا۔

"اٹس اوکے سے تو بات نہیں بننے والی، آپ کیا چاہتی ہیں مارے شرمندگی کے رات بھر کروٹیں بدلتا رہوں۔"

"رہنے دیں اسفند بھائی۔ شرمندہ ہونے والی صورتیں آپ جیسی نہیں ہوتیں۔" نیلم نے پیچھے سے لقمہ دیا۔

"تم نے ضرور ٹانگ اڑائی تھی۔ اچھا بھلا وہ مسکرانے لگی تھیں۔" اسفند نے مصنوعی غصے سے نیلم کو دیکھا۔

"مسکراہٹ اور یہ۔۔۔ رہنے دیں۔ ابھی یہ فرمائش بہت بڑی ہے۔ چلو عرینہ۔" وہ اسے منہ چڑا کر چل دی تو اسفند کندھے اچکا کر رہ گیا۔

وہ سب اگلی صبح اسفند کے ساتھ روانہ ہوئے۔ وہ ان کے آرام کی خاطر کسی دوست سے گاڑی مانگ لایا تھا۔ ان تینوں کے علاوہ نگینہ بھابھی بھی ساتھ تھیں۔ ان کا میکہ کاغان میں ہی تھا۔ دونوں بہنوں نے میکے جانے کے لیے باریاں رکھی ہوئی تھیں۔ سوائے کسی فنکشن وغیرہ کے وہ زیادہ تر الگ الگ ہی میکے جاتیں، تاکہ ان کے پیچھے گھر کے معمولات اثر انداز نہ ہوں۔ ممتاز خالہ اس معاملے میں کافی خوش قسمت ثابت ہوئی تھیں۔ دونوں بہوئیں ہی بہت خدمت گزار اور پیار کرنے والی تھیں۔

بھابھی چھوٹے حمزہ کو لے کر اسفند کے ساتھ آگے بیٹھ گئیں۔ جبکہ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر ایڈجسٹ ہو گئیں۔ مانسہرہ سے نکلے تو علاقے کے حسن کا صحیح معنوں میں احساس ہوا۔ وہ اور جیا مبہوت سی کھڑکی کے پار بکھرے قدرت کے اس حسین و جمیل خطے کو دیکھے جا رہی تھیں۔ اوپر سے اسفند نے پرانا میوزک لگا دیا۔ لتا کی آواز ماحول میں اور بھی گمبھیرتا پیدا کر رہی تھی۔ "او بے قرار دل، ہو چکا ہے مجھ کو آنسوؤں سے پیار۔۔۔"

"تمہاری چوائس کا بھی جواب نہیں اسفند۔" بھابھی نے متاثر ہو کر اسفند کو دیکھا۔

"اچھا۔۔۔ میں تو سوچ رہا تھا ابھی کہیں سے نئے گانوں کی فرمائش آ جائے گی۔"

"کیوں بھئی۔۔۔ کیا ہم اچھا ذوق نہیں رکھ سکتے۔" بھابھی مسکرائیں تو اسفند نے سر ہلایا۔

"بالکل جی۔۔۔ کیوں نہیں۔"

"اچھا بھئی۔۔۔ اب آگے ذرا سائیڈ پہ روک کر ہمیں کولڈ ڈرنک وغیرہ پلواؤ۔"

"بہتر جناب۔" وہ مسکراتے ہوئے سامنے دیکھنے لگا۔

"دس منٹ کے بعد ہی ایک آبشار کے ساتھ کولڈ ڈرنک شاپ آ گئی۔" اسفند نے گاڑی سائیڈ پہ روک

کر سب کو اترنے کا اشارہ کیا۔ جیا اور عرینہ نیچے اتریں تو حیرت سے منہ کھولے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ کولڈ ڈرنکس کے کریٹ آبشار کے نیچے ہی ٹھنڈے کرنے کے لیے رکھے ہوئے تھے اور آبشار کا پانی سڑک کے بیچوں بیچ سے گزر کر دوسری طرف وادی میں گر رہا تھا۔

"بیوٹی فل۔" جیا منہ پہ ہاتھ رکھے بے اختیار آگے بڑھی۔

"چلو پانی کو ہاتھ لگاتے ہیں۔" نیلم نے اس کا بازو کھینچا تو وہ ہوش میں آئی۔ کافی ڈرتے ڈرتے اس نے پانی کے نیچے ہتھیلی رکھی۔ تو اتر سے بہتا پانی ہاتھ سے ٹکرایا تو چھینٹے سیدھے منہ پر پڑے۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی' اسے بغور دیکھتا اسفند بے ساختہ ہنس دیا۔ جانے کیوں اس کے دل میں خیال آیا کہ کیمرہ ہوتا تو وہ اس منظر کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیتا۔ ہنستے ہنستے گھبرا کر پیچھے ہٹتی عرینہ اس لمحے واقعی بہت پیاری لگی تھی۔

خوب صورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے وہ لوگ کاغان پہنچے' یہ جگہ بھی کم حسین نہیں تھی۔ شبنم باجی کا گھر ایک ڈھلوانی راستے سے ہوتا ہوا اوپر پہاڑی پر تھا۔ دور سے وہ چھوٹا سا لکڑی کا ماڈل دکھائی دیتا تھا۔ سادگی سے بنا صاف ستھرا چھوٹا سا ان کا گھر عرینہ کو بہت پیارا لگا۔ ممتاز خالہ کے زیادہ تر سسرالی رشتہ دار کاغان میں ہی رہتے تھے۔ نگینہ بھابھی شام تک ان کے ساتھ رہیں۔ پھر ان کا بھائی لینے آگیا تو وہ اپنے میکے چلی گئیں۔ باجی کے گھر کافی مختصر سے لوگ تھے۔ اس لیے بقول نیلم باقی گھروں کی نسبت یہاں کافی سکون تھا۔ یہاں شبنم باجی' ان کے شوہر ساجد اور بیٹی نازش کے علاوہ اسفند اور ان کے والد صاحب رہتے تھے۔ ساجد بھائی واپڈا میں سرکاری ملازم تھے اور اسفند کاغان میں ایک لکڑی کے کارخانے میں اسسٹنٹ منیجر تھا۔

شام کو کھانے سے فارغ ہو کر وہ لوگ باہر لان میں آ بیٹھے۔ لان کیا تھا پوری پہاڑی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر کی تقسیم کے لیے صرف ایک لکڑی کی باؤنڈری سی بنائی ہوئی تھی۔ یہاں سے دور تک کا منظر با آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ نیلم نے تفصیل سے باجی اور ساجد بھائی کو ان لوگوں کے حالات بتانا شروع کیے' اسفند بھی وہیں موجود تھا۔ ساری باتیں اس نے بھی سنیں تو دھیان سے۔ لیکن گفتگو میں شامل ہونے کے بجائے نازش سے کھیلتا رہا۔

اتوار کے دن عرینہ کی آنکھ کچھ زیادہ ہی جلدی کھل گئی۔ جیا اور نیلم کو بے سدھ پڑا دیکھ کر اس کی ہنسی نکل گئی۔ واش روم سے نکل کر وہ کنگھی کرتی ہوئی کھڑکی کی طرف آئی۔ ہلکا سا پردہ سرکا کر باہر دیکھا تو حرکت کرنا ہی بھول گئی۔ باہر لان میں بادل کے ٹکڑے سگریٹ کے مرغولوں کی طرح اڑ رہے تھے۔

"واؤ۔" وہ جھٹ سرہانے رکھی میرون شال اوڑھ کر باہر آگئی۔ باقی لوگ ابھی سو رہے تھے شاید۔ وہ لان میں آکر اکیلی ہی اس منظر سے لطف اندوز ہونے لگی۔ اسفند کی اگرچہ آج چھٹی تھی لیکن شبنم باجی نے رات آؤٹنگ کا پروگرام بنایا تھا۔ سو وہ صبح سویرے ڈرائیور اور گاڑی کا بندوبست کرنے چلا گیا۔ واپسی پر ناشتے کا کچھ سامان لے کر جوں ہی اوپر آیا' ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گیا۔ عرینہ بادلوں کو چھونے کی کوشش میں بچوں کی طرح خوش ہو رہی تھی۔

"یہ لڑکی ہنستی ہوئی کتنی اچھی لگتی ہے۔ لیکن پھر بھی کنجوسی کرتی ہے۔" وہ سوچتا ہوا آگے آیا تو عرینہ کی بھی اس پر نظر پڑ گئی۔

"کیسی لگی یہاں کی صبح۔" اسفند نے خود ہی گفتگو کا آغاز کیا۔

"بہت خوب صورت' بلکہ ناقابل یقین حد تک حسین۔" وہ بھی مسکرا دی۔

"چلیں تو پھر اس خوشی میں ناشتا کرتے ہیں۔ بہت سخت بھوک لگی ہے۔" اس نے زبردستی شاپر عرینہ کو تھمایا۔

"لیکن باقی سب تو سو رہے ہیں۔" عرینہ کہتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

"کوئی بات نہیں تین لوگ بھی کم نہیں ہوتے ناشتا کرنے کے لیے۔"

"تین۔۔۔؟" اس نے حیرت سے اسفند کو دیکھا۔

"جی۔۔۔ تیسرے میرے ابا جی۔۔۔ وہ یقیناً" جاگ گئے ہوں گے۔ ناشتا تیار ہونے تک اچھی روشنی ہو جائے گی۔ پھر انہیں باہر لے آؤں گا۔۔۔ آ۔۔۔ آپ روٹیاں تو بنا لیں گی نا۔" وہ کہتے کہتے رکا تو عرینہ مسکرا دی۔

"جی بالکل۔۔۔" وہ کچن میں آکر کام میں لگ گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں اسفند بھی آگیا۔ چائے کی کیتلی میں پانی ڈال کر چولہے کے پاس آیا' تب ہی عرینہ کی نظر پڑی۔

"ارے آپ رہنے دیں میں کرلوں گی سب۔"

"پریشان نہ ہوں میری روز کی روٹین ہے۔ دراصل چائے بنا میں چارج نہیں ہوتا۔ لیکن روزانہ اتنی صبح بھابھی کو جگانا اچھی نہیں لگتا۔ ایک تو ساجد بھائی کے جانے کا ٹائم مجھ سے ذرا لیٹ ہے۔ دوسرے مجھے ذرا زیادہ ہی دور جانا ہوتا ہے تو کافی جلدی اٹھنا پڑتا ہے۔ اس لیے اپنی اور ابا جی کی چائے روزانہ ہی میں بناتا ہوں۔" وہ تیز تیز بولتا ہوا انڈے باؤل میں ڈالنے لگا۔

"اور یہ اسپیشل ناشتے کی عیاشی تو سنڈے کو ہی اچھی لگتی ہے۔ ویسے میں خود بھی اچھی کوکنگ کرلیتا ہوں بلکہ سوائے روٹی کے سب بنا لیتا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔؟" وہ سچ مچ حیران ہوگئی۔ دیکھنے سے واقعی نہیں لگتا تھا۔

"یقین نہ آئے تو بھابھی سے پوچھ لیں۔ چکن کڑاہی' قورمہ' تکے' چپلی کباب وغیرہ سب بنا لیتا ہوں۔"

"یعنی سب نان ویج۔" عرینہ نے ٹکڑا لگایا تو وہ ہنس دیا۔

"جی یہی سمجھ لیں۔ سبزیوں وغیرہ کی کیمسٹری تو کیا فزکس بھی میری سمجھ سے باہر ہے۔ ہر چیز کو بنانے کا ایک الگ اور نرالا طریقہ۔" اس نے منہ بنایا تو عرینہ کو ہنسی آگئی۔ وہ بہت بولتا تھا۔ اس کی باتوں میں ناشتا بھی جلدی تیار ہوگیا۔ وہ اپنے ابا جی کو باہر برآمدے میں بٹھا کر واپس آیا اور چیزیں رکھنے میں عرینہ کی مدد کرنے لگا۔ عرینہ کو ان کے ساتھ بیٹھنے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ اس لیے ناشتا رکھ کر پلٹی۔

"عرینہ بیٹی۔۔۔ تم بھی آؤ۔"

"شکریہ انکل۔۔۔ میں بعد میں کرلوں گی۔ ابھی زیادہ بھوک نہیں ہے۔"

"ارے بھئی۔۔۔ شروع تو کرو' بھوک بھی لگ جائے گی' ناشتا ویسے بھی وقت پر کرنا چاہیے آؤ شاباش۔" انہوں نے مسکرا کر اصرار کیا تو عرینہ اپنے لیے چائے ڈالنے لگی۔

"اتنے دن سے یہ لوگ آئے ہوئے ہیں۔ کہیں گھمانے پھرانے بھی لے جاؤ۔" انہوں نے اسفند کی طرف دیکھا۔

"جی' ابا جی ہم چھٹی کا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ابھی گل محمد سے بات کر کے آرہا ہوں وہ نو بجے تک گاڑی لے آئے گا۔"

"ارے بھئی سات تو بج گئے کب جاگیں گے یہ لوگ۔"

"بس ناشتا کرلوں۔۔۔ پھر سب کو جھنجھوڑ کر اٹھاتا ہوں۔"

"میں جگا دیتی ہوں۔" عرینہ اپنا کپ اٹھا کر اندر آگئی۔

پروگرام ناران جانے کا بنا۔۔۔ نگینہ بھابھی اور ان کی چھوٹی بہن زرینہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ ناران کی اونچائی سے سامنے پھیلی وادی کا حسن اور بھی دوبالا ہو رہا تھا۔ نیچے وادی سے لے کر بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں تک ہریالی ہی ہریالی تھی۔ کہیں کہیں سڑک کنارے گلیشیئر کے ٹکڑے بھی تھے۔ جن کا پانی بہہ کر سڑک کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ عرینہ پر عجیب سحر کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ حسن تو ہر شخص کو ہی پسند ہوتا ہے۔ لیکن اس کے اور جیا کے معاملے میں علاقے کے اس حسن نے ایک بھلا اور بھی کیا تھا کہ اس خوب صورتی کی بدولت انہیں اپنا گھر چھوڑنے اور ابا کی جدائی کے دکھ کو کم کرنے میں بہت مدد ملی تھی۔ پھر

یہاں تو پتھروں سے بھی سبزہ پھوٹتا تھا۔ بھلا گوشت پوست کا بنا نرم و نازک دل کیوں نہ متاثر ہوتا۔ وہ سب سے الگ ہو کر پہاڑی کے کنارے تک آئی۔

اللہ پاک اگر ایک مصور ہے تو سامنے پھیلا یہ منظر ایک کینوس تھا۔ جہاں بنانے والے نے اپنی تخلیق کو جنت کی ایک جھلک دکھائی تھی۔ حد نگاہ تک سبزہ ہی سبزہ، پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتے سفید و سرمئی بادل کے ٹکڑے، عرینہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سامنے دور تک نظر آتے اونچے نیچے راستوں پر بھاگتی چلی جائے۔ آس پاس سے بے خبر وہ نظارے دیکھنے میں اتنی گم تھی کہ ذرا دور درخت سے ٹیک لگائے اسفند کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا۔ جو اسے بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ قدرت کے اس حسین نظارے کو مکمل کرنے میں اس اداس چہرے والی لڑکی کا کتنا ہاتھ ہے۔

عرینہ اس وقت ہلکے پیلے رنگ کے سرخ پھولوں والے سوٹ میں ملبوس تھی جو حقیقتاً" اس سرسبز ماحول میں ایک عجیب سی دلکشی اور رنگینی پیدا کر رہا تھا۔ البتہ چہرے پر ثبت اداسی پھر بھی اس شوخ رنگ پر حاوی تھی۔ ستواں ناک میں پڑی لونگ سورج کی روشنی پڑنے سے چمک جاتی۔ بال اگرچہ اس نے ایک ربن میں قید کر رکھے تھے۔ لیکن سامنے کے رخ پر کچھ چھوٹی لٹیں بار بار ہوا سے چہرے پر آرہی تھیں۔ اسفند نے بمشکل خود کو اس سحر کی زد میں آنے سے بچایا اور پلٹ کر ساجد بھائی کی طرف چلا گیا۔

چار بجے تک وہ سب وہیں انجوائے کرتے رہے۔ واپسی کے راستے میں ساجد بھائی تھوڑا سا روٹ تبدیل کر کے انہیں ایک نئی جگہ پر لے آئے۔ گاڑی روک کر ان سب کو نیچے آنے کو کہا۔ وہاں بھی اوپر پہاڑ سے ایک آبشار گر کر سڑک پر آرہی تھی۔ ساجد بھائی نے جیا اور عرینہ کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ خاص طور پر ان دونوں کو یہ جگہ دکھانے لائے ہیں۔ وہ ڈھلان چڑھ کر اوپر آئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ پہاڑ نے اس جگہ پھیل کر میدان کی شکل اختیار کرلی تھی اور آبشار کا پانی بھی چشمے کی صورت کھلی جگہ پر پھیل سا گیا تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے کئی پتھر بھی بکھرے تھے۔ جن کی وجہ سے پانی خوب اچھل اچھل کر نیچے جا رہا تھا۔ نگینہ بھابھی اور شبنم باجی کنارے کی گھاس پر بیٹھ گئیں۔ ان کے بچے وہیں کھیلنے لگے تھے۔ نیلم فوٹو گرافی کرنے لگی اور اب اس کا چشمے کے دوسرے کنارے جا کر تصویریں بنانے کو دل کر رہا تھا۔ جہاں پیلے اور جامنی رنگ کے بہت خوب صورت پھول کھلے تھے۔ شبنم باجی تو منع کر رہی تھیں کہ آگے پانی گہرا ہو گا۔ لیکن نیلم کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسفند چیک کرنے کے لیے آگے بڑھا۔ صرف ایک جگہ ایسی تھی جہاں پانی کمر جتنا گہرا لگ رہا تھا۔ البتہ اس جگہ کی چوڑائی اتنی تھی کہ چھلانگ لگا کر دوسری جانب جایا جا سکتا تھا۔ اسفند نے بجائے دوسری طرف چھلانگ لگانے کے دایاں پیر ایک اونچے پتھر پہ جما کر بایاں پیر دوسری طرف کے ایک مضبوط پتھر پہ رکھا اور نیلم کو دیکھا۔

"آؤ بھئی... اگر ادھر جانا ہے تو میں مدد کر سکتا ہوں۔"

"لیں... یہ ہوئی نا بات۔" نیلم کیمرہ سنبھال کر بھاگی۔ اسفند نے اس کا بازو مضبوطی سے تھام کر دوسری جانب جانے میں مدد کی۔ نیلم کے بعد جیا اور زرینہ بھی دوسری طرف چلی گئیں۔ ساجد بھائی نے تو خود ہی لمبی سی چھلانگ لگائی تھی۔ عرینہ اب سب سے انجان بن کر نازش سے کھیلنے لگی۔ لیکن برا ہو نیلم کا جو وہاں سے چیخ چیخ کر اسے پکارنے لگی۔

"مجھے نہیں آتا۔" عرینہ نے صاف جواب دیا۔ وہ اسفند کا ہاتھ تھام کر ہرگز دوسری جانب نہیں جانا چاہتی تھی۔ بھلے وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا تھا، لیکن بندے کے انداز صاف بتاتے ہیں کہ وہ کسی کے لیے کیا جذبات اپنے دل میں رکھتا ہے۔ اس لیے وہ از حد محتاط رہتی تھی۔

"چلی جاؤ عرینہ... تم لوگ تو جوان ہو بھئی۔ ہم بے چارے تو اپنے بچوں کی وجہ سے مجبور ہیں۔" نگینہ بھابھی نے ہنستے ہوئے کہا اور جیا، زرینہ بھی بلانے لگیں تو ناچار اسے اٹھنا ہی پڑا۔ اسفند اسی کی وجہ سے

اب تک وہیں کھڑا تھا۔ عرینہ قریب تو آگئی، لیکن اب ہاتھ پکڑنے میں جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ بمشکل ہاتھ بڑھا کر ہلکا سا اسفند کی شرٹ کا کف چھوا تو اس کی ہنسی نکل گئی۔ لیکن فوراً" چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے عرینہ کا بازو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا۔

"یوں نہیں... ایسے پکڑتے ہیں۔" چہرے پر متانت اور آنکھوں میں شرارت ہی شرارت بھری تھی۔ عرینہ بری طرح گڑبڑا گئی۔

"اب آپ بھی میرا ہاتھ پکڑ لیں، کیونکہ بنا آپ کی مدد کے پار لے جانا میرے لیے ممکن نہیں۔" جانے کیا تھا اس کے لہجے میں۔ عرینہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ آخری جملہ اسے موجودہ سچویشن کے لیے بالکل نہیں لگا۔

"ہاں مرو... اب لو تصویریں۔" دوسری سمت آکر اس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں نیلم کو مخاطب کیا۔

"ہائیں... یہ تمہیں کیا ہوا؟" وہ خاصی تشویش سے گھورنے لگی۔

"دماغ خراب ہوا ہے میرا۔"

"کیا بات ہے اسفند بھائی... یہ اس پار سے اس پار آنے میں ایسا کیا ہوا؟ کچھ دیر پہلے تو بالکل ٹھیک تھی۔"

"معلوم نہیں ڈیئر... میں نے تو بس اتنا ہی کہا کہ..."

"چلو تم... تصویریں بناؤ میری۔" عرینہ نے عجلت سے حصہ لے کر اس کی بات کاٹی اور نیلم کو گھسیٹ کر لے گئی تو اسفند مسکرانے لگا۔

☼ ☼ ☼

کاغان سے واپسی پر پھر وہی روٹین شروع ہو گئی تھی۔ لیکن فاطمہ کے لیے یہ روٹین بھی بہت خوشی اور اطمینان کا باعث تھی۔ اس کی بچیاں جس گھٹن بھرے ماحول سے نکل کر آئی تھیں تو اس کا خیال تھا کہ شاید انہیں سنبھلنے میں مہینوں لگ جائیں گے۔ لیکن جگہ کی تبدیلی تلخ یادوں کو بھلانے میں بہت مددگار ثابت ہوئی تھی۔ دوسری اہم وجہ ممتاز اور اس کے پورے گھر والوں کا رویہ تھا جنہوں نے ایک دن بھی انہیں غیریت کا احساس نہیں ہونے دیا تھا۔ حالانکہ اب تو یہاں رہتے انہیں تین ماہ کا عرصہ ہو چکا تھا۔ لیکن سب آج بھی ان کا مہمانوں کی طرح خیال رکھتے تھے۔ لیکن انہیں مہمانوں کی طرح رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس لیے ہر کام میں خالہ اور بھابھیوں کی مدد کیا کرتیں۔

اسفند بالاکوٹ آیا تھا۔ وہ اس وقت کچن میں کام کر رہی تھی جب ثمینہ بھابھی نے اسے بتایا کہ اسفند بیٹھک میں آرام کر رہا ہے۔ وہ اس کے لیے چائے بنانے لگیں۔ اسفند کو چائے دینے بھی یقیناً" وہ خود ہی جاتیں، لیکن کمرے سے ان کے چھوٹے بیٹے کے رونے کی آواز آنے لگی تو وہ جلدی جلدی میں عرینہ کو ہدایات دے کر چلی گئیں۔ عرینہ نے پہلے تو یہی سوچا کہ چھت سے نیلم یا جیا کو بلا لے، لیکن پھر خود ہی رک گئی۔ کافی دنوں سے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے بھی اپنا رویہ اسفند کے ساتھ نیلم اور جیا والا کر لینا چاہیے۔ وہ دونوں اسفند کو بھائی بھی کہتی تھیں اور بات بھی سہولت سے کر لیتی تھیں، جبکہ عرینہ ریزرو رہنے کے چکر میں نہ تو کبھی اسفند سے مخاطب ہوتی، نہ ہی بھائی کہنے کی عادت ڈال پائی تھی۔ اگرچہ اس میں بھی زیادہ دخل اسفند کے رویے کا تھا، کیونکہ عرینہ سے بات کرتے وقت اس کا انداز بدل جاتا تھا جو اس کے جذبات اور عرینہ کی طرف اس کے جھکاؤ کی صاف غمازی کرتا تھا اور اسی بات سے عرینہ کو چڑ تھی۔

"السلام علیم اسفند بھائی۔" ٹرے سامنے رکھ کر عرینہ نے مسکرانے کی ایکٹنگ میں پورے دانت نکالے تو اسفند نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا اور حیرت میں جواب بھی نہیں دے پایا۔

"شبنم باجی وغیرہ کیسے ہیں؟"

"ہوں... ٹھیک ہیں۔" اس نے سنجیدگی سے مختصر جواب دے کر کپ لے لیا۔

"اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو کہہ دیجیے گا اسفند بھائی۔" عرینہ نے اضافی جملہ بول کر جیسے دوسری مرتبہ بھائی کہنے کا شوق پورا کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ جبکہ اسفند ابرو چڑھائے محض ہلتے پردے کو دیکھے گیا۔

☼ ☼ ☼

نومبر کا آغاز ہوا تو شبنم باجی نے ایک بار پھر ان سب کو بلا بھیجا۔ وہ چاہتی تھیں کہ سخت سردی شروع ہونے سے پہلے ایک بار پھر تھوڑی آؤٹنگ کر لی جائے کیونکہ پھر برف باری کی وجہ سے گھومنا پھرنا دشوار ہو جاتا۔ شبنم نے اس بار فاطمہ خالہ اور اپنی امی کو بھی آنے کی دعوت دی، لیکن فاطمہ کو سردیاں شروع ہوتے ہی جوڑوں کے درد کی تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔ اس لیے وہ سفر کا رسک نہیں لینا چاہتی تھیں اور ان کی مجبوری دیکھتے ہوئے ممتاز نے اپنا پروگرام بھی ملتوی کر دیا۔

اس بار شبنم نے انہیں پورے پندرہ دنوں کے لیے بلایا تھا۔ موسم میں بھی نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ دن کا سارا وقت وہ تینوں سامنے کی پہاڑی پر نازش کو اٹھائے گھومتے رہتے۔ زیادہ تر وقت گھر میں ہی گزر رہا تھا۔ اسفند اور ساجد بھائی دونوں کو فرصت نہیں مل رہی تھی۔ ادھر شبنم کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ آؤٹنگ کب کی جائے کیونکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ سردی بھی بڑھ رہی تھی۔ ان سب کو آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اسفند نے بتایا کہ اگلے روز ناران اور سیف الملوک جھیل جانے کا پروگرام طے پا گیا ہے۔ ان کے والد اپنی بہن کے گھر چلے گئے تھے جو قریب ہی رہتی تھیں۔ اب بار لوگ چونکہ کم تھے۔ اس لیے اسفند کسی سے فوکسی لے کر آیا اور ڈرائیونگ بھی اس نے اور ساجد بھائی نے خود ہی باری باری کی تھی۔ دوپہر کے قریب وہ لوگ ناران پہنچے۔ اچھا سا ہوٹل بھی جلدی مل گیا۔ انہوں نے دو کمرے بک کروا کے سامان وغیرہ رکھا اور لنچ کرنے نکل پڑے۔ پروگرام یہی تھا کہ لنچ کے بعد واپس ہوٹل آ کر دو، تین گھنٹے ریسٹ کیا جائے اور شام کا وقت یہیں ناران میں ہی گھوم پھر لیا جائے اور جھیل سیف الملوک کے لیے اگلی صبح نکلا جائے۔

لنچ سے واپس آ کر اسفند اور ساجد بھائی ایک کمرے میں سو گئے۔ جبکہ دوسرے کمرے میں وہ سب بیڈ اور صوفوں پر کسی طرح ایڈجسٹ ہو گئیں۔

عرینہ کی آنکھ الارم سے پہلے ہی کھل گئی تو باقی سب کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا اور منہ ہاتھ دھو کر باہر نکل آئی۔ بائیں طرف کا ویو بہت خوب صورت تھا۔ وہ کوریڈور سے نکل کر بالکنی میں آئی تو جھجک کر وہیں رک گئی۔ اسفند نے آہٹ پر مڑ کر دیکھا تو نگاہ عرینہ پر پڑی۔

"ارے اٹھ گئیں آپ۔۔۔" بڑے خوشگوار انداز میں اسے خوش آمدید کہا، لیکن جواباً وہ سنجیدگی سے جی کہہ کر واپسی کے لیے پلٹی۔ اسفند نے ایک گہری نگاہ کے حصار میں لے کر گویا اس کے خیالات پڑھے اور دو قدم چل کر اس کے قریب آیا۔

"آپ یہیں رکیں میں ویسے بھی اندر جانے والا تھا۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر بنا جواب کا انتظار کیے اندر بڑھ گیا۔

چار بجے باقی سب بھی اٹھ گئے، لیکن تیاری وغیرہ میں ٹائم لگ گیا۔ اس لیے جب باہر نکلے تو پانچ بج رہے تھے۔ عرینہ نے ڈارک براؤن سوٹ پہنا، جس کی سب نے بہت تعریف کی اور نیلم نے تو زبردستی اسے میک اپ بھی کر دیا۔ بلیک آئی لائنر اور میچنگ براؤن لپ اسٹک کے ساتھ اس کے نقوش مزید نمایاں اور پرکشش لگنے لگے تھے۔ لیکن وہ خود کافی کانشس ہو رہی تھی۔ کیونکہ اسے میک اپ وغیرہ کرنے کی بالکل عادت نہیں تھی۔ بال کیچر میں ڈال کر نیلم نے سامنے کے رخ پر ایک لمبی لٹ بھی چھوڑ دی تھی۔ اسفند ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ٹھٹک سا گیا۔ عرینہ کا ایسا روپ وہ بھی پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ آج بلاشبہ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ وہ باقیوں کے خیال سے بس ایک نظر ہی دیکھ پایا اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس شام وہ ناران میں ہی گھومتے رہے۔ پل کراس کر کے اوپر پہاڑی کے تنگ خوب صورت راستے پر ہنسی مذاق کرتے وہ کافی اوپر پہنچ گئے۔ فوٹو گرافی بھی کی اور جب ناران کی روشنیاں جلنے لگیں

تو واپسی کی راہ لی۔ اگلی صبح سیف الملوک جھیل جانا تھا۔ عرینہ دل ہی دل میں بے حد پرجوش تھی۔ بچپن سے ہی سیف الملوک جھیل کا نام اس کے لیے عجیب سی کشش کا باعث تھا۔

ناران سے جھیل تک کا راستہ فوکسی میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے عموماً لوگ جیپ ہی ہائر کیا کرتے تھے۔ یوں تو سفر محض ایک گھنٹے کا تھا، لیکن دشوار گزار اتنا تھا کہ پہنچتے پہنچتے کافی ٹائم لگ گیا۔ اونچے نیچے ڈھلوانی راستوں پر ان سب کا سانس خشک ہو چکا تھا۔ لیکن بس اللہ کو یاد کرتے سفر کٹ ہی گیا۔ جیا کا تو بری طرح سر گھوم رہا تھا۔

"اف میرے خدا۔۔۔ مجھے تو ہر موڑ پر یہی لگ رہا تھا کہ بس اب گئے کہ تب گئے۔"

"لیکن بچ گئیں نا آخر۔" نیلم نے تسلی دی۔

"سفر ضرور خطرناک تھا، لیکن ذرا منزل بھی تو دیکھو۔" عرینہ نے مسکرا کر سامنے پھیلی جھیل کی طرف جیا کی توجہ مبذول کروائی تو اس نے پہلی بار دھیان دیا۔

"یہ منظر اب سے پہلے صرف کتابوں میں دیکھا تھا۔ دو بلند و بالا پہاڑوں کے دامن میں پرسکون سی جھیل اور کنارے کھلے رنگ رنگ کے خودرو پھول۔۔۔ وہاں اور بھی کافی سیاح نظر آ رہے تھے۔ لیکن نیلم نے بتایا کہ جون، جولائی کے گرم مہینوں میں یہاں بے پناہ رش ہوتا ہے۔

گھومتے پھرتے مناظر دیکھتے بلا ارادہ ہی ان لوگوں کے دو گروپس بن گئے۔ شبنم باجی، نازش اور ساجد بھائی تصویریں بناتے ذرا دور نکل گئے تو ان میں سے کسی نے بھی مداخلت مناسب نہیں سمجھی۔ نیلم کو بھوک محسوس ہونے لگی تو نسبتاً" پرسکون جگہ کا انتخاب کر کے شیٹ وغیرہ بچھالی۔ عرینہ نے کھانے پینے کا سامان رکھنے میں اس کی مدد کی، اسفند اور جیا بھی وہی آ گئے۔

"سچ، بہت ہی خوب صورت جگہ ہے، بالکل خوابوں جیسی۔" جیا کا چہرہ کھلا پڑ رہا تھا۔

"تم یہاں کتنی بار آچکی ہو نیلم؟"

"کافی مرتبہ آئی ہوں۔ لیکن میرا خیال ہے شبنم باجی وغیرہ زیادہ آئے ہوں گے، کیونکہ وہ قریب رہتے ہیں کیوں اسفند بھائی۔" نیلم نے تائید چاہی۔

"ہاں وہ بھی بہت بار آئی ہیں، لیکن سب سے زیادہ میں یہاں آتا ہوں، کیونکہ دوست وغیرہ اکثر پروگرام بنا لیتے ہیں۔" اسفند نے اسنیک لیتے ہوئے گفتگو میں حصہ لیا۔

"بلکہ کبھی بھی، کوئی بھی آ جا رہا ہو میں موقع مس نہیں کرتا۔"

"بار بار آنے کی کوئی خاص وجہ اسفند بھائی۔۔۔" جیا نے شرارت سے پوچھا تو وہ ہنس پڑا۔

"بھئی خوبصورت جگہ ہے اور میری فیورٹ ہے۔"

"کوئی۔۔۔ یاد تو وابستہ نہیں ہے یہاں سے۔" نیلم نے آنکھیں گھمائیں۔

"ہاں۔۔۔ سنا ہے کسی جگہ سے انسیت کی وجہ کبھی کبھی کوئی شخص بھی ہوتا ہے۔ کیوں؟" جیا نے مزید استفسار کیا تو اسفند ان کی چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو کر ہنسنے لگا جبکہ عرینہ کو ان پر شدید غصہ آ رہا تھا جو بلاوجہ ایک بے تکے ٹاپک کو طول دے رہی تھیں۔ زیادہ غصہ اسے جیا پر آ رہا تھا۔ اس نے دل میں طے کیا کہ کسی وقت اکیلے میں اسے ضرور سمجھائے گی کہ اتنا زیادہ فری ہو کر نہ بولا کرے۔

"تم لوگوں کی سنی سنائی سر آنکھوں پر۔۔۔ لیکن بار بار یہاں آنے کی اکلوتی وجہ صرف اس کا قدرتی حسن ہے۔ بعض جگہیں ہمیں اپنے حقیقی حسن کی وجہ سے ہی پسند ہوتی ہیں۔ البتہ ہم اس کو وہ جگہ ضرور دکھانا چاہتے ہیں، جو ہمیں پسند ہوتا ہے۔"

"اوہ۔۔۔" نیلم نے او کو لمبا کیا۔ "تو پھر آپ اپنی اس کو یہ جگہ دکھانے میں کامیاب ہوئے کہ نہیں؟"

"کامیاب تو ہوا، لیکن معلوم نہیں اسے یہ جگہ کیسی لگی۔" بالکل ہی بے ساختہ اسفند کے لبوں سے جملہ پھسلا تھا۔ نیلم نے چونک کر اسفند کو دیکھا، لیکن

پھر کچھ بھی کہنے سے خود کو باز رکھا اور موضوع تبدیل کردیا۔ اسفند بھی وہاں سے اٹھ کر جھیل کے کنارے جا کھڑا ہوا۔ نیلم نے ایک نظر عرینہ کی طرف دیکھا جو لاتعلق نظر آنے کی کوشش میں دوسری جانب دیکھ رہی تھی۔ نیلم نے نوٹ کیا کہ کسی گفتگو میں اسفند شامل ہوتا وہ چپ ہی رہتی تھی۔ بس لحہ ہی لگا نیلم کو یہ سمجھنے میں کہ اسفند کس کو یہ جگہ دکھانا چاہتا تھا۔ خوشی سے اس کا دل چاہا عرینہ کو گلے لگالے لیکن بمشکل اپنے جذبات پر کنٹرول کرکے ٹہلتی ہوئی اسفند کے پیچھے آئی۔

"آپ کی اجازت ہو تو... میں پتا کروں؟"

"ہوں..." اسفند چونک کر مڑا۔

"کہ اسے یہ جگہ کیسی لگی۔"

"کس کو؟" اسفند نے بننے کی کوشش کی۔

"وہ لڑکی... عرینہ ہے نا۔" نیلم نے اس کی کوشش خاک میں ملادی۔ اسفند نے اس کے بھرپور اعتماد کے آگے فوراً" ہار مانتے ہوئے سر اقرار میں ہلایا۔

"لیکن ہاں... کچھ بھی پوچھنے کی کوشش مت کرنا اس سے۔"

"وہ کیوں؟" نیلم نے منہ بنایا۔

"میرے خیال میں وہ ایسا کچھ نہیں سوچتی' میرے بارے میں؟"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

"بس اندازہ ہوجاتا ہے۔ خیر... کیا خیال ہے تھوڑا گھوم پھرلیں۔" وہ مسکرا کر بات گول کر گیا تو نیلم نے بھی سرہلانے پر اکتفا کیا۔

چار بجے تک وہ سب جھیل پر رہے۔ عرینہ کو ماننا پڑا کہ جھیل میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ اس کا یہاں سے جانے کو دل ہی نہیں کررہا تھا۔

"کیا سچ مچ یہاں پریوں کا کوئی وجود ہے؟" وہ نیلم سے پوچھنے لگی تو اس نے اسفند کی طرف دیکھا۔

"کیوں اسفند بھائی' آپ کا کیا خیال ہے؟"

"معلوم نہیں... لیکن سنا ہے رات کو یہاں رکنے سے گریز کرنا چاہیے۔ بندے پر عجیب سا نفسیاتی اثر شروع ہوجاتا ہے۔"

"ہیں... واقعی۔" جیا نے آنکھیں نکالیں۔

"پھر تو ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔"

"تم تو پریوں پر بھی بھاری پڑوگی۔ تم کیوں ڈر رہی ہو۔" عرینہ نے اس کا مذاق اڑایا تو وہ گھور کر رہ گئی۔ جبکہ نیلم بغور عرینہ کو دیکھنے لگی۔ سی گرین لائٹ سے سوٹ میں وہ آج بھی بہت کیوٹ لگ رہی تھی۔ نیلم نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں کا جوڑا ہر لحاظ سے آئیڈیل مانا جاسکتا تھا۔ اسفند نے آج بلیک پینٹ اور چاکلیٹی براؤن شرٹ پہنی تھی جو بلاشبہ اس پر بہت جچ رہی تھی۔ اس کا اونچا لمبا قد اس کی وجاہت میں مزید اضافے کا باعث تھا۔ چہرے پر نظر ڈالو تو کہیں کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی۔

اس کی گہری چمکیلی آنکھوں' کمان دار بھنوؤں' کھڑی تیکھی ناک اور گھنی سیاہ مونچھوں پر کوئی بھی لڑکی بری طرح فدا ہوسکتی تھی۔ بلکہ ظاہری صورت ہی کیا۔ وہ باطنی خوب صورتی کی دولت سے بھی مالا مال تھا۔ کبھی اس کے حوالے سے کوئی ایسی ویسی بات نہ سنی نہ دیکھی اور خوب صورت تو عرینہ بھی بے حد تھی۔ اسفند جیسے بندے کا اس پر دل آجانا کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔ لیکن اس سارے معاملے میں عرینہ کی بے حسی نیلم کی سمجھ سے باہر تھی۔ یا تو وہ اسفند کے جذبات سے ناواقف تھی یا پھر آج تک اسد کو نہیں بھلاپائی تھی اور اسے دوسری وجہ زیادہ صحیح لگی کیونکہ عرینہ کے انداز صاف بتاتے تھے کہ وہ اسفند کے جذبات سے آگاہ ہے۔ لیکن جان بوجھ کر گریز کررہی ہے۔ ایک گہرا سانس لے کر نیلم خیالوں کی دنیا سے باہر نکلی۔ ایک نظر عرینہ پر ڈالی جو اردگرد سے بے نیاز مناظر دیکھنے میں گم تھی۔ جانے کیا رکھا ہے ان نظاروں میں جو یہ آس پاس سے بے خبر ہوکر ان میں کھوجاتی ہے۔ نیلم محض سوچ کر رہ گئی۔

کاغان واپس آئے انہیں دوسرا دن تھا۔ دو روز بعد ان سب کو مانسہرہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔ وہ تینوں اس بار اسفند کے ساتھ جارہی تھیں۔

نیلم پورے گھر میں عرینہ کو ڈھونڈتی پھررہی تھی اور وہ محترمہ لان کے جنگلے سے ٹیک لگائے شفق کی سرخی دیکھنے میں محو تھی۔

"تم یہاں ہو اور میں پورا گھر چھان آئی۔" وہ پھولی سانوں کے ساتھ جنگلے سے ٹک گئی۔

"ہاں' دیکھ رہی ہوں کہ سورج تو ہمارے شہروں میں بھی روز غروب ہوتا ہے' لیکن کبھی غور کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ شفق کی لالی اتنی خوب صورت بھی ہوسکتی ہے۔ شاعر بے چارے یوں ہی تو اتنا کچھ نہیں لکھ گئے۔" وہ ہنسی تو نیلم مزید چڑ گئی۔

"کبھی کبھی سوچتی ہوں' کاش ہمارا علاقہ اتنا پیارا نہ ہوتا۔"

"ہیں کیا مطلب؟" عرینہ کو اس کی دماغی حالت پر شبہ ہوا۔

"مطلب یہ کہ جب سے یہاں آئی ہو' مناظر میں گم ہو' یہ منظر' وہ منظر' میں تو تھک گئی سن سن کر۔"

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ڈیئر کہ اس علاقے کی خوبصورتی نے ہمیں ہمارا دکھ بھلانے میں کتنی مدد دی ہے۔ ہم اگر اپنے جیسے کسی دوسرے شہر گئے ہوتے تو شاید اب تک نہ سنبھلے ہوتے۔ یہاں کے حسن نے تو جیسے مرہم کا کام کیا ہے۔"

"مانتی ہوں لیکن میری بہن یہاں مناظر کے علاوہ لوگ بھی بستے ہیں وہ بھی دیکھنے میں کوئی ایسے برے نہیں۔ لیکن تمہاری نزدیک کی نظر شاید کمزور ہے۔" نیلم سابقہ رویے سے بولی تو عرینہ کو اس کے اسٹائل پر ہنسی آگئی۔

"او تو یہ بات ہے' ویسے نظر میری دور و نزدیک دونوں کی بالکل ٹھیک ہے الحمد للہ اور دیکھا بھی خوب دھیان سے ہے سب کو۔"

"دھیان سے دیکھا ہوتا تو تمہیں پتا ہوتا کہ تمہارے لیے کسی کے دل میں کیا ہے۔"

"کسی کے دل میں۔" عرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"میں اسفند بھائی کی بات کررہی ہوں وہ..."

"تو پلیز نیلم ایسی فالتو باتوں کے لیے میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔"

"یہ فالتو بات نہیں ہے' میں سیریس ہوں اور اسفند بھائی بھی سنجیدہ ہیں وہ تمہیں بہت پسند کرتے ہیں۔" نیلم نے اس کے روکھے لہجے کی پروا کیے بغیر بات جاری رکھی۔

"دیکھو نیلم' تم مجھ سے ایسے موضوع پر بات کررہی ہو جس میں مجھے دلچسپی نہیں۔ میرے بارے میں وہ کیا سوچتے ہیں مجھے قطعاً" اس سے کوئی سروکار نہیں۔"

"لیکن کیوں' کیا برائی ہے ان میں؟" نیلم کو اتنے سخت جملوں کی بالکل امید نہیں تھی۔

"برائی کوئی نہیں' یقیناً" وہ بہت اچھے ہیں۔ لیکن اب ہر اچھے بندے سے رشتہ تو نہیں جوڑا جاسکتا۔ میں ان کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتی' یہ طے ہے۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر دوسری جانب دیکھنے لگی۔ جیا بھی اس دوران وہاں آگئی تھی اور آخری چند جملے اس نے بھی سن اور سمجھ لیے تھے۔ نیلم نے اس کی طرف دیکھ کر گویا بے بسی سے کندھے اچکائے۔

"مجھے خود اسفند بھائی بہت پسند ہیں۔ حیرت ہے عرینہ' تم بلاوجہ اتنی سختی دکھارہی ہو۔"

"تم چپ رہو جیا' تمہیں کسی بات کا نہیں پتا۔"

"سب پتا ہے۔" جیا بری طرح تپ گئی۔

"تم ابھی تک اس اسد کے بچے کو چاہتی ہو۔"

"شٹ اپ جیا بالکل غلط سوچ رہی ہو تم۔ تم دونوں وجہ جاننا چاہتی ہو نا تو سنو۔ میں یہاں کسی سے ایسا کوئی رشتہ نہیں جوڑنا چاہتی جس کا کل کو ہمیں طعنہ سننا پڑے۔ سوری نیلم' برا مت ماننا' تم سب لوگ واقعی بہت اچھے ہو' جس کٹھن وقت میں تم سب نے ہمارا ساتھ دیا' اس کا شکریہ لفظوں میں ادا ہی نہیں کیا جاسکتا لیکن اگر آپ کے بھرے پرے خاندان میں سے کسی ایک فرد نے بھی یہ کہہ دیا کہ شاید ہماری امی ہمیں ایسے ہی کسی مقصد کو پورا کرنے کے لیے یہاں لائی تھیں تو یقین کرو میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ کوئی اور

بھلا ہماری امی کی مجبوریوں کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔" اس بار عرینہ نے صاف صاف جواب دیا تو جیا بھی خاموش ہو گئی۔

"تمہاری سوچ بالکل احمقانہ ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہاں یہ بات سب کے لیے بہت خوشی کا باعث ہو گی اور ویسے بھی عرینہ اب ہمیں تم سب کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ تم لوگوں کے واپس جانے کے بارے میں' میں سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ پلیز تم سب یہیں رہ جاؤ ہمیشہ کے لیے۔" نیلم نے جذباتی ہو کر عرینہ کا ہاتھ تھاما تو اس نے سختی سے لب بھینچے۔

"ہاں عرینہ میں بھی اب ہرگز یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔ ان سب سے دور کیسے رہیں گے۔" جیا باقاعدہ رونے لگی تھی اس کی دیکھا دیکھی نیلم بھی جذباتی ہو گئی۔

"ہم یہاں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں آئے تھے جیا وہاں ہمارا گھر ہے' جس پر صرف ہمارا حق ہے اور جسے دشمنوں سے واپس لینا ہے۔" اس بار عرینہ نے اسے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"گھر تو رہنے سے بنتے ہیں اور وہاں کون ہے ہمارا۔ سوائے ابا کی قبر کے' اس شہر میں کچھ بھی تو اپنا نہیں اور یہاں کتنے پیار کرنے والے ہیں۔" اس نے پلو سے آنکھیں رگڑیں تو عرینہ کی پلکیں بھی نم ہو گئیں۔ ابا کے ذکر پر جانے کیا کچھ یاد آنے لگا۔ کافی دیر تینوں کی یہ خاموش برسات جاری رہی۔ شبنم باجی نے آواز دی تو تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک ساتھ ہی تینوں کو ہنسی آ گئی اور پھر دیر تک وہ اپنے بچکانہ پن پر ہنستی رہیں۔

دو روز بعد وہ لوگ مانسہرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ اس بار چونکہ کافی سارے دن شبنم کے پاس گزارے تھے اس لیے روانگی کے وقت وہ بری طرح اداس نظر آ رہی تھیں۔

"تم لوگوں کے جانے کے بعد پھر سے گھر میں اتنی خاموشی ہو جائے گی جو مجھ سے بالکل برداشت نہیں ہو گی۔" انہوں نے باقاعدہ روتے ہوئے سب کو گلے لگایا تو گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے اسفند کو ہنسی آ گئی۔ بھابھی جذباتی ڈائیلاگ بولتے ہوئے کسی سیریل کا حصہ معلوم ہو رہی تھیں۔ وہ اندر بیٹھنے کے بجائے گاڑی کی چھت سے ٹھوڑی ٹکا کر یہ الوداعی منظر دیکھنے لگا۔ عرینہ نے آج گہرے جامنی رنگ کا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کے گیلے بال شانوں پر بکھرے تھے۔ اسفند نے اس سے قبل اسے کھلے بالوں میں نہیں دیکھا تھا۔ صبح سویرے کی کھلی کھلی دھوپ میں شوخ جامنی رنگ کے ساتھ اس کا سفید رنگ بے حد گلابی لگ رہا تھا۔ اسفند نے مسکراتے ہوئے سن گلاسز لگائے اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ "صبح کی شروعات اتنی پیاری ہوئی۔ دن یقیناً" اچھا گزرنے والا ہے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا اور نیلم کو آواز دی۔

نیلم اس کے ساتھ آگے ہی بیٹھ گئی جبکہ وہ دونوں پیچھے براجمان ہو گئیں۔ نیلم اور جیا نے حسب عادت اسفند کو اپنی باتوں میں شامل کر لیا۔ عرینہ باوجود کوشش کے ایسا نہ کر سکی اس لیے ڈائجسٹ نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ کافی سارا سفر سکون سے کٹ گیا۔ لیکن بھلا ان دونوں سے کہاں یہ سکون برداشت ہوتا تھا جیا نے پیاس پیاس کی دہائی دے کر زبردستی اسفند سے گاڑی رکوائی۔ عرینہ نے چونک کر سر اٹھایا اور گہری سانس لی۔ پھر پہاڑوں سے بہتی ایک آبشار اور نیچے رکھی ٹھنڈی ٹھنڈی کولڈ ڈرنکس۔

"اف اتنی سردی میں ٹھنڈی کولڈ ڈرنکس۔" بے ساختہ عرینہ کے منہ سے نکلا لیکن ان دونوں نے ان سنی کر دی۔ اسفند نیچے اترنے لگا تو نیلم نے شور ڈال دیا۔

"ہم بھی ساتھ جائیں گے۔"

"گاڑی میں کولڈ ڈرنک پینا سخت بورنگ ہے۔" وہ خود ہی کہہ کر اتر بھی گئیں تو اسفند ہنس دیا۔

"او کے سب اترو' میں گاڑی لاک کر دوں۔" اس نے اشارتاً" کہا تو عرینہ بھی باہر آ گئی کافی ٹھنڈ تھی باہر۔ وہ آبشار سے تھوڑا دور ہٹ کر ٹھہر گئی۔ اسفند ان کے

لیے جوس لایا۔ نیلم نے جلدی سے دونوں جوسز لیے' ایک جیا کو تھمایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھی۔

"اسفند بھائی' یہ اینٹوں کا راستہ اوپر جاتا ہے۔ میں ذرا جیا کو دکھا لاتی ہوں۔" وہ بنا عرینہ کی طرف دیکھے اوپر چڑھ گئیں۔

"یہ کہاں جا رہی ہیں؟" عرینہ حیرت سے آگے بڑھی۔ پانی کے شور میں اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔

"دیکھنے گئی ہیں کہ پانی کہاں سے آ رہا ہے۔" وہ ہنسا۔

"لیکن مجھے ساتھ کیوں نہیں لیا؟" وہ ہنوز حیران تھی۔

"شاید جان بوجھ کر۔" اس نے بے ساختہ کہا لیکن فوراً" سنبھلا "آئی مین میں چلتا ہوں آئیں۔" وہ اوپر چڑھنے لگا تو عرینہ نے بھی پیش قدمی کی۔ اسی وقت ایک لڑکا چائے کی ٹرے لے آیا۔ اسفند نے دو کپ لے کر ایک عرینہ کی طرف بڑھایا۔

"بنا پوچھے آپ کے لیے بھی چائے آرڈر کر دی تھی۔ مجھے لگا آپ کو ٹھنڈ لگ رہی ہے۔" اس نے وضاحت کی تو پہلی بار عرینہ نے تشکر سے اس کی طرف دیکھا وہ واقعی چائے کو بہت مس کر رہی تھی۔

"عرینہ مجھے آپ سے کچھ کہنا تھا اگر آپ کی اجازت ہو تو تھوڑی دیر یہیں رک جائیں۔" اسفند نے مزید آگے بڑھنے کے بجائے درخت سے ٹیک لگائی تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میں نے اس سے پہلے یہ بات نیلم سے بھی کی تھی کہ۔۔۔"

"مجھے نیلم بتا چکی ہے۔" عرینہ نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن میں نے اسے منع کیا تھا۔ خیر تو کیا میں آپ کا جواب جان سکتا ہوں۔" اسفند نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"جواب تو میں اسے دے چکی۔ حیرت ہے اس نے آپ تک نہیں پہنچایا۔" عرینہ کے لہجے میں طنز کی واضح کاٹ تھی۔

"میری واقعی دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ لیکن خیر اچھا ہی ہوا۔ کم از کم کوئی بات تو آمنے سامنے ہو۔"

"ہاں لیکن میرا جواب شاید آپ کے لیے زیادہ خوشی کا باعث نہ ہو۔ میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتی جس سے میری امی کا سر جھک جائے۔"

"ارے نہیں' میرا گھر سے بھگانے کا کوئی پروگرام نہیں ہے' یقین کریں۔ شادی ان کی رضامندی سے ہی ہو گی۔" اسفند کا لہجہ بھرپور شرارت لیے ہوئے تھا۔ عرینہ نے بری طرح جزبز ہو کر اسے دیکھا۔ اتنی سنجیدہ بات کا ایسا الٹا جواب۔

"دیکھیں آپ میری بات کو مذاق میں مت لیں۔"

"ہوں انکار کی وجہ جان سکتا ہوں۔" اسفند بھی یک لخت سنجیدہ ہو گیا تو عرینہ نے ایک سرد آہ کھینچی۔

"ہمیں جن حالات میں یہاں آنا پڑا وہ آپ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ جن لوگوں نے ہمیں ہمدردی کے قابل سمجھ کر پناہ دی کل کو وہ ہماری نیت پر شک کریں' ایسا میں ہرگز نہیں چاہتی میں اپنے کسی عمل سے کسی پر برا تاثر نہیں چھوڑنا چاہتی۔ باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔"

"تعریف کا شکریہ۔ ویسے میرے خیال میں آپ کا وہم بالکل بے جا ہے۔"

"آپ پلیز اس موضوع کو چھوڑ دیں۔" وہ جھنجلا گئی۔

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی لیکن میری چند باتیں ضرور سن لیں۔ سب سے پہلے یہ کہ میرا پرپوزل آپ کے انکار کے باوجود برقرار رہے گا۔ آپ بعد میں تسلی سے سوچ کر جواب دے سکتی ہیں۔ بنا کسی ٹائم لمٹ کے۔ دوسرے یہ عرینہ مجھے ہرگز ایسا کوئی دعوا نہیں کہ پہلی نظر میں مجھے آپ سے پیار ہو گیا وغیرہ۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ مجھے اپنی سلجھی طبیعت اور اچھی عادات کی وجہ سے پسند ہیں۔ پہلے پہل جب نیلم کی زبانی آپ کے حالات سنے تو ایک بات' جس نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ آپ کی ہمت اور ذہانت تھی۔ جن

حالات کا شکار آپ لوگ ہوئے ان میں اچھے اچھوں کے حواس چھن جایا کرتے ہیں۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ انسان کے دم خم کا صحیح معنوں میں اندازہ مصیبت کے وقت ہوتا ہے اور آپ نے اتنے کٹھن وقت میں جس بے دار مغزی کا ثبوت دیا وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ ابھی آپ نے اپنے لیے "قابل ہمدردی" کا لفظ استعمال کیا' ہو سکتا ہے آپ کی جگہ میں ہوتا تو میرے بھی یہی خیالات ہوتے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایک دن بھی خدا ناخواستہ آپ کو ہمدردی کے قابل نہیں سمجھا اور نہ ہی آپ کو پرپوز کرنے کا مقصد آپ کو سہارا دینا ہے' کیونکہ سہارا ان کو دیا جاتا ہے جو کمزور ہوں' جبکہ آپ تو ماشاء اللہ اتنی باہمت ہیں کہ آپ کا ساتھ خود میرے لیے باعث فخر ہو گا۔ مجھے آپ کا سہارا بننے کی خواہش نہیں ہے۔ بلکہ آپ کا ساتھ چاہیے۔ لیکن آپ کی رضامندی اور خوشی کے ساتھ' کیونکہ آپ اپنے فیصلے میں خود مختار ہیں اور آپ کو وہی کرنا چاہیے جو آپ اپنے لیے مناسب سمجھیں۔ کیونکہ آپ کی طرف سے انکار ہو یا اقرار' اپنے پیچھے یقیناً" کوئی وجہ رکھتے ہوں گے۔ البتہ اسے میری درخواست سمجھ لیں کہ ایک بار ٹھنڈے دل سے دوبارہ غور ضرور کریں۔"

اسفند نے روانی اور تسلسل سے اپنی بات مکمل کی اور ان دونوں کو بلانے مزید اوپر چلا گیا۔ جبکہ عرینہ سوچ میں گم گاڑی کی طرف آگئی۔ اسی وقت ایک جیپ پاس سے گزر کر ان کی گاڑی کے آگے جا کر رک گئی۔ چار پانچ لڑکے نیچے اترے۔ عرینہ نے ایک سرسری نظر ان پر ڈالی لیکن پھر نگاہ ہٹانا جیسے بھول ہی گئی۔ کیونکہ ان میں سے ایک اسد تھا جو نہ صرف اسے دیکھ چکا تھا بلکہ چلتا ہوا اس کی جانب آ رہا تھا۔ شاید اس نے عرینہ کو دیکھ کر ہی جیپ رکوائی تھی۔

"عرینہ تم یہاں؟"

"آ۔ آپ" وہ حقیقتاً" ہکلا گئی۔

"تم لوگ اس طرح بنا بتائے کیوں گھر چھوڑ گئے اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"یہاں ہماری خالہ رہتی ہیں ہم ان کے پاس آئے ہیں۔"

"لیکن اپنے چچا جہانزیب سے چھپ کر کیوں آئے' وہ مہینوں سے ہمارا سر کھا رہے ہیں کہ ضرور ہمیں پتا ہو گا۔ ہم سب کا بھی ٹینشن سے برا حال تھا۔" وہ بلا توقف بولے ہی گیا۔ اسفند اس دوران جیا اور نیلم سمیت قریب آ چکا تھا۔ جیا کا حلق تک کڑوا ہو گیا اس کو دیکھ کر۔

"یہ اسد ہیں ہمارے بہاولپور کے پڑوسی۔" عرینہ نے نیلم اور اسفند کی طرف دیکھ کر تعارف کروایا تو اسفند نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"آنٹی کہاں ہیں؟" وہ دوبارہ عرینہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"امی مانسہرہ میں ہیں۔ ہم اپنے عزیزوں سے ملنے کاغان گئے تھے۔ اب واپس مانسہرہ جا رہے ہیں۔"

"او اچھا' میں بھی ادھر ہی جا رہا ہوں۔ یہاں دوستوں کے ساتھ گھومنے آیا تھا۔ کل صبح ہماری بہاولپور روانگی ہے۔ آج رات ہم مانسہرہ میں ہیں۔ اگر اپنا ایڈریس دو تو میں شام کو آنٹی سے ملنے آ جاؤں گا۔ تفصیلی بات بھی ہو جائے گی۔" اسد نے سوالیہ انداز میں عرینہ کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایڈریس اور فون نمبر لکھ کر دے دیا۔

"ایڈریس دینے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمیں اب ان لوگوں سے کیا لینا۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی جیا شروع ہو گئی۔

"تو اور کیا کرتی۔" عرینہ الٹا اسی پر غصہ ہوئی تو وہ نتھنے پھلا کر باہر دیکھنے لگی۔

فاطمہ نے الف سے یے تک ساری روداد اسد کو سنا ڈالی' وہ بھی جہانزیب لوگوں کے رویے پر ہکا بکا رہ گیا۔

"تو پھر آنٹی آپ لوگ کب تک یہاں چھپے رہیں گے؟ وہاں آپ کا گھر ہے' کاروبار ہے۔"

"ہاں بس کچھ دنوں تک بہاولپور جانے کا ارادہ کیے بیٹھی تھی۔ وہاں ہمارے خاندانی وکیل ہیں وقار عثمانی۔

سوچا ہے ان سے مل کر مشورہ کروں گی۔ بس تم اتنا احسان کرو کہ کسی طرح ان سے رابطہ کرو اور ہمارے حالات انہیں بتا کر ہماری ان سے بات کرا دو۔ ان کا پرانا نمبر بہت بار ملا کر دیکھ لیا لیکن لگتا ہے اب ان کے استعمال میں نہیں ہے۔ ان سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔ ہماری حویلی کے کاغذات ان ہی کے پاس ہیں۔"

"جی آنٹی بے فکر رہیں۔ میں کل پہنچتے ہی ابو کو سارے حالات بتاتا ہوں۔ وہ یقیناً" عثمانی صاحب کو جانتے ہوں گے' کیونکہ جب ہم نے آپ کی حویلی کا آدھا حصہ خریدا تھا تب شاید ان ہی کے توسط سے سارا کام ہوا تھا۔ میں نے ابو سے ان کا نام بہت بار سنا ہے۔ اچھا اب مجھے اجازت۔ صبح واپسی کے لیے روانہ ہونا ہے۔"

"بس خیال رکھنا کہ جہانزیب وغیرہ کو ہماری یہاں موجودگی کی بھنک نہ پڑے۔"

"جی آنٹی میں سمجھتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا بیٹے خیریت سے جاؤ۔" فاطمہ دروازے تک آئیں۔

تیسرے روز ہی حمید بھائی کا فون آ گیا۔ رابعہ بھابھی نے بھی فاطمہ سے بات کی اور سارے حالات پر افسوس کا اظہار کیا۔ اسد نے عثمانی صاحب کا نمبر بھی انہیں نوٹ کروا دیا۔

عرینہ نے تفصیل سے عثمانی انکل کے ساتھ ہر بات ڈسکس کی۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ چند دنوں کے لیے وہ سب بہاولپور واپس آ جائیں تاکہ جہانزیب کے خلاف قانونی کارروائی کا آغاز کیا جا سکے۔ نہ صرف قتل کا کیس دائر کیا جائے بلکہ انہیں حویلی خالی کرنے کا نوٹس بھی جاری کیا جائے۔ انکل نے مزید یہ بھی کہا کہ وہ بہاولپور میں ان ہی کے گھر آ کر ٹھہریں۔ اور جب تک معاملات حل نہیں ہو جاتے وہیں قیام کریں۔ عرینہ نے سکون کا سانس لیا' کیونکہ ان کے گھر سے زیادہ محفوظ جگہ وہاں کوئی نہیں تھی۔

بڑے عرصے بعد ایک بار پھر وہ تھے اور بہاولپور کی فضائیں۔ عثمانی انکل سے روبرو اور بھی مکمل کر باتیں ہوئیں۔ انہیں لگ رہا تھا کہ اگر جہانزیب پر قتل کا مقدمہ چلایا جائے تو وہ صاف بچ نکلے گا کیونکہ قتل کا کوئی واضح ثبوت ان کے پاس نہیں تھا اور جو ایک عینی شاہد تھی یعنی جیا۔ وہ نہ صرف کم عمر لڑکی تھی بلکہ مقتول کی بیٹی بھی تھی جو ان کے مطابق مصلحتاً" بھی جھوٹ بول سکتی ہے۔ البتہ جہانزیب کو حویلی سے باہر نکلوانے میں یہ کیس کافی مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ یوں تو حویلی کے کاغذات عثمانی صاحب کے پاس ہی تھے۔ ان کاغذات کی رو سے شیر زمان کے بعد اس کی تمام جائیداد کی وارث اس کی دو بیٹیاں اور بیوی فاطمہ تھے۔ عثمانی صاحب کے لیے بھی یہی بات بہت تقویت کا باعث تھی کہ کم از کم اس معاملے میں انہیں زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

سب سے پہلے انہوں نے عرینہ اور جیا کے ساتھ جا کر ایف۔ آئی۔ آر درج کرائی اور دوسرے مرحلے میں گھر پر ناجائز قبضے کی رپورٹ لکھوائی۔ پولیس نے جلد ہی کارروائی کا آغاز کر دیا جس کے بعد پہلے جہانزیب کو حراست میں لیا گیا اور اس کے بعد حویلی خالی کرنے کا نوٹس جاری کیا گیا۔ دونوں طرف سے وکیل مقرر ہوئے اور پہلی پیشی کی تاریخ دے دی گئی۔ ان سب کا چچا سے پہلا سامنا کورٹ میں ہی ہوا۔ وہ ایک گھورتی ہوئی نظر ان پر ڈال کر آگے بڑھ گئے۔ عرینہ کو ان کے چہرے پر سوائے نفرت کے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ وقار انکل کی کوششوں سے گھر تو چند ہفتوں کے اندر خالی ہو گیا۔ جس کے بعد وہ فوراً" نہ صرف اپنے گھر شفٹ ہو گئے بلکہ پولیس کا تحفظ حاصل کرنے کی درخواست بھی دے دی۔ قتل کے کیس کی کارروائی البتہ کافی طویل تھی۔ جہانزیب نے اس دوران عارضی ضمانت بھی کروالی تھی۔ اب انہیں ہر وقت چچا کی طرف سے کسی منفی کارروائی کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ لیکن وقار عثمانی معاملے کی نزاکت سے آگاہ تھے اس لیے ہر مرحلے پر ان کا خیال رکھا۔ دو ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی جہانزیب کے خلاف

کچھ ثابت نہیں ہو پا رہا تھا۔ جیا کی گواہی کو وہ یہ کہہ کر رد کرتے رہے کہ اس روز وہ شیر زمان کے کمرے میں گئے ہی نہیں بلکہ جس وقت شیر زمان کو ہارٹ اٹیک ہوا وہ گھر پر ہی نہیں تھے۔ ان کی گواہی کے لیے ان کا پورا کنبہ اس جھوٹ میں شامل ہو گیا۔

عرینہ اور فاطمہ کے بیان کو یہ کہہ کر الزام قرار دے دیا کہ یہ سب انہیں گھر سے نکلوانے کی ایک سازش ہے۔ عرینہ نے اس معاملے کو جتنا آسان سمجھا تھا ویسا ہوا نہیں۔ عثمانی صاحب کی تمام کوششیں بھی جہانزیب کو قاتل ثابت نہ کر سکیں اور عدالت نے کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی بنیاد پر اس کیس کو ختم کر دیا۔ تین ماہ کی جان توڑ کوشش کے بعد بھی وقار اپنے پیارے دوست کے قاتل کو سزا نہ دلوا سکے' فاطمہ کے سامنے انہوں نے نہایت شرمندگی سے سر جھکایا۔

"مجھے معاف کر دیں بھابی۔ کاش میں جہانزیب کو اس کے کیے کی سزا دلوانے میں کامیاب ہو جاتا تو آج آپ کے سامنے سرخرو ہوتا۔"

"ایسا مت کہیں بھائی صاحب۔ آپ نہ ہوتے ہم آج بھی گھر سے بے گھر کہیں پردیس میں بیٹھے ہوتے۔ آپ نے ہمارا جتنا ساتھ دیا اتنا تو کوئی اپنا بھی نہ کرتا۔ باقی جہانزیب کی رہائی پر میں تو خوش ہوں اگر اس دنیا میں سزا پا لیتا تو اس کڑے عذاب سے بچ جاتا جو اللہ کی عدالت میں اب اسے دیا جائے گا۔ سنا تھا نیک لوگ اپنی غلطیوں کی سزا اس دنیا میں ہی پا لیتے ہیں۔ کیونکہ اس دنیا کی سزا بہت معمولی ہے اب تو ثابت ہو گیا کہ یہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ جس کے نصیب میں معمولی سزا پانا لکھا ہی نہیں۔" وہ کرب سے چور لہجے میں بولے چلی گئیں۔

"اور ویسے بھی انکل' ہم اگر ابا کی قبر کشائی سے منع نہ کرتے تو شاید ثبوت بھی ہاتھ آ جاتا لیکن آپ جانتے ہیں' امی اس کے حق میں نہیں تھیں اس لیے آپ خود کو مورد الزام مت ٹھہرائیں۔" عرینہ نے بھی گفتگو میں حصہ لیا تو عثمانی نے سر ہلا دیا۔

"اب آگے کے بارے میں کیا سوچا ہے بھابی جی۔"

"آگے کا کیا سوچنا ہے۔ بس زندگی کے باقی روز سکون سے اپنے گھر گزر جائیں تو بہت ہے۔ باقی اخراجات تو دکانوں سے آنے والی رقم سے باآسانی پورے ہوتے رہیں گے۔"

"دکانوں کی دیکھ بھال کون کر رہا ہے۔ میرا مطلب ہے شیر زمان کے بعد تو جہانزیب نے سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا تو اب؟" انہوں نے کچھ جانچتی نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔

"جب سے جہانزیب کو اپنے حصے کی ایک دکان ملی ہے وہ تو الگ ہو گیا۔ آج کل تو پھر منظور حساب دینے آتا ہے۔"

"ہونہوں۔" وقار نے سر ہلایا۔ شیر زمان جن پانچ دکانوں کا مالک تھا' ان میں سے صرف دو ہی ان کے والد کی ذاتی ملکیت تھیں۔ باقی تین دکانیں شیر زمان نے اپنی محنت سے شروع کی تھیں۔ اس لیے جائیداد تقسیم ہوئی تو رستم خان کی دو دکانوں میں سے ایک شیر زمان کو ملی اور دوسری جہانزیب کے حصے میں آئی۔

"بات یہ ہے کہ بھابی جی کہ میں نے اپنی طرف سے پتا کروایا ہے' جہانزیب اب بھی آپ کی دکانوں پر آتا جاتا ہے اور۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکے "میرے کہنے کا مطلب ہے کہ اب آپ کو اپنے پرانے کام کرنے والوں پر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے اب ان کی وفاداریاں بدل چکی ہوں۔ آج ہر شخص اپنا نفع دیکھتا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی بھی ایسا نہیں جو خود جا کر دکانوں کے معاملات سنبھال سکے۔ یہ کوئی کرائے کی دکانیں نہیں ہیں کہ ہر ماہ لگا بندھا کرایہ آپ کو آتا رہے گا۔ ان دکانوں کا کاروبار بھی آپ کا اپنا ہے۔ جسے بغیر کسی بھروسے کے آدمی کی مدد کے آپ کے لیے سنبھالنا ناممکن ہے۔"

"تو پھر انکل۔ ہمیں اب کیا کرنا چاہیے۔" عرینہ ان کی ساری باتیں نہ صرف بغور سن رہی تھی بلکہ سمجھ بھی رہی تھی۔

"میرے نزدیک اس کے دو حل ہیں۔ پہلا یہ کہ پرانا پورا عملہ تبدیل کر کے نئے لوگ لائے جائیں۔ لیکن ایسا کرنے میں بہت سارے مسائل ہیں۔ جیسے یہ کہ پرانے لوگ جن کو ہٹایا جائے گا وہ بلاوجہ دشمنی پر اتر آئیں اور پھر نئے لوگ کہاں سے لائیں گے اور کون انہیں ڈھونڈے اور انتخاب کرے گا۔"

"جی انکل یہ حل واقعی تقریباً "ناقابل عمل ہے۔" عرینہ نے بھی اتفاق کیا۔

اور دوسرا حل یہ ہے کہ آپ اپنی دکانیں بمع کاروبار کے بیچ دیں۔ کیونکہ جس کاروبار کے نفع نقصان کا ہی آپ کو علم نہیں اسے جاری رکھنے کا کیا فائدہ۔"

"لیکن یہ بھی تو بہت مشکل کام ہے انکل۔ ہماری دکانیں بمع کاروبار کے کون خریدے گا اور کیا یہ کام بہت زیادہ وقت نہیں لے گا؟" عرینہ نے خدشہ ظاہر کیا تو وہ مسکرائے۔

"آپ لوگوں کو شاید اندازہ نہیں کہ یہ کام کتنی آسانی سے اور کتنے کم وقت میں ہو جائے گا۔ کیونکہ جتنا پرانا یہ کاروبار ہے اور جو اس کی لوکیشن ہے۔ اس کی مارکیٹ ویلیو بہت زیادہ ہے۔ بازار میں بیٹھنے والا کوئی بھی تاجر منہ مانگے داموں اسے خریدنے پر آمادہ ہو جائے گا۔ باقی آپ لوگ تسلی سے سوچ بچار کر لیں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ اسی وقت حمید انکل اور آنٹی وہاں آن پہنچے۔ عثمانی صاحب تو چلے گئے اور فاطمہ نے ساری بات حمید بھائی کو بتا کر ان سے مشورہ طلب کیا اور انہوں نے بھی تائید کی۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں بھابی کہ چار دکانوں کے بکنے پر آپ لوگوں کو کتنا کیش ملے گا۔"

اور واقعی ان کا کہا سچ ثابت ہوا۔ ایک مہینے کے اندر اندر سب دکانیں بک گئیں اور ان سے ملنے والی رقم لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں تھی۔ اتنی رقم ایک ساتھ دیکھ کر فاطمہ کو تو ہول اٹھنے لگے۔ عرینہ وقار انکل کے ساتھ اگلے ہی روز ساری رقم بینک میں رکھوا آئی۔ اب کم از کم ایک طرف سے تسلی ہو گئی تھی۔ وہ سب بمشکل ہی سکون کا سانس لے پائے تھے کہ ایک نئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔

چند روز سے گھر میں دھمکی آمیز فون آنا شروع ہو گئے تھے۔ ایک اجنبی شخص یہ کہہ کر فون کاٹ دیتا کہ جو کچھ تم لوگوں نے کیا اب اس کا نتیجہ بھگتنے کو تیار ہو جاؤ۔ عرینہ نے وقار انکل کو اس بارے میں بتایا تو وہ خود آ گئے۔ حمید انکل اتفاق سے پہلے سے وہیں آئے ہوئے تھے۔

"میں تو کہتی ہوں بھائی صاحب اب اس حویلی کو بھی بیچ دوں۔ جہانزیب محض دھمکی دینے والوں میں سے ہوتا تو آج میں شوہر اور بچیاں باپ سے محروم نہ ہوتیں۔" فاطمہ نے حد درجہ افسردگی سے کہا۔

"سچ تو یہ ہے بھابی جی کہ میں بھی آپ سے یہی کہنا چاہتا تھا لیکن یہ سوچ کر کہا نہیں کہ شاید آپ کے لیے یہ فیصلہ مشکل ہو۔"

"مشکل تو اس نے بنا دی ہے ہماری زندگی۔ اور ویسے بھی کیا کروں گی حویلی میں بیٹھ کر۔ اصل سہارا تو چھن چکا۔ اب تو ان بچیوں کی زندگی کا سوچنا ہے بس انہیں کچھ نہ ہو۔" پریشانی فاطمہ کے چہرے سے صاف عیاں تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں بھابی جی۔ میں نے پولیس میں رپورٹ لکھوا دی ہے آپ کے ساتھ کسی بھی قسم کے ناخوشگوار واقعے کی ذمہ داری جہانزیب پر عائد ہو گی لیکن بہرحال یہ کوئی حل نہیں ہے۔ خدانخواستہ کوئی واقعہ پیش آئے ہی کیوں۔ آپ کہیں تو میں کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرتا ہوں۔ آپ لوگوں کا جہانزیب کی نظروں سے دور رہنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"ڈیلر سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم تو خود پوری حویلی لینے میں انٹرسٹڈ ہیں۔" حمید انکل نے فوراً "لقمہ دیا۔ "بلکہ جب جہانزیب ہمارے پاس آفر لے کر آیا تھا تو میں یہی سمجھا تھا کہ پوری حویلی کی بات ہو گی۔ تب مجھے معلوم نہیں تھا کہ باقی کے حصے میں آپ لوگ مقیم ہیں۔" وہ مسکرائے۔

"چلیں یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ لوگ آپس میں معاملات طے کر لیں۔ میری ضرورت کسی بھی موقع پر پڑے تو میں حاضر ہوں۔" وہ اجازت لے کر چلے گئے۔

فاطمہ نے عرینہ اور جیا سے بھی مشورہ کیا۔ تو انہیں بھی مسئلے کا دوسرا کوئی حل نظر نہیں آیا سوائے اس کے کہ گھر بیچ دیا جائے۔

"ہاں اب تو شہر کے مضافات میں بہت خوبصورت ٹاؤن بن گئے ہیں۔ جو ہر لحاظ سے محفوظ بھی ہیں۔" عرینہ نے پرسوچ انداز میں اضافہ کیا۔

شام کو اسد انہیں کھانے پر بلانے کے لیے آگیا۔ مانسہرہ سے واپس آنے کے بعد ان سب کے ساتھ تعلقات میں کافی بہتری آئی تھی۔

جیا کا صبح سے ہی دل بہت اداس تھا۔ بلکہ جب سے وہ لوگ مانسہرہ سے واپس آئے تھے، ایک دن بھی اس کا یہاں دل نہیں لگا تھا۔ چار ماہ ہو گئے تھے واپس آئے لیکن وہ اب بھی خود کو وہیں محسوس کرتی۔ پچھلے کچھ عرصے مسائل اور مصروفیت کا عالم کچھ ایسا رہا کہ وہ خالہ کے ہاں فون بھی نہیں کر سکی تھی۔ اب جو دل بوجھل ہوا تو پہلا خیال نیلم کا آیا جیا نے کال ملائی اور دیر تک نیلم سے بات کر کے دل کا بوجھ ہلکا کیا۔ سب کی خیریت دریافت کی۔ یہاں کا حال احوال بتایا۔ خالہ اور بھابیوں سے بھی بات کی دل کو ایک دم بہت سکون ملا تھا۔ کافی ہلکے پھلکے موڈ میں کمرے میں آئی تو عرینہ ڈھیر سارے ڈریسز سامنے بیڈ پر پھیلائے کھڑی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" جیا ٹھٹکی۔

"ارے اچھا ہوا تم آگئیں۔ بتاؤ ذرا ان میں سے کون سا پہنوں؟"

"ہم کہیں شادی میں جا رہے ہیں؟" اسے سچ مچ اچنبھا ہوا۔

"نہیں بھئی آج حمید انکل کی طرف ڈنر ہے، بھول گئیں تم۔" عرینہ بدستور کپڑوں کی طرف متوجہ تھی۔ جیا نے تاسف سے ایک نظر اسے دیکھا اور باہر کی راہ لی۔

جانے عرینہ اتنی بے حس کیوں ہو گئی تھی۔ تمام عرصے میں ایک دن بھی اس نے مانسہرہ کو ویسا مس نہیں کیا تھا جیسا وہ کرتی تھی۔

کافی سارے دن گزر گئے تھے لیکن حمید اللہ صاحب اور ان کی فیملی کے کسی بندے نے دوبارہ حویلی خریدنے کی بات نہیں کی تھی۔ فاطمہ نے دل میں ارادہ کیا کہ آج خود ہی ان کے ہاں جا کر بات کرے لیکن اس سے پہلے ہی حمید بھائی اور بھابی ان سے ملنے آگئے۔

"اچھا ہوا، آپ لوگ آگئے، میں تو خود ارادہ کیے بیٹھی تھی دراصل وقار بھائی بہت مرتبہ پوچھ چکے ہیں کہ اگر آپ لوگ حویلی خریدنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو معاملات آگے بڑھائے جائیں۔"

"ارے بھابی جی چھوڑیں یہ بیچنے خریدنے کا چکر اور آپ بس یہیں رہیں۔"

"جی۔" فاطمہ فوری طور پر کافی حیران ہو گئی۔

"آپ کو تو سب پتا ہے بھائی صاحب۔"

"بھئی ہم تو چاہتے ہیں کہ گھر نہ ہی بکے تو اچھا ہے، اب ہمارا آپ کا پانچ سال کا ساتھ ہو چکا ہے۔ آپ لوگ کہیں چلے گئے تو ہمارے درمیان دوری آجائے گی۔" حمید صاحب نے آغاز کیا۔

"ہاں بھائی صاحب، بات تو ٹھیک ہے لیکن گھر خوشی سے کہاں چھوڑے جاتے ہیں۔ مجبوریاں ہی بندے کو لیے پھرتی ہیں۔ جہانزیب کی نظر سے بچنے کے لیے سب سے پہلے اس گھر کو چھوڑنا ضروری ہو گیا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔ انتقام کی آگ کو جب تک وہ ٹھنڈا نہ کرلے چین سے نہیں بیٹھے گا۔ اور اب تو اس کی نظر میں ہماری زیادتیوں کی لسٹ اور بھی لمبی ہو گئی ہے۔ پہلے صرف ثمر اور عرینہ کی شادی نہ کروانے کی بات تھی۔ اب قتل کا کیس اور حویلی خالی کرانے کا نوٹس بھی ساتھ شامل ہو گئے۔ بلکہ پانچ دکانوں سے صرف ایک اس کے حصے میں آئی اس بات کا بھی اسے بہت غصہ ہو گا۔"

وہ سب تو ٹھیک ہے بھابی لیکن اصل مسئلہ تو اپنی جگہ پر رہے گا کہ آپ کہیں بھی چلی جائیں، رہیں گی تو تین اکیلی عورتیں۔ اور اسی بات کا جہانزیب فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔"

"تو پھر ہم کریں بھی کیا؟" فاطمہ نے آہ "بھری شوہر بھی نہیں رہا اور بیٹا اللہ نے دیا نہیں۔"

"بیٹا نہ دینا تو اللہ کی مرضی پر تھا' لیکن داماد ڈھونڈنا تو آپ کے اپنے اختیار میں ہے۔" بھابی نے مسکرا کر وضاحت کی تو فاطمہ چونکی۔

"جی۔۔۔؟"

"ہم آج اسی سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں۔ ہم بہت شرمندہ ہیں بھابی کہ پہلے جب اسد اور عرینہ کے لیے آپ نے بات کی تو ہم نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا تب آپ نے بھی کھل کر مسائل سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ کاش اس وقت ہم اسد کو منا لیتے تو شاید بھائی صاحب ہمارے ساتھ ہوتے۔ خیر اللہ انہیں جنت نصیب کرے بات یہ ہے کہ ہم نے دوبارہ اسد سے بات کی ہے۔ وہ عرینہ سے شادی پر تیار ہے۔ آپ چاہیں تو یہ گھر ہمیشہ کے لیے ایک ہو سکتا ہے۔" حمید صاحب نے بوے نپے تلے انداز میں مدعا بیان کیا۔

"اور یہ دوستی جب رشتے داری میں بدل جائے گی تو کسی دشمن کی اس حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوگی۔" بھابی نے فاطمہ کا ہاتھ تھاما تو انہوں نے بمشکل اپنی اندرونی خوشی چھپائی۔ اللہ نے بیٹھے بٹھائے کیا بہترین سبب پیدا کر دیا تھا۔ انہوں نے بھیگی پلکوں کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

"میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی بھائی صاحب۔ آپ نے ہمیں دربدر ہونے سے بچا لیا۔"

"احسان کا نام لے کر ہمیں شرمندہ نہ کریں بھابی جی آپ تو بس شادی کے لیے جلد از جلد کوئی تاریخ بتا دیں۔"

"ہاں بھائی صاحب تاریخ بھی رکھ لیں گے۔ ذرا مشورے کا وقت تو دیں۔" فاطمہ نے ہنستے ہوئے آنکھیں صاف کیں۔

"کیوں نہیں بھئی ضرور کریں مشورہ اور ہاں آج رات کا کھانا بھی ہماری طرف ہے بچیوں کو بھی ساتھ لائیں۔" رابعہ بھابی کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ کبھی انکار کرتے ہیں تو کبھی خود رشتہ لے کر آجاتے ہیں۔" جیا نے سنا تو فوراً" شروع ہو گئی۔

"تو کیا ہوا یہ سب تو رشتوں میں چلتا ہی رہتا ہے۔ پھر اس وقت ہم بھی تو ہتھیلی پہ سرسوں جمانا چاہتے تھے۔" فاطمہ کو جیا کا اعتراض برا لگا۔

"تم کیا کہتی ہو۔" جیا نے عرینہ کی طرف دیکھا تو اس نے نہ سمجھنے والے انداز میں کندھے اچکائے۔

"اب یہ کیا بات ہوئی' کچھ کہو تو سہی۔" جیا کو سمجھ نہ آسکی کہ وہ خوش ہے یا ناراض۔

"چپ رہو تم۔" فاطمہ نے جیا کو جھاڑ دیا۔ "زبردستی اسے اپنا حمایتی بنانے کی کوشش مت کرو خوش ہے وہ۔" جیا ڈانٹ سن کر پیر پٹختی اندر چلی گئی۔ رات کو ڈنر پر جانے کا بھی اس کا قطعا" موڈ نہیں تھا۔ لیکن امی اسے گھر پر اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھیں اس لیے مجبورا" چلی آئی۔ سائرہ بھابی نے آج کھانے پر خصوصی اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے کے دوران بھی خوب ہنسی مذاق ہوتے رہے لیکن جیا اپنا بگڑا مزاج درست نہ کر سکی سب سے زیادہ غصہ اسے اسد پر آرہا تھا جو مسکرا مسکرا کر عرینہ کو گھورے جارہا تھا۔ اوپر سے باقی سب کے معنی خیز جملے' عرینہ بھی بلاوجہ لال گلابی ہو رہی تھی کھانے کے بعد اسد انہیں ان کے گیٹ تک چھوڑنے آیا۔

"بس آنٹی اب اس دیوار کو بھی گرادیں تاکہ باہر سے آنے جانے کا سلسلہ بند ہو جائے۔" اسد نے ایک شوخ نظر عرینہ پر ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا۔۔۔ ان شاء اللہ بہت جلد یہ گھر ایک ہو جائے گا۔"

☆ ☆ ☆

عرینہ اس وقت لان میں چہل قدمی کر رہی تھی جب اسد آگیا۔ اسے لان میں ٹہلتے دیکھا تو ادھر ہی آگیا۔

"خیریت۔۔۔ اکیلے اکیلے واک ہو رہی ہے۔"

"جی۔۔۔ امی تو سو رہی ہیں اور جیا شاید ٹی وی دیکھ رہی ہے۔ میرا موڈ نہیں تھا اس لیے باہر آگئی۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔

"لگتا ہے کچھ خاص سوچ بچار ہو رہی ہے۔" اس نے اس کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔

"جی' بس یہی سمجھ لیں۔" وہ ہنس پڑی۔

"اچھا' مثلا" کیا سوچا جارہا ہے' ویسے مجھے زیادہ سوچنے والی لڑکیاں نہیں پسند۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"پسند تو میں ویسے بھی آپ کو نہیں ہوں۔" عرینہ نے بے ساختہ کہہ دیا تو اسد چلتے چلتے رک گیا۔

"ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟"

"اگر پسند ہوتی تو آپ پہلے انکار نہ کرتے۔" بہت دنوں سے ایک شکوہ جو اسے چبھن دے رہا تھا لبوں پر آہی گیا۔

"ارے نہیں۔۔۔" وہ ہنسنے لگا۔ "تب بات الگ تھی۔ دراصل اس وقت میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتا تھا' مجھے لگا اب سب لوگ مجھ پہ زیادہ ہی پریشر ڈال رہے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔؟" عرینہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"لیکن وہ بات زیادہ پرانی تو نہیں ہے۔ یہی کوئی دس ماہ گزرے ہوں گے۔"

"تم تو بحث کرنے لگیں۔ بھئی اس وقت ہمیں آپ لوگوں کی پرابلمز کا صحیح معنوں میں اندازہ نہیں تھا۔ میرے نزدیک تو اب بھی جلدی ہے' لیکن مجھے اپنی مرضی سے زیادہ آپ لوگوں کی مجبوری کا خیال ہے۔" اس نے داد لینے کے انداز میں عرینہ کو دیکھا۔

"یعنی آپ نے ہماری مجبوریوں کو دیکھتے ہوئے ہاں کی ہے۔" عرینہ کے لہجے میں کچھ جان لینے کا تجسس تھا۔

"کیوں نہیں بھئی۔۔۔ آپ لوگوں کو اس وقت ایک مرد کے سہارے کی اشد ضرورت ہے' لیکن خیر اس سے یہ مطلب مت لو کہ تم مجھے پسند نہیں ہو۔" وہ ہنسا' لیکن عرینہ نے باقی کے جملے پر دھیان نہیں دیا۔

"سہارا۔۔۔" عرینہ نے عجیب نظر سے اسے دیکھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا اور کوئی حل تھا اس مسئلے کا؟" اسد نے الٹا اسی سے سوال کیا۔

"ہاں' لے دے کہ آپ ہی بچے تھے سہارا دینے کے لیے۔" عرینہ کی بے ساختہ زبان پھسلی لیکن پھر فورا" محتاط ہوئی۔ "میرا مطلب ہے' ہمیں واقعی آپ کا احسان ماننا چاہیے' آخر آپ نے مشکل میں ہمارا ساتھ دیا ہے۔"

"ویسے سچ کہوں عرینہ۔۔۔ تمہارے معاملے میں' اپنے جذبات سے میں پہلے واقعی ناواقف تھا' لیکن تمہاری دوری نے مجھے احساس دلایا کہ تم مجھے کتنی عزیز ہو۔ تمہاری کمی اس وقت بہت شدت سے محسوس ہوئی جب تم یہاں نہیں تھیں۔" اسد نے عرینہ کے لہجے میں چھپی بے اعتباری بھانپتے ہوئے فورا" لہجہ بدلا۔۔۔ وہ جوابا" چپ ہی رہی۔

"بس اب تو جلد از جلد یہ حویلی ایک ہو جائے اور ہم سب ایک ہی گھر کے افراد کی طرح رہنے لگیں۔" وہ بیچ کی دیوار کو بغور دیکھنے لگا۔

"اب یہ ذرا مشکل ہے اسد۔۔۔" عرینہ نے کچھ جھجک کر آہستہ سے کہا۔

"ہوں۔۔۔" وہ چونک کر مڑا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہمیں لگتا ہے حویلی بیچنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ چاہے میری آپ سے شادی ہو یا نہیں' اسے تو بیچنا ہی پڑے گا۔ اب اگر آپ لوگ اسے خرید لیں تب تو یہ بیچ کی دیوار گر سکتی ہے' لیکن اگر کوئی اور اس حصے کو خریدے گا' پھر یہ ممکن نہیں۔" عرینہ نے رک رک کر بات مکمل کی تو اسد بوکھلا ہی گیا۔ عرینہ کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہی۔

"لیکن کیوں۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔ بیچنے کا کیا مطلب؟"

"آپ پریشان نہ ہوں' اس سے ہمارے رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" اس نے سادگی سے وضاحت کی۔

"ہاں' لیکن یہ پروگرام کب بنا' ہمیں تو کچھ علم نہیں۔ ہمارے خیال سے تو اب حویلی بیچنے کی کوئی

"ضرورت نہیں رہی۔" اسد کو سمجھ نہیں آرہی تھی اپنی بات کیسے سمجھائے۔

"اسی لیے تو میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ اصل میں ہم جہانزیب چچا پر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حویلی اب ہماری ملکیت نہیں رہی۔ دوسرے یہ کہ وقار انکل کے گھر کے پاس ایک مکان برائے فروخت ہے امی سمجھتی ہیں میری شادی کے بعد وہ اور جیا وہاں زیادہ محفوظ رہیں گی۔"

"یعنی یہ حویلی اب کبھی ایک نہیں ہو سکتی۔" اسد پرسوچ انداز میں بڑبڑایا۔

"کیوں نہیں اسد۔۔۔ اگر آپ لوگ اسے خرید لیں جیسا کہ حمید انکل نے کہا تھا تو ایک ہو جائے گی نا۔" وہ بھرپور معصومیت سے مشورہ دینے لگی۔

"لیکن۔۔۔" اسد اضطرابی انداز میں انگلیاں چٹخانے لگا۔

"لیکن عرینہ، آنٹی اور جیا بنا حویلی بیچے بھی دوسرا مکان خرید سکتے ہیں۔ آخر آپ لوگوں کے پاس چار دکانوں سے آئی ایک کافی بھاری رقم موجود ہے جس سے ایک نہیں کئی مکان خریدے جا سکتے ہیں۔ نیا مکان اس رقم سے خرید کر وہ یہ حویلی تمہارے نام کر دیں۔ آخر تمہارا بھی حصہ ہے جائیداد میں۔۔۔" اب وہ ذرا کھل کر بولا بلکہ سمجھانے لگا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔۔۔ میں تو منہ سے مانگ کر حویلی لے سکتی ہوں۔" عرینہ نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

"لیکن مسئلہ یہ ہے اسد کہ اس وقت ہمارے پاس پیسے بالکل بھی نہیں ہیں۔ حویلی بیچ کر ہی امی نیا مکان خریدیں گی اور میری شادی بھی کریں گی۔"

"کیا مطلب۔۔۔ شادی کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں، لیکن کیوں۔۔۔ اور وہ دکانوں کی رقم۔۔۔" اسد کی حالت اس وقت دیکھنے والی تھی۔

"وہ بات دراصل یہ ہے کہ۔۔۔ دکانوں سے ملنے والی تمام رقم امی نے ایک سماجی ادارے کو دے دی ہے۔"

"واٹ۔۔۔ آر یو کریزی؟" وہ حیرت سے چیخا۔

"جی یہی سچ ہے۔ پچھلے دنوں ہم اتنے مسائل میں گھر گئے تھے کہ امی کو میری اور جیا کی زندگی کی شدید فکر لاحق ہو گئی تھی تب ہی انہوں نے منت مان لی تھی کہ ان سب مسائل سے چھٹکارا مل جائے تو وہ اپنا سارا پیسہ کسی ٹرسٹ کے نام کر دیں گی۔" عرینہ نے چہرے پر بھرپور مسکینی طاری کی۔

"اوہ۔۔۔" اسد نے نتھنے پھلا کر اسے دیکھا۔ "خیر ابھی تو میں چلتا ہوں۔ کافی رات ہو گئی ہے پھر بات کریں گے۔"

"جی ضرور۔۔۔" اس نے خوش دلی سے سر ہلایا تو اسد نے باہر کی راہ لی۔ عرینہ نے اسے جاتے دیکھا اور ایک گہرا سانس لے کر اندر آ گئی۔ جیا بیڈ پر الٹی لیٹی کسی سوچ میں گم نظر آئی۔

"تم سوئی نہیں ابھی تک۔۔۔؟" عرینہ بھی اسی کے انداز میں کشن ٹھوڑی کے نیچے ٹکا کر ساتھ لیٹ گئی۔

"ہاں کچھ سوچ رہی تھی۔" جیا کا لہجہ ازحد سنجیدہ بلکہ رنجیدہ سا تھا۔

"اچھا تو کیا سوچ رہی تھیں، مجھے بھی بتاؤ۔" عرینہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"بہت کم عمری میں مجھے ایک تجربہ تو حاصل ہو گیا۔" وہ بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

"کیا بھلا۔۔۔؟"

"کہ دنیا میں تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔"

"اچھا۔۔۔" عرینہ نے دلچسپی سے بھنویں اٹھائیں۔

"جیسے۔۔۔؟"

"وہ پہلی قسم جہانزیب چچا اور فیملی جیسے لوگوں کی ہے جو احساس نامی جذبے سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ خود غرض اور ظالم، کسی بھی قیمت پر اپنا مطلب حاصل کرنے والے۔"

"اور دوسرے۔۔۔؟"

"دوسرے ممتاز خالہ اور ان کے پورے خاندان جیسے۔۔۔ دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر گلے لگانے والے، بنا نفع، نقصان کی پروا کیے، سچی اور پرخلوص محبت رکھنے والے بالکل بے غرض۔۔۔"

"ہوں۔۔۔ اور۔۔۔؟" عرینہ نے مزید پوچھا تو جیا نے ایک آہ بھری۔

"تیسری قسم میں حمید اللہ انکل اور فیملی والے آتے ہیں۔۔۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنا مقصد بھی حاصل کر لیتے ہیں اور اچھائی کا نقاب بھی اپنے چہرے سے نہیں اترنے دیتے۔۔۔ میرے نزدیک یہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ دوست نما دشمن۔۔۔"

"تو تمہیں بھی اندازہ ہو گیا ان کی نیچر کا۔" عرینہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"مجھے "بھی" مطلب؟" جیا کچھ نہ سمجھتے ہوئے اٹھی۔

"ایک تجربہ مجھے بھی حاصل ہوا ہے، ابھی تھوڑی دیر پہلے، پتا ہے کیا۔" عرینہ نے جیا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام اسے پیار سے دیکھا۔

"کیا۔۔۔؟"

"وہ یہ کہ کچھ رشتوں اور لوگوں کی قدر ہمیں ان سے دور جا کر ہی ہوتی ہے۔ ویسے تو یہ بات ابھی اسد نے میرے لیے کہی، لیکن اس کے جملے نے بہت دن سے پڑی ذہن کی ایک گرہ کھول دی۔ جانے مجھے بھی بہت دنوں سے ایسا کیوں لگ رہا تھا کہ کوئی اہم چیز ہے جو اردگرد کے ماحول سے غائب ہے۔ اپنے ہی گھر میں ایک خالی پن کا احساس ہوتا تھا خیر۔۔۔ فی الحال ایک اچھی خبر سنو۔"

"تمہاری شادی کی تاریخ طے ہو گئی ہے؟" جیا نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔۔۔" عرینہ نے اسے کشن مارا۔ "میں شادی نہیں کر رہی۔"

"ہائیں۔۔۔ یہ کب ہوا؟ اور کیسے میرا مطلب ہے۔"

"بس بس میں بتاتی ہوں۔" عرینہ ہنسی۔ "ابھی اسد آیا تھا، کچھ دیر اس سے بات ہوئی جس کے بعد میں نے یہ فیصلہ کیا۔ شکوک و شبہات تو کافی دنوں سے مجھے لاحق تھے اور سوچ بچار بھی بہت دنوں سے کر رہی تھی، لیکن آج بات کر کے پورے معاملے کی تہہ تک پہنچنے میں کافی آسانی ہوئی۔"

"کچھ مجھے بھی بتاؤ۔" جیا کا تجسس عروج کو پہنچ گیا۔

"یاد کرو، جس روز وقار انکل امی سے حویلی بیچنے کی بات کر رہے تھے تب حمید انکل اتفاقاً وہاں موجود تھے۔ اس وقت انہوں نے یہی کہا تھا کہ وہ خود حویلی خریدنے میں انٹرسٹڈ ہیں۔ امی اور انکل خوش ہو گئے کہ چلو معاملہ بخوبی حل ہونے والا ہے، لیکن ادھر جب حمید انکل نے گھر جا کر سب کو یہی بات بتائی تو شاید کسی عقل مند نے انہیں صلاح دی کہ جو حویلی اسد اور عرینہ کی شادی پر چند لاکھ خرچ کر کے حاصل کی جا سکتی ہے اس پر کروڑوں لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ سو انہوں نے جھٹ پٹ اسد صاحب کو راضی کیا اور رشتہ لے کر آ گئے۔"

"لیکن اسد سے ابھی ایسی کیا باتیں ہوئیں کہ تمہارا شک یقین میں بدل گیا؟" "ذرا سوچو ڈیئر۔۔۔ مانسہرہ سے واپس آئے ہمیں پانچواں مہینہ چل رہا ہے اور اسد کو آج مجھ سے اظہار محبت کی سوجھی۔۔۔ آج وہ کہہ رہا ہے کہ میری جدائی نے اس کے دل میں میری محبت پیدا کی، اگر ایسا ہی تھا تو یہ محبت مجھے اس دن نظر آتی جب کاغان سے مانسہرہ کے راستے میں اچانک اس سے ملاقات ہوئی تھی، لیکن تب تو وہ مجھے ڈانٹ رہا تھا کہ ہم بغیر اطلاع کے کیوں آ گئے ہیں کیونکہ جہانزیب چچا نے ان کا سر کھا رکھا ہے اور ویسے بھی اگر ان کا ارادہ بن گیا تھا میری اور اسد کی شادی کا تو پچھلے پانچ ماہ کے دوران کوئی ایک بندہ کم از کم اشارتاً ہی ایسی کوئی بات کر دیتا، لیکن اب اچانک ایک ہفتے کے اندر سب کے سب ایک دم اتنے مہربان ہو جائیں تو دماغ کی بتی روشن تو ہو گی نا۔" عرینہ نے ہنس کر تفصیلی جواب دیا۔

"اچھا اور کیا باتیں ہوئیں اسد سے۔۔۔؟"

"بہت دلچسپ۔۔۔" عرینہ کچھ سوچ کر مسکرا دی۔

"پتا ہے میں نے اسے کیا کہا؟"

"کیا۔۔۔؟"

"میں نے اسے کہا کہ اس وقت ہم لوگ بالکل خالی ہاتھ ہیں اور امی کے پاس میری شادی کے لیے بھی پیسے

نہیں ہیں۔ کیونکہ ہم نے دکانوں سے ملنے والی رقم ایک ٹرسٹ کے نام کردی ہے۔"

"ہائیں... یہ کب ہوا؟" جیا نے آنکھیں نکالیں تو عزینہ کا قہقہہ نکل گیا۔

"پاگل جھوٹ بول رہی تھی۔"

"اوہ..." جیا بھی ہنس پڑی۔ "اسد کا چہرہ تو دیکھنے کے لائق ہوگا۔"

"ہاں... بالکل ہی ہاتھ پیر چھوٹ گئے تھے اس کے... خیر چلو امی کو بتاتے ہیں۔" عزینہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم نے فیصلہ کرنے میں ذرا جلدی نہیں کردی۔" ساری بات سن کر فاطمہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"بالکل نہیں امی... اور ہاں آپ پلیز اپنے دماغ کو آزاد چھوڑ دیں۔ مزید کوئی پریشانی نہ لیں... اب حالات ان شاء اللہ بہتری کی طرف جارہے ہیں۔" عزینہ نے انہیں تسلی دی۔

"لیکن بیٹا... کرنا کیا ہے... کچھ بتاؤ تو سہی۔ حمید بھائی کو کیا جواب دوں، حویلی بیچنے کے معاملے کا کیا ہوگا... اور..."

"حمید انکل کو جواب دینے کی تو بالکل فکر نہ کریں... وہ لوگ خود ہی اب ہماری شادی کے موضوع پر بات نہیں کریں گے۔ کیونکہ اسد نے انہیں تازہ ترین "اپ ڈیٹس" دے دی ہوں گی... باقی حویلی بیچنے کے معاملے پر وقار انکل سے بات کریں۔ وہ کسی پراپرٹی ڈیلر سے بات کرکے گھر کی قیمت لگوائیں اور بیچنے کے لیے پارٹی ڈھونڈیں۔ بلکہ اگر حمید انکل بھی لینا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"ہوں..." فاطمہ نے سرہلایا۔

☆ ☆ ☆

حویلی حمید صاحب نے ہی خریدی تھی البتہ پے منٹ ابھی آدھی کی تھی۔ باقی کی پے منٹ کے لیے انہوں نے آٹھ سے دس ماہ کی مدت مانگی تھی۔ فاطمہ نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یوں بھی وقار بھائی نے انہیں یقین دہانی کرائی تھی کہ باقی کی رقم وصول کرنا اب ان کی ذمہ داری ہے۔ فاطمہ نے حویلی خالی کرنے کے لیے پندرہ بیس دن مانگ لیے تھے۔ وقار بھائی نے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے ساتھ والا گھر وہ کسی بھی وقت خرید سکتے ہیں۔ مالک مکان سے انہوں نے بات کرلی تھی۔ گھر وہ دیکھ چکی تھیں بہت ہی خوب صورت اور کشادہ تھا۔ عزینہ حویلی سے ملنے والی رقم بینک میں رکھوا کر واپس آئی تو امی تیار بیٹھی تھیں اسے اور جیا کو مکان دکھالانے کے لیے۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے امی۔" عزینہ نے بہت سارا ٹھنڈا پانی حلق سے اتارا۔

"کیا مطلب، کیوں ضرورت نہیں ہے۔" فاطمہ نے حیرت سے سوال کیا۔

"امی اس میں کوئی شک نہیں کہ وقار انکل جس گھر کا بتا رہے ہیں وہ لوکیشن کے حساب سے کافی محفوظ ہے، لیکن کیا ہم ساری زندگی گھر بیٹھے گزار دیں گے ظاہر ہے باہر نکلے بغیر چارہ نہیں ہے۔ اب ہمارے پاس کسی مرد کا سہارا نہیں ہے تو کیا ہوا، اپنی حفاظت کے بے شمار اور راستے ہیں جن پر عمل کرکے ہم خود کو خطرات سے بچا سکتے ہیں اور مجھے لگتا ہے ہمیں یہ شہر ہمیشہ کے لیے چھوڑنا ہوگا۔ بلاوجہ کی بہادری بھی بے وقوفی کے زمرے میں آتی ہے اور میں اس کی قائل نہیں۔" عزینہ نے اپنا فیصلہ سنادیا۔

"یعنی... مانسہرہ..." فاطمہ نے کچھ سوچنے والے انداز میں دہرایا تو عزینہ نے سرہلادیا۔

"یہ ہوئی نا بات... میں تو ابھی جانے کو تیار ہوں۔ سچ..." جیا نے مارے خوشی کے ماں کو گلے لگایا تو انہوں نے مسکرا کر جیا کو تھپکی دی۔ "ٹھیک ہے جیسا تم دونوں کہو... میرے لیے سب سے قیمتی تم دونوں کی زندگی ہے۔ اللہ پاک تمہیں اپنی حفظ وامان میں رکھے مجھے اور کیا چاہیے۔"

اگلی صبح انہوں نے سب کے لیے بہت سارے گفٹس خریدے اور اپنے لیے کچھ ضروری شاپنگ کی۔ ارادہ چونکہ دوسرے دن روانگی کا تھا اس لیے

آتے ہی پیکنگ شروع کردی گھر کا سامان بیچنے کی نوبت نہیں آئی حمید اللہ صاحب نے چونکہ فرنشڈ گھر خریدنے کی خواہش ظاہر کی تھی اس لیے سامان کو شامل کرکے قیمت لگائی گئی تھی۔

"میں کچھ سوچ رہی تھی عزینہ..."

"ہوں..." ماں نے مخاطب کیا تو عزینہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

"دیکھو بیٹا، تم نے اسد کو آزمانے کے لیے رقم ٹرسٹ کے نام کرنے کی بات تو کردی تھی، لیکن اس میں کوئی صداقت نہیں۔ جبکہ آج ہم واقعی اس قابل ہیں کہ کسی سماجی ادارے کی مدد کرسکیں۔ بھلے تھوڑا سا حصہ ڈالیں، لیکن حق تو بنتا ہے نا۔"

"کیوں نہیں امی... مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ البتہ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ اگر ہمارے عزیز رشتہ دار اور محسن ضرورت مند ہوں تو پہلا حق ان کا بنتا ہے، لیکن بہرحال یہ بات میں اسد کو نہیں بتا سکتی تھی۔ خیر آپ جتنی رقم بھی کہیں کسی ادارے کو دینا چاہتی ہیں، مجھے بتادیں۔ میں چیک تیار کرکے وقار انکل کو دے جاؤں گی وہ سنبھال لیں گے۔"

"ہاں یہ صحیح رہے گا۔ میں بھی سوچ رہی تھی کہ کیا طریقہ کار اپناؤں۔ وقار بھائی کرلیں گے یہ کام..." فاطمہ نے تسلی بھرے انداز میں خود کلامی کی۔

"اچھا ممتاز خالہ کے گھر والوں کے لیے ہم نے کیا کرنا ہے، وہ سب تو یاد ہے نا۔"

"ہاں ہاں بالکل یاد ہے... بس ممتاز کو منانا پڑے گا۔ وہ برا مان جاتی ہے۔" فاطمہ نے مسکرا کر کہا تو عزینہ بھی ہنس پڑی۔ "ہاں ماشاء اللہ بہت خوددار ہیں۔"

آج تقریباً چھ ماہ بعد وہ ایک بار پھر مانسہرہ کے سفر پر رواں دواں تھے البتہ کیفیت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ عزینہ نے اس دن کے بوجھل پن کو یاد کیا جوان دیکھے، انجانے لوگوں کے بیچ جانے کے خیال سے دل و دماغ پر حاوی تھا اور آج... من بہت ہلکا پھلکا تھا۔ اس اعتماد اور بھروسے کی بدولت جو خالہ ممتاز اور ان کے گھر والوں کی محبت نے دیا تھا۔ بس ایک چھوٹا سا ڈر... عزینہ کھڑکی کے پار نیچے وادی میں دیکھتے ہوئے کہیں دور پہنچ گئی۔ "کیا چھ ماہ بعد بھی سب کچھ اپنی جگہ پر ہوگا... کوئی آج بھی اپنے وعدے پر قائم ہوگا یا..." اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔

دروازہ خالہ ممتاز نے کھولا اور حیرت سے کھڑی دیکھتی ہی رہیں، کیونکہ اس بار بھی وہ لوگ پہلے سے بتا کر نہیں آئے تھے۔ فاطمہ نے تو بہت کہا تھا کہ اطلاع کرنی چاہیے، لیکن جیا اور عزینہ کی ضد تھی سرپرائز دینے کی سو وہ بھی چپ ہوگئیں۔ خالہ کی خوشی کا یہ حال تھا کہ صحن سے ہی آوازیں دے کر سب کو بلانا شروع کردیا۔ نیلم نے باقاعدہ چیخ کر ان دونوں کو گلے لگایا۔

"سچ اتنی عادت ہوگئی تھی تم لوگوں کی... ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب ہم نے تم سب کو یاد نہ کیا ہو۔" نگینہ بھابھی نے کہا۔

"ہاں اور اس نیلم بی بی کو تو چپ ہی لگ گئی تھی اور آج دیکھو کیسے چہک رہی ہے۔" ثمینہ بھابھی اسے دیکھ کر ہنسیں۔

"شکر ہے کہ تم لوگ آج آگئے۔ اگر کل آتے تو میں شبنم باجی کے گھر جاچکی ہوتی۔ وہ تو بہت دنوں سے بلا رہی تھیں، لیکن میری سستی آڑے آگئی، لیکن اچھا ہوا، اکیلی تو میں بھی بور ہوتی ادھر۔ اب سب مل کر چلیں گے۔"

"کل ہی..." عزینہ نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں یار اس بار باجی کو بھی سرپرائز دیتے ہیں۔ میرے آنے کا تو انہیں پتا ہے، لیکن تم لوگوں کا انہیں نہیں بتاتے۔" نیلم نے آئیڈیا دیا جو سب سے زیادہ عزینہ کو بھایا۔

"ارے بھئی... انہیں تھکن تو اتار لینے دو، کچھ روز بعد چلی جانا۔" خالہ ممتاز نے نیلم کو بریک لگانے کی کوشش کی۔

"نہیں خالہ... اب ساری تھکن وہیں اتاریں گے۔" عزینہ شوخی سے ہنس کر اندر چلی گئی۔

"پہلے کے آنے اور اب کے آنے میں کتنا فرق

ہے فاطمہ۔" ممتاز نے اپنا رخ فاطمہ کی طرف موڑا۔
"پہلے جب بچیاں آئی تھیں تو مجھے ان کی ہنسی بھی مصنوعی لگتی تھی۔ خصوصاً" عرینہ تو اتنی سنجیدہ تھی کہ لگتا ہے نہیں تھا کبھی حالات کے اثر سے باہر نکلے گی پر اب دیکھو ماشاءاللہ اس کے کھلتے چہرے پر نظر ہی نہیں ٹک رہی۔"
"ہاں اللہ انہیں بہت خوشیاں نصیب کرے۔" فاطمہ نے بے ساختہ دعا دی۔
"آمین۔۔۔" ممتاز نے بھی دل سے تائید کی۔ "چلو آؤ کمرے میں چلتے ہیں۔ آج تفصیل سے بتاؤ' کیا حالات پیش آئے' فون پر تو بس موٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں۔" دونوں باتیں کرتی اندر کی طرف بڑھ گئیں۔
واصف اور جمال بھائی آئے تو وہ لوگ گفٹس اٹھا لائیں۔ فاطمہ نے ثمینہ اور نگینہ کی طرف سونے کی چوڑیوں کے سیٹ بڑھائے تو ان دونوں سمیت سب نے حیرت سے فاطمہ کی طرف دیکھا۔
"یہ تو اصلی ہیں' سونے کی۔" ممتاز نے چوڑیاں ہاتھ میں لے کر فاطمہ کو دیکھا۔ "اتنا مہنگا تحفہ۔۔۔ یہ کیوں؟"
"کوئی مہنگا نہیں ہے۔ یہ سب میرے لیے جیا اور عرینہ کی طرح تو ہیں۔ یہاں آؤ نیلم۔" انہوں نے انگوٹھا کرکے نیلم کو اشارہ کیا۔
"یہ تمہارے لیے۔۔۔" فاطمہ نے بہت خوب صورت جیولری سیٹ آگے بڑھایا۔
"میرے لیے۔۔۔" اتنا بھاری سیٹ دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"ہاں اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔ جب دلہن بنو گی تب پہنائیں گے۔ ان شاءاللہ" فاطمہ نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ شرما گئی۔ شبنم کے لیے بھی چوڑیاں تھیں وہ فاطمہ نے سنبھال کر عرینہ کو الگ رکھنے کے لیے دیں اور پرس سے دو چیک نکال کر پہلے واصف کی طرف آئیں۔
"یہ چیک تمہارے لیے ہے۔ اب موٹر سائیکل پر آفس جانے کی ضرورت نہیں اس رقم سے اپنے لیے گاڑی خریدنا۔"
"جی۔۔۔؟" وہ حیرت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارے نہیں خالہ یہ میں نہیں لے سکتا۔"
"غیریت برت رہے ہو نا۔۔۔ میں کیا تمہاری ماں جیسی نہیں ہوں۔"
"لے لیں واصف بھائی۔۔۔ آخر گاڑی کام تو ہمارے ہی آئے گی۔ روز' روز گھومنے کے پروگرام بنا کر ہم آپ کو احسان اتارنے کا پورا موقع دیں گے۔" عرینہ نے شوخی سے کہا تو سب ہنس پڑے۔
"اور یہ چیک تمہارے لیے جمال۔۔۔" فاطمہ نے دوسرا چیک جمال کی طرف بڑھایا تو اس میں لکھی رقم دیکھ کر اس کا بھی یہی حال ہوا۔
"یہ رقم میں اس لیے دے رہی ہوں تاکہ اب تم کرائے کی دکان پر کام کرنے کے بجائے اپنا ذاتی جنرل اسٹور خریدو۔۔۔ اچھا اور یہ رقم میں نے اندازے سے لکھی ہے۔ اگر گاڑی اور دکان کے لیے مزید رقم درکار ہوئی تو میں خود دوں گی کیونکہ یہ تحفے میری طرف سے ہیں۔"
"اتنا سب کچھ مت کرو فاطمہ۔۔۔ انہیں اتارنے کی میری حیثیت نہیں ہے۔" ممتاز کی آنکھیں بھر آئیں۔
"احسان تو تم نے کیا تھا' جسے اتارنے کی میں بہت معمولی کوشش کر رہی ہوں۔۔۔ رات کے اندھیرے میں جب میں اپنی دو جوان بچیوں کو لے کر گھر سے نکلی تھی تو سوائے اللہ کی ذات کے اس کھلے آسمان تلے میرا کوئی بھی نہیں تھا تم نے میری یتیم بچیوں کو محبت سے گلے لگایا۔ چار ماہ ہم تمہارے مہمان رہے اور میں نے ایک بھی دن کسی کے چہرے پر ناگواری اور ماتھے پر شکن نہیں دیکھی۔ تمہارے احسان کیسے بھلا سکتی ہوں۔" فاطمہ کہتے ہوئے رو پڑیں۔
"کیسی باتیں کر رہی ہیں خالہ۔ بار بار احسان کا لفظ استعمال کر کے ہمیں شرمندہ مت کریں۔ آپ اتنے مان سے۔۔۔ ہمارے ہاں آئیں' ہم بھلا اس کا پاس کیسے نہ رکھتے بلکہ یہاں رہتے انہیں کوئی تکلیف پہنچتی تو ہمارے لیے شرم کا مقام تھا انہیں یتیم اور بے آسرا کہہ کر آپ بھی غیریت برت رہی ہیں۔ جن کے سروں پر دو' دو بھائیوں کا ہاتھ ہو وہ بے آسرا کیسے ہو سکتی ہیں۔" جمال بھائی نے پیار سے دونوں کو اپنے ساتھ لگایا تو سب کی آنکھیں بھر آئیں۔
"اگر تم اسے احسان سمجھتی ہو تو پھر اسے چکا کر تم بھی تو ہمیں پرایا کر رہی ہو" ممتاز نے شکوہ کیا۔ ماحول کافی جذباتی سا ہو گیا تھا۔ عرینہ مسکراتے ہوئے ممتاز کے قریب آ بیٹھی اور ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔
"بالکل نہیں خالہ۔۔۔ اور ویسے بھی کچھ احسان روپے پیسے سے چکائے ہی نہیں جا سکتے یہ سب ہم نے اپنی خوشی سے کیا ہے آپ بس زیادہ مت سوچیں ہمیں اور بھی بہت کام ہیں۔"
"ہیں۔۔۔" ثمینہ بھابھی نے ہنس کر آنکھیں نکالیں۔ "ایسے کیا کام ہیں؟"
"میرا پروگرام یہ ہے کہ۔۔۔ ہم نئی گاڑی میں کاغان جائیں۔۔۔ کیوں؟" عرینہ نے باری باری نیلم اور جیا کو دیکھا تو دونوں نے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔
"یس۔۔۔"
"ارے لیکن تم تو کل جا رہی ہو نا۔ چوبیس گھنٹوں میں گاڑی کہاں سے لاؤں۔" واصف حیران ہو گیا۔
"کوئی مسئلہ نہیں میں ابھی باجی کو فون کرکے چند دن نہ آنے کا بہانہ گھڑتی ہوں۔ آپ آرام سے گاڑی خرید لیں لیکن بھئی یہ تو طے ہو گیا کہ جائیں گے نئی گاڑی میں۔" نیلم نے فیصلہ سنایا اور شبنم باجی کو فون کر کے کہہ بھی دیا کہ فی الحال تین چار دن واصف بھائی کسی ضروری کام میں مصروف ہو گئے ہیں اور وہ کچھ دن بعد آئے گی۔
اس بار ثمینہ بھابھی اور بچے بھی ساتھ تھے۔ شبنم تو واصف کے ساتھ صرف نیلم اور ثمینہ کی توقع کر رہی تھی' لیکن ان کے ساتھ جیا اور عرینہ کو دیکھ کر اس کی حیرت اور خوشی کا بھی وہی حال ہوا۔ عرینہ اندر جاتے ہوئے کافی نروس سی تھی' لیکن باجی سے پتا چلا کہ ساجد بھائی اور اسفند ابھی دفتر سے نہیں لوٹے۔ وہ لوگ بابا جی سے ملے۔
کھانے کے بعد واصف' ثمینہ بھابھی کو ان کے میکے چھوڑنے کے لیے جانے لگے تو شبنم گیٹ تک ان کی نئی گاڑی دیکھنے آئی۔
"اللہ مبارک کرے۔۔۔ ماشاءاللہ بہت خوب صورت گاڑی ہے۔ بس ذرا احتیاط سے چلایا کرو۔"
"تم بھی آؤ شبنم۔۔۔" ثمینہ بھابھی نے اسے بلایا۔
"ارے نہیں۔۔۔ ابھی تو یہ لوگ آئے ہیں۔"
"آجاؤ بھئی۔۔۔ ثمینہ کو چھوڑ کر میں نے واپس یہیں تو آنا ہے۔ ساجد بھائی اور اسفند سے ملنے کے بعد ہی واپس مانسہرہ جاؤں گا۔ بس کچھ دیر ہی بیٹھیں گے وہاں۔" واصف بھائی نے بھی اصرار کیا تو شبنم راضی ہو گئی۔
"اچھا ٹھیک ہے۔۔۔" وہ نیلم کی طرف مڑی۔
"تازش کو مجھے دے دو۔۔۔ اور تم لوگ تھوڑا آرام کرلو۔ اسفند آجائے تو اس کو کھانا گرم کر کے دے دینا۔ تمہارے ساجد بھائی آج ذرا لیٹ آئیں گے۔" شبنم ہدایات دیتی گاڑی میں بیٹھ گئی۔
بابا جی اپنے کمرے میں آرام کر رہے تھے۔ وہ تینوں بھی تھکی ہوئی تھیں۔ آرام کی غرض سے کمرے میں آگئیں۔ جیا اور نیلم تو باقاعدہ لیٹ گئی تھیں۔ عرینہ نے البتہ میگزین کھول کر کرسی سے ٹیک لگائی۔ دس منٹ بعد ہی ڈور بیل کی آواز سنائی دی۔
"تم چلی جاؤ جیا۔۔۔ مجھے تو سخت نیند آرہی ہے۔" نیلم نے لمبی سی جمائی لی۔
"میں تو سو بھی چکی۔۔۔" جیا نے کشن منہ پہ رکھا تو عرینہ نے میگزین کی آڑ میں بمشکل مسکراہٹ روکی۔
"دفع ہو جاؤ دونوں۔۔۔ میں ہی کھول لیتی ہوں۔" وہ مصنوعی غصہ کرتی باہر نکلی۔
"یہ ہوئی نا بات۔" اس کے نکلتے ہی دونوں نے ہاتھ ملایا اور پھر سے سوتی بن گئیں۔
گیٹ کی طرف جاتے ہوئے عرینہ کا دل بے ترتیب سے انداز میں دھڑکنے لگا۔ کنڈی کھولتے ہوئے ہاتھ بھی کانپا۔ بڑی مشکل سے اپنی حالت پہ قابو پا کر دروازہ

کھولا۔ اسفند اسے یوں اچانک سامنے پاکر بری طرح چونکا۔
"آپ۔۔۔؟"
"جی۔۔۔ السلام علیکم۔۔۔" وہ مسکراہٹ چھپانے کے لیے فوراً" مڑگئی۔
"وعلیکم السلام۔۔۔" اسفند بھی سنبھل کر اندر آیا۔
"کون کون آیا ہے؟"
"جی۔۔۔ واصف بھائی، ثمینہ بھابھی، بچے، نیلم، جیا اور میں۔۔۔" وہ ساتھ ساتھ چلنے لگی۔
"اچھا۔۔۔" اسفند نے حیرت کا اظہار کیا کیونکہ گھر میں تو مکمل خاموشی کا راج تھا۔
"وہ اصل میں واصف بھائی، بچوں اور بھابھی کو ان کے گھر چھوڑنے گئے ہیں اور باجی نازش کو لے کر ان کی نئی گاڑی کی سیر کرنے ساتھ گئی ہیں۔ نیلم اور جیا اندر سو رہی ہیں۔" عرینہ نے تفصیلی جواب دیا۔
"اچھا ماشاءاللہ۔۔۔ واصف نے نئی گاڑی لی ہے۔"
"جی۔۔۔" عرینہ نے آگے بڑھ کر اسفند سے فائلیں لیں تو اسے دوسرا جھٹکا لگا۔
"ایسے انداز تو۔۔۔" وہ محض سوچ کر ہنس پڑا۔ عرینہ آگے آگے چلتے ہوئے اس کے کمرے میں آگئی۔
"آپ کے لیے کھانا گرم کردوں۔" فائلیں میز پہ رکھ کر وہ مڑی۔
"نہیں شکریہ فی الحال بالکل بھوک نہیں ہے۔" وہ صوفے پہ بیٹھ کر بوٹ اتارنے لگا۔
"تو چائے۔۔۔؟"
"نہیں میں اس وقت چائے نہیں پیتا۔"
"تو پھر کیا لاؤں۔" اس نے تنگ آکر پوچھا تو اسفند ہنس پڑا۔
"اب آپ مصر ہی ہیں کچھ کھلانے پلانے پر تو پانی لے آئیں، لیکن ٹھنڈا نہ ہو۔" وہ کہہ کر واش روم چلا گیا۔ اور جب تک عرینہ پانی لے کر آئی وہ کپڑے تبدیل کرچکا تھا۔
"شکریہ۔۔۔" اسفند نے پانی پی کر گلاس لوٹایا۔
"اور سنائیں، کیسے گزرے یہ چھ ماہ۔۔۔" اسفند کو لگا وہ جانے والی نہیں ہے۔ اس لیے خود ہی بات کا آغاز کردیا تاکہ اسے رکنے میں سہولت ہو۔
"بہت مصروف اور ٹینشن بھرے۔۔۔" وہ مسکرا کر ٹیبل کے کنارے سے ٹک گئی۔
"ہاں کافی پریشان کن حالات میں آپ کا جانا ہوا تھا۔ وہاں سب خیریت تو رہی۔"
"جی شکر ہے۔ اب سارے مسائل حل ہو گئے۔"
"چلیں یہ تو اچھی بات ہے اور کب تک قیام ہے یہاں؟"
"یہاں کاغان تو بس ہفتے بھر کے لیے آئے ہیں۔ البتہ مانسہرہ میں اب ہم مہمان نہیں ہیں۔۔۔ ہم۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ "ہم ہمیشہ کے لیے یہاں آگئے ہیں۔"
"اچھا۔۔۔؟" اسفند واقعتاً" حیران ہوگیا۔ "ہمیشہ کے لیے اپنی جگہ چھوڑنا کافی تکلیف دہ ہوتا ہے تو کوئی افسوس۔۔۔" وہ کہتے کہتے رکا۔
"تکلیف تو یقیناً" ہوتی ہے، لیکن گھر انسانوں سے بنتے ہیں اور ابا کے بعد اس گھر کے در و دیوار سمیت پورا شہر ہی ہمارے لیے اجنبی ہوگیا تھا۔ پہلی بار ہم واقعی یہاں بہت عجیب سے حالات میں آئے تھے۔ نہ لوگوں سے واقفیت۔۔۔ نہ جگہ سے انس البتہ اس بار بات اور ہے اب ہم خالص اپنی ذاتی کوشش اور دل کی خوشی سے یہاں آئے ہیں۔" وہ مکمل تفصیل سے ایک ایک بات کا جواب دے رہی تھی۔ جس پر اسفند حیران بھی تھا اور خوش بھی۔ انتہائی ریزرو رہنے والی عرینہ کا یہ روپ بالکل نیا اور بہت خوب صورت تھا۔ اپنے حالات اس سے شیئر کرتی اس وقت وہ بہت اپنی اپنی لگ رہی تھی۔ اسفند دیوار سے ٹیک لگائے اسے بغور دیکھے گیا۔ عرینہ نے کچھ دیر بعد سر اٹھایا تو اتنے انہماک سے اسے دیکھتے پاکر گڑبڑا سی گئی۔ دل میں ارادہ کیا کہ اب چلے جانا چاہیے، لیکن اس کی نظروں کی تپش اپنی جگہ سے ہلنے نہیں دے رہی تھی۔
"اب آگے کیا ارادے ہیں؟" سینے پہ ہاتھ باندھے ہوئے اسفند نے سوال کیا۔

"آگئے۔۔۔" وہ کہہ کر مسکرادی۔ "اب تو ایک گھر بنانا ہے جیا اور امی کے لیے۔۔۔" وہ کہہ کر رک گئی اور اسفند نے سرہلادیا۔ لیکن چند لمحوں بعد جیسے اس کے الفاظ پر غور کیا تو بے ساختہ منہ سے پھسلا "اور آپ۔۔۔!" جواباً" عرینہ بنا کچھ بولے نیچے دیکھنے لگی البتہ ہونٹوں پر مبہم سی شرمائی شرمائی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اسفند کو مزید سوال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عرینہ کا اب تک کا رویہ اگرچہ بہت کچھ سمجھا رہا تھا، لیکن اس آخری جملے نے تو رہا سہا شک بھی دور کردیا۔ وہ چند قدم چل کر اس کے مقابل آکھڑا ہوا۔
"تو تمہیں یہ پرپوزل قبول ہے۔" اس نے انگلی سے عرینہ کا چہرہ تھوڑا سا اوپر کیا تو اس نے ہنس کر منہ دوسری طرف پھیرلیا۔
"یعنی ایک گھر بنانا ہے اور ایک بسانا ہے۔۔۔ لیکن بھئی گھر تو صرف ایک ہی بنے گا۔ کیونکہ آنٹی اور جیا بھی وہیں رہیں گے جہاں ہم۔۔۔ کیونکہ وہ ہم سے الگ نہیں ہیں کہو منظور ہے۔"
"جی۔۔۔ منظور ہے۔" وہ مسکرادی۔ لیکن اسفند کسی خیال کے تحت ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔
"تم نے اچھی طرح سوچ تو لیا ہے نا۔"
"جی۔۔۔" عرینہ نے حیران ہوکر اسے دیکھا۔ "کیا آپ کو لگتا ہے میں کسی پریشر میں ہوں۔"
"نہیں نہیں۔۔۔ میرا مطلب تھا کہ تمہیں میرے بارے میں سب معلوم ہونا چاہیے۔ اگر تمہارے ذہن میں کچھ سوالات ہوں تو پوچھنا تمہارا حق ہے۔"
"اچھا۔۔۔ مثلاً" کیا۔۔۔؟" وہ مسکرائی، لیکن اسفند ہنوز سنجیدہ تھا۔
"جیسے تمہیں پتا ہونا چاہیے کہ میرے کام کی نوعیت کیا ہے، میں کماتا کتنا ہوں اور کیا تم میری کم تنخواہ میں گزارا کرلوگی کیونکہ تم ماشاءاللہ بہت سہولتوں میں پلی ہو۔"
"اوہ۔۔۔" وہ ہنسی۔ "پھر تو آپ کو بھی جاننا چاہیے کہ والد کی جائیداد میں سے مجھے کتنا حصہ ملا۔"
"کبھی لڑکی سے بھی ایسے سوال پوچھے جاتے ہیں۔۔۔ حیرت ہے۔"
"کیوں، کیا لڑکیاں امیر نہیں ہوتیں۔" وہ مسکرانے لگی۔
"کیوں نہیں، بالکل ہوتی ہیں، لیکن شریعت کی رو سے شادی کے بعد نان نفقے کی ذمہ داری خالصتاً" مرد پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے یہ حق صرف اور صرف لڑکی والوں کو ہونا چاہیے کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے کسی اچھی فیملی کے برسرروزگار لڑکے کا انتخاب کریں جو شادی کے بعد ان کی بیٹی کو خوش رکھ سکے۔ لڑکے کو صرف لڑکی کے کردار اور اس کی خصوصیات کو دھیان میں رکھنا چاہیے۔" وہ ازحد سنجیدہ تھا۔ عرینہ پوری توجہ سے اس کی بات سنے گئی۔
"کاش ہر نوجوان کی سوچ آپ جیسی ہوجائے۔ مجھے ویسے بالکل نہیں جاننا کہ آپ کتنا کماتے ہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے کہ آپ کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔"
"ہاں، لیکن ایک شرط پہ یہ ذمہ داری اٹھانے کو تیار ہوں۔"
"شرط۔۔۔؟" وہ چونکی۔
"تم پر ایک مسکراہٹ کا ادھار باقی ہے۔"
"اوہ۔۔۔ آپ کو ابھی تک یاد ہے۔"
"جی۔۔۔ پہلے روز جب کوشش کی تو نیلم بیچ میں آگئی کہ ابھی یہ فرمائش بہت بڑی ہے اس کے بعد تم خود اتنی ریزرو ہوگئیں کہ بات کرنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی تھی ویسے سچ بتاؤ اتنا برا لگتا تھا میں۔" وہ اب مکمل شوخی کے موڈ میں آگیا تھا۔
"جی ہاں اتنے برے کہ میں نے سوچا شادی کرکے اس لڑکے کو سدھارنا چاہیے۔" وہ بے ساختہ بولی تو اسفند نے قہقہہ مارا۔
"کتنے ملتے جلتے ہیں ہمارے خیالات۔"
"کیا؟" عرینہ نے آنکھیں نکالیں۔
"میرا پروگرام بھی ایک بدمزاج لڑکی کو راستے پر لانا تھا۔"
"پھر تو بالکل نہیں نبھ سکتی۔" عرینہ نے منہ بنایا۔

"سوچ لو شوہر اچھا لک بھی ہو' ایسا بہت کم ہوتا ہے۔" اسفند نے ہنستے ہوئے کہا تو جواباً" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ اسفند کا شوہر کہنا اسے عجیب سے احساسات سے دوچار کر گیا۔ بے ساختہ شرم سے سر جھک گیا اور دل میں خود کو کوسا کہ زیادہ بک بک نہیں کرنی چاہیے۔ اسفند نے نرمی سے اس کے شانے تھام کر اپنے سامنے کیا اور سرخ ہوتے اس کے گالوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

"کچھ کہو گی نہیں؟"

"کہنا تو ہے۔" وہ جھجکی اور پہلی بار ذرا سا سر اٹھا کر اسفند کی آنکھوں میں دیکھا۔

"مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے۔"

"شکریہ؟ کس بات کا؟" اسفند حیرت سے ہنسا۔

"پچھلے دنوں کسی نے میرا سہارا بننے کی خاطر میرا ہاتھ تھامنا چاہا تو مجھے آپ کی بے حد یاد آئی۔ آپ نے کہا تھا کہ سہارے کی ضرورت کمزور لوگوں کو ہوتی ہے۔ آپ کے ان الفاظ نے میرے اندر پھر سے اٹھ کھڑے ہونے کا حوصلہ پیدا کر دیا۔ حالانکہ تب میں نے سوچا کہ حویلی نہ بکنے دوں اور اسد سے شادی کر لوں لیکن آپ کے بس ایک ہی جملے نے میرے اندر طاقت پیدا کی اور میں نے سوچ لیا کہ اب یہ ہاتھ اگر کسی کی طرف بڑھے گا تو۔ میرے دل کی خوشی اور پوری رضامندی سے ہی بڑھے گا نہ کہ حالات کے آگے قربان ہونے کے لیے۔ اس لیے میں نے اسد کا پرپوزل ٹھکرا دیا۔ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ پیچھے اب بھی کوئی ہے جو میرا انتظار کر رہا ہے اور جسے میری طاقت پر پورا بھروسا ہے تھینکس۔"

"میں نے تو صرف ان خوبیوں کا اعتراف کیا جو تمہاری شخصیت کا حصہ ہیں ویسے کیا واقعی صرف ایک جملے نے یہ تبدیلی پیدا کی۔" اسفند کے لہجے میں کچھ جاننے کا شوق بہت واضح تھا عرینہ ہنس پڑی۔

"نہیں سچ تو یہ ہے میں اپنے دل کے آگے ہار نہیں مان رہی تھی۔ ایک عجیب سی نظر نہ آنے والی کوئی کشش ضرور تھی جس نے بہت پہلے آپ کی جانب کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن میں اس وقت حالات کے بہت اثر میں تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی ہماری ذات پر انگلی اٹھائے۔"

"چلو کوئی بات نہیں اب تو ایسے کوئی وہم لاحق نہیں ہیں نا؟"

"نہیں آپ سب بہت اچھے ہیں۔ مجھے یقین ہے کوئی ہمارے لیے اپنے دل میں ایسا ویسا گماں نہیں رکھتا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ آپ خود بہت اچھے ہیں۔" عرینہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اگرچہ تھوڑا سا غریب ہوں۔" اسفند نے جملہ جوڑا۔

"لیکن پھر بھی چلے گا۔ اچھے کک آسانی سے واقعی نہیں ملتے اور میری اپنی کوکنگ کافی خراب ہے۔" وہ شرارت سے ہنسی تو اسفند بھی مسکرا دیا۔

"میں ایک بات پوچھوں۔" عرینہ اچانک قدرے سنجیدہ ہوئی۔

"جی جی ضرور"

"آپ مجھ سے اس بات پر ناراض تو نہیں کہ پہلے میرا رویہ آپ کے ساتھ اچھا نہیں تھا؟" "تمہارے سخت رویے سے تو کوئی گلہ نہیں تھا۔ البتہ انکار سے ضرور مایوسی ہوئی تھی۔" "اپنے انکار سے تو خود مجھے بھی بہت گلہ ہے۔" وہ شرمندگی سے ہنسی "دراصل پورا راستہ میں یہ سوچ کر ڈرتی رہی کہ اگر یہاں سچویشن تبدیل ہو چکی ہوئی۔ یعنی آپ کا کہیں رشتہ وغیرہ طے پا گیا ہو تو کیا ہو گا۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ کے لیے یہاں آجانے کا فیصلہ اسی بنیاد پر کیا تھا۔"

"اب اتنا بھی ٹائم نہیں گزرا تھا کہ یہاں کوئی بہت بڑی تبدیلی آچکی ہوتی۔" اسفند نے بے ساختہ کہا۔

"اچھا یعنی ذرا زیادہ ٹائم گزر چکا ہوتا تو تبدیلی کا امکان تھا۔" عرینہ نے ابرو چڑھائے تو اسفند کا قہقہہ نکل گیا۔

"نہیں نہیں برے گمان نہ کریں۔ بلکہ ایسا کوئی معاملہ ہونے لگتا تو میں بھابھی یا نیلم کے ذریعے ایک بار اور تمہاری رائے ضرور جانتا۔ تب بھی تمہاری طرف سے انکار ہوتا تو پھر کچھ اور سوچتا۔" اسفند نے تفصیلی جواب دیا تو عرینہ نے سر ہلا دیا۔

"اچھا ویسے اور کیا کیا وہم لاحق ہوئے تھے راستے میں۔" اسفند اب اسے باقاعدہ چھیڑ رہا تھا لیکن وہ چڑنے کے بجائے مسکرانے لگی۔

"میں نے تصور کیا کہ ہم اچانک خالہ ممتاز کے گھر پہنچتے ہیں اور وہ لوگ آپ کے ہاں آنے کے لیے تیار کھڑے ہیں کہ آج اسفند کی شادی ہے اور وہ شرکت کرنے جا رہے ہیں۔"

"مذاق کر رہی ہو۔" اسفند نے یقین نہ آنے والے انداز میں اسے دیکھا تو وہ ہنس پڑی۔

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔ میں واقعی ایسی ہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی ہوئی آئی تھی۔"

"تم نے ہمارے بارے میں کسی اور سے ڈسکس کیا۔" اسفند کو اچانک جیسے خیال آیا۔

"جی ہاں۔ امی سے ابھی پچھلی رات ہی تفصیلی بات کی۔"

"تو کیا کہا انہوں نے؟" اسفند کے لہجے میں بھرپور اشتیاق تھا۔

"وہ بہت خوش ہوئیں اور۔۔۔"

"اور خوش تو ہم بھی بہت ہیں۔" نیلم اور جیا نے اچانک کمرے میں انٹری ماری تو وہ دونوں چونک گئے۔

"کتنی بری بات ہے نیلم۔ دوسروں کی سن گن لینا۔" اسفند نے مصنوعی غصہ دکھایا۔

"لیں اتنی دیر سے خود پہ جبر کر کے محترمہ کے باہر آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور یہ ہیں کہ یہاں سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہیں۔"

"ارے بس جا ہی رہی ہوں۔" عرینہ نے باقاعدہ باہر کی طرف قدم بڑھائے تو جیا نے آنکھیں نکالیں۔

"واہ کیا ٹائم ہے باہر جانے کا ہم بھی تو ہم آئے ہیں۔" "اسی لیے تو جا رہی ہوں۔" عرینہ نے منہ چڑایا۔

"ان ہی کا سر کھاؤ۔ مجھے معاف رکھو۔" وہ مسکرا کر باہر نکل گئی جبکہ وہ تینوں ہنس دیے۔

✲ ✲

فاخرہ گل

مکمل ناول

کوئی تم سے پوچھے کون ہوں میں
تم کہہ دینا کوئی خاص نہیں
اک دوست ہے کچا پکا سا
اک جھوٹ ہے آدھا سچا سا
جذبات کو ڈھانپے اک پردہ
بس ایک بہانہ اچھا سا
جیون کا ایسا ساتھی ہے
جو دور بھی ہے اور پاس بھی
کوئی تم سے پوچھے کون ہوں میں
تم کہہ دینا۔۔۔کوئی خاص نہیں

ندی کی امی سے بات کرنے کے بعد اکمل کی بے چینی اپنے عروج پر تھی۔ ندی نے آج جو انتہائی قدم اٹھایا تھا اس کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا اور حالات اس کے حق میں پہلے سے بھی برے ثابت ہونے کا قوی امکان موجود تھا۔ ایسے میں اس کا یوں گھر سے باہر نکل کر شاہ زین سے ملنا کئی خطرات کو دعوت دینے کا سبب بھی بن سکتا تھا۔

معصوم چہرے اور شفاف آنکھوں والی ندی مسلسل اکمل کی نیک خواہشات کے حصار میں تھی۔ مگر ایک بات پر شرمندگی اکمل کو بھی ضرور تھی اور وہ یہ کہ اس کی اپنی سگی بہن حسد کی آگ میں جلتے ہوئے اسے اس کی غلطی سے بھی کہیں بڑھ کر سزا دلوانے پر تلی ہوئی تھی حالانکہ وہ ہمارا رب جو چاہے تو ہماری ذرا سی نافرمانی پر ہم پر تکلیفوں کے پہاڑ توڑ دے مگر اس کی ذات کو تو یہ گوارا ہی نہیں کہ کوئی اپنے گناہ سے بڑھ کر سزا کاٹے بلکہ اس کی رحمت تو اکثر ہماری کتنی ہی خطاؤں کو نظر انداز کر کے انہیں اپنی عطاؤں سے ڈھانپ دیتی ہے۔ ہماری سزا کو جزا میں بدل ڈالتی ہے۔ پھر ہم انسان آخر خود کو اختیار کی کون سی منزل پر سمجھتے ہوئے اپنے ہی جیسے انسانوں کو ان کے کردہ اور ناکردہ گناہوں کی آخری حد تک سزا دینے پر تل جاتے ہیں۔

خود کو کل اختیار کا مالک سمجھتے ہوئے ہم رب کریم کو کیوں بھولنے لگتے ہیں؟

ہم اُس دن کا تصور ذہن میں کیوں نہیں لاتے جب ہم پروردگار کے سامنے اپنی سزاؤں کی معافی کے لیے گڑگڑا رہے ہوں، بلبلا رہے ہوں اور تب ہمیں یاد دلایا جائے کہ اسی طرح کبھی ہم سے بھی کسی نے معافی مانگی تھی، اسی رب کے پاک نام کا واسطہ دیا تھا، مگر اس وقت ہم طاقت اور اختیار کے نشے میں دھت بدمست ہاتھی کی طرح تمام جذبات اور سب درخواستوں کو روندتے چلے گئے تھے محض اپنی ذاتی انا کے برج کو اعلا سے اعلا تر کرنے کے لیے۔۔۔

اور معاف کر دینے کے بجائے بدلہ لینے کو ترجیح دی تھی اور بدلہ بھی کیسا، ماشہ کے بدلے پورا چھٹانک۔

باوجود اس کے کہ دوسری طرف اس کی بہن تھی مگر اس کی مکمل حمایت ندی کے ساتھ تھی۔ جبھی ایک بار پھر اس کا دل چاہا کہ فون کر کے ندی سے بات کرے جو یقیناً اب تک گھر پہنچ گئی ہوگی مگر یہ جان کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ندی اس وقت تک گھر نہیں لوٹی تھی اور امی کی پریشانی کے باعث حلق سے آواز کا نکلنا بھی ایک مشکل امر معلوم ہو رہا تھا۔ ان سے بات کرتے ہوئے اکمل کا دل چاہا کہ کاش وہ

سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں ان کے پاس پہنچ پاتا۔ ندی اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگی یہ امر بھی اپنے نزدیک پریشان کن ضرور تھا مگر ان حالات میں امی کس طرح ایک ایک لمحے کو صدیوں پر محیط پا رہی ہوں گی، یہ بات بھی اکمل کو خاصا پریشان کر رہی تھی۔ امی اس وقت کس اعصاب شکن صورت حال

سے گزر رہی ہیں، یہ سوچ ہی اکمل کے لیے انتہائی دل گرفتگی کا باعث تھی۔ اچھا خاصا جوان بندہ بھی ایسی صورت حال میں شاید اپنے حواس پر قابو نہ رکھ پاتا اور امی جو تن تنہا اس ساری صورت حال کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

مٹھیاں بھینچتے ہوئے اور کچھ نہ سوجھا تو زوردار مکا تکیے پر ہی جڑ دیا۔ ڈرل وہ کر چکا تھا اور یہ ٹائم اس کی جاگنگ کا تھا مگر آج ٹریک سوٹ پہننے کا اہتمام کیے بغیر ہی محض چابی اٹھا کر باہر نکل آیا۔ برآمدے سے لانڈری کی طرف جاتے ہوئے بیٹ مین کو نبیل کے لیے پیغام دے کر اپنے جانے کے بارے میں بتایا اور اپنی واحد پناہ گاہ یعنی پارک کا رخ کیا۔

☆☆☆

عصر کی دھوپ دیواروں پر پڑی بے دلی سے اونگھ رہی تھی۔ کالونی میں لگے درخت اور پودے بھی خاموش کھڑے چپ چاپ یونہی بلا مقصد یہاں وہاں دیکھتے وقت گزارنے کے پابند تھے۔ ماحول میں ایک عجیب سا سکوت تھا۔ کالونی کے بچے عام طور پر شام کے اوقات میں اپنے اپنے اسکول کا ہوم ورک نبٹا لینے کے بعد اس وقت کھیلتے ہوئے نظر آ رہے ہوتے۔ ایک دوسرے کے گھر کی بیلز دی جاتیں، ٹیمیں سلیکٹ ہوتیں، کھیل منتخب کیے جاتے اور پھر کچھ دیر مل کر کھیلنے کے بعد انہیں ٹیموں میں دھڑے بازی ہوتی اور نئی ٹیمیں تشکیل پاتیں اور پھر یہی کھیل کو دو دیر تک چلتا رہتا۔

اختلاف رائے کے بعد جب نئی ٹیمز بنتیں تب بھی نہ تو کوئی شور و غوغا ہوتا اور نہ ہی لڑائی جھگڑا، یہی وجہ تھی کہ سب ہی مائیں اپنے اپنے گھروں میں بڑے ہی سکون اور بے فکری سے کاموں میں مصروف رہتیں۔

"اماں۔۔۔! آج باہر اتنی خاموشی کیوں ہے؟"

کیاریوں کے پاس موڑھا رکھ کر نیل کٹر کی مدد سے ناخن تراشتے ہوئے ثمینہ نے اماں کے آنے کی آہٹ محسوس کی تو بولی۔

"روزانہ اس وقت اتنی ہی خاموشی ہوتی ہے بیٹا!"

یہ وقت ان کا پودوں کے ساتھ گزرتا تھا جب ہی عقبی حصے سے چھوٹی سی پیڑھی اور ہاتھ میں کھرپی لے کر اس کے پاس آ بیٹھیں۔

"دراصل آج سے پہلے تم کبھی اس وقت یہاں آ کر بیٹھی ہی نہیں نا تو بھلا تمہیں کیسے اندازہ ہوتا۔"

اُن کی بات پر ثمینہ نے سوچا کہ سچ ہی تو ہے کہ آج سے پہلے وہ کبھی اس پہر یہاں بیٹھی ہی نہیں تھی آج پتا نہیں کیا جی میں آئی کہ یہیں بیٹھ کر ناخن تراشنے لگی۔

"ویسے اماں! ہمارا گھر بھی تو کتنا سونا سونا لگتا ہے نا۔۔۔ خاموش خاموش سا۔۔۔" گردن کو بائیں کندھے کی طرف گھماتے ہوئے اس نے اماں کو دیکھا۔

"آپ کو نہیں لگتا ایسا؟"

"لگتا تو ہے۔۔۔" انہوں نے بھی تائید کرتے ہوئے کیاریوں میں گر جانے والے پتے اٹھائے اور کیاری کے ساتھ ساتھ لگی تکونی سرخ اینٹ کے ساتھ رکھ دیے۔

"اور اسی لیے اس مرتبہ میں نے شاہ زین کی شادی کی بات چھیڑ دی ہے۔"

"بھائی کی شادی۔۔۔؟"

وہ ایک دم موڑھے سے یوں اچھل کر نیچے اتری گویا سانپ دیکھ لیا ہو۔

"واؤ اماں واؤ۔۔۔! مگر کب؟ کس کے ساتھ؟ کہاں؟ اور بھائی کو پتا ہے اس بات کا؟"

ثمینہ خوشی سے بے حال ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی بڑی خبر اور اماں اسے یوں سرسری لہجے میں سنا رہی ہیں۔ فوراً اپنا موڑھا گھسیٹ کر ان کے قریب کیا اور دھپ سے اس پر ایک بار پھر جو بیٹھی تو ان کے ہونٹوں پر رینگتی مسکراہٹ دیکھ کر انہیں پکڑ کر جھنجھوڑ ہی تو ڈالا۔

"بتائیں نا اماں! ساری بات بتائیں پوری تفصیل کے ساتھ۔"

"ارے بیٹا! ابھی تو صرف پہلا قدم اٹھایا ہے اور تم اس طرح جوش دکھا رہی ہو۔۔۔"

"ہاں تو بتائیں نا وہی پہلا قدم کون سا ہے؟"

ثمینہ نے ان کی بات کاٹی۔ تجسس واقعی قابل دید تھا۔

اور اس وقت اس کے ذہن میں سوالات یوں ٹھنسے ہوئے تھے گویا پوست کے ڈوڈے میں چھپنے کو خشخاش کے دانے۔

"تمہارے ابا کے ایصال ثواب کے بعد جب محلے کی خواتین یونہی بیٹھ کر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگی تھیں نا، تب میں نے اُن سے شاہ زین کے لیے رشتہ دیکھنے کا کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ میں شاہ زین کی شادی جلد کرنا چاہتی ہوں، اس لیے اگر کسی کی بھی نظر میں کوئی رشتہ ہو تو مجھے ضرور بتائے۔"

موتیے کے ننھے سے ناتواں پودے کو اون کے دھاگے کے ساتھ باندھ کر دھاگے کی گرہ امرود کے نسبتاً مضبوط پودے کے ساتھ لگا کر انہوں نے ثمینہ کو تفصیل سے آگاہ کیا۔

"اور بھائی۔۔۔؟ وہ جانتے ہیں یہ سب؟"

"نہیں۔۔۔ اور ظاہر ہے اگر اس سے بات کی ہوتی تو تمہیں بھی تو پتا چلتا نا۔"

"ہوں۔۔۔" مکمل توجہ اور دھیان ان کی بات پر دیتے ہوئے ثمینہ نے ہنکارا بھرا۔

"لیکن اماں۔۔۔! آپ کو کیا لگتا ہے کہ بھائی مان جائیں گے شادی پر؟"

"ان شاء اللہ ضرور مان جائے گا۔ مجھے بڑا اعتماد ہے اپنے بیٹے پر۔"

اُن کے لہجے میں شاہ زین کے لیے محبت بھرا فخر پانی سے بھرے بادلوں کی طرح ڈول رہا تھا۔ پیڑھی کو ذرا سا پیچھے کھسکا کر انہوں نے براہِ راست ثمینہ کو دیکھا۔

"اور پھر تم خود بھی تو سوچو نا کہ ندی تو اپنا گھر بسا چکی ہے، اللہ اُسے آباد رکھے مگر کیا ہم شاہ زین کو یونہی سوگوار چھوڑ دیں؟"

لمحہ بھر کے لیے وہ خاموش ہوئیں مگر ثمینہ نے گہری سانس لے کر محض اثبات میں سر ہلایا اور بدستور اُن کی طرف متوجہ رہی۔

"وہ میرے سامنے، میری خوشی کے لیے لاکھ اداکاری کیوں نہ کرے مگر ماں ہوں، جانتی ہوں کہ وہ یہ سب صرف مجھے خوش دیکھنے کے لیے کر رہا ہے ورنہ اس کا دل یقیناً بہت ناشاد ہے۔"

"ہاں اماں! اکثر مجھے بھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بھائی محض اوپری دل سے ہنس بول رہے ہوں۔" ثمینہ نے تائید کی۔

"بس اسی لیے تو میں چاہتی ہوں کہ اس کی زندگی میں کوئی خوش گوار تبدیلی آنی چاہیے جو اسے سب کچھ بھلا دے۔۔۔ سب کچھ۔۔۔!"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے، بھائی کو بھی تو اپنی زندگی خوش باش طریقے سے گزارنے کا پورا حق ہونا چاہیے نا، یہ تھوڑی ہوگا کہ اب وہ ساری زندگی بس اسے ہی یاد کرتے رہیں گے۔" اماں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"میں بھی دیکھوں گی اماں! ہو سکتا ہے ہمارے کالج میں ہی کوئی اچھی اور پیاری سی لڑکی مل جائے۔"

ثمینہ کے جذبات اب جوش کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ اماں بھی آنکھوں میں آنے والے دنوں کے خوش گوار ہونے کی امید لیے مسکراتے لبوں کے ساتھ گہری سانس لے کر بس اسے دیکھے گئیں۔

ثمینہ کا تو بس چلتا تو ابھی ابھی بیٹھے بٹھائے مہندی مایوں تک کے انتظامات ڈسکس کرنے لگتی ـــ کہ نرمین کے بیل دینے کے مخصوص انداز نے اس کے خیالات کو لمحہ بھر کے لیے بریک لگا دیا اور اپنی سوچوں کو تصوراتی آنکھ سے حال کا حصہ بنائے جب اس نے نرمین کے لیے دروازہ کھولا تو اسے پہلے کے برعکس ایک نئے زاویے سے دیکھا۔ گھنگھریالے بالوں اور سانولی رنگت والی نرمین، ثمینہ کو آج بے حد دلکش لگ رہی تھی اور اس کے انداز کو خود نرمین نے بھی محسوس کیا۔

"خیر تو ہے، آج تو لگتا ہے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو

مجھے۔"

"ہاں۔۔۔ نہیں تو۔۔۔ بس ویسے ہی۔"

چوری پکڑی جانے پر وہ بوکھلا کر پیچھے ہٹی اور اسے اندر آنے کے لیے رستہ دیتے ہوئے غیر ارادی طور پر اماں کی طرف دیکھا تو وہ بھی رخ پلٹے اس ہی کی طرف متوجہ تھیں اور یقینی طور پر اس کا ذہن پڑھ چکی تھیں۔

نرمین یوں بھی باتیں کرنے کی شوقین تھی۔ ثمینہ کو اکثر محسوس ہوتا کہ وہ اس کے پاس باتیں ہی کرنے آیا کرتی ہے کیونکہ پڑھائی کی طرف اس کا رجحان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکثر اوقات خود ثمینہ اسے کہہ کہہ کر کتاب کھلواتی مگر آج معاملہ کچھ مختلف تھا۔ آج تو ثمینہ خود اس سے باتیں کرنے کے انتظار میں معلوم ہوتی تھی۔ سو صوفوں پر بیٹھتے ہی یونہی اِدھر اُدھر کی دو ایک باتیں کرنے کے بعد اُس کے اور اس کی فیملی کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش تو اپنے تئیں ضرور کی مگر وہ ہمیشہ ہر سوال کے جواب میں کنی کترا جاتی اور اس کے اسی رویے سے جب ثمینہ کو محسوس ہوا کہ وہ اپنے یا اپنی فیملی کے متعلق کوئی بھی بات نہیں کرنا چاہتی اور آج جبکہ وہ باتیں کرنا چاہ رہی ہے تو خلافِ معمول نرمین خود کتاب کھول کر کچھ پڑھانے پر اصرار کرتے ہوئے پورے سال کی تعلیم ابھی ایک دو گھنٹوں میں حاصل کرنے پر مصر ہے تو لاشعوری طور پر ثمینہ کے ذہن میں نرمین سے ملنے کے بعد اس کے گھر تک آنے اور پھر آج تک کے تمام مناظر چلتی ٹرین کے بھاگتے مناظر کی طرح ذہن میں نمودار ہوتے اور اوجھل ہو کر نئے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کرتے نظر آئے۔

اور تب جو ایک بات ثمینہ نے نوٹ کی وہ یہ کہ اول روز سے آج تک نرمین نے صرف اور صرف اُس ہی کے بارے میں یا اس کے گھر اور گھر کے افراد کے بارے میں ہی بات کی ہے۔ وہ کون ہے؟ کتنے بہن بھائی ہیں؟ ابا کیا کام کرتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ اس نے اپنے بارے میں کچھ بھی تو شیئر نہیں کیا تھا۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ یا کچھ اپنی فیملی کے متعلق ہی سہی، مگر وہ اسے کچھ بھی کیوں بتانا نہیں چاہ رہی تھی۔ یہ بات ثمینہ کو نرمین کے متعلق بری طرح الجھائے جا رہی تھی۔

☆☆☆

اور کچھ دیر میں جب پھر میرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر! ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے

سرد ہوتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ ندی کی سماعتوں پر یہ جملہ برف بن کر برس رہا تھا۔ "ہاں بھئی، جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ کہتے ہیں کہ کسی لڑکی کا چکر تھا اور اپنا شاہ زین تو خود ہمارے ہاتھوں میں پلا بڑھا، انتہائی شریف بچہ ہے مگر وہ بدذات لڑکی شاید اس کے پیچھے پڑ کر زندگی تباہ کر گئی بے چارے کی، نیک نامی کو ایک داغ لگا اور گھر بھی چھوڑ گئے بے چارے۔۔۔ کسی بھلے مانس نے اس لڑکی کو سمجھایا تو اس بے چارے کو بھی یونیورسٹی سے نکلوا دیا اس بے غیرت نے۔"

ندی کے لیے ان کی باتیں سنتے ہوئے اپنے ہی پیروں پر کھڑا ہونا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ تھا اب اس کا معاشرے میں تاثر اور مقام۔

ایک اور خاتون بھی متجسس نظروں سے ان کے قریب آ کر کھڑی ہوئی تھیں اور گفتگو میں اپنا حصہ ڈالنا انہوں نے بھی ضروری خیال کیا۔

"لڑکی کے بھائیوں کو پتا چلا تو بجائے اس کے کہ وہ اپنی آوارہ لڑکی کو کسی کھونٹے سے باندھتے، اس بے چارے کی جان کے دشمن ہو گئے، مانو اکلوتا بیٹا ہے یہ اپنی ماں کا، اور ہے بھی بہت نیک اور سلجھا ہوا، بس اسی کم بخت نے بدنام کر دیا تو محلہ ہی چھوڑنا پڑا۔"

"ہاں ورنہ دیکھو تو شادی کے بعد میاں کے

ساتھ اسی گھر میں آئیں، دونوں بچے یہیں پیدا ہوئے، میاں کا کوئی رشتے دار بھی دیکھا نہ خود اُن کا، بس اسی محلے میں ہی سب کو اتنا پیار دیا کہ آج بھی اُن کی یاد آئے تو ساتھ گزرے دنوں کی یاد کر کے آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔"

دونوں خواتین ایک دوسرے کو مخاطب کر کے بات آگے بڑھا رہی تھیں۔

یوں بھی ندی آگے سے بھلا کیا سوال جواب کرتی اُس کا تو جسم سن اور زبان گنگ ہو چکی تھی۔ اسی دوران سامنے سے سبزی فروش ٹھیلے پر مختلف سبزیاں سجائے ایک ہاتھ سے اُن پر پانی کے چھینٹے مارتا اور دوسرے ہاتھ سے ٹھیلے کو آگے کی طرف دھکیلتے ہوئے صدا لگاتا گلی میں داخل ہوا تو اس کی آواز سننے کے ساتھ ہی فوراً چند خواتین گھروں سے نکل کر یوں ٹھیلے کی طرف لپکیں گویا دروازے کے عقب میں ہی کھڑی تھیں بس اس کی آواز لگانے کی منتظر تھیں اور یوں فوراً باہر نکل آنے کا مقصد یقینی طور پر تازہ سبزی کا حصول تھا۔

بھاؤ تاؤ کرنے کے بعد سبزی اپنی پلاسٹک کی ننھی سی ٹوکری میں ڈلوانے کے بعد ایک خاتون کی نظر غیر ارادی طور پر اُن پر پڑی تو سامنے کھیلتے بچے کے ہاتھ ٹوکری اپنے گھر کی طرف بھجوانے کے بعد اُن ہی کے پاس آ گئیں۔

ندی کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے اور باقی دو خواتین کی گفتگو سنتے ہوئے وہ بھی بولے بنا نہ رہ پائیں۔

"ہاں بھئی۔۔۔ باپ کے مرنے کے بعد پھر جس طرح اس لڑکے نے کم عمری میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھال کر اپنی شرافت سے نیک نامی کمائی تھی، اس لڑکی کی وجہ سے سب ملیا میٹ ہو گئی اور میرے حسنین کا دوست تو اسی یونیورسٹی میں ہے، کہہ رہا تھا وہ لڑکی تو ہے ہی ایسی۔"

خاتون نے اپنے بیٹے کے ذریعے ملنے والی معلومات شیئر کیں۔

ندی کا وجود اس وقت پتھر کا مجسمہ بنا سب کچھ سن رہا تھا۔ دیکھ رہا تھا مگر افسوس کسی بھی قسم کی حرکت کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی کیفیت سے بے خبر اب وہ تینوں خواتین اسے ہر طرح کی معلومات دینے پر بضد نظر آتی تھیں۔

"ہاں یہ سب تو ہے مگر اب تو ویسے ہی شاہ زین کی شادی کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔۔۔" شاہ زین کی شادی۔۔۔؟ کچھ دنوں کی بات۔۔۔؟

اس سے آگے وہ خاتون کیا کہہ رہی تھیں اور بعد میں آنے والی خاتون کیا پوچھے جا رہی تھیں، ندی کا دماغ تو جیسے سن ہی نہیں رہا تھا۔ ذہن اور دل ایک عجیب خانہ جنگی کا شکار معلوم ہوتے تھے۔ اُن میں ایک دوسرے کے خلاف ہی شاید جنگ چھڑ چکی تھی۔ وہ سب کچھ جو ہم جانتے ہیں اور وہ سب جو ہم محسوس کرتے ہیں اگر ایک دوسرے سے متضاد ہونے لگیں تو ذہن و دل میں چھڑنے والی جنگ اکثر اعصاب کا امتحان بن جاتی ہے۔ ندی کی آنکھوں کے سامنے ابھرتے سیاہ اور نیلے ننھے منے دائرے دن کی روشنی چھپانے لگے تو اس سے پہلے کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی ان ہی خاتون نے اپنی گفتگو کے دوران چونک کر اسے سہارا دیا۔

"بیٹا معاف کرنا، اتنی دیر سے ہم نے تمہیں یہیں کھڑا رکھا ہوا ہے، ثمینہ چلی گئی تو کیا ہوا، آؤ ہمارے گھر چلو کوئی چائے ٹھنڈا وغیرہ۔۔۔"

اُن کی کی گئی پیش کش پر ندی نے ایک ہاتھ سے سر دباتے ہوئے خالی الذہنی سے ان سب کو دیکھا اور انہیں حیران و متجسس چھوڑ کر بغیر کچھ کہے چپ چاپ انہی قدموں پر واپس مڑ گئی۔

من من کے قدم بڑھاتے ہوئے کیفیت وہی تھی جو کسی بھی جواری کی ہو سکتی ہے وہ بھی تب، جب وہ شرط میں اپنی زندگی ہی ہار جائے۔ مکڑی کی طرح جالے بنتی زندگی میں وہ ادھ مری مکھی کی طرح جالے کے اندر پھنس کر رہ گئی تھی۔ دماغ تھا کہ بالکل ماؤف۔۔۔ جس آخری اور واحد امید کے سہارے

اس نے انتہائی رسک لے کر گھر سے قدم نکالا تھا وہ امید تو پانی کے بلبلے کی طرح لحہ بھر میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اب زندگی اس کے ساتھ کیا سلوک کرنے والی ہے۔

اس بات کا خیال ذہن میں آتے ہی سوچ بس ایک دم رک کر رہ جاتی تھی۔ اس سے آگے تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

حالات نے جب جب اسے جلتے انگاروں کی بھٹی سے گزارا تھا تب تب ہی اسے خدا کے بعد صرف شاہ زین کا ہی خیال آتا۔ اسے یقین تھا کہ بس اس تک پہنچنے کی دیر ہے اور سب کچھ چٹکی بجاتے ہی گویا حل ہو جائے گا۔ مگر اب۔۔۔ اب جبکہ شاہ زین کی شادی ہونے والی ہے، وہ اس کی جگہ کسی اور کو دینے والا ہے تو اس کا کیا بنے گا جس نے شاہ زین کو ہمیشہ خود سے بڑھ کر چاہا۔۔۔

ندی کو خود اپنے آپ پر آج ترس آ رہا تھا۔ شاہ زین کی شادی کا خیال آتا تو لگتا دانتوں میں ریت گھس گئی ہو، آنسو تواتر سے چشمے کے عقب سے بہتے ہوئے سیاہ نقاب میں جذب ہونے لگتے۔ سبزی کے ٹھیلے والا دائیں ٹانگ پر بوجھل ڈالے بایاں پاؤں دائیں ٹانگ کے گھٹنے پر رکھے اسے دیکھتا ہوا کیا سوچ رہا ہے، سبزی لے کر گھروں کو لوٹتی عورتیں اُسے کس نظر سے دیکھ رہی تھیں، گلی میں صاف ستھری فراکیں پہن کر ننھی منی پونیاں سجائے بچیاں اسے منہ میں انگلیاں ڈالے دیکھتے ہوئے کیا سوچ رہی ہیں، ان باتوں کی نہ تو اسے کوئی فکر تھی نہ ہی خیال۔

اسے لگا تھا جیسے آج پھر ایک بار بابا اس دنیا سے رخصت ہوئے ہوں، آج پھر اسے اپنا آپ کسی تنکے کی مانند ہلکا اور ناتواں لگنے لگا تھا جسے وقت کی ہوا جانے کہاں کہاں اڑا کر لے جائے، کس کے قدموں میں مسل جانا مقدر ٹھہرے، یا یونہی ویرانے میں پڑا رہنا اور یا پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سفر ہی اس کا نصیب بنے۔

ماضی قریب میں کیے گئے شاہ زین کے خوب صورت محبت بھرے جملے وائلن سے بکھرتے حسین سُروں کی بازگشت بن کر ذہن کی فصیلوں سے سر پٹخ رہے تھے۔ آنے والے کل کا خوف اور بیتے کل کا دکھ اس کی دھڑکنوں کے لیے عجیب سا امتزاج بن کر ابھر رہا تھا۔ واپسی کا رستہ دیکھنے والی ماں کا کمزور وجود گھر میں منتظر نہ ہوتا تو شاید وہ دوبارہ گھر کا رخ نہ کرتی، اس کی منزل کوئی اور ہوتی لیکن اب بہر حال اسے اپنی مجسم دعا بنی ماں کے لیے ہی سہی گھر کو لوٹنا تو تھا۔ جہاں کل کی بولڈ اور آج کی بے غیرت کہلائی جانے والی ندی کے بخیریت گھر کو لوٹنے کے لیے ماں کی ہتھیلیاں آنسوؤں سے تر ہونے کے باوجود ابھی تک ملی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

"ہتھ جوڑا پکھیاں دا
نالے میرا پُت لگدا
نالے جانن اکھیاں دا"

آج صبح سے ملکانی سائیں کی زبان پر جو یہ فقرے ابھرے تو اب تک رواں تھے۔ جی بھر کے اپنے بیٹے، حویلی کے اکلوتے وارث اور اتنی بڑی جاگیر و جائیداد کے تنہا مالک میران پر پیار آ رہا تھا۔

اور بھلا پیار آتا بھی کیوں نا، آخر وہ اس کی شادی کی بات جو پکی کر چکی تھیں اور وہ بھی اس طرح کہ رشتہ لینے کے لیے بھی رسمی طور پر بھی لڑکی والوں کے گھر نہیں جانا پڑا تھا۔ سو مختلف ملازمین کو مختلف ہدایات جاری کرنے کے بعد اس وقت وہ "رومن کولوسیم" کی یاد دلاتے حویلی کے لمبے لمبے ستونوں کے درمیان کھڑی ظاہری طور پر تو حویلی کے وسیع و عریض باغ کے آگے گیٹ کے عین سامنے کھڑے توڑے دار بندوق والے چوکیدار کو دیکھ رہی تھیں جو اپنے لیے مخصوص کالی کرسی چھوڑے چوکس یوں کھڑا تھا گویا کسی طرف سے حملہ کیے جانے کی پیشگی اطلاع مل چکی ہو۔

اور ویسے بھی اب تو آہستہ آہستہ یہ خوش خبری پورے گاؤں میں پھیلتی جا رہی تھی کہ چھوٹے سائیں

کے سر پر سہرا سجنے والا ہے اور گاؤں بھی کوئی چھوٹا سا نہیں تھا، پرچون کے کھوکھے، دودھ دہی کی دکانیں، پٹواری، پتنگ والے، گنے کے رس کی ریڑھیاں، سائیکل کو پنکچر لگانے کی "ورکشاپس"، درزی، نائی الغرض کہ بنیادی ضرورت کی کافی اشیاء گاؤں ہی سے دستیاب ہو جایا کرتیں۔ اسکول شاہ سائیں نے بنوا دیا تھا اور دوا بیماری کے لیے روزانہ شام کو ایک ڈسپنسر آ جایا کرتا جس سے گاؤں کی اکثریتی آبادی چھوٹی موٹی بیماری کی دوا لے لیا کرتی۔ دوسری صورت میں شہر کا رخ کیا جاتا، مگر گاؤں کے رہائشی علاقے سے شہر تک جانے والی سڑک سے بس میں بیٹھنے کے لیے پہلے گاؤں سے چلنے والے تانگے یا چنگ چی رکشے کا سہارا لینا پڑتا کہ آبادی سے سڑک تک آنے کا رستہ بھی چار پانچ کلو میٹر سے کم تو ہر گز نہیں تھا۔

حویلی میں آج سے ڈھولکی بھی رکھی جانی تھی جس کی مکمل ذمہ داری کنیزاں کے سر پر تھی۔ آرائشی قمقموں سے بھرا ٹرک بھی کچھ ہی دیر میں پہنچا ہی چاہتا تھا جس نے نہ صرف حویلی کی چھت اور بیرونی دیواروں پر لائٹنگ کرنی تھی بلکہ باغ کو بھی روشنیوں سے سجانا تھا۔ یوں بھی سارے انتظامات محض ایک فون کال ہی کے تو منتظر تھے۔ شاہ سائیں بھی حویلی ہی میں موجود تھے اور خوش تھے۔

حویلی کے رسم و رواج کے عین مطابق پورے گاؤں میں "کچی روٹی" کی رسم آج ہی دوپہر کو ادا کی گئی تھی۔ جس کے مطابق ہر گھر کو ایک کلو گوشت اور اسی کا ہم وزن گڑ، چاول اور گندم دی جاتی تھی۔ یہ رسم ہر کوئی ادا نہیں کرتا تھا بلکہ حویلی کے مالکان یا ان ہی کے ہم پلہ لوگ اپنے بیٹوں کی شادی کے موقع پر خوشی کے طور پر تمام گاؤں والوں کو تحفے کے طور پر یہ سب کچھ بھیجا کرتے اور ملکانی سائیں کا بس چلتا تو ہر چیز دس دس کلو کے حساب سے تقسیم کرتیں۔ ساری حویلی میں موجود ملازمائیں بھی ملکانی کو اس قدر مسکراتے دیکھ کر کہ ان کے دانت بھی نظر آنے لگتے، حیرت کا شکار تھیں اور مسکراتی آنکھوں سے ایک دوسرے کو جو اشارے کرتیں تو خود بھی دوپٹے کے پلو میں منہ چھپا کر ہنسنے لگتیں۔

جس جگہ رات کو ڈھولک رکھ کر گانے گائے جانے تھے اور گاؤں سے خواتین نے آ کر بیٹھنا تھا وہاں خوب صورت نیلے رنگ کا ایرانی قالین ڈال کر تمام دیواروں کے ساتھ کشن بھی رکھے گئے تھے البتہ جو بیگمات دوسرے گاؤں سے آنے والی تھیں ان کے لیے خاص طور پر کو ہائی دیوان اس بڑے سے ہال میں رکھوا کر اطراف میں اطالوی کشن سیٹ کیے گئے تھے۔ ہال کے چاروں کونوں میں خشک میووں سے بھرے تھال موجود تھے اور چھت پر دائیں سے بائیں ترچھے انداز میں پھولوں کی لڑیاں لگا کر چھت پر کی گئی نقش و نگاری پر اعتماد ظاہر نہ کرتے ہوئے اسے مزید خوب صورت بنانے کی تگ و دو جاری تھی۔ گانوں کی تقریب میں شامل ہونے والی خواتین اور گھر آئے مرد حضرات اور ملازمین میں بانٹی جانے والی مختلف انواع کی مٹھائیاں، جلیبیوں اور بتاشوں سمیت حویلی میں ہی تیار کی جا رہی تھیں۔

سب کچھ بڑی خوب صورتی اور منصوبہ بندی کے تحت ہو رہا تھا۔ باوجود اس کے کہ شادی اچانک طے ہوئی تھی اس "اچانک" کا کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ شاہ سائیں بھی بڑے پرسکون انداز میں ڈرائنگ روم کے صوفوں پر عین دیوار پر ٹنگی چیتے کی کھال کے نیچے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ہاتھ میں جدید موبائل لیے "کونٹیکٹ لسٹ" میں سے مختلف نام دیکھ کر سامنے بیٹھے منشی چاچا کو لکھواتے جا رہے تھے۔

یہ وہ تمام نام تھے جنہیں شادی میں مدعو کرنے کے لیے دعوتی کارڈز ارسال کیے جانے تھے۔ برادری کے لوگوں کی لسٹ الگ تھی۔

اُدھر ملکانی سائیں بھی مطمئن انداز میں ہاتھ باندھے تمام کام ہوتے دیکھ رہی تھیں، کمی تھی تو صرف مہربانو کے آنے کی۔

جو ابھی حویلی میں ہونے والے اس جشن سے متعلق بے خبر تھی۔ ملکانی سائیں نے صبح اس سے بات

کرنے کی کوشش بھی کی جو اس کے کلاس میں ہونے کی وجہ سے ناکام رہی۔ اس لیے اب انہیں رات نو بجے کا شدت سے انتظار تھا کہ جب وہ اس سے بات کر پاتیں۔

سونی ہمیشہ کی طرح ان کے قدموں کے پاس ہی موجود تھی، جب میران کا فون آیا، وہ اپنی شادی کی خریداری کرنے گیا تھا کہ وہاں جا کر اسے مہربانو کا بھی خیال آ گیا۔ سو ناپ پوچھنے کے لیے فون کر ڈالا۔ اسے کچھ دیر بعد فون کرنے کا کہہ کر ملکانی سائیں مہربانو کے کمرے میں جانے کے لیے اندرونی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ شاہ سائیں نے اشارے سے منشی چاچا کو فی الحال باہر جانے کا اشارہ کیا اور ملکانی سائیں کو آنکھوں کے اشارے سے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا کہا۔

''خیر تو ہے شاہ سائیں؟''

اُن کے اس انداز پر ملکانی سائیں اُلجھ گئیں۔ تبھی آنکھوں کو سکیڑتے ہوئے صوفے پر بیٹھنے سے پہلے ہی سوال کیا اور پھر چادر سنبھالتے ہوئے سونی کو گود میں لے کر بیٹھیں۔

''کیا واقعی جو کچھ تم سوچ رہی ہو وہ ہو جائے گا؟''

بے یقینی ان کے لہجے میں کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہی تھی۔

''ناں تے اس میں مسئلہ کیا ہے؟''

وہ ابھی تک ان کی پریشانی اور تذبذب کی اصل وجہ تک نہیں پہنچ پائی تھیں۔

''میران کی حد تک تو چلو ٹھیک ہے اور میں خود یہ ہی چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی ایسی تبدیلی آئے جو اس کی زندگی کو مثبت راہ پر لے آئے مگر مہربانو۔۔۔'' وہ لحہ بھر کو رکے، اپنی سنہری باریک سے فریم والی انتہائی نفیس عینک اتار کر صوفے پر ہی دائیں طرف رکھی، انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کی پوروں سے لحہ بھر کے لیے آنکھوں کو ہلکا سا دبایا اور پھر گہری سانس لے کر بولے۔

''مہربانو کی زندگی کے لیے تو میں نے بہت سے خواب دیکھے تھے۔ اسے اعلا تعلیم دلوا کر ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا میں۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر اب یوں اچانک اس کی شادی کا معاملہ چھیڑ کر تم نے تو خود میرے اندر جنگ چھیڑ دی ہے تو خود سوچو مہربانو کا کیا ردِعمل ہوگا۔۔۔''

''کوئی ردِعمل، شدِعمل نئیں ہوگا شاہ سائیں! آخر کو وہ میری بھی تو بٹی ہے نا، ناں کیا خیال ہے آپ کا، میں اودے لئی اچھا نئیں سوچ رہی۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں یہ سب کیوں کہہ رہا ہوں۔''

''آہو، پتا ہے مینوں، پر تسی اے بھی تو دیکھو نا کہ رحمٰن شاہ دے علاوہ اس کے جوڑ کا کوئی اور ہے بھی تو نہیں نا۔''

''رحمٰن شاہ اور اس میں تمہیں کوئی فرق نظر نہیں آتا؟''

شاہ سائیں، ملکانی کے اس انداز پر تڑپ ہی تو اٹھے تھے۔

''پورے اٹھارہ سال کا فرق ہے دونوں میں، اور اگر رحمٰن شاہ نے ابھی تک شادی نہیں کی تو اس کا کیا مطلب ہے کہ وہ دودھ پیتا بچہ یا کوئی کم عمر نوجوان ہے اب تک؟ ہماری مہربانو سے اٹھارہ سال بڑا ہے وہ۔۔۔ پورے اٹھارہ سال۔۔۔''

سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے شاہ سائیں نے آخری جملہ تقریباً چباتے ہوئے ادا کیا۔ مگر آج ملکانی سائیں پہلے کی طرح فرماں برداری کے موڈ میں قطعاً نہیں تھیں۔

''تے شاہ سائیں! ایہہ کوئی نویں بات تے نئیں ہے نا ہماری برادریوں میں، پہلے دن سے ایہو ای ہوتا آ رہا ہے، جس کا جوڑ نئیں، اسے تے فیر انتظار کرنا ہی پڑتا ہے نا، چاہے اٹھارہ سال ہو یا وی (بیس) سال۔۔۔''

''کس کا اتنا جگرا ہے کہ گھر کی جائیداد باہر لوکاں میں جا کر دے آئے۔''

اضطراب کے عالم میں شاہ سائیں نے سگار سلگا لیا تھا۔

''رحمٰن شاہ کو تو ساڈی جیداد (جائیداد) میں سے آنہ وی نئیں چاہیے، وہ تے کہتا ہے کہ صرف ویاہ کر دو میرا اور بس۔۔۔ میں تے ابھی تک مہربانو کے آنے اور آپ کی طرف سے ہاں کے انتظار میں ہوں ورنہ میران وی راضی ہے ایس رشتے پر، کہتا ہے اگر ابھی مہربانو کی شادی نا کی تے فیر سبطین کے جوان تک انتظار کرنا پڑے گا مہربانو کو۔۔۔ تے او وی کم از کم پندرہ نئیں تے بارہ سال ضرور۔''

ملکانی سائیں اپنے تئیں شاہ سائیں کو اس شادی کے نہ ہونے کی صورت میں تمام سائڈ ایفکٹس سے آگاہ کر رہی تھیں مگر ان کے چہرے پر ابھی تک ملکانی سائیں کے دلائل کے حق میں تائیدی تاثرات نہیں ابھرے تھے۔

''پتا ہے نا، ہماری عمروں میں بھی کتنا فرق ہے؟''

ملکانی سائیں نے خاموشی اختیار کرتے ہوئے اُن کی طرف توجہ مرکوز رکھی۔

''اور عمروں کے اس واضح فرق نے ہم سے اس ایک دفعہ ملنے والی زندگی کو ایک دفعہ بھی ڈھنگ سے جینے نہیں دیا۔ ان سب کے باوجود میں نے گو کہ تمہارے تمام حقوق پورے کیے، ہر ضرورت کا خیال رکھا مگر تمہارے اندر تحفظ کی کمی کا احساس جو پہلے دن سے تھا اسے ختم نہیں کر پایا۔''

ملکانی سائیں نے سر جھکا کر سونی کو خود سے مزید قریب کیا۔

''اور اس کی بڑی وجہ شادی کے ابتدائی سالوں میں میرا وہ رویہ تھا جس میں، میں تم سمیت سب کو اپنی خوشیوں کا قاتل سمجھا کرتا تھا کہ ساری عمر میں تمہیں عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا آیا تھا اور اسی طرح جیسے آج تم میران کی شادی کے موقع پر مہربانو کی زندگی کا صفحہ بھی الٹنا چاہتی ہو نا، بالکل اسی طرح جب حیدر بھائی نے حویلی کی تمام روایات سے بغاوت کرتے ہوئے اپنی پسند سے شادی کر لی اور ابا سائیں نے انہیں ان کی بیوی سمیت سب ملازموں کے سامنے بے عزت کر کے حویلی سے نکال دیا تو انہیں میری فکر نے آ لیا کہ کہیں میں بھی حیدر بھائی کی تقلید نہ کر بیٹھوں اور ہم دونوں کی شادی کر دی گئی، مگر۔۔۔ مگر تم خود سوچو کیا ہم نے اپنی زندگی خود گزاری ہے؟''

وہ ملکانی سائیں کے جواب کے انتظار میں لحہ بھر خاموش ہوئے مگر کوئی جواب نہ پا کر پھر سے بولے۔ سگار البتہ اُن کے لفظوں کی روانی کے باعث ابھی تک نظر انداز ہو رہا تھا۔

''صرف میری حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کے لیے تم نے ایک کل وقتی ملازم آج تک میرے تعاقب میں رکھا، صرف اس لیے کہ ہمارا رشتہ بے یقینی کا شکار تھا۔'' ملکانی سائیں اس انکشاف پر بے اختیار چونکیں اور یہ حقیقت کھلنے پر کہ شاہ سائیں یہ سب جانے کب سے جانتے ہیں چور سی بن گئیں۔

''تمہیں خوف تھا کہ عمروں کے اس واضح فرق کے باعث ایسا نہ ہو کہ میں اپنی کسی ہم عمر کو اپنا لوں۔۔۔ اور اکثر اوقات میں جان بوجھ کر اسے تمہارے سامنے شکایتیں لگانے کا موقع بھی دے ڈالتا اور وہی بات پھر اخباروں تک کیسے پہنچتی، مجھے سب معلوم تھا۔''

مسکراتے ہوئے انہیں اب سگار کا خیال آیا تو اس کا کش لے کر گہری سنجیدگی سے بولے۔

''دیکھو، میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو، ہمارے معاملے میں بات اور تھی اور اب جو کچھ تم کرنا چاہتی ہو اس میں رحمٰن شاہ ہماری بٹی پر حاکم قرار پائے گا، جب تم عورت ہو کر مجھ پر شک کر سکتی ہو تو خود سوچا نا کہ رحمٰن شاہ کس طرح کا رویہ رکھے گا ہماری پھول سی مہربانو کے ساتھ۔''

شاہ سائیں کو لگا کہ شاید اُن کی باتوں نے ملکانی سائیں کے ذہن پر ٹیسو کے پھول کا سا رنگ دکھانا شروع کر دیا ہے مگر اس کے باوجود ان کے چہرے کا

اضطراب شاہ سائیں کو چونکائے دے رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر ہمت نہیں کر پا رہیں، لفظوں کے جوڑ توڑ میں مصروف ملکانی سائیں کی طرف سے کچھ بھی کہنے کا تھوڑی دیر تو انہوں نے انتظار کیا پھر یہ خاموشی برداشت نہ ہو پائی تو یوں بول اٹھے۔

"کیا بات ہے؟ کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں شاہ سائیں! مسئلہ تے کوئی نہیں او دراصل۔۔۔۔"

سگار کا کش گہرے سے گہرا ترین ہو گیا۔

"او دراصل پائی قربان شاہ نے رحمن شاہ کو زبان دے دی ہے، ہاں کر دی ہے انہوں نے ایس رشتے تے۔"

ملکانی سائیں نے تھوک نگلنا چاہا مگر خشک پڑتے حلق میں جیسے سارے غدود خاردار جھاڑیوں کی طرح یک لخت تن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ نئی نویلی دلہنوں کی طرح سر جھکائے ملکانی سائیں خود میں اتنی ہمت موجود نہیں پا رہی تھیں کہ شاہ سائیں کا سامنا کر سکتیں، جن کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ سگار کے دھوئیں میں بڑا کمزور اور نحیف سا تاثر دے رہا تھا۔

☆☆☆

اس وقت تو یوں لگتا ہے اب کچھ بھی نہیں ہے
مہتاب نہ سورج نہ اندھیرا نہ سویرا
آنکھوں کے دریچوں میں کسی حسن کی جھلکن
اور دل کی پناہوں میں کسی درد کا ڈیرا
ممکن ہے کوئی وہم ہو ممکن ہو سنا ہو
گلیوں میں کسی چاپ کا اک آخری پھیرا
شاخوں میں خیالوں کے گھنے پیڑ کی شاید
اب آ کے کرے گا نہ کوئی خواب بسیرا
اک بیر نہ اک مہر نہ اک ربط نہ رشتہ
تیرا کوئی اپنا نہ پرایا کوئی میرا
مانا کہ یہ سنسان گھڑی سخت کڑی ہے
لیکن میرے دل! یہ تو فقط ایک گھڑی ہے
ہمت کرو جینے کو ابھی عمر پڑی ہے۔

شاہ زین جس طرح خلوص اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا، ایسے میں کام کا روز بروز بڑھنا کوئی اچنبھے کی بات ہرگز معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ذاتی طور پر وہ تمام ورکرز کے کام کو جس طرح سپروائز کرتا وہ بھی سمجھ گئے تھے کہ اُن پر تعینات یہ ہیڈ واقعی کام کروانا چاہتا ہے۔

یوں بھی کہیں بھی نظر دوڑائی جائے تو مزدور یا ورکرز یا کارکنان ہمیشہ جان توڑ اور خلوص دل سے محنت کرتے ہیں مگر بدنصیبی سے اگر اوپری سطح پر موجود لوگ ہی بے دیانت ہو جائیں تو اُن کا کیا گیا تمام کام رائیگاں جاتا ہے۔

اور شاہ زین کے معاملے میں تو دوہرا اصول کارفرماں تھا کہ وہ محنتی اور ایمان دار بھی تھا اور پھر اسے پرانی یادوں کو بھلانے کے لیے بھی آخر کچھ درکار تھا۔ جبھی اپنے کام کرنے کے اوقات میں مکمل دل جمعی سے یوں مصروف رہتا کہ غالب گمان گزرتا کہ وہ یہاں ایک تنخواہ دار طبقے سے تعلق رکھنے کے بجائے مالک ہے اور یہی وجہ تھی کہ اب شاہ زین Casual Wear کے ساتھ ساتھ فارمل ڈریسز کے نصف شعبے کو بھی ہیڈ کر رہا تھا اور یہ اضافی ذمہ داری شاہ سائیں نے اس سے پہلی ملاقات اور اس کے متعلق رپورٹ پڑھنے کے بعد لگا کر تنخواہ میں بھی اضافہ کیا تھا۔

اس روز ابھی وہ پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کا وزٹ کر کے لوٹا ہی تھا کہ انٹر کام کے ذریعے اسے اطلاع ملی کہ شاہ سائیں فیکٹری کا سرپرائز وزٹ کر رہے ہیں اور اُن ڈیپارٹمنٹس کی طرف آنے والے ہیں جن کی ذمہ داری شاہ زین کو سونپی گئی ہے۔ اطلاع ملتے ہی شاہ زین نے ایک نظر سامنے ترتیب وار رکھی فائلوں کو اور پھر انٹر کام کو دیکھا جس کے ہی ذریعے اسے یہ اطلاع خیر خواہی کے طور پر پہنچائی گئی تھی تاکہ وہ "چوکنا" رہے۔ مگر اس کے ذمہ لگائے گئے تمام کام بڑی خوش اسلوبی سے چل رہے تھے اس لیے بے فکر ہو کر معمول کے مطابق کاموں میں مصروف ہو گیا اور

بجائے اس کے کہ تسلسل رہتا سامنے رکھے میگزین میں موجود سیاہ رنگ کے دلکش اور دیدہ زیب ڈریس کو دیکھ کر ایک بار پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے ندی کا سراپا گھوم گیا۔

یوں بھی عشق حقیقی ہو یا مجاز، اس کی حدود ہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں پر خود اپنی ذات پر سے اختیار کی حد ختم ہو جائے۔

اور ندی کے لیے شاہ زین کی محبت یقینی طور پر عشق کے درجے پر پہنچ چکی تھی جبھی تو چاہنے نہ چاہنے کے باوجود اور اکثر اوقات لاشعوری طور پر بھی اسے سوچا کرتا۔ شاید وہ چند لمحے اور اسی لباس کے ساتھ ندی کے تصور میں گم رہتا کہ ہلکی سی دستک کے ساتھ ہی کھل جانے والے دروازے کی آواز پر چونک گیا۔ سامنے شاہ سائیں موجود تھے، ہمیشہ کی طرح اکیلے، اُن کا ماننا تھا کہ چونکہ ہر بندے کی اپنی عزت نفس ہوتی ہے اس لیے اگر وہ کسی کو فرائض سے کوتاہی پر سرزنش بھی کرنا چاہتے تو کوشش کرتے کہ اکیلے میں کی جائے تاکہ سامنے والے کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور یہی وہ بنیادی وجہ تھی جس کے باعث وہ ہمیشہ سرپرائز وزٹ عہدیداران کے بغیر ہی کیا کرتے۔

شاہ زین انہیں دیکھتے ہی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہاتھ آگے بڑھا کر مصافحہ کیا گیا اور شاہ سائیں کے اشارے پر دونوں بانشست ہوئے۔ تنقیدی نظروں سے انہوں نے اس کے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر "ہوں" کرتے ہوئے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔ شاہ زین کو آج شاہ سائیں کا سرپرائز وزٹ جانے کیوں خانہ پری لگ رہا تھا ورنہ اس سے پہلے تو وہ آ کر فائلز چیک کرتے، ڈیلی بیسز پر لکھی گئی رپورٹس دیکھتے، مختلف ورکرز کے بارے میں پوچھتے، مشینوں پروڈکشن ہوتی وغیرہ۔۔۔ مگر آج تو وہ بہت خاموش خاموش اور سرسری سا انداز اپنائے ہوئے تھے۔

"شاہ زین۔۔۔!"

"یس سر۔۔۔!"

اسے یوں لگا تھا جیسے شاہ سائیں نے اسے پکارا نہ ہو بس خود کلامی کی ہو، مگر ظاہر ہے کہ اسے تو جواب دینا ہی تھا اور اس کے جواب دینے پر ہی شاید شاہ سائیں کو لگا کہ جیسے وہ بے دھیانی میں اسے پکار بیٹھے ہیں۔

عجیب ادھورا اور غیر ضروری سا سوال کیا تھا انہوں نے جس کا جواب شاہ زین نے یوں دل چسپی سے دیا گویا وہ اسٹاک ایکسچینج کے شیئرز کی بات ہو۔

"جی سر بالکل، تمام لوگ بہت محنت اور خلوص کے ساتھ کام کرتے ہیں اور تقریباً سبھی ورکرز گھنٹوں کا کام منٹوں میں کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔"

"ہوں۔۔۔ ویری گڈ، تم خود بھی تو بہت محنتی ہو۔"

"شکریہ سر! مگر میں اکیلا بھلا کیا کر سکتا تھا اگر باقی سب میرا ساتھ نہ دیتے تو۔"

"کیوں؟ اکیلا انسان کچھ نہیں کر سکتا کیا؟"

"سر! علامہ اقبال بھی تو یہی کہہ گئے ہیں نا کہ
؎ موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
جب تک دوسرے ساتھ نہ دیں اکیلا چنا تو سر! بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا نا۔"

"ہاں بات تو تمہاری ٹھیک ہے لیکن مثبت انداز میں، اگر یہی بات دوسرے زاویے سے دیکھی جائے ملکی سطح پر یا گھریلو سطح پر، تو ایک منفی ذہن کا مالک انسان ہی سارا گھروندہ گرانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔"

"یس سر! بات تو آپ کی بالکل ٹھیک ہے۔" شاہ زین نے بھی تائید کی تھی۔

"ملکی اور گھریلو سطح پر بھی تباہی کے لیے ایک ہی شخص بہت کچھ کر سکتا ہے۔"

"تمہارا تجربہ ہے یہ سب یا پھر مشاہدہ؟"

اُن کے اس ذاتی سوال پر اس کے لبوں پر وہی دھیمی سی مسکراہٹ ابھری جو اس کا خاصہ تھی۔ شاہ سائیں آج کی ملاقات میں اسے نہایت ان فارمل لگ رہے تھے مگر شاہ زین بھلا کب کسی پہ کھلتا تھا سو بات کا زاویہ بدلنے کی کوشش کی۔

”سر! یہ سب تو ہماری دنیا میں بہت کامن ہے اور ہر بندہ ہی اس کا شکار بھی۔“

”ہوں۔۔۔“ شاہ سائیں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”تمہاری ڈگری تو ادھوری رہ گئی تھی نا شاید۔۔۔“ اٹھنے کا ارادہ کرتے کرتے وہ ایک بار پھر بیٹھ گئے تھے۔

”یس سر۔۔۔!“

”لیکن کیوں؟“

شاہ سائیں کے سوال پر شاہ زین کے لیے یہ اندازہ لگانا بے حد مشکل ہو گیا تھا کہ آیا وہ تمام معاملے سے باخبر ہیں یا نہیں۔

”کیا فیس وغیرہ کے اخراجات کا مسئلہ تھا؟“

اُن کے سوال سے شاہ زین کو لگا جیسے وہ واقعی سارے قصے سے لاعلم ہیں۔

”نہیں سر! اخراجات کا تو ایسا مسئلہ نہیں تھا، بس ذرا یونیورسٹی میں ڈسپلن کا کچھ ایشو ہو گیا تھا جس کی وجہ سے ذرا پرابلم ہوئی۔“

”دنیا میں تعلیم سے بڑھ کر کوئی چیز قیمتی نہیں ہے، کوشش کرو کہ اپنی ڈگری کو حاصل کر لو، اس سے تمہارا سیلری اسکیل بھی امپروو ہو سکتا ہے۔“

”یس سر۔۔!“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ پہلے اس جنون میں پڑھ رہے تھے کہ اچھی نوکری ملے گی اور اب چونکہ نوکری تو آل ریڈی مل چکی ہے اس لیے بس avoid کر دیا۔“

وہ مسکرائے، شاہ زین بھی ان کے سامنے ظاہری طور پر تو فارمل تھا مگر ذہنی طور پر اب بے حد ریلیکس اور دوستانہ انداز میں بڑی سہولت سے جواب دیے جا رہا تھا۔

”نہیں سر! ایسا تو ہرگز نہیں تھا، میری والدہ کی زندگی کی یہ بہت بڑی خواہش ہے کہ میں اعلا تعلیم حاصل کرتا۔“

”اولاد کا تعلیم یافتہ ہونا بھی تو نصیبوں کی بات ہے۔“

”جی سر۔۔! ورنہ وہ بھی لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس دولت و آسائشوں کی فراوانی کے باوجود تعلیم نہیں ہوتی۔ بچوں کو اعلا تعلیم یافتہ دیکھنا ان کی خواہش سے حسرت میں بدل جاتا ہے، ہوتا ہے نا ایسا؟“ انہوں نے سوال کیا۔

”اسی لیے تو کہا جاتا ہے نا کہ علم نصیب سے ملتا ہے روپے پیسوں اور اثر و رسوخ سے نہیں۔“

”ہاں سچ کہہ رہے ہو بلکہ بالکل سچ۔“

اس کی بات پر شاہ سائیں کے چہرے پر سے جیسے کوئی تاریک سایہ لرزتے ہوئے گزرا۔ مہربانو اور میران کو اعلا تعلیم دلوانا ان کی بہت بڑی خواہش تھی اور اسی لیے تمام لوگوں کی مخالفت مول لینے کے باوجود انہوں نے مہربانو کو پڑھنے کے لیے گھر سے اتنی دور بھیجا مگر اب پھر لگتا تھا کہ ان کی خوشیوں کا قتل ہونے جا رہا ہے۔ میران سے یوں بھی انہیں کوئی توقع نہیں تھی کہ وہ دوبارہ یونیورسٹی جاتا اور مہربانو کو ایک دفعہ کھلے آسمان میں پرواز کروانے کے بعد پھر سے پنجرے میں قید کرنے کا جو اندیشہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اس کی وجہ سے شاہ سائیں انتہائی متفکر تھے، جب ہی تو بس یونہی شاہ زین سے اتنی زیادہ باتیں کیے گئے اور وہ بھی یوں جیسے پہلے سے دونوں میں گپ شپ رہتی ہو۔ روشن روشن سرمئی آنکھوں والے شاہ زین سے بات چیت کے دوران انہیں لحہ بھر کے لیے بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ وہ اس سے اسی انداز میں بات کر رہے تھے جیسے حویلی میں بیٹھے میران سے کر رہے ہوں۔

لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ جس طرح شاہ زین نے ان کی بات کے رخ کو سمجھتے ہوئے جواب دیے تھے، میران کے جوابات ان سے قدرے مختلف ہوتے، اپنے ننھیال والوں کی طرح اس کے دماغ میں ”اعلا“ ہونے کا جو کیڑا پل رہا تھا اس کے باعث ہی وہ کبھی بھی تعلیم کو اپنی اوائل ترجیحات میں نہیں رکھ پایا تھا اور اس کی اسی عادت پر شاہ سائیں کو اختلاف ہوتا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے ڈگری کے بغیر بھی معاشرے میں ایک اعلا مقام حاصل ہے۔ شاہ سائیں سے نسبت کی وجہ سے عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ آتے جاتے لوگ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں اور بھلا اسے کیا چاہیے تھا۔ الیکشن میں بھی کھڑا ہوتا تو آبائی حلقے سے جیت جانے میں کوئی شک نہیں تھا اور بس اسی لیے وہ مطمئن تھا۔ راہ چلتے کسی بھی شخص کی بے عزتی کر دینا، خلافِ پسند کسی بات پر طوفان کھڑا کر دینا، یاروں، دوستوں کا خوشامد کرنے میں تھرڑا ہجوم اپنے ساتھ رکھنا، یہی اس کی زندگی تھی اور اسی میں وہ بے حد خوش بھی تھا۔

”بہت اچھا لگا آج تم سے تھوڑی دیر بات کر کے۔“

”اٹس مائی پلیژر سر!“

بازوؤں پر زور ڈال کر کرسی سے اٹھتے ہوئے شاہ سائیں نے کہا تو شاہ زین اُن کے کمنٹ پر مسکرا دیا۔

”ہوپ ٹو سی یو سون اگین۔“

”ہوپ فلی۔۔“

الوداعی مصافحے کے بعد وہ رخصت ہوئے تو اب شاید سوچنے کی باری شاہ زین کی تھی۔ آج کا سرپرائز وزٹ اسے واقعی سرپرائز ہی تو دے کر گیا تھا۔ اُن کا ایک سخت گیر قسم کا جو تاثر سارے لوگوں کی طرح شاہ زین کے بھی ذہن میں قائم تھا آج تو وہ اس تمام تاثر کی نفی کر گئے تھے۔

اُن کی بول چال، مسکرا کر دیکھنے کا انداز اور کسی لمحے تفکر آمیز لہجہ۔۔۔

یہ سب کیا تھا؟ اس طرح تو بندہ صرف اپنوں کے سامنے ہی ظاہر ہوتا ہے دوسروں کے سامنے کوئی اپنے دکھ درد بھلا کہاں شیئر کرتا ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے آگے جس کی حیثیت ان کے نزدیک ایک تنخواہ دار ملازم سے زیادہ ہرگز نہ ہو، کوئی بھلا کیوں اپنا دل کھولے گا۔ وہ اپنی اولاد کی وجہ سے پریشان ہیں یہ تو شاہ زین نے اندازہ لگا لیا تھا مگر کیوں پریشان ہیں؟ اتنا مال و دولت اور معاشرے میں ایک نمایاں مقام رکھنے والے انسان کا لہجہ بات کرتے کرتے ڈھے کیوں جاتا تھا؟ اور کیا وہ کسی بھی طریقے اُن کے کام آسکتا تھا؟ یہ سب باتیں اس کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں۔ ان کے آتے وقت مصافحہ کرنے کے انداز میں اور الوداعی مصافحہ کرنے میں بہت فرق تھا۔

یوں بھی اگر غور کیا جائے تو ہم کسی کے ملنے کے انداز سے ہی اس کے دل میں اپنی حیثیت کو بخوبی جانچ سکتے ہیں اور جاتے ہوئے جس طرح گرم جوشی سے انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا وہ انداز اب تک شاہ زین کے دل میں ان کی محبت کو بڑھائے دے رہا تھا۔ اپنے والد کی وفات کے بعد سے اب تک اس کا دل یوں کبھی کسی کے لیے نہیں ہمکا تھا۔ مگر آج تو دل چاہ رہا تھا کہ جب انہوں نے ہاتھ ملایا تھا کاش ایک دفعہ گلے بھی لگا لیتے۔ مگر اپنی اس خواہش پر وہ گردن جھٹک کر خود ہی زیرِ لب مسکرا دیا۔

یہ دل بھی بعض اوقات کیسی کیسی خواہشات کرنے لگتا ہے، مٹھی میں پانی کو بند کر لینے کی خواہش اور جستجو میں چاہے انگلیوں کی پوریں اور ہتھیلی نرم ہو کر جھریوں میں بدل جائیں، جب تک دماغ کی طرف سے ڈانٹ ڈپٹ نہ ہو، منہ زور گھوڑے کی طرح رسی تڑائے اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے بس سرپٹ بھاگتا ہی چلا جاتا ہے اسی لیے کامیاب کہلائے جاتے ہیں وہ لوگ جو ہمیشہ اپنے دل کی فیصلوں پر عقل کو حاکم قرار دے دیں۔

☆☆☆

کیسی خوشی کہاں کی ہنسی کیسا اختلاط
ہم کو نہ چھیڑو تم کہ اب وہ ہم نہیں رہے

ندی کی امی سے بات کرنے سے لے کر اب تک اکمل کا وقت گویا کانٹوں پر گزر رہا تھا۔ ندی اب تک واپس گھر پہنچ چکی ہے کہ نہیں؟ اس کی شاہ زین سے یا اُس کے گھر والوں سے ملاقات ہوئی کہ نہیں؟ اگر ملاقات ہو گئی ہے تو پھر نتیجہ کیا رہا؟ یہ تمام سوالات

اسے کسی طور چین لینے نہیں دے رہے تھے۔ وجہ اس کے اور ندی کے درمیان تعلق تھا جو بچپن سے چلا آرہا تھا اور جس کے باعث وہ ذہنی طور پر اتنے نزدیک تھے کہ جب درمیان میں کچھ عرصے کے وقفے کے بعد ملاقات ہوئی تب بھی ایسا ہی لگا گویا بیچ میں وہ عرصہ آیا ہی نہ ہو ندی اسی طرح شوخ و شنگ تھی اور اکمل اسی طرح زندہ دل۔۔۔

فرق تھا تو بس اتنا کہ اکمل باقی گھر والوں کے سامنے ذرا محتاط رویہ اپنانا چاہتا تھا مگر اس کے ارادے کو ندی کے برجستہ جملوں نے بھلا کہاں پورا ہونے دیا تھا، مگر یہ بھی حقیقت تھی کہ اس وقت اکمل کا دل سچا دوست ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے بے حد پریشان تھا اور یہی وجہ تھی کہ آج وہ خلافِ توقع جاگنگ کرنے کے بجائے جاگنگ ٹریک کے اطراف میں بنی ایک سنگی بینچ پر بیٹھا تھا۔

کبھی دل چاہتا کہ فون کرکے ندی کے بخیریت واپس آنے کی یقین دہانی کی جائے، مگر وہ یوں بار بار فون کرکے امی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا، وہ بھی ایسی صورت میں کہ اگر وہ اب تک گھر نہ پہنچی ہو، عجیب کشمکش تھی۔

دانت بھینچتے ہوئے اس نے پوری قوت سے دائیں ہاتھ کا مکا بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر مارا۔ رہ رہ کر ایک ہی خیال دامن گیر تھا کہ ندی کی وجہ سے وہ اس قدر پریشان ہے تو ان حالات میں خود ندی اور اس کی امی کی ذہنی حالت کس قدر مخدوش ہوگی۔

آتے جاتے لوگوں سے بے نیاز شاید وہ دیر تک ندی ہی کے بارے میں سوچتے ہوئے کسی بھی ممکنہ حل تک پہنچنے کی کوشش کرتا کہ جیب میں رکھے موبائل کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ سامنے ایک اجنبی نمبر موجود تھا۔ چند لمحے رک کر اکمل نے نمبر کو ذہن میں دوہرایا۔ مگر پھر بھی خیال میں کوئی شناسائی نہ ابھری اور بیلز مسلسل بجتی رہیں تو اکمل نے فون ریسیو کرنے کا فیصلہ کیا مگر دوسری طرف مکمل طور پر نامانوس آواز نے اسے حیرت سے دوچار کردیا اور حیران ہونے کی بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ آواز نسوانی تھی اور اس سے واقف بھی۔

"معاف کیجیے گا، میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"ہاں، وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن کیا تم اکمل ہی بات کررہے ہو نا؟"

اکمل کے الجھن بھرے لہجے میں کیے گئے سوال کے جواب میں آگے سے انتہائی مطمئن انداز میں جواب آیا تھا۔

"جی ہاں محترمہ! میں اکمل ہی ہوں اور آپ کا تعارف؟"

ایک تو وہ پہلے ہی پریشان تھا اور سے یہ "آ سہیلی بوجھ پہیلی" جیسی فون کال اسے زچ کیے دے رہی تھی اور قریب تھا کہ وہ اکتا کر فون بند کرتا، سماعتوں سے ٹکرائی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔

"اچھا اچھا، وہ دراصل ابھی تھوڑی دیر پہلے شاید تمہاری بہن آئی تھی نا ثمینہ سے ملنے۔۔۔"

"میری بہن؟ کب آئی تھیں؟ اور آپ کو یہ یقین بھلا کیسے کہ وہ میری بہن تھیں؟" عجیب کسوٹی نما فون کال تھی جو لحہ بھر میں اکمل کے ذہن کو کئی سمتوں میں بیک وقت سوچنے پر مجبور کررہی تھی۔

"ارے ابھی آئی تھی تھوڑی دیر پہلے کالی شیشوں والی چادر میں نقاب کیے۔" اپنی بات سچ ہونے کا یقین دلاتے ہوئے حلیہ تک بیان کردیا گیا۔ مگر یہ بات اکمل کے لیے انتہائی حیرت کا باعث تھی کہ عائشہ آپی اور وہ بھی چادر اور نہ صرف چادر بلکہ نقاب کرکے کسی ثمینہ سے ملنے گئیں اور یہ ثمینہ کون ہے؟ جس سے وہ یوں مشکوک انداز میں ملنے گئیں اور پھر اٹھارہ کروڑ عوام میں سے آخر یہ خاتون صرف اسے ہی کیوں اس لڑکی کا بھائی بنانے پر تلی ہیں؟ جب یہ بھی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہونے لگیں تو اس نے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"دیکھیں محترمہ! آپ جو کوئی بھی ہیں، صاف بات کریں یوں پہیلیاں نہ بجھوائیں؟" بات ختم کرتے ہی اس کے ذہن میں چھناکا سا ہوا، ہوسکتا ہے یہ ندی کی بات کررہی ہوں اور پھر تو اس نے مکمل توجہ فون سے آنے والی آواز کی طرف مبذول کردی۔

"بھئی نام تو میں نے اس کا نہیں پوچھا مگر وہ ثمینہ سے ملنے آئی تھی اور جاتے ہوئے اس کا چھوٹا پرس (والٹ) یہیں گر گیا۔ بس اسی میں سے تمہارا نمبر دیکھا تھا ہم نے اور ساتھ ہی نام بھی۔"

"ثمینہ کون؟ وہ شاہ زین کی بہن نا؟"

اکمل نے اندھیرے میں تیر چھوڑا جو عین نشانے پر لگا۔

"ہاں، ہاں بیٹا! وہی، مگر وہ تو گھر چھوڑ گئے ہیں نا، اس لیے وہ جو چھوٹا پرس گرا تھا نا تمہاری بہن کا، وہ میں نے اپنے بیٹے کے ہاتھ تمہارے گھر بھیج دیا ہے۔" اکمل کی سماعتوں پر انہوں نے ایک ساتھ دو بم چھوڑے تھے۔ یعنی ندی کی شاہ زین یا اس کے کسی بھی فیملی ممبر سے ملاقات نہیں ہوپائی ہے اور نہ صرف یہ بلکہ ان خاتون کا بیٹا ندی کا والٹ لے کر اُن کے گھر پہنچنے ہی والا ہے، اور اگر یہ والٹ کسی اور کے ہاتھ لگ گیا تو۔۔۔ یقیناً اس کا گھر سے باہر نکلنا مخفی نہ رہ پاتا۔

انتہائی اضطراب کے عالم میں اکمل نے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی اور موبائل کو دائیں کان سے پر منتقل کیا یہ بات سمجھ سے باہر تھی کہ وہ ان سے شاہ زین کی فیملی کے بارے میں کچھ بات کرے یا پھر ان کے بیٹے کے بارے میں، جو کہ مستقبل قریب میں ندی کے گھر بس پہنچنے ہی والا تھا۔

"آپ کا بیٹا کس ایڈریس پر گیا ہے؟"

"ارے بیٹا وہی۔۔۔"

انہوں نے ایڈریس دوہرایا۔

"اُسی پرس میں لکھا ملا تھا ہمیں یہ ایڈریس، وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میرا بیٹا گھر پر تھا تو اسی وقت موٹر سائیکل پر بھیجا، مگر بیٹا اپنے روپے گن لینا، ہم تو ایک آنے کے بھی روادار نہیں ہیں، اللہ نصیب ہی نہ کرے کسی اور کے روپے پیسے۔۔۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جارہی تھیں۔

"لیکن دیکھیں، وہ دراصل۔۔۔ آپ مہربانی کرکے اپنے بیٹے کو واپس بلالیں کیونکہ وہ ایڈریس ٹھیک نہیں ہے۔"

اُس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"ٹھیک نہیں ہے تو کیا مطلب؟ اب وہ بے چارا سارا شہر گھومے گا اُس پرس کو لے کر، حالات کا معلوم ہے نا کتنے خراب ہیں۔"

اُن کے لہجے سے ناگواری جھلکی۔

"میرا مطلب ہے آپ بس کسی طریقے سے اسے گھر بلالیں، پرس میں خود ایک دو روز میں آکر آپ سے لے لوں گا۔"

اُس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طریقے سے التجا کرکے ہی سہی اُن کے بیٹے کو واپس موڑ دے اور وہ ندی کے گھر یا گھر والوں تک نہ پہنچ پائے۔

"لیکن اب تو شاید وہ پہنچ بھی گیا ہوگا اور جب اُسے پتا چلے گا کہ پتا غلط ہے تو پھر واپس بھی آجائے گا۔"

لاپروائی سے جواب آیا تو اکمل سلگ کر رہ گیا، اب وہ انہیں کس طرح سمجھاتا کہ اس پرس کے وہاں پہنچنے پر کیسا ہنگامہ کھڑا ہوسکتا ہے۔ اس لیے مجبور ہوکر ضدی بچوں کی طرح ایک مرتبہ پھر اپنی بات دوہرائی۔

"آپ کی بات تو بالکل ٹھیک ہے مگر خوامخواہ اسے جانے کی زحمت ہی ہوگی نا، تو میرا مطلب تھا کہ بے چارہ اتنی دور جائے گا پھر آئے گا، تو بہتر ہے کہ اسے ابھی فون کرکے رستے ہی سے واپس بلالیں۔"

"چلو کوئی بات نہیں بیٹا! کسی کے کام آنا ہی زندگی ہے اور میں اُسے فون کربھی دیتی مگر وہ غصے کا بڑا تیز ہے اس لیے میں ذرا احتیاط ہی کرتی ہوں۔"

انہوں نے اسے اپنی مجبوری سے آگاہ کیا۔

یوں بھی یہ بات حقیقت ہے کہ ہر گھر میں کوئی نہ کوئی ایک فرد ضرور ٹیڑھے مزاج کا ہوتا ہے جو باقی سب کو "نتھ" ڈال کر رکھتا ہے۔

"اچھا بیٹا! اگر وہ پرس واپس لے آیا نا تو میں امانت کے طور پر سنبھال کے رکھ دوں گی، تم کوشش کرنا

کہ ذرا جلدی آ کے لے جاؤ، پتا ہے نا امانت کا بڑا بوجھ ہوتا ہے دماغ پر۔"

"جی جی بالکل۔"

تھکے تھکے لہجے میں اُس نے انہیں اللہ حافظ کہا کیونکہ جانتا تھا کہ اب وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتیں۔

پہلے ندی گھر پہنچے گی یا اس کا والٹ؟ یہ بات اپنی جگہ خود ایک پہیلی تھی۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ ندی سے بات بھی کرنا چاہتا تھا مگر کچھ دیر بعد، تاکہ وہ گھر میں آ جائے اور اس سے سکون کے ساتھ ساری بات ہو۔ سست قدموں سے چلتا اب وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا، مگر ذہن اور دل ندی کا تصور ذہن میں لیے بڑے زور و شور کے ساتھ اس دعا میں مصروف تھے۔

میرے مالک! کرم کر دے
رحم کر دے
اس کی آنکھ میں آئے اگر آنسو
تھکاوٹ، کرب، کلفت یا پریشانی
کبھی احساسِ تنہائی
کوئی آفت، کوئی وحشت
وقوع ہونے کو ہو کچھ بھی برا
افتاد کی صورت
اسے تو روک دے مولا
تیری رحمت وسیع ہے
خلق سے تیرے پیار کی مانند
دعا میں مانگتی ہوں تو اسے مقبول کر لینا
اگر ہونے کو ہو ایسا
اسے جو مضطرب و مضمحل کر دے
تو اپنے رحم کے صدقے
اسے تو روک دے مالک!
کبھی واپس نہ آنے کو۔

☆☆☆

"میری! تم کسی اور روز چرچ نہیں جا سکتیں کیا؟" کنول نے آج صبح آتے ہوئے کینٹین والے چاچا سے مینو کا کیا پوچھ لیا تھا اس کا تو بس نہیں چل رہا تھا کہ جلد از جلد وقت کی ڈوری لپیٹ کر واپس ہاسٹل جا پہنچے اور گرما گرم پائے کا سالن، سلاد اور نرم نرم سے نان کے ساتھ مزے لے کر کھائے۔

جب تک وہ آج دوپہر کے مینو سے بے خبر تھی بڑی پُرسکون تھی۔ تینوں کے باہم مشورے سے ہی پروگرام یہ طے پایا تھا کہ صبح کالج سے جلدی آف کرنے کے بعد وہ تینوں مل کر چرچ جائیں گی اور واپسی میں سپر اسٹور سے کچھ شاپنگ کر کے رات آٹھ بجے تک وہ لوگ دوبارہ ہاسٹل جا پہنچیں گی اور تب ہی نو بجے مہربانو نے ملکانی سائیں سے بات بھی کرنا تھی۔ لیکن اب تو ظاہر ہے معاملہ "پائے کے سالن" کا تھا اور وہ بھی کنول کے لیے، جو ان سب کے بلاک میں سب سے چٹوری تھی۔ اسی لیے اب اپنا دوپہر کا کھانا "قضا" ہو جانے کے خیال سے کچھ جز بز دکھائی دے رہی تھی۔

"تو باہر کھا لیں گے نا یہی کھانا، اس میں اتنا مسئلہ کیا ہے؟"

میری اس کے بہانوں کی وجہ سے باخبر تھی جب ہی بولی۔

"تمہارا کیا خیال ہے میں کھانے کے لیے کہہ رہی ہوں؟"

"نہیں نہیں، مجھے پتا ہے تم تو ویسے ہی ہاسٹل کو مس کر رہی ہو، ہے نا؟"

"اچھا زیادہ اوور اسمارٹ نہ بنو۔"

کنول اس کا مذاق سمجھ گئی تھی جب ہی چار و نا چار کتابیں اور نوٹس سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہربانو نے بھی پہلے سے سر پر موجود چادر کو ایک مرتبہ پھر سلیقے سے اوڑھا، شولڈر بیگ میں اپنی چیزیں ڈالیں اور تینوں ایک ساتھ کالج کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھنے لگیں۔

"ویسے میں ایک بات سوچ رہی ہوں مہربانو!"

برآمدے سے گزرتے ہوئے لائبریری کے اندر موجود بیٹھے اسٹوڈنٹس کو کھلے دروازے سے ایک نظر

دیکھتے ہوئے کنول پُرسوچ انداز میں بولی تو اس کی سنجیدگی پر میری بھی آتی جاتی مستقبل کی ڈاکٹرز کے نت نئے ماڈلز نما ڈریسز کو دیکھنا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

مہربانو نے بھی کنول کی طرف رخ موڑا۔

"ہاں بولو کنول کیا بات ہے؟"

"پتا نہیں تم لوگوں کا اس بات کو سننے کے بعد کیا ردِعمل ہو، اچھی لگے یا بری اور اللہ جانے تم لوگ میری بات سے ایگری کرتی بھی ہو کہ نہیں۔"

چلنے کے دوران اپنے ہی جوتوں پر نظر جمائے کنول کا اس قدر سنجیدہ لہجہ مہربانو کے ساتھ ساتھ میری کو بھی تشویش میں مبتلا کیے دے رہا تھا۔

"تم کہہ کر تو دیکھو، باقی باتیں تو بعد کی ہیں نا۔" میری بولی۔

"اور ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا کہ ہم تینوں کو ایک دوسرے سے کوئی بات کرنے کے لیے اس قدر تمہید باندھنی پڑے، اتنی سوچ بچار کرنی پڑے تو پھر آج ایسا کیوں؟" مہربانو نے بھی اسے اپنائیت کا احساس دلایا تو وہ ہاتھ سے چہرے پر آئے بال ہٹاتے ہوئے دونوں کو دیکھنے لگی۔

"کیا گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟"

"ارے نہیں، ایسا تو کچھ نہیں ہے، اچھا تم دونوں وعدہ کرو کہ میری بات کا برا نہیں مناؤ گی۔"

"اچھا بابا، وعدہ تو ہے مگر کچھ بتاؤ گی بھی کہ براہِ راست بچے کی جان لو گی؟" میری سے اب یہ سسپنس برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

"وہ مہربانو۔۔۔ ادراصل میں سوچ رہی تھی کہ ظاہر ہے ہم تو اب سات آٹھ بجے سے پہلے ہاسٹل نہیں جا سکتے تو کیوں نا انوشے کو فون کر دیں۔"

"اوہو، لیکن اسے فون کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟"

"وہ دراصل وہ چاچا سے ہم تینوں کا سالن لے کر فریج میں رکھ دے گی نا تو ہم شام کو اوون میں گرم کر لیں گے۔"

کمال معصومیت سے کنول نے پورا "منصوبہ" ان کے گوش گزار کیا تو اس کی پشت پر پڑنے والی پہلی کتاب میری ہی کی تھی۔ مہربانو البتہ بے اختیار کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔ وہ پائے کی اتنی بڑی "فین" تھی یہ بھلا کسی کو اندازہ ہی کب تھا۔

"اگر ان گائے بکروں کو پتا چل جائے کہ تم ان کے پائے کی کس قدر شیدائی ہو تو بخدا ہر ذبح خانے میں تمہاری تصویر فریم کروا کر لگوانا ان کی پہلی اور آخری خواہش ہو۔" میری کی بات پر کنول کھسیا گئی مگر اپنی بات پر ابھی تک قائم تھی۔

"کیا ہوا تیرا وعدہ۔۔۔ وہ قسم وہ ارادہ؟" مصنوعی آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے صاف کرتے ہوئے اس نے ان دونوں کو وعدہ یاد دلایا تو مہربانو اپنے بیگ سے موبائل نکالنے لگی۔

"بس بس تم یہ گانا تو رہنے ہی دو، یہ تو ہمارے ہر سیاست دان کے فون کی رنگ ٹون ہونا چاہیے۔"

میری کی بات پر وہ تینوں مسکرانے لگی تھیں۔

مہربانو نے بیگ سے فون نکالا اور اس سے پہلے کہ انوشے کا نمبر ڈائل ہوتا، اس کی چارجنگ نہ ہونے کے باعث فون بند پایا گیا سو دوبارہ بیگ میں ڈال دیا۔

"میری تم کر دو اسے فون، بس ہمارے "پائے" کسی طریقے ہمارے ہی رہیں۔" اور کنول کی تب جان میں جان آئی جب انوشے نے بڑی خوش دلی سے یہ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ہامی بھر لی اور تبھی وہ تینوں بس اسٹاپ پر بھی پہنچ چکی تھیں۔ بس میں بیٹھ کر کہیں بھی جانے کا مہربانو کا یہ بالکل پہلا تجربہ تھا۔ ورنہ آج سے پہلے تک وہ پارک، لائبریری یا سپر اسٹور وغیرہ کے علاوہ کہیں نہیں گئی تھی۔ شروع شروع میں تو جب اس نے کالج جوائن کیا تھا تو "فیس بک" کے اسٹیٹس کی طرح ہر وقت ملکانی سائیں کو اپ ٹو ڈیٹ رکھا کرتی۔ ابھی کالج گئی، ابھی ہاسٹل آئی، ابھی لائبریری جا رہی ہوں، ابھی کچھ لینے جا رہی ہوں وغیرہ وغیرہ۔

مگر آہستہ آہستہ ملکانی سائیں بھی سمجھ گئی تھیں کہ

اس کی روزمرہ کی روٹین بس انہی چیزوں کے گرد گھومتی ہے جبھی ذرا سا خود بھی ریلیکس ہو گئیں اور اس کو بھی کر دیا، مگر اس نرمی کے باوجود وہ ہمیشہ بہت محتاط رہا کرتی، ہر قدم پھونک پھونک کر رکھتی، کسی سے بھی زیادہ بات چیت کرنے سے کتراتی اور خصوصاً لڑکوں سے تو سلام دعا بھی ہو جاتی تو گھبرا کر یوں چاروں اطراف دیکھتی گویا اس سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہو اور میران یہیں کہیں کسی درخت، پودے یا ستون کے پیچھے سے نکل کر ہاتھ میں ہتھکڑی لیے بس اس کی طرف بڑھنے ہی والا ہے۔

شروع ہی سے اس نے حویلی میں میران شاہ کو اس قدر dominent پایا تھا کہ وہ بے شک اس کے سامنے ظاہر نہ کرتی مگر دل ہی دل میں وہ ہمیشہ میران شاہ سے خوف زدہ ہی رہی تھی۔ کبھی بھی کسی بھی بات پر اس کے دل میں شاہ سائیں اور ملکانی سائیں کا خیال تو بعد میں آتا سب سے پہلے میران کا تصور ذہن میں آن ابھرتا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بھائی تو بہنوں کے لیے ماں باپ کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ مضبوط ڈھال ہوتے ہیں۔ اس کے دماغ میں بھائی کا تصور بید کی چھڑی ہاتھ میں لیے غصیلی نظروں سے دیکھتے ایک شخص سے بڑھ کر کبھی بنتا ہی نہیں تھا۔ اور یہی حال اب حویلی سے اس قدر فاصلے پر مقیم ہونے کے باوجود بھی تھا۔ اسے لگتا کہ میران یہیں کہیں کھڑا اس کی نگرانی کر رہا ہے۔

اور اگر دیکھا جائے تو صرف ایک مہربانو ہی کیا ہم میں سے کتنے ہی لوگ اکثر کوئی کام کرتے ہوئے پہلے یہ ضرور سوچتے ہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اور اگر کام کچھ ایسا ہو جس سے خود ہمارے دل میں بھی کھٹکا پیدا ہو رہا ہو تو اول آنے والا خیال یہی ہوتا ہے کہ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا ہوگا؟

اس سب کے برعکس اگر ہم اپنی اس تمام سوچ کو اوپر والے کی طرف موڑ دیں اور کوئی بھی کام کرتے ہوئے یہ سوچ لیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے تو دنیا والوں کے اس دو دھاری تلوار جیسے پیمانے سے تو مشکل آپ گزرا جا سکتا ہے کیونکہ تلوار کتنی ہی تیز اور دو دھاری کیوں نہ ہو پانی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

خود مہربانو بھی حویلی کے اس ماحول سے فرار حاصل کرتے ہوئے رفتہ رفتہ خود کو اس پاک ذات کے قریب محسوس کرنے لگی تھی اور اب تک جو وہ سنتی آئی تھی کہ رب ہمارے دل میں رہتا ہے، ذہن اس سے بھی آگے بڑھ کر سوچتا، اسے یوں لگتا جیسے اب تو اس کی شخصیت میں کوئی کمی باقی ہی نہیں رہی، اپنا آپ اسے مکمل سا لگنے لگا تھا اور یہی بات جب وہ ایک روز جائے نماز پر بیٹھی دیوار سے ٹیک لگائے بند آنکھوں سے دعا مانگ رہی تھی تو اس نے کنول سے بھی کہی تھی۔

''مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کنول! کہ رب تو میری آنکھوں میں رہتا ہے، بند کروں تو اس کا تصور اتنا قریب لگنے لگتا ہے کہ اپنے ہونے کا اپنی ذات کا احساس ختم ہو جاتا ہے اور آنکھیں کھولوں تو ہر طرف بس وہ ہی وہ ان آنکھوں کے پردے پر نقش محسوس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب جب میری خشک آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں وہ میرے قریب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ میری دل جوئی کرنے اور مجھے سہارا دینے کی خاطر۔''

اور تب اسے اپنے رب پر ٹوٹ کر پیار آتا۔

دنیا کے رشتے، ان کی بے اعتنائیاں اسے ہرگز برے نہ لگتے کہ یہ سب تو رب کی طرف سے عطا کردہ تھے اور بے شک وہ کسی کو بھی کچھ برا عطا نہیں کرتا۔ اب یہ الگ بات ہے کہ رب نے دنیا میں آنے والے ہر انسان کو جو بھی کچھ دیا، بلاشبہ بہترین تھا مگر اس عطا کو ڈھانپنے والے اعمال کی چادر سب کی اپنی اپنی ہے اور اعمال کی اسی چادر کے باعث عطا مخفی اور اعمال ظاہر ہیں اور اسی کی مثال مہربانو اور میران شاہ بھی تھے اور اس کا ہر لحہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا بھی اسی باعث تھا کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی ذرا سی غلطی اس کے اعمال کی چادر پر دھبا بن کر ظاہر ہو۔

چلتی بس کے مناظر کے ساتھ ساتھ جانے کب

تک اس کی سوچوں کا سلسلہ چلتا رہتا کہ اُن کا مطلوبہ اسٹاپ آنے پر بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور اُن سے پہلے چند دوسرے لوگ بس کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ میری اور کنول نے بھی اپنے اپنے کانوں پر لگائے ہیڈ فون اتار کر پرس میں ڈالے اور باہر جاتے مسافروں کی قطار کا حصہ بن گئیں۔

دس پندرہ منٹ پیدل چلنے کے بعد اب وہ لوگ سرخ اینٹوں سے بنی ایک قدرے قدیم عمارت کے سامنے موجود تھیں۔ بیرونی گیٹ پر ہی قطار سے دائیں بائیں موجود درخت آنے والوں کے اذہان کو تر و تازہ کرنے میں اپنا کردار بخوبی نباہ رہے تھے۔ نہ صرف باہر بلکہ اندر بھی مختلف قسم کے خوب صورت اور دلکش پھول پودوں کی موجودگی بڑا خوب صورت تاثر دے رہی تھی۔ باہر سے انتہائی وسیع نظر آنے والی چرچ کی یہ عمارت حقیقت میں اس سے کہیں کم تھی۔ وسیع دکھائی دینے کی وجہ ملحقہ مشنری اسکول تھا جو دو منزلہ اور انتہائی کشادہ رقبے کا حامل تھا اور جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو پہلا تاثر یہی ملتا کہ شاید یہ عالی شان رقبہ چرچ کے زیر استعمال ہے۔

اپنی والدہ کی بات پوری کرنے اور انہیں مطمئن کرنے کی خاطر آج میری نے چرچ کا رخ کیا تھا۔

''تم جاؤ اندر جا کر اپنی پرے (Pray) وغیرہ کر آؤ ہم تھوڑی دیر یہاں گھومتے ہیں۔'' کنول چرچ کے اندر جانے سے کترا رہی تھی۔ جبھی میری کو اکیلے ہی اندر جانے کا بھی مشورہ دے ڈالا۔

اس کے برعکس مہربانو چرچ کو اندر سے بھی دیکھنے کی خواہش مند تھی اور خود میری بھی یہی چاہتی تھی کہ وہ دونوں اس کے ساتھ اندر چلیں مگر کنول کے یوں ہچکچانے پر اسے حیرت ہوئی۔ ''گھومتے ہیں؟ کیا مطلب کیا تم یہاں گھومنے کے لیے آئی ہو؟''

''اوہو یار! پرے تو تمہیں کرنی ہے نا ہم تو بس ویسے ہی تمہارے ساتھ آئے ہیں۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں نا کہ یہاں تک میرے ساتھ آ گئی ہو تو اندر بھی آ جاؤ مجھے اچھا لگے گا اگر تم لوگ بھی مجھے دیکھو تو۔''

''فضول میں بچوں کی طرح ضد نہ کرو یار! ہم نے پہلے بھی تمہیں اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔''

ہنوز اپنی بات پر اڑتے ہوئے کنول نے مسکراتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ مہربانو البتہ ان دونوں کی بات چیت خاموشی سے سنتے ہوئے اپنی رائے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ کنول کا خیال تھا کہ شاید اس کی بات پر میری بھی مسکرا دے گی مگر ہوا اس کے برعکس۔

''تم جس بات سے ڈر رہی ہو نا کنول! وہ خوف اپنے دل سے نکال دو، چرچ کے اندر چلے جانے سے تمہارا مذہب نہیں بدل جائے گا، کرسچن نہیں ہو جاؤ گی، رہو گی مسلم ہی۔'' طنزیہ انداز میں میری نے کہا تو کنول کا لہجہ بدلنے میں بھی دیر نہ لگی۔

''مذہب تو وہ لوگ بدلتے ہیں جن کا عقیدہ کمزور ہو، جو حق پر نہ ہوں، میں بھلا کیوں مذہب بدلوں گی، تم اپنی خیر مناؤ کہ گھر والوں نے زبردستی چرچ بھیجا ہے۔'' میری کے مسکراتے مگر طنزیہ جملوں کے جواب میں کنول کا لہجہ کاٹ دار ہو گیا تھا۔

''وہ تم پر زبردستی کر سکتے ہیں مگر معاف کرنا تم ہمیں زبردستی اندر نہیں لے جا سکتیں اور پہلے خود تو مکمل کرسچن بن جاؤ پھر ہمیں بنانے کا بھی سوچنا۔''

''کنول! تمہارا دماغ ٹھیک ہے یہ کس طرح کی فضول باتیں کر رہی ہو آج؟''

مہربانو کو خود بھی کنول کی باتیں انتہائی تحقیر آمیز اور بری لگی تھیں جبھی اسے درمیان میں بولنا ہی پڑا۔

میری کا دھواں دھواں ہوتا چہرہ بتا رہا تھا کہ اسے کنول سے ان باتوں اور اس لہجے کی ہرگز توقع نہیں تھی۔

''میری! میں تم سے کنول کی طرف سے معافی مانگتی ہوں دیکھو......''

مہربانو نے میری کا ہاتھ پکڑ کر اسے کچھ سمجھانا تو چاہا مگر وہ ہاتھ چھڑا کر اکیلی ہی چرچ کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔

"کیوں کہا تم نے یہ سب کنول؟ ہم تینوں تو ایک دوسری کے بہت اچھی دوست تھیں نا، کیوں ہرٹ کیا تم نے اسے؟ اور وہ بھی اس معاملے میں؟" کنول خاموش رہی البتہ وہیں نیچے گھاس پر بیٹھتے ہوئے وہ دروازہ جہاں سے ابھی ابھی میری اندر گئی تھی اس کی نظروں کے حصار میں تھا۔

"تم کون ہوتی ہو یہ فیصلہ کرنے والی کہ وہ مکمل کرسچن ہے یا نہیں، کیا تم خود ایک مکمل انسان ہو؟"

کنول کیا کہتی کیونکہ ظاہر ہے وہ جانتی تھی کہ جواب نفی میں ہے۔

"نہیں نا۔۔۔ تو پھر تمہیں کس نے یہ حق دیا ہے کہ کھڑے کھڑے کسی پر بھی کوئی بھی فتویٰ دے ڈالو۔ اگر تم مسلم ہو تو اس میں تمہارا کیا کارنامہ ہے اور اگر کوئی اور نہیں ہے تو اس میں اُن کا کیا قصور؟ یہ سب تو رب کا احسان ہے کہ اُس نے ایک مسلم گھرانے میں ہمیں پیدا کیا ورنہ ہم میں سے کتنے فیصد لوگ ہوتے جو اپنی فیس بک، ٹوئٹر وغیرہ کی ایکٹیوٹیز چھوڑ کر ایک سچے دین کی تلاش کرنے اور پھر اُس دینِ حق کے ساتھ اپنے آباء و اجداد کے مذہب کو کمپیئر کرنے کے بعد تو مسلم قرار پاتے۔۔۔" مہربانو چند لمحے رکی۔

"تم ہوتیں تو کرتیں؟ ہرگز نہیں نا، تو پھر دوسروں پر تنقید کیوں یار؟ جبکہ ہم خود صحیح معنوں میں مسلمان ہونے کا حق ادا نہیں کرتے۔" اس بات پر کنول نے شکایتی نظروں سے دیکھا۔

"دن کے بیس گھنٹے ٹیکنالوجی استعمال کرنے والی ہماری اپنی جنریشن میں سے تناسب نکالو تو کتنے لوگ ہوں گے جو سیرتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) تو دور کی بات ہے تمام امہات المومنین کے نام ہی ترتیب سے بتا دیں، تو جب ہم خود نقائص سے بھرپور ہیں تو دوسروں کی خامی کی نشان دہی کرنے سے پہلے اپنا تو نقص دور کریں نا۔"

"ہوں۔۔۔" کنول نے گھاس کے درمیان اگنے والے ننھے پودے کے ارد گرد گھاس اکٹھی کرتے ہوئے گہری سانس خارج کی۔

"اگر ہم اندر چلے جاتے تو وہ خوش ہو جاتی اور بس، کیا بگڑ جاتا تمہارا؟"

مہربانو کبھی بھی اُن پر اپنی کوئی بات مسلط نہیں کرتی تھی، تھوپتی نہیں تھی مگر آج اس سے میری کا چہرہ دیکھا نہیں گیا تھا سو جذباتی ہو گئی۔

"بس میرا دل نہیں مان رہا تھا یار۔۔۔!" دھیمی آواز میں وہ بولی تو مہربانو نے اسے بولنے کا موقع دیا۔

"کہ بے شک وہ اہلِ کتاب سہی مگر۔۔۔ عقائد میں موجود بنیادی فرق جو ہے نا، مجھے انہی بنیادوں نے جکڑ لیا تھا اُس وقت۔"

"پتا ہے کنول! ہم جس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے امتی ہیں نا اُن کے حُسنِ سلوک اور صلہ رحمی کو دیکھ کر تو کافر بھی کلمہ پڑھ لیتے تھے، مسلمان ہو جایا کرتے تھے، مگر معاف کرنا مجھے افسوس ہے کہ تمہارے جیسے طرزِ عمل کے لوگ ہی لوگوں کو اسلام سے دور کر رہے ہیں، جو بندہ پانچ وقت کی نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگے وہ خود کو دین کا عالم سمجھ کر چھوٹی چھوٹی باتوں پر جس طرح دوسروں کو ٹوکنا شروع کرتا ہے اس سے صرف وہ اپنا ایک مکمل مسلمان ہونا ثابت کرتا ہے اور دوسروں کو خطاؤں سے بھرا۔"

"آئی ایم سوری یار۔۔۔! مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے، اندازہ ہی نہیں تھا کہ بات اتنی بڑھ جائے گی۔"

"سوری مجھے نہیں میری کو کہنا، جسے تم نے ہرٹ کیا اور پھر اللہ سے بھی سوری کرنا۔" تائید میں سر ہلاتے ہوئے کنول نے مہربانو کے دائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی گرم جوشی سے دبایا۔

"اور سنو، ایسا کرنا ابھی جب شاپنگ پر جائیں گے تو میری کو کچھ گفٹ کر دینا، خوش ہو جائے گی سنو۔"

"ہاں یہ بھی ٹھیک ہے کیونکہ میں خود بہت گلٹی فیل کر رہی ہوں۔"

یوں فوراً اپنی غلطی تسلیم کر لینے پر مہربانو نے کنول کو مسکرا کر دیکھا اور دونوں میری کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ یوں بھی غلطی کرنا برا نہیں، انسان روزِ اول سے غلطی کرتا آیا ہے اور آئندہ بھی اس سے غلطیاں سرزد ہوتی ہی رہیں گی لیکن غلطی کرنے کے بعد احساسِ ندامت کو دبا دینا اور خود اپنے ہی ضمیر کے سامنے بھی پشیمان نہ ہونا حقیقت میں بُرا فعل بھی ہے اور دل کے مُردہ ہو جانے کا واضح ثبوت بھی۔

☆☆☆

ہم نے سوچ رکھا ہے
چاہے دل کی ہر خواہش
زندگی کی آنکھوں سے اشک بن کے بہہ جائے
چاہے اب مکینوں پر
گھر کی ساری دیواریں، چھت سمیت گر جائیں
اور بے مقدر ہم۔۔۔
اس بدن کے ملبے میں
خود ہی کیوں نہ دب جائیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
کیسی نیند تھی اپنی، کیسے خواب تھے اپنے
اور اب گلابوں پر، نیند والی آنکھوں پر
نرم خو سے خوابوں پر
کیوں عذاب ٹوٹے ہیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
گھر گئے ہیں گھاتوں میں، بے لباس باتوں میں
اس طرح کی راتوں میں
کب چراغ جلتے ہیں، کب عذاب ٹلتے ہیں
اب تو ان عذابوں سے بچ کر بھی نکلنے کا، راستہ نہیں جاناں
جس طرح تمہیں سچ کے لازوال لمحوں سے، واسطہ نہیں جانا
ہم نے سوچ رکھا ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے
تم سے کچھ نہیں کہنا۔

ندی اس وقت پاؤں کہاں رکھ رہی تھی اور پڑ کہاں رہا تھا اس بات کی خود ندی کو کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ ان کی گلی سے نکل کر یہ جانے بغیر کہ رستہ کس طرف جاتا ہے۔ بس یونہی اپنی سوچوں میں گم سر جھکا کر تھکے تھکے قدموں سے بس چلتی چلی گئی۔ حال اس جواری کا سا تھا جو جوئے میں اپنی تمام تر متاع ہار کر گھر کو لوٹ رہا ہو۔ آگے کی زندگی میں اس کے لیے اندھیرے ہی تھے، یہ گمان بھی ذہن پر پوری طرح غالب تھا۔ شاہ زین نے اس کے ساتھ یہ کیسا سلوک کیا کہ وہ خود اپنے آپ پر یقین نہیں کر پا رہی تھی۔ وہ لڑکی ہو کر اتنا بولڈ اسٹیپ لیتے ہوئے اس قدر نامساعد حالات میں اس سے ملنے آ پہنچی تھی تو وہ مرد ہو کر اس کے لیے کچھ بھی کیوں نہیں کر پایا تھا اور رابطہ کرنا بھی بھلا اس قدر مشکل یا ناممکن کہاں تھا، کرنے والے تو ہزار رستے نکال لیتے ہیں، لاکھ تدبیریں کرتے ہیں مگر وہ۔۔۔ شاہ زین۔۔۔

اس نے اتنی آسانی سے خود کو حالات پر کیوں چھوڑ دیا؟ کیا اسے ایک لمحے کے لیے بھی ندی کا خیال نہیں آیا ہو گا اور پھر شادی۔۔۔۔

یہ اور اس سے ملتی جلتی کئی سوچیں ندی کے ذہن کو گارے اور مٹی کی طرح اپنی لپیٹ میں لی ہوئی تھیں۔ کبھی سوچتی کہ گھر واپس نہ جائے، بہتر ہے کسی دارالامان میں جا کر اپنی زندگی کی نئی شروعات کرے یا کہیں ویمن ہاسٹل میں جا کر رہ لے اور ساتھ کوئی بھی جاب شروع کرے۔ آپشنز تو ایک کے بعد ایک ذہن میں آتے جا رہے تھے مگر جہاں خیال گھر بیٹھی ماں کا آتا تو تمام خیال، ارادے اور منصوبہ بندی دن موسم کے بادلوں کی طرح جھٹ پٹ غائب ہو جاتے۔ سو جیسے تیسے وہ مرتی یا جیتی، گھر واپس اپنی ماں کے پاس پہنچنا ہی اس نے اپنے لیے واحد ترجیح خیال کی اور رکشا کی تلاش میں سر اوپر اٹھا کر دھیان سڑک کی طرف مبذول کیا تو جیسے ایک دنیا تھی جو بھاگی چلی جا رہی تھی، بسوں، ٹیکسیوں، گاڑیوں اور رکشوں میں۔ دونوں اطراف پیدل چلنے والے بھی اپنی ہی دھن میں بس چلے جا رہے تھے۔

یہاں سے وہاں ایک سفر تھا جو جاری تھا۔ لمحہ بھر کے لیے اسے لگا کہ وہ جو اپنے غم کو دنیا بھر کے غم سے

بڑا اور اپنی زندگی کو سب سے کٹھن خیال کیے ہوئے تھی تو ایسا نہیں تھا۔ تمام لوگ جو اس وقت زمین کے کشادہ سینے پر اپنے قدموں کے نقش ثبت کیے جارہے تھے، سبھی کے پاس ایک الگ ہی کہانی تھی۔ سڑک کنارے فٹ پاتھ پر بنا کسی چھاؤں کے بیٹھی بوڑھی عورت چھوٹی چھوٹی اشیاء سامنے دری پر سجائے اپنے ساتھ اس جھریوں بھرے چہرے کی داستان بھی تو لیے بیٹھی تھی۔ ایک ایک جھری میں جانے کتنے غم کروٹ لیے پڑے ہوں، روئی کے گالوں سے سفید بالوں کی ہر ہر تار میں اپنوں کی بے رخی کے نہ جانے کتنے زخم پاؤں پسارے دنیا والوں کے ظاہری پیار و محبت اور اپنائیت کے ڈھکوسلوں کو مطلب کی میلی چادر کی اوٹ سے دیکھ کر تمسخر اڑاتے ہوں مگر شاید یہ حقیقت ہے کہ ہمیں اپنا غم اور دوسروں کی خوشی ہمیشہ محدب عدسے کی اوٹ سے نظر آتی ہے اور مصیبت میں چلا اٹھنا اور دوسروں سے حسد کا بے دار ہوتا جذبہ بھی اسی محدب عدسے سے نکلنے والی حسرت کی شعاعوں کے مرہونِ منت ہوتا ہے۔

دو رویہ سڑک پر دائیں سے بائیں اور مخالف سمت جانے والے تمام رکشے اپنی پیٹھ پر مالک اور مسافر کا بوجھ لادے سرپٹ دوڑے چلے جارہے تھے۔ اُدھر ندی کے لیے اس وقت خود اپنے جسم کا بوجھ اٹھانا محال تھا۔ سو وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی کہ اب مزید کھڑا رہنا اس کے لیے ناممکن ہوتا جارہا تھا۔

شاہ زین کے ساتھ یونیورسٹی میں ہونے والی پہلی ملاقات سے لے کر آخری دن بیک اسٹیج پر ہونے والی دونوں کی بات چیت تک ندی کے ذہن میں خالی جھولے کی مانند ٹھہر گئی تھی۔ گھر پر امی کی پریشانی کا بھی خیال تھا اور رکشا بھی نظر نہیں آرہا تھا، قریب سے گزرتے دو تین لڑکوں نے اسے دیکھ کر ہونٹ سکیڑتے ہوئے سیٹی بجانا اپنا فرض سمجھا اور اسے اوپر سے لے کر نیچے تک بغور دیکھتے ہوئے بالوں میں ہاتھ پھیر کر آنکھ بھی مار ڈالی۔

"وقت کبھی ایک جیسا نہیں رہتا۔"

یہ خیال آتے ہی ندی کی آنکھیں بھر آئیں۔

یہ وہی ندی تھی، جس سے بات کرتے ہوئے خود کو شاہ رخ خان کا جانشین سمجھنے والے بھی محتاط ہوا کرتے تھے اور آج راہ چلتے اوباش اور چھچھورے لڑکے اسے میلی نظر سے دیکھ رہے ہیں اور وہ خاموش ہے۔

اس نے بھیگی نظروں سے اوپر آسمان کی طرف دیکھا اور پھر ان لڑکوں کو جن کی نظریں ہوس کے شیرے سے لتھڑی ہونے کے باعث اب تک اس پر چپکی ہوئی تھیں۔ باوجود اس کے کہ وہ چادر میں لپٹی اور نقاب کیے ہوئے تھی۔

اس سے چار پانچ گز کے فاصلے پر کھمبے سے ٹیک لگائے نوجوان بھولے بیٹھے تھے کہ نظریں ہماری شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں اور میلی نظروں کی کثافت کسی دوسرے کا کچھ بھی بگاڑنے کے بجائے اپنی ناگوار باس سے دیکھنے والے ہی کی شخصیت کو بدبودار اور روح کو مردہ کیے دیتی ہے۔ اس کے برعکس صاف اور پاکیزہ نظروں کے مالک لوگوں کی شخصیت خوشبو کی طرح معطر اور چاہے جانے والی ہوتی ہے۔

بحالت مجبوری ندی وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور قدرت کی مدد یوں پہنچی کہ جس رکشا میں بیٹھ کر وہ شاہ زین کے گھر گئی تھی وہی رکشا والا ایک بار پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

"بیٹا! گھر واپس جانا ہے کیا؟"

اسے یوں فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا دیکھ کر رکشا والے چاچا نے رکشا سے سر باہر کی سمت نکالتے ہوئے کہا تو وہ دل ہی دل میں سکون کا سانس لیتی بغیر کچھ کہے یوں رکشا کے اندر جا بیٹھی گویا اس کی اپنی ذاتی گاڑی ہو۔ رکشا والے نے بیک مرر سے دیکھا وہ رکشا کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کیے بیٹھ گئی تھی۔ جاتے ہوئے آنکھوں پر لگایا گیا چشمہ اب ہاتھ میں تھا۔ چہرہ تو نقاب میں تھا مگر آنکھیں یوں ساکت تھیں گویا مراقبہ کیا جارہا ہو۔ نہ پلکوں کا کوئی ارتعاش تھا نہ ہی آنکھ کی پتلی کی خفی حرکت۔ چاچا کو جیسے ندی

سے ہمدردی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں تو سارا دن کتنے ہی مسافر اس سیٹ پر بیٹھا کرتے، مرد ہوتے تو چاچا سے بات چیت کرنے لگتے۔ خواتین ہوتیں تو آپس میں ہی باتیں کرتی رہتیں۔ مگر اتنا چپ چاپ اس قدر خاموش مسافر۔۔۔ آخر ان سے رہا نہ گیا اور وہ بول ہی اٹھے۔

"کیا بات ہے بیٹا! پریشان ہو؟ جس کام سے گئی تھیں نہیں ہوا کیا؟" تھوڑی تھوڑی دیر کے وقفے سے انہوں نے دو تین سوالات کیے تو ندی نے گہری سانس کے ساتھ تمام تر صدمہ باہر نکالنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ میں پکڑے گلاسز سے ایک بار پھر آنکھوں اور دنیا کے درمیان باڑھ کھڑی کردی۔

"نہیں چاچا! جیسے خالی ہاتھ گئی تھی اس سے بھی تہی داماں ہو کر لوٹی ہوں۔" ٹوٹے بکھرے لہجے میں اس نے کہا تو چاچا کو اس سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ مگر اس کے بعد کچھ اور پوچھنے کی جانے کیوں انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اس کا دکھ ان کا دل شاید جذب نہ کرپائے۔ اسی لیے خاموش رہے۔ مگر دل سے ندی کے تمام مسائل کے حل اور اس کے اچھے نصیب کی دعا ضرور مانگتے رہے۔

ادھر ندی جلد از جلد امی کے پاس پہنچ کر انہیں سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس بات کا بھی دل کو دھڑکا تھا کہ کہیں ثروت آپا یا عائشہ بھابھی کو اس کے آنے کا پتا نہ چل گیا ہو، ناصر بھائی گھر لوٹ نہ آئے ہوں اور اب اسے گھر کے اندر چوروں کی طرح داخل ہوتے ہوئے کوئی دیکھ نہ لے۔ سب کچھ بھلا کر اس وقت وہ گھر میں سب کے "بے خبر" رہنے کی دعا مانگ رہی تھی کہ اپنی وجہ سے وہ ایک بار پھر ماں کا جھکا ہوا سر یقیناً برداشت نہیں کرپاتی۔ انہیں دعاؤں اور خیالات کے تسلسل کے ساتھ ہی رکشا والے نے اس کے کہے بغیر ہی اس جگہ آکر رکشا روک دیا جہاں سے صبح جاتے ہوئے وہ بیٹھی تھی۔

"بیٹا! یہیں اتار دوں یا گھر کے سامنے تک جانا ہے؟" گردن عقب میں موڑے وہ ندی سے پوچھ رہے تھے جو پاؤں ہٹا کر، اِدھر اُدھر اور کبھی سیٹ پر ہی دائیں بائیں کچھ ڈھونڈتی دکھائی دی۔

"نہیں نہیں، گھر نہیں، ادھر ہی ٹھیک ہے۔" اس نے یوں برق رفتاری سے کہا گویا وہ اس کے گھر کی طرف رکشا موڑ چکے ہوں۔

"لیکن چاچا۔۔۔! وہ۔۔۔" انہوں نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"وہ میرا والٹ شاید کہیں گر گیا ہے، مگر پتا نہیں کہاں۔" بے چارگی سے وہ بولی تو وہ چند لمحے اسے دیکھتے رہے اور بولے۔

"چلو خیر ہے کوئی بات نہیں، وہ میرا نصیب ہی نہیں تھے اسی لیے مجھے نہیں مل سکے۔"

"چاچا! معاف کیجیے گا، لیکن میں بے حد شرمندہ ہوں کہ آپ کی سو فیصد جائز کمائی اور حق ادا نہیں کرپائی۔" اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ کس طرح انہیں کرایہ ادا کرے اور اس کا والٹ کب گرا اور کہاں گر گیا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا اور پتا نہ چلنے کی ایک وجہ شاید ہاتھ میں پکڑے گلاسز تھے جنہیں وہ اپنی سوچوں کی پٹڑی پر چلتے چلتے والٹ سمجھے بیٹھی تھی۔

"ہم مسلمان ہیں نا بیٹا! اور ہمارا ایمان ہے کہ جو نصیب میں لکھا ہو وہ مل کر رہتا ہے چاہے کچھ ہوجائے اور جو نہیں لکھا وہ نہیں ملے گا چاہے کچھ ہوجائے۔ وہ پیسے میرے نصیب کے تھے ہی نہیں اس لیے تم فکر نہ کرو اور گھر جاؤ۔" چاچا کے سمجھانے پر وہ رکشا سے اتر آئی تھی کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا۔ سو اچھی طرح چادر کو ایک بار پھر پھیلایا۔ نقاب درست کیا اور گھر کی سمت مڑتے مڑتے ایک بار پھر چاچا کی طرف پلٹی۔

"جو نہیں ملا، وہ لکھا ہی نہیں گیا تھا کیا؟" کتنی حسرت اور بے بسی تھی اس کے لہجے میں۔ چاچا کا بھی دل کھنچ گیا۔ نفی میں گردن ہلائی مگر اس سے پہلے کہ وہ رخ موڑتی پُرشفقت انداز میں بولے۔

"مگر دعا سے نصیب بدل جایا کرتے ہیں بیٹا!"
اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ اس انجان لڑکی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر کر اسے رخصت کرتے۔ اسی طرح جیسے ایک باپ اپنی بیٹی کو کرتا ہے۔ گردن کی ہلکی سی جنبش کے بعد اب وہ تیز قدموں سے چلتی دائیں طرف مڑ گئی تو چاچا نے بھی گہرا سانس لیا اور رکشا اسٹارٹ کر کے کسی نئی سواری کی تلاش میں پہیوں کو سڑک پر دوڑانے لگے۔

اس وقت ندی کی رفتار پہیوں سے کہیں بڑھ کر تھی جبھی گھر کے نزدیک پہنچ کر اچھی طرح دائیں بائیں اور عقب میں دیکھ کر کسی "اپنے" کے نہ ہونے کی یقین دہانی کی اور بالکل لاشعوری طور پر ڈور بیل پر انگلی رکھ کر اپنے مخصوص انداز میں ایک یا دو نہیں تین بار بجا ڈالا۔ ہوش آیا تو تب جب اسی بیل کی آواز اپنی ہی سماعتوں سے ٹکرائی اور تب جو اس نے بیل سے ہاتھ اٹھایا تو اس طرح کہ گویا بیل کے ذریعے اس کے جسم میں ننگی تار کو چھو جانے سے کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ گھر میں عائشہ بھابھی اور ثروت آپا کی موجودگی کی وجہ سے یہ امکان تو ہر گز نہیں تھا کہ امی باہر آ کر گیٹ کھولتیں اور یہ بات بھی سبھی جانتے تھے کہ گھر کے باقی افراد محض ایک دفعہ بیل دے کر انگلی ہٹا لیا کرتے ورنہ اکثر اوقات تو گاڑی کے ہارن سے ہی آمد کی اطلاع مل جاتی جو کہ ایک ہی دفعہ دیا جاتا۔

☆☆☆

فیکٹری اور حویلی میں کچھ اتنا زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ جو فیکٹری میں کام کرتے تھے وہ تو گاؤں ہی کی سواریوں کو اپنے آنے اور جانے کے لیے استعمال کیا کرتے۔ گاؤں کے کتنے ہی لوگ تھے جنہوں نے چنگ چی رکشے کو اپنا روزگار کا وسیلہ بنا رکھا تھا، سو جس نے فیکٹری بھی جانا ہوتا وہ پینتیس چالیس کلومیٹر کے اس فاصلے کو چنگ چی پر بیٹھ کر ہی طے کیا کرتا۔ شہر البتہ کافی فاصلے پر تھا اور گاؤں شہر سے کافی ہٹ کر واقع تھا۔ اس غیر آباد علاقے میں فیکٹری بنانے کا مقصد بھی اپنے گاؤں کے لوگوں کو نزدیک ترین جگہ پر روزگار دینا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ اس فیکٹری میں روزگار دینے سے ان کا ووٹ بینک ارد گرد کے دیہاتوں تک بھی پھیل گیا تھا۔

چند محافظوں کی موجودگی میں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے حویلی پہنچنے تک ان کے ذہن میں شاہ زین کی باتیں اور اس کا انداز ہی گھومتا رہا تھا۔ سرمئی آنکھوں کی چمک ایک انجانی کشش بن کر جیسے انہیں اپنی طرف کھینچتی محسوس ہونے لگی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آنکھیں انہیں پھر سے اپنی جانب بلا رہی تھیں۔ لبوں پر پھیلتی وہ دھیمی سی ہلکی مسکراہٹ اور ان کی باتوں میں لی گئی دلچسپی ان کے دل کو ایک عجیب طرح کا لطف دیتی محسوس ہونے لگی تھی، حالانکہ آج تک وہ کتنے ہی لوگوں سے ملتے رہے تھے، کوئی خوشامد اور مطلب کا چولا اوڑھے ملتا تو کوئی خود انہی کی ذات کو رعب و دبدبہ اور جاہ جلال کے منصب پر بٹھا کر خود عقیدت کا لبادہ پہنے اتنا عاجز ہو جاتا کہ آنکھیں ملانا تو دور کی بات نظریں اوپر کر کے انہیں دیکھنا بھی بے ادبی خیال کرتا۔

ایسے میں شاہ زین جس طرح ان کے ساتھ شریکِ گفتگو ہوا تھا، وہ انداز تو جیسے ان کے دل کو چھو گیا تھا۔ اس کے برعکس میران بھی ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے بے حد محتاط ہوا کرتا، ملکانی سائیں سے چاہے وہ کسی بھی طریقے اور لہجے سے مخاطب ہوتا مگر ان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ادب اس قدر حاوی ہو جاتا کہ باپ اور بیٹے کے بجائے ان دونوں میں بعض اوقات حاکم اور محکوم کا سا رشتہ محسوس ہونے لگتا اور شاید یہی حویلی کی ریت بھی رہی تھی کہ خود وہ بھی اپنے والد کے سامنے ہمیشہ نظریں جھکا کر ہی بیٹھے رہا کرتے۔ بات کرتے ہوئے الفاظ کا چناؤ بھی ناپ تول کر بڑے محتاط انداز میں ہوتا اور ایسے میں وہ اکثر سوچا کرتے کہ وہ اپنے بچوں اور خصوصاً بیٹے کے ساتھ باپ بیٹے کے بجائے دوستی کا رشتہ بنائیں گے۔

یوں بھی دنیا میں میاں بیوی کے رشتے سے لے

کر ماں بیٹی تک، ہر رشتہ میں مٹھاس تبھی شامل ہوتی ہے جب اس میں دوستی کی شیرینی بھی موجود ہو اور خاص طور پر وہ والدین جو اپنی اولاد کی عمروں کو اس طرح تقسیم کر لیں کہ شروع کے دس سال ان کے ساتھ استاد بن کر رہیں۔ گیارہویں سال میں داخل ہونے سے لے کر بیسویں سال کی دہلیز عبور کرنے تک اسی استاد میں دوست ہونے کا روپ شامل کر کے اپنے بچے کا دوست بن جائیں اور اکیسویں برس سے لے کر اکتیس برس کی حد پھلانگنے تک دوست کے رشتے کو نبھاتے ہوئے ان کے لیے ایک گائیڈ، ایک رہنما کے طور پر سامنے آئیں۔ تو یہ ممکن ہی نہیں کہ کبھی ان بچوں یا والدین میں کوئی جنریشن گیپ آئے، اعتماد کا فقدان ہو یا پھر والدین یا اولاد دونوں میں سے کوئی بھی زندگی میں خلا محسوس کرے۔

شاہ سائیں نے جو کچھ اپنی ہونے والی اولاد کے متعلق سوچا تھا اسے پورا نہ کر کے وقتی طور پر تو حالات سے منہ زوری کرتے رہے، ملکانی سائیں کو عمر میں خود سے کہیں بڑا ہونے کی وجہ سے وہ کئی برس تک ذہنی طور پر قبول نہیں کر پائے تھے جبھی دانستہ طور پر نہ کبھی بچوں کو پیار سے بلایا اور نہ ہی ملکانی سائیں سے بھی ڈھنگ کی بات کی۔ بچوں اور ان کے درمیان بڑھنے والے فاصلوں کی بنیادی وجہ بھی یہی تھی اور ملکانی سائیں تو پھر خود کو زیور اور میک اپ سے آراستہ رکھ کر ان کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتیں مگر بچے۔۔۔ وہ تو ظاہر ہے کسی بھی طرح کے ایسے ان ڈائریکٹ راستے سے ناواقف تھے جس سے ان کا پیار اور توجہ حاصل کی جا سکتی۔

جب انہیں اس چیز کا خیال آیا تو ظاہر ہے کہ وقت گزر چکا تھا۔ سو کفارے ہی کے طور پر سہی، انہوں نے مہربانو کو تمام روایات توڑ کر نہ صرف ہائی اسکول تک بھیجا بلکہ کالج اور پھر طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہاسٹل تک میں قیام کی اجازت دے ڈالی۔ برادری یا رشتے دار کیا کہہ رہے ہیں، اس بات کی البتہ انہیں فکر نہیں تھی۔

دوسری طرف میران شاہ جسے ننھیال والے ویسے بھی شاہ سائیں کی طرف سے توجہ نہ دینے پر خصوصی لاڈ پیار سے نوازتے اور اس کی ہر خواہش کی تکمیل کرتے، اسے جب شاہ سائیں کی طرف سے بھی توجہ ملنا شروع ہوئی تو اس نے خود کو گویا ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا۔ شروع ہی سے ننھیال والوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کے باعث البتہ اس کے ذہن میں خود کو باقی تمام سے برتر سمجھنے والی بیماری ضرور موجود تھی۔ اس کے برعکس شاہ زین کے انداز و اطوار اور بغیر کسی بناوٹ یا ملمع کے سادہ بھی تھے اور بہترین بھی۔

حویلی میں شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور ملکانی سائیں کا نہ صرف خیال تھا بلکہ پر زور خواہش بھی تھی کہ مہربانو اور رحمن شاہ کی شادی بھی مہران کے ساتھ ہی کر دی جائے۔ ہتھیلی پر سرسوں اگانے کا محاورہ ان کی باتوں کے بالکل حسب حال تھا۔ ان کے بھائیوں نے کب اس رشتے کے لیے ہاں کی اور کب اتنے بڑے فیصلے ہوئے انہیں اس تمام معاملے سے قطعی طور پر لاعلم رکھا گیا تھا اور اب مسئلہ آن پڑا تھا انا اور زبان کا۔

انہیں لگتا تھا کہ بیٹھے بٹھائے اُن کا پورا وجود ایک الجھے ہوئے ریشم میں جکڑ دیا گیا ہو۔ نہ کوئی سرا ہی سامنے نظر آتا اور نہ کوئی دوسرا نفس، جو انہیں اس سے آزاد کروا پاتا، اسی الجھن میں شکار اُن کی قیمتی گاڑی حویلی کے بلند و بالا آہنی گیٹ کے سامنے رکی ہی تھی کہ ہارن کی آواز پر بجلی کی سی رفتار پر چوکیدار نے یوں گیٹ کھولا کہ ابھی ہارن بھی پورا نہ ہو پایا۔ پورچ میں گاڑی کے جانے تک انہوں نے تنقیدی نظروں سے دائیں بائیں موجود وسیع و عریض لان کو دیکھا۔ ملازمین ہر درخت اور پودوں کے پھول پتوں کو بھی جگمگاتی ہوئی لائٹوں سے سجا دینا چاہتے تھے تاکہ سورج غروب ہونے پر جب اُن میں برقی رو دوڑنے لگے تو پوری حویلی بقعۂ نور دکھائی دے۔

وقت کم اور مقابلہ سخت ہونے کے مصداق زیادہ

ملازمین کو کام میں شامل کیا گیا تھا تاکہ جلد از جلد سجاوٹ اور آرائش کی اصل شکل سامنے آسکے۔ حویلی کی چھت اور دیواروں پر قمقمے سجانے کا کام الگ الگ گروپس کی شکل میں کیا جا رہا تھا۔ شاہ سائیں جیپ سے نکلے تو ایک عجیب سی کیفیت کا شکار تھے۔ ان کی سمجھ سے باہر تھا کہ وہ اس ہونے والے جشن پہ خوش ہوں یا بیٹی کے مستقبل پر لٹکتی تلوار سے غمگین۔ اُن کے اندر موجود یہ دھوپ چھاؤں کا منظر جیسے ان کا ذہن شل کیے دے رہا تھا۔ جبھی گاڑی کو پھر پورچ میں لا کر بے دلی سے باہر نکلے اور انہی سوچوں میں گم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے تمام تیاریوں اور گہما گہمی کو نظر انداز کرتے سیدھے اپنے بیڈ روم جا پہنچے، جہاں وہ کچھ دیر تنہائی اور تاریکی میں صرف اپنے ساتھ وقت گزارنا چاہتے تھے۔ مگر دروازہ کھولتے ہی ناگواری سے ان کی پیشانی پر اس وقت شکنیں ابھر آئیں جب میران اور ملکانی سائیں وہیں بیٹھے میران کی کی گئی شاپنگ دیکھ رہے تھے۔

"شاہ سائیں! میرا تے خیال ہے کہ مہربانو آ کے اپنی مرضی تے پسند کے کپڑے خریدے۔" مختلف ڈیزائنرز کے خوب صورت اور دیدہ زیب لباس جو میران اپنی پسند کے اپنی ہونے والی دلہن کے لیے خرید کر لایا تھا۔ ملکانی سائیں نے ایک طرف رکھتے ہوئے انہیں مخاطب کیا تو وہ بغیر کوئی جواب دیے خاموشی سے بیٹھ گئے۔ شاید ملکانی سائیں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اس وقت اپنے اندر ہوتی اعصاب کی جنگ کے کس سنگین اور پُرخطر مرحلے پر ہیں۔

یوں بھی اعصاب کی جنگ، احباب کی جنگ سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتی ہے اور اس میں صرف وہی لوگ کامیاب قرار پاتے ہیں جو کسی بھی قسم کے غیر متوقع اور مشکل حالات میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اعصاب کی اس جنگ میں احباب کا بھی ساتھ حاصل ہو تو فتح پکے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں آ گرتی ہے۔ میران نے ان کی اس خاموشی، تھکے ہوئے انداز اور اکتاہٹ کو تشویشی نظروں سے دیکھا اور جان بوجھ کر نظریں یہاں وہاں گھماتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے بابا سائیں؟ فیکٹری میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے کیا؟" یہ سوال اس نے بالکل اپنی مرضی کے خلاف پوچھا تھا ورنہ اس وقت تو وہ چاہتا تھا کہ صرف اور صرف اس کی شادی کی بات چیت ہو، تیاریاں کیسی جا رہی ہیں؟ انتظامات اب تک مکمل ہوئے کہ نہیں؟ اور کچھ تو نہیں چاہیے؟ تمام فنکشنز شان دار ہونے چاہئیں اور وہ بھی ایسے کہ آج تک کسی کے نہ ہوئے ہوں وغیرہ وغیرہ۔۔۔

مگر اس تمام کے برعکس شاہ سائیں نے پہلے تو جس طرح چونک کر اندر آتے ہی انہیں دیکھا پھر دیکھنے کے بعد ناگواری کے جو تاثرات ان کے چہرے پر ابھرے اور اس کے بعد سامنے رکھے زرق برق لباس دیکھ کر کسی بھی قسم کی خوشی کا اظہار کیے بغیر جس طرح بددلی سے وہ صوفے پر ڈھے گئے تھے یہ سب میران شاہ نے بھی محسوس کیا تھا اور ملکانی سائیں نے بھی۔ مگر اپنے تئیں دونوں ہی نے یہ ظاہر کیا تھا کہ ان کے یہ تمام تاثرات وہ نوٹ نہیں کر پائے ہیں، جبھی اپنی ہی دھن میں ملکانی نے انہیں مخاطب تو کیا مگر کسی بھی قسم کا جواب نہ پا کر میران کی طرف متوجہ ہوئیں تو اس نے شادی کی تقریبات وغیرہ سے بالکل ہٹ کر مکمل طور پر ایک مختلف سوال پوچھا اور حسب توقع جواب بھی آگیا۔

"نہیں، مسئلہ تو خیر ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔" ایک اچٹتی نظر سامنے پڑے عروسی ملبوسات پر ڈالتے ہوئے بند ہونٹوں کے اندر یونہی جبڑوں کو حرکت دیتے ہوئے وہ بولے تو ملکانی سائیں پھر بول پڑیں۔

"فیکٹری وچ وی مسئلہ کوئی نہیں تے پھر پریشان کیوں ہو؟" شاہ سائیں نے ملکانی سائیں کی بات سنی مگر اسی طرح گویا کہ نہ سنی ہو۔

"میران! تمہیں میں نے ایک روز کہا تھا کہ کبھی کبھار فیکٹری کا چکر لگا لیا کرو، کتنی دفعہ گئے ہو آج تک وہاں؟" ایک اور سوال اور وہ بھی موقع اور محل سے بالکل متضاد۔۔۔ دل ہی دل میں میران بھنا

کر رہ گیا تھا مگر ظاہر ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا جبھی آواز کو دھیما رکھتے ہوئے بولا۔

"بابا سائیں! جانا تو تھا مگر پچھلے دنوں مصروفیت کچھ ایسی رہی کہ چاہنے کے باوجود بھی جا نہیں سکا۔"

"شکار اور دوستوں کے علاوہ بھی دنیا میں بہت کچھ ہے، بہت لوگ ہیں، مگر تم کبھی غور کرو تو تب نا۔۔۔" میران خاموش رہا، بس چلتا تو وہاں سے اٹھ کر چلا جاتا مگر شاہ سائیں کے رعب کے سامنے یہ بات صرف سوچی جا سکتی تھی، اس پر عمل کرنا میران شاہ کے لیے ناممکنات میں سے تھا۔

"کسی بھی کام کو ہیڈ کرنے کے لیے پہلے اس کام سے مکمل واقفیت ہونا لازمی ہوتا ہے نا۔" میران کی تائید چاہتے ہوئے وہ رکے اور تائید میں اس کے سر ہلانے پر پھر بولے۔

"بڑھئی سے لے کر صنعت کار تک جب تک وہ خود اپنے کام سے واقف نہیں ہوگا وہ دوسروں سے کام نہیں لے سکے گا، ناواقف ہوا تو اسے کیا پتا کون سا کاری گر کیا ڈنڈی مار رہا ہے یا پھر کام میں کس طرح ردوبدل کر کے اسے مزید کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔"

"جی بابا سائیں!"

"بس اسی لیے تمہیں کہا تھا کہ فیکٹری جا کر دیکھو کہ ہمارا کام کیا ہے، کس طرح کیا جاتا ہے، مگر تمہیں تو شاید یہ بھی پتا نہ ہو کہ ہماری فیکٹری ہے کس چیز کی؟"

"نہیں بابا سائیں! ایسی بات نہیں ہے۔" ان کے طنز پر وہ کھسیا گیا تھا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے کل سے دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے اپنی مرضی کے منتخب کردہ ایک گھنٹے میں تم فیکٹری جاؤ گے۔" شاہ سائیں نے گویا مختصر فیصلہ جاری کیا تھا۔

"پر شاہ سائیں! اناں دناں وچ تے شادی ویاہ دے سو کم۔۔۔"

"شادی بیاہ کے وہ سو کام صرف فون کال پر ہونے ہیں۔ کرنے والے لوگ بھی ہیں اور نگرانی والے بھی اور پھر میں پورے دن کے لیے اسے فیکٹری نہیں بھیج رہا ملکانی سائیں۔۔۔! صرف ایک گھنٹہ کہا ہے اور میران! تم تو اچھی طرح جانتے ہو نا میرے ایک گھنٹے میں پانچ دس منٹ نہیں پورے ساٹھ منٹ ہوتے ہیں۔" میران کی امداد طلب نظروں پر ملکانی نے اسے مدد فراہم کرنے کی کوشش تو ضرور کی مگر شاہ سائیں نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی۔ البتہ میران شاہ خاموشی سے بیٹھا تھا۔

"جی بابا سائیں! جانتا ہوں۔"

"شاباش! ایک ایک ہفتہ ہر ڈیپارٹمنٹ ہیڈ کے ساتھ ان کے آفس میں بیٹھو، کام کو سمجھو، ان کا طریقہ کار دیکھو، اب تمہاری شادی ہونے جا رہی ہے تو ذمہ داریوں کا بھی تو کچھ احساس بڑھنا چاہیے نا۔"

"تے جدوں شادی ہوئی اس دن وی۔۔۔؟" ملکانی سائیں کو ابھی تک پریشانی لاحق تھی کہ یہ شاہ سائیں کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھ رہا ہے۔ بجائے اس کے کہ شادی کے معاملات پر بات کریں وہ کاروبار کے لیے فکرمند نظر آ رہے ہیں۔

"نہیں نہیں، شادی کے لیے تو چھٹیاں مل جائیں گی۔" اس بار وہ ہلکا سا مسکرائے تھے۔

"پیکنگ ڈیپارٹمنٹ کا ہیڈ بہت اچھا اور نفیس لڑکا ہے۔ تعلیمی قابلیت تمہاری طرح ماسٹرز بھی نہ ہونے کے باوجود انتہائی گہری نظر ہے اس کی تمام کاروباری امور پر۔۔۔ میرا خیال ہے اپنا پہلا ہفتہ تم اسی کے ساتھ گزارو، کیونکہ اس کے ساتھ رہ کر تم نہ صرف کاروبار کو اچھی طرح سمجھ جاؤ گے بلکہ ہو سکتا ہے اس کی شخصیت کی خوب صورتی اور خیالات کی میچورٹی بھی تمہاری ذات میں مثبت تبدیلی کا باعث بنے اور میں خود آج اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" ایک تنخواہ دار ملازم کی اپنے مقابلے میں ہونے والی اس قدر تعریف نے اس کا منہ بدمزا کر دیا تھا۔ شکایتی نظروں سے ملکانی سائیں کو دیکھا مگر ظاہر ہے کہ شاہ سائیں نے کہہ دیا سو تعمیل تو کرنا ہی تھی ورنہ کوئی اس کے دل سے پوچھتا تو پتا چلتا کہ وہ اس وقت اس بے وقت کی راگنی پر کس طرح نوحہ کناں تھا۔

(باقی آئندہ)

فوزیہ یاسمین

دستِ کوزہ گر

زوبیہ کو اپنے گھر میں اپنی خالہ شائستہ کی روح نظر آتی ہے۔ مگر وہ اس سے بات نہیں کرتی... مگر زوبیہ ان سے بات کرنے کے لیے بے حس ہے۔ میں اس کی ملاقات رخسار سے ہوتی ہے۔ جو اس کے کالج میں ساتھ پڑھتی ہے اور روحوں سے بات کرنے کا دعوا بھی کرتی ہے... رخسار اسے رات کے دو بجے اپنے گھر کی چھت پر لے جاتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس کی خالہ کی روح کو بلائے... اور روح کو بلانے کی کوشش کرتی ہے۔

رگو میلہ، سنبل اور نمل کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل جاتا ہے... اور اسی خوشی میں نمل ان دونوں کو پیلس میں لنچ کی دعوت دیتی ہے... اس آفر پر دونوں حیران رہ جاتی ہیں۔ جبکہ دوسری طرف خرم، ذکی سے شرط ہارنے کے بعد اس کی عجیب و غریب شرط کو قبول کر لیتا ہے۔ اور انہیں پیلس میں لنچ کے لیے کہہ دیتا ہے۔

زوبیہ اپنی خالہ سے بات کرنے کے بعد بہت مطمئن ہوتی ہے... رخسار اس کے بے وقوف بن جانے پر خوش ہے... وہ دونوں واپس جانے کے لیے سڑھیوں کی طرف بڑھتی ہیں کہ اچانک لائٹ چلی جاتی ہے... اور کوئی رخسار کو اندھیرے میں زخمی کر دیتا ہے... اب آگے پڑھیں۔

۴۳ تینتالیسویں قسط
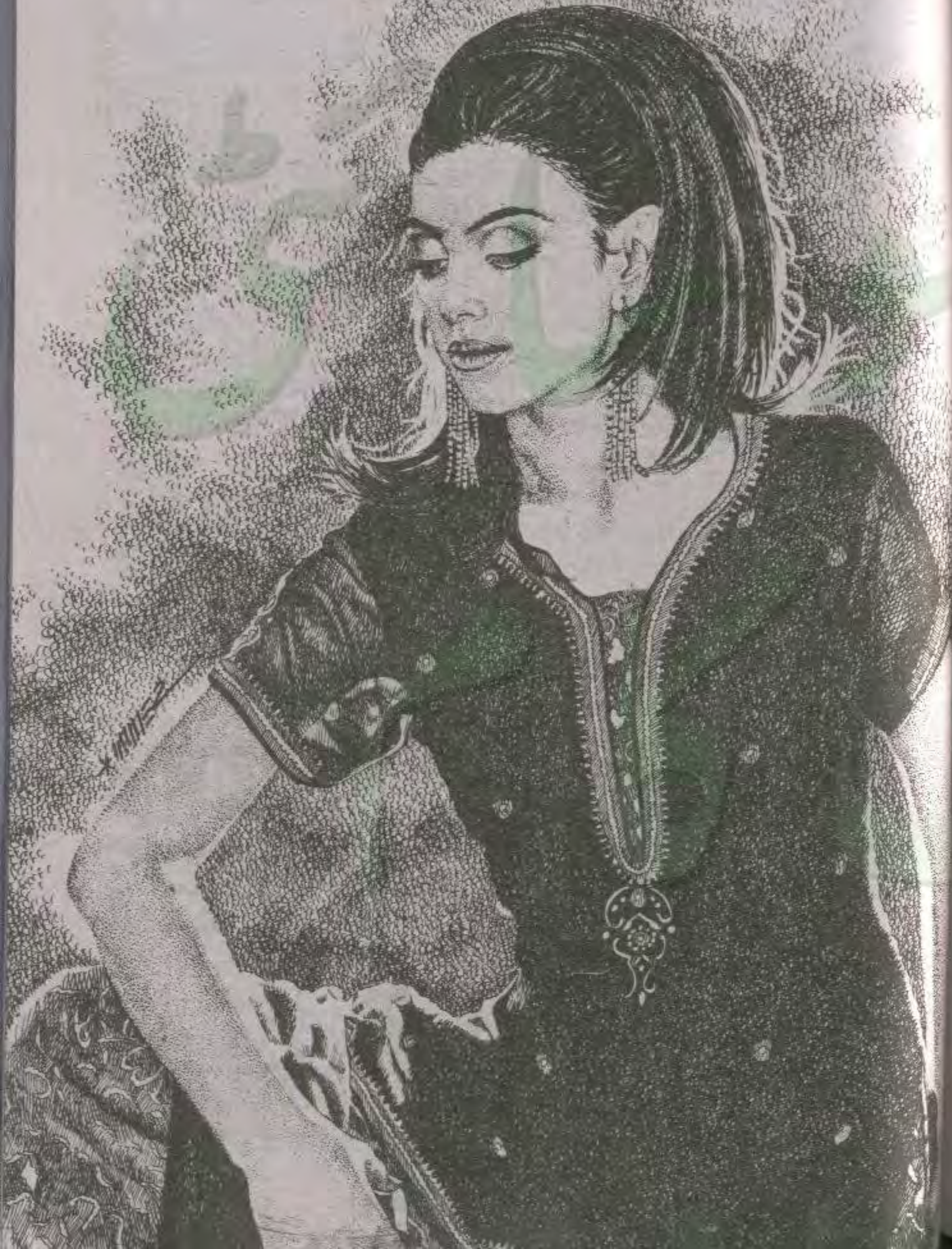
نانی اماں کچھ ٹھٹک کر شگفتہ غفار کو دیکھنے لگیں انہوں نے جس طرح رومیلہ کے بھائی کا ذکر نفرت سے کیا تھا اسے سن کر نانی اماں کو پہلے ہی کسی بہت بری اطلاع ملنے کا یقین ہو گیا وہ پوری توجہ سے شگفتہ غفار کے ایک ایک انداز کا مشاہدہ کرنے لگیں جو ایسے بول رہی تھیں جیسے لوہے کے چنے چبا رہی ہوں۔

"ابرار نے ہم سب کو جیتے جی مار دیا اس نے بریرہ کو شادی سے دو دن پہلے پارلر سے اغوا کر لیا تھا..."

"کیا؟" نانی اماں جو بڑے غور سے انہیں سن رہی تھیں ایک دم اچھل پڑیں شگفتہ غفار ان کا رد عمل دیکھ کر ذرا سا ہچکچائیں پھر تنک کر کہنے لگیں۔

"جی ہاں... سب مجھے سمجھاتے رہتے ہیں رومیلہ کے ساتھ بہتر طریقے سے پیش آؤ کوئی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ میرے اوپر کیا بیت رہی ہے۔

میری بیٹی دو دن بعد دلہن بننے والی تھی اور کسی اجنبی انجان شخص نے اسے کڈنیپ کر لیا اور فون کر کے تعاون کے طور پر میرے بیٹے کو پیلس ہوٹل میں بارات لے کر آنے پر مجبور کیا تو بھلا میں وہ شادی خوشی کیسے کر سکتی ہوں اور اس لڑکی کو بطور بہو کیسے قبول کر سکتی ہوں۔" شگفتہ غفار ٹھنک کر بولیں۔

نانی اماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے شگفتہ غفار کو دیکھتی چلی گئیں۔

"یقین نہیں آ رہا نا۔ بریرہ تو آج آپ کے سامنے ہے اور صحیح سلامت ہے ذرا اس وقت کا سوچیں جب وہ پارلر کے لیے نکلی اور گھر نہیں آئی بلکہ کافی دیر بعد ایک فون آیا کہ آپ کی بیٹی اغوا ہو گئی ہے۔

مجھے جب یہ پتا چلا کہ بریرہ کہیں نہیں مل رہی میں تو تب ہی بے ہوش ہو کر ہسپتال میں داخل ہو گئی تھی مجھے تو بہت بعد میں پتا چلا ہے کہ بریرہ کو باقاعدہ پلان بنا کر اغوا کیا گیا ہے۔" شگفتہ غفار کی آنکھوں کے سامنے وہ تمام تکلیفیں کسی فلم کی طرح چلنے لگیں تو ان کی آواز رندھ گئی وہ تھوڑا توقف کرنے رکیں تو نانی اماں کانپتے لہجے میں کہنے لگیں۔

"ات... اتنا کچھ ہو... ہو گیا اور تم نے ہمیں بتایا تک نہیں۔"

"کیسے بتاتی بریرہ کی شادی سر پر تھی۔ بھائی جان کو معلوم ہو جاتا تو وہ لوگ تو رشتہ ہی ختم کر دیتے اتنی بدنامی میں کیسے برداشت کرتی اس وقت ابرار نے بریرہ کو آزاد کرنے کی یہی شرط رکھی تھی کہ اس کی بہن سے الیان دو دن کے اندر اندر شادی کر لے اور کسی کو اپنے ساتھ لائے بھی نہیں بس میں اور ریاض اس کے ساتھ بارات میں آئیں۔" شگفتہ غفار بے بسی سے بولیں۔

نانی اماں ششدر سی انہیں دیکھے جا رہی تھیں ان کے لیے یہ صدمہ برداشت کرنا آسان نہیں تھا شگفتہ غفار نے انہیں سکتے میں دیکھ کر تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"اللہ کا شکر ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بریرہ کا دامن داغ دار نہیں ہوا ابرار نے اسے عزت کے ساتھ واپس بھیج دیا مگر ظاہری بات ہے بریرہ کا اغوا ہونا کوئی چھوٹی بات نہیں کہ میں اسے بھول کر رومیلہ کو ہنسی خوشی قبول کر لوں۔" شگفتہ غفار نے اپنی صفائی دی تو نانی اماں بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں شگفتہ غفار بے اختیار ان کے سینے سے لگ کر خود بھی ان کے ساتھ رونے لگیں۔

کتنی دیر وہ دونوں ماں بیٹی آنسو بہاتے رہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے ایک دوسرے کو تسلی بھی دیتے رہے۔

کافی دیر بعد جب دونوں کا غبار نکل گیا۔ شگفتہ غفار نے اٹھ کر نانی اماں کے لیے پانی نکالا جسے پی کر نانی اماں ہنکارہ بھرتے ہوئے بولیں۔

"سچ بہت کڑوا ہوتا ہے شگفتہ۔ میں تو ماں ہوں میں نے تو تمہارے کہے پر یقین کر لیا کہ بریرہ جیسی گئی تھی ویسی ہی آ گئی لیکن حامد اور یہاں تک کہ تمہارا اپنا سگا بھائی بھی تمہاری اس بات پر کبھی یقین نہیں کرے گا۔

اللہ تعالیٰ اس راز کو ہمیشہ راز ہی رکھے ورنہ اول تو حامد اسے کبھی بھی اپنے ساتھ نہیں رکھے گا اور بالفرض اگر وہ رکھ بھی لیتا ہے تب بھی تمہاری بھابھی اسے طعنے مار مار کر اس کا جینا حرام کر دے گی۔" شگفتہ غفار اس حقیقت

سے واقف تھیں پھر بھی یہ بات اماں کے منہ سے سن کر وہ نئے سرے سے فکر مند ہو گئیں۔

ان کے چہرے پر تفکرات کا جال پھیلا دیکھ کر نانی اماں ناصحانہ انداز میں کہنے لگیں۔

"میں تمہیں ڈرا نہیں رہی صرف احساس دلا رہی ہوں کہ اس راز پر پردہ پڑا رہنا کتنا ضروری ہے۔

کیونکہ تم تو بڑی ناسمجھی کا مظاہرہ کرتی رہی ہو اگر رومیلہ کا بھائی اتنا خطرناک ہے وہ ایک دفعہ بریرہ کو اغوا کر کے اپنا مطالبہ منوا سکتا ہے تو اس حقیقت سے پردہ ہٹا کر وہ تم لوگوں کے رومیلہ کے ساتھ ناروا سلوک کا بدلہ بھی لے سکتا ہے۔

کیونکہ ایک بات تو طے ہے کہ وہ ایک خود غرض انسان ہے اس نے الیان کے ساتھ رومیلہ کی شادی بہن کا گھر بسانے کے لیے نہیں کی بلکہ اس کی شادی ٹوٹ گئی تھی لہٰذا محض اپنی انا کی تسکین کے لیے اسی وقت اس کی شادی کردی جس دن اس کی شادی ہونا طے ہوئی تھی۔

اس لیے اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اس زبردستی کی شادی کے نتیجے میں اس کی بہن تو رل کر رہ جائے گی اسے اپنے گھر میں نا عزت ملے گی نہ محبت ملے گی اور نہ ہی تحفظ کا احساس ملے گا۔

پھر بھی اس نے اپنی جان چھڑانے کے لیے یہ شادی کر ڈالی اب اگر تم لوگ اس کے ساتھ برا سلوک کرتے ہو یا جو بھی کرتے ہو وہ یقیناً "اپنے گھر میں نہیں بتاتی تب ہی اس کا بھائی خاموشی سے بیٹھا ہوا ہے۔

ورنہ وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ اس کی بہن کا گھر بھی بریرہ کے گھر کے ساتھ اجڑ جائے گا وہ بریرہ کو برباد کرنے کے لیے اس راز کو اب تک کھول چکا ہوتا۔" نانی اماں کہتی چلی گئیں شگفتہ غفار نہ چاہتے ہوئے بھی بڑے غور سے انہیں سنتی رہیں اسی لیے جب وہ خاموش ہوئیں تو شگفتہ غفار ایسے بولیں جیسے نیند میں بول رہی ہوں۔

"ہاں یہ یقین تو مجھے بھی ہے کہ وہ اپنے گھر میں کچھ نہیں بتاتی تھی ورنہ اس کا بھائی بلیک میل کرنے کے لیے کم از کم فون کر کے تو ضرور ڈراتا۔

اب پتا نہیں وہ کیا کرے گا۔" شگفتہ غفار گہری سانس کھینچتے ہوئے بولیں۔

"اگر تم سمجھداری سے کام لو تو اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، جس طرح تم نے رومیلہ کے متعلق اپنی دوستوں سے باتیں کی تھیں وہ بہت ہی نازیبا حرکت تھی اور اب یہ جاننے کے بعد کہ یہ شادی کن حالات میں ہوئی ہے میں تو صاف کہوں گی تم نے حماقت کی حد کردی تھی۔

اللہ کا شکر ادا کرو کہ رومیلہ میں اتنا ضبط ہے جو وہ اتنی بے عزتی برداشت کر گئی ورنہ لڑکیاں تو ذرا سی سسرال میں تکلیف پہنچتی ہے تو اسے بڑھا چڑھا کر بتاتی ہیں میکے میں جیسے دنیا میں ان سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں۔

لیکن تم اس کی خاموشی کو اس کی کمزوری نہیں سمجھو ویسے بھی کسی کے صبر کو آزمانا اچھی بات نہیں۔ اگر تم بار بار اس طرح کرو گی تو ہو سکتا ہے وہ بھی کسی دن اپنے گھر میں سب بتا دے بھلے ہی بعد میں اسے بھی افسوس ہو اپنی جلد بازی پر۔ لیکن اس وقت اس کا اور تمہارا دونوں کا پچھتانا بے کار ہو جائے گا۔

ابرار سے مجھے تو کسی بھلائی کی امید نہیں اگر تمہیں بریرہ کی خوشیاں عزیز ہیں تو تمہیں رومیلہ کو ساری زندگی برداشت کرنا ہوگا۔ ویسے بھی اس کے بھائی نے چاہے جو بھی کیا ہو رومیلہ میں تو کوئی برائی نہیں ہے نا۔

مجھے تو وہ بچی بہت پسند ہے تم اپنے دل میں اس کے لیے تھوڑی گنجائش نکالو تو تمہیں احساس ہو گا اس کے بھائی کے کیے کی سزا اسے دے کر نہ تم سکون میں ہو اور نہ وہ۔ تمہارا واسطہ تو رومیلہ سے ہے کیوں اس کے بھائی کی وجہ سے اپنے گھر کا سکون غارت کر رہی ہو۔ الیان کے بارے میں سوچو گھر کے اس ماحول کی وجہ سے اسے کتنی ذہنی اذیت ہوتی ہوگی۔

وہ تو دوہرے عذاب سے گزر رہا ہے جس شخص نے اس کی بہن کو اغوا کیا وہ اسی کی بہن کو اپنی عزت بنا لایا ہے اور اس پر تمہارا بار بار گھر میں کسی نہ کسی بات کو لے کر فضیحتہ کرنا۔ اگر اس نے غصے میں کسی دن کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا تو سب سے زیادہ نقصان تمہیں ہی برداشت کرنا پڑے گا۔" نانی اماں اپنے مخصوص ٹھنڈے محبت بھرے میٹھے لہجے میں بول رہی تھیں۔

ان کی بات ختم ہونے تک شگفتہ غفار کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"وہ انتہائی قدم الیان اٹھا چکا ہے۔" شگفتہ غفار کا لہجہ خود بخود تلخ ہو گیا۔

"کیا مطلب؟" نانی اماں سمجھ نہ سکیں۔

"الیان نے رومیلہ کو طلاق دے دی ہے۔"

"کیا؟" نانی اماں چیخ پڑیں۔

"یہ۔۔۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو شگفتہ۔" ان کی آواز پھٹ گئی تھی انہوں نے بے اختیار شگفتہ غفار کا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

"میں نے اسے سمجھایا تھا۔ اسے بہت منع کیا تھا بریرہ کی عزت کی دہائیاں دی تھیں لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔" شگفتہ غفار ایک بار پھر رونے لگیں۔

مگر اس بار نانی اماں کو ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہوئی وہ ان کے کندھے پر دو ہتڑ مارتے ہوئے ماتم کرنے والے انداز میں بولیں۔

"یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے تم نے کیا خاک سمجھایا ہوگا اسے۔ یہ نوبت تمہاری قینچی جیسی زبان کی وجہ سے ہی آئی ہے کہ الیان نے تمہاری سنی نہیں۔

بڑا غرور تھا نا تمہیں کہ تمہاری مرضی کے بغیر وہ سانس بھی نہیں لے سکتا۔

ہائے اللہ یہ سب دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہیں گئی۔ کب ہوا ہے یہ سب کتنے دن ہو گئے؟"

"کل رات ہی رومیلہ اپنے گھر واپس چلی گئی ہے اب تک تو اس نے اپنے گھر میں بھی بتا دیا ہوگا۔" شگفتہ غفار کی بات پر نانی اماں رونا دھونا بھول کر خوفزدہ انداز میں شگفتہ غفار کو دیکھنے لگیں۔

شگفتہ غفار کا اپنا دل تب سے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا اب نانی اماں کی آنکھوں میں بھی وہی خوف دیکھ کر وہ بری طرح ہراساں ہو گئیں۔

"تب سے میری جان سولی پر لٹکی ہوئی ہے میں مانتی ہوں الیان نے یہ سب میرے رویے سے تنگ آ کر کیا ہے لیکن مجھ سے غلطی ہوئی تھی سو ہو گئی اب بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"کیا کر سکتی ہو۔" نانی اماں بگڑ کر بولیں۔

"اگر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا یا تمہیں بریرہ کی زندگی کی پروا ہوتی تو کل رومیلہ کے اپنے گھر چلے جانے کے بعد تم منہ اٹھا کر یہاں نہیں آ جاتیں بلکہ اس کے گھر جاتیں اس کے والد اور بھائی سے بات کرنے۔ ان سے معافی مانگنے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کرتیں کہ ان کا غصہ بھڑکنے کی بجائے ٹھنڈا ہو جائے۔

ہو سکتا ہے تمہارے منت سماجت کرنے سے اس کے بھائی کا دل پسیج جاتا لیکن تم۔۔۔ تم وہ عورت ہی نہیں ہو جو گھر بسانے اور اپنے اردگرد سب کو خوش رکھنے کے لیے اپنی انا کو مار سکے۔

تم یہاں بیٹھو اور دیکھو کہ ابرار کیا قدم اٹھاتا ہے اور بریرہ پر کیا گزرتی ہے میں ابھی اور اسی وقت شہر کے لیے نکل رہی ہوں۔" نانی اماں ایک دم بستر سے اتر آئیں۔

"اس وقت۔" شگفتہ غفار حیرانی سے بولیں۔

"جب انسان کے دل و دماغ میں آگ لگی ہو تو وہ وقت نہیں دیکھتا اور تمہارے شہر میں تو اس وقت سویرا مانا جاتا ہے۔ ابھی نکلوں گی تو صبح تک پہنچ سکوں گی۔

مجھے فوراً" رومیلہ سے ملنا ہے پتا نہیں اس بچی کی قسمت میں کیا لکھا ہے پہلے شادی ہوتے ہوتے رک گئی اور اب شادی ہو کر اتنی کم مدت میں ٹوٹ گئی۔

اپنے طور پر تو اس نے تم لوگوں کا بھرم رکھنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن کچھ لوگوں کے نصیب میں آزمائشیں زیادہ ہوتی ہیں۔" پاؤں میں چپل اڑستے ہوئے نانی اماں ایک سانس میں بولے گئیں کبھی ان کا لہجہ گلوگیر ہو جاتا تو کبھی انہیں طیش آنے لگتا۔

"لیکن اماں آپ اس وقت کیسے نکلیں گی؟" شگفتہ غفار حیران پریشان سی بولیں۔

"کہہ دوں گی رومیلہ کی طبیعت خراب ہو گئی ہے اسے دیکھنے جا رہی ہوں ویسے بھی جو ہو چکا ہے اسے کتنے دن چھپاؤ گی۔ ایک دن تو گھر میں سب کو پتا چلنا ہی ہے۔" اور واقعی جب باہر نکل کر انہوں نے رومیلہ کی طبیعت خرابی کا ذکر کیا تو کسی نے بھی ان کے جانے پر اعتراض یا حیرانی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ممانی جان نے انہیں فوراً" جانے کا مشورہ دیتے اپنے چلنے کی خواہش کا بھی اظہار کر دیا۔

لیکن نانی اماں اس وقت انہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتی تھیں انہوں نے بڑی خوب صورتی سے انہیں فی الحال یہیں رکنے کا کہہ کر ٹال دیا اس کا عذر انہوں نے یہ دیا کہ اب وہ بریرہ کی ساس ہیں ان کے جانے سے شگفتہ خواہ مخواہ کی مہمانداری میں لگ جائے گی جس پر رومیلہ کو بھی طبیعت خراب ہونے کے باوجود اٹھنا پڑے گا۔

یہ ایک نہایت معقول بہانہ تھا جس پر وہ فوراً" خاموش ہو گئیں اور نانی اماں اور شگفتہ غفار ڈرائیور کے ساتھ اسی وقت نکل گئیں جب وہ دونوں گھر پہنچی تھیں تو صبح ہو چکی تھی ریاض غفار اور الیان دونوں آفس جا چکے تھے۔

شگفتہ غفار چاہ رہی تھیں کہ نانی اماں نے ابھی اتنا لمبا سفر کیا ہے وہ کچھ دیر ستا لیں پھر ظہر کے وقت رومیلہ کے گھر جانے کے لیے نکلیں گے مگر نانی اماں اس کے لیے تیار نہ ہوئیں۔

انہوں نے ہاتھ منہ دھو کر صرف کپڑے بدلے اور ایک کپ چائے تک پیے بغیر رومیلہ کے گھر پہنچ گئیں۔

ان کے گھر کے دروازے کی گھنٹی بجاتے وقت شگفتہ غفار کا دل حلق میں دھڑک رہا تھا۔

انہیں اپنا یہاں آنا قطعی مناسب نہیں لگ رہا تھا وہ بھی الیان اور ریاض غفار کے علم میں لائے بغیر۔ مگر نانی اماں نے انہیں مطلع کرنے سے سختی سے منع کر دیا تھا اور اس وقت وہ ان کے سامنے کچھ مجرمانہ احساسات کا شکار ہونے کے باعث بالکل بحث اور تکرار نہ کر سکیں۔

مگر رومیلہ کے گھر میں داخل ہوتے وقت ان کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے حالانکہ نانی اماں نے انہیں تسلی دی تھی کہ اس وقت ابرار گھر پر نہیں ہوگا ہم رومیلہ کے والد سے مل لیں گے ایک دفعہ ان سے بات کر چکے ہوں گے تو پھر ابرار سے دوبدو بات کرنے کی بجائے فون پر معافی تلافی کر لینا زیادہ آسان ہوگا۔

شگفتہ غفار خود ابرار کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھیں لہٰذا انہیں یہ تجویز بڑی تسلی بخش محسوس ہوئی ملازم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر چلا گیا تو شگفتہ غفار گھبرائی ہوئی آواز میں بولیں۔

"آپ نے تو سیدھا رومیلہ کے والد کو بلا لیا پہلے اس کی بھابھی کو بلا کر ان سے بات کر لینی چاہیے تھی عورتوں سے بات کرنا پھر بھی آسان ہوتا ہے۔"

"بزرگوں کے ہوتے ہوئے بچوں سے بات کرنا آسان چاہے جتنا بھی ہو مناسب قطعاً" نہیں ہے۔" نانی اماں کچھ پڑھ رہی تھیں مگر شگفتہ کے ہوائیاں اڑتے چہرے کو دیکھ کر رک کر دھیمی آواز میں بولیں اور پھر دعائیں پڑھنے میں مشغول ہو گئیں شگفتہ غفار صرف انہیں دیکھ کر رہ گئیں۔

مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ رومیلہ کے پاپا ملازم کے اطلاع دینے پر حواس باختہ سے ڈرائنگ روم میں چلے آئے تھے ان پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں کھڑی ہو گئیں شگفتہ غفار نے فوراً" سلام کیا تو انہوں نے گھبرائے ہوئے انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔

"آپ۔۔۔ بیٹھیں نا۔۔۔ آپ اس وقت اچانک۔" ان سے جیسے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"میں الیان کی نانی ہوں۔" نانی اماں نے کہنا شروع کیا۔

"جی۔۔۔ جی میں نے پہچان لیا ہے آپ تو گاؤں میں ہوتی ہیں نا۔" پاپا جانی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں کل شگفتہ میرے پاس آئی تھی تو ہم رات میں ہی شہر جانے کے لیے نکل گئے تھے بس سامان شگفتہ کے گھر پر رکھ کر میں سیدھا آپ کے پاس ہی آ رہی ہوں۔" نانی اماں نے تمہید باندھنے والے انداز میں کہا جبکہ آگے کی بات کہنے کے لیے انہیں تھوڑا توقف کرنا پڑا تھا۔ جبکہ فیاض صاحب ایسے منتظر کھڑے تھے جیسے آگے کی بات جاننے کے لیے بہت بے چین ہوں۔

ان کی منتظر نظروں کو دیکھتے ہوئے نانی اماں نے کہنا شروع کیا۔

"اصل میں میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میں بات کہاں سے شروع کروں۔ مجھے وہ الفاظ نہیں مل رہے، جو اس سانحہ پر میری دکھ کو بیان کرسکیں۔"

"آپ کو دکھ ہے اس سانحہ پر۔" اچانک ایک عورت کی آواز پر نانی اماں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا وہاں رومیلہ کی بھابھی کو ایستادہ دیکھ کر وہ شگفتہ غفار کو دیکھنے لگیں۔

بھابھی کے صرف ایک جملے نے یہ ظاہر کردیا تھا کہ ان سے بات کرنے سے زیادہ آسان اور مناسب تھا رومیلہ کے والد فیاض صاحب سے بات کرنا۔

نانی اماں کو خاموش دیکھ کر بھابھی ان دونوں کے قریب چلی آئیں۔

"ایسی لڑکی سے جان چھوٹ جانے پر شکر کرنے کی بجائے آپ یہاں اس سانحہ پر دکھ کا اظہار کرنے آئی ہیں۔ کمال ہے آپ لوگوں کی شرافت پر۔" بھابھی کا لہجہ نہایت طنزیہ تھا۔

فیاض صاحب گہری سانس کھینچتے ہوئے ایسے ادھر ادھر دیکھنے لگے جیسے بہو کے آجانے پر انہیں شدید کوفت ہو رہی ہو۔

"دکھ تو ہمیں ہونا چاہیے ایک تو پہلے ہی اس لڑکی سے جان نہیں چھوٹ رہی تھی خدا خدا کرکے بڑی مشکل سے اس کے لیے ایک رشتہ ملا مگر وہ لڑکا بھی شادی سے دو دن پہلے اس منحوس کو دھتکار کر چلا گیا۔" بھابھی زہر خند لہجے میں بول رہی تھیں۔

جب سے انہیں پتا چلا تھا رومیلہ پھر سے ان کے سینے پر مونگ دھرنے آگئی ہے ان کا خون کھول رہا تھا وہ بات بات پر کاٹنے کو دوڑ رہی تھیں اور اس وقت تو جیسے انہیں جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کا نادر موقع مل گیا تھا۔

"جس لڑکی کی شادی دو دن پہلے ٹوٹ جائے اسے بھلا کون قبول کرتا ہے لیکن اس کے باوجود میرے شوہر نے دو دن کے اندر اندر نہ صرف اس کی شادی کرادی بلکہ اتنا بہترین لڑکا اس کے لیے ڈھونڈ لیا جس کے وہ قابل ہی نہیں تھی۔

مگر لوگ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ کچھ لوگ اتنے منحوس ہوتے ہیں کہ وہ صرف دوسروں کو تکلیف دینے کے لیے ہی دنیا میں تشریف لاتے ہیں۔"

"بہو بس کردو۔" بابا جانی سے برداشت نہیں ہوا جس طرح وہ رومیلہ کو موضوع گفتگو بنا کر چبا چبا کر بول رہی تھیں۔

لیکن سسر کے ٹوکنے پر انہیں پتنگے لگ گئے وہ ایک دم تنک کر بولیں۔

"ارے میں کیا بس کردوں۔ ذرا ان لوگوں کی شرافت دیکھیں ایک تو اتنے برے وقت میں ان لوگوں نے شادی کی ہامی بھری اسے عزت کے ساتھ بیاہ کر لے گئے اور اب جبکہ طلاق ہوگئی ہے تب بھی شاکی ہونے کی بجائے شرمندہ ہو کر افسوس کرنے آئے ہیں۔

بھلا آپ نے کبھی سنا ہے کہ بہو کو طلاق دے کر ساس اور دادی ساس بہو کو کوسنے اور اس کے گھر والوں کو گالیاں دینے کی بجائے ان کا دکھ بانٹنے چلے آرہے ہوں، یہ ان لوگوں کی شرافت کی انتہا ہے۔

اور ایک آپ کی بیٹی ہے، جو طلاق جیسا بدنما داغ لے کر بھی ایسے دندناتی ہوئی آئی ہے جیسے ہماری چوکھٹ پر آکر ہم پر کوئی احسان کیا ہو۔

یہ اس کی بے غیرتی کی انتہا نہیں ہے تو اور کیا ہے۔" نانی اماں اور شگفتہ غفار مجبور کھڑی ان کی گفتگو اور توہین آمیز انداز کو ملاحظہ فرما رہی تھیں۔

بھلے ہی ان کی ملاقات رومیلہ کی بھابھی سے بہت کم ہوئی تھی۔ وہ ان کے مزاج اور عادت کو سمجھنے کے دعوے دار نہیں تھے لیکن وہ اتنی بدزبان اور بدتمیز ہوں گی یہ انہیں قطعی امید نہیں تھی۔

نانی اماں کو پہلے ہی رومیلہ کے ساتھ ہوئی زیادتی پر افسوس تھا اب اس کی بھابھی کا اتنا برا رویہ دیکھ کر تو جیسے

انہیں دلی صدمہ ہوا تھا وہ خود کو روک نہ سکیں اور رومیلہ کی حمایت میں بے ساختہ بول اٹھیں۔
"ایسے مت کہو بیٹی۔ ایک لڑکی جو پہلے ہی اتنے بڑے صدمے سے گزر رہی ہو اس کے دکھ کو بانٹنے کی بجائے
—"
"یہ آپ کون سے زمانے کی باتیں کر رہی ہیں اگر آپ کی کوئی بیٹی آپ کی عزت کو مٹی میں ملا کر آپ کی دہلیز پر واپس آ بیٹھے تو کیا آپ اسے پچکاریں گی یا اس پر تھو تھو کریں گی۔" بھابھی نے جلے ہوئے لہجے میں نانی اماں کی بات کاٹ دی۔
شگفتہ غفار ویسے ہی بریرہ کی وجہ سے ذہنی عذاب سے گزر رہی تھیں بھابھی کا ایسی مثال دینے پر تو ان کا دل ہی دہلا وہ بے ساختہ بولیں۔
"اللہ نہ کرے، جو ہم میں سے کبھی کسی پر یہ وقت آئے سب کی بیٹیاں اپنے گھروں میں آباد رہیں۔
ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم دوسروں کی عزت کا خیال نہیں کرتے مگر چاہتے ہیں کہ ہماری عزت بنی رہے ابرار نے جب—" شگفتہ غفار کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ رومیلہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔
"ارے آپ لوگ! اتنی صبح صبح یہاں؟"
رومیلہ پر نظر پڑتے ہی نانی اماں اور شگفتہ غفار دونوں چونک اٹھیں شگفتہ غفار چور نظروں سے اس کا جائزہ لینے لگیں وہ گھر کے عام سے حلیے میں تھی البتہ اس کی آنکھیں صاف چغلی کھا رہی تھیں اس کے تسلسل سے جاگنے اور رونے کی۔
جبکہ نانی اماں کو رومیلہ کی مداخلت پر صاف محسوس ہوا جیسے وہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑی ساری گفتگو سن رہی تھی اور شگفتہ غفار کی بات پوری نہ ہو محض اس لیے وہ کمرے میں بولتی ہوئی آئی تھی ورنہ قدرتی سی بات ہے اس وقت نانی اماں اور شگفتہ غفار کا سامنا کرنا اس کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔
"نانی اماں آپ گاؤں سے کب آئیں سب خیریت تو ہے نا؟" رومیلہ کچھ متفکر لگ رہی تھی خود بخود نانی اماں کو لمحے کے ہزاروں حصے میں احساس ہو گیا کہ وہ بریرہ کے لیے فکر مند ہو رہی ہے۔
نانی اماں کا دل بھر آیا انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر رومیلہ کو گلے لگا لیا۔
ڈرائنگ روم میں جیسے ایک دم سناٹا چھا گیا بھابھی' رومیلہ کے آنے پر ابھی اعتراض کرنا ہی چاہتی تھیں کہ نانی اماں کے اس محبت بھرے مظاہرے نے انہیں انگلی دانتوں تلے دبانے پر مجبور کر دیا۔
پوتے نے جس بہو کو طلاق دے دی تھی دادی ساس کے دل میں اس کے لیے ایسی والہانہ محبت انہیں کسی چینل کے ٹی وی ڈرامے کا کوئی سین لگ رہا تھا وہ اس خلوص کے پیچھے کوئی مقصد تلاشنے اور اس کا پس منظر سمجھنے کے لیے ان کے چہروں کو ٹٹولنے لگیں۔
نانی اماں کے چہرے پر گہرے دکھ کے سوا اور کچھ نہیں تھا رومیلہ ان کی محبت پر آبدیدہ ہونے کے باوجود کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی وہ بڑی بہادری سے ان کی کمر تھپک رہی تھی جبکہ شگفتہ غفار کے چہرے پر شرمندگی زیادہ نمایاں تھی ایسا لگ رہا تھا وہ دکھ سے زیادہ احساس جرم میں مبتلا ہیں۔ بابا جانی تک اس منظر پر حیران حیران سے انہیں دیکھ رہے تھے آخر نانی اماں کی گلوگیر آواز نے خاموشی کو توڑا۔
"مجھے شگفتہ نے سب بتا دیا ہے۔" رومیلہ ایک جھٹکے سے ان سے الگ ہو گئی وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے پہلے تو انہیں دیکھتی رہی جیسے ان کے چہرے سے اخذ کرنا چاہ رہی ہو کہ وہ کیا بات کر رہی ہیں اور کس کے متعلق کر رہی ہیں اور جب اسے یقین ہو گیا کہ جو وہ سمجھ رہی ہے وہ صحیح ہے تب وہ بے بسی سے شگفتہ غفار کو دیکھنے لگی جو اس

سے نظریں چرائے کھڑی تھیں۔
تو گویا وہ اس راز کی حفاظت نہیں کر سکیں۔ رومیلہ کی آنکھوں سے شدید قسم کا پچھتاوا چھلکنے لگا تو نانی اماں فوراً گویا ہوئیں۔
"شگفتہ نے بالکل ٹھیک کیا۔ یہ کام تو اسے بہت پہلے کر دینا چاہیے تھا' لیکن الیان نے بہت بڑی حماقت—"
رومیلہ نے بے اختیار ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اتنی زور سے دبایا کہ وہ کچھ نا سمجھتے ہوئے بھی خاموش ہو کر حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں جو آنکھ کے ذریعے انہیں چپ رہنے کا اشارہ کر رہی تھی۔
"ایسا کیا بتا دیا ہے شگفتہ آنٹی نے ذرا میں بھی تو سنوں۔" بھابھی چبھتی ہوئی نظروں سے رومیلہ کو دیکھتے ہوئے بولیں تب ہی رومیلہ آواز دبا کر کہنے لگی۔
"بھابھی کو کچھ نہیں پتا اور انہیں پتا چلنا بھی نہیں چاہیے۔" رومیلہ کا تنبیہہ کرتا انداز نانی اماں کو حیران کر گیا اس کا جملہ تو نانی اماں کے علاوہ کوئی نہیں سن سکا مگر شگفتہ غفار کے بھی بھابھی کی طرح کان کھڑے ہو گئے۔
وہ ٹوہ لینے کے لیے نہیں البتہ فکر مند ہو کر غیر ارادی طور پر ان کے نزدیک چلی آئی تھیں وہ جس طرح بریرہ کے مستقبل کو لے کر خوف زدہ تھیں انہیں ہر غیر معمولی چیز اور رویہ ہولنے پر مجبور کر رہا تھا اور اس وقت تو رومیلہ اور نانی اماں کا اس طرح رازدارانہ انداز میں ایک دوسرے سے گفت و شنید کرنا بابا جانی تک کو پریشان کر گیا تھا تو شگفتہ غفار کا مضطرب ہونا تو عین جائز تھا۔
"تو کیا ابرار نے—" نانی اماں اچنبھے کے ساتھ کچھ کہنے والی تھیں کہ رومیلہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ دبی آواز میں کہا۔
"اپنے جرم کے رازدار وہ کیوں بنائیں گے اور بھابھی کو تو آپ دیکھ ہی رہی ہیں کیا وہ بھروسے کے قابل ہیں۔" شگفتہ غفار اتنے قریب آ چکی تھیں کہ رومیلہ کی آواز سن سکتی تھیں۔
یہ جان کر کہ بھابھی کو کچھ نہیں پتا انہیں بھی گونا گوں سکون ملا تھا کیونکہ وہ واقعی بڑے ہلکے کردار کی عورت لگ رہی تھیں۔
ابھی بھی وہ یہ سوچے بغیر کہ رومیلہ کے علاوہ یہاں موجود سارے لوگ ان سے عمر میں بڑے ہیں وہ بڑے ڈپٹنے والے انداز میں چیخیں۔
"ارے میں پوچھتی ہوں یہ کھسر پھسر کیا ہو رہی ہے میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر کیا میرے ہی خلاف سازشیں بن رہے ہو۔" ان کا محدود ذہن اس سے آگے سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
مگر رومیلہ کو ان کی ذرا پروا نہیں تھی اسے فکر تھی تو صرف اس بات کی کہ بھابھی' نانی اماں کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کر دیں اسی لیے وہ بغیر شرمندہ ہوئے بے دھڑک بولی۔
"نانی اماں آپ یہاں سے چلی جائیں اور جا کر آرام کریں۔ میری طرف سے بلکہ کسی بھی طرف سے پریشان نہ ہوں۔ اللہ نے چاہا تو سب اپنے گھروں میں خیریت سے رہیں گے۔" نانی اماں اور شگفتہ غفار اتنے نادان نہیں تھے کہ رومیلہ کا مطلب نہ سمجھ سکتے۔
وہ یقیناً "بریرہ کی بات کر رہی تھی نانی اماں کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولیں۔
"اور تم؟" رومیلہ کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا بہت کوشش کے باوجود وہ فوری طور پر خود کو بولنے پر آمادہ نہ کر سکی۔
نانی اماں کو سامنے دیکھ کر وہ ویسے ہی کمزور پڑنے لگی تھی جب کوئی غم گسار سامنے ہو تو دل چاہتا ہے اپنے اندر

چھپائے سارے آنسو اس کے کندھے پر بہادو اور رومیلہ کا دکھ تو اتنا معمولی بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی اس سے باہر آپاتی اگر صرف جگ ہنسائی کا ڈر ہوتا تو رومیلہ خود کو آئندہ آنے والے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرلیتی لیکن یہاں تو لگ رہا تھا جیسے زندگی ہی ختم ہوگئی ہو۔

حالانکہ اس نے الیان کے حوالے سے کوئی خواب نہیں دیکھے تھے مگر جو جذبہ اس کے اندر جڑ پکڑ چکا تھا وہ اب الیان کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں تھا اور یہ احساس بہت اذیت ناک تھا کہ وہ اسے سوچنے تک کا حق کھو چکی ہے۔

"تمہارا کیا ہوگا تم نے اپنے بارے میں کچھ سوچا ہے" نانی اماں نے اسے خاموش دیکھ کر اپنا سوال دہرایا۔

شگفتہ غفار بغور اسے دیکھ رہی تھیں جو نانی اماں کے دو اپنائیت بھرے جملوں پر بالکل روہانسی ہوگئی تھی' لیکن بالآخر وہ خود کو کمپوز کرنے میں کامیاب ہوگئی اپنے رندھے ہوئے گلے کو کھنکھارتے ہوئے وہ بظاہر بہادری سے بولی۔

"آپ بھی میری فکر کرنے کی بجائے اس پر شکر کریں کہ وہ ہر خطرے سے آزاد ہوگئی ہے۔"

"کیسے؟" شگفتہ غفار نے پہلی بار زبان کھولی تو رومیلہ انہیں دیکھنے پر مجبور ہوگئی۔

وہ ان پر کوئی احسان نہیں جتانا چاہتی تھی' لیکن ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر محض انہیں مطمئن کرنے کے لیے رومیلہ صرف اتنا بولی۔

"میں نے سارا الزام اپنے سر لے لیا ہے۔" بھابھی سے آخر برداشت نہ ہوا اور وہ ان کے سر پر آکھڑی ہوئیں۔

"کیا باتیں ہورہی ہیں؟ حق مہر کی رقم میں کچھ کمی بیشی کرانی ہے کیا جو یہ ڈسکشن ختم ہی نہیں ہورہا۔" بھابھی کے تپے ہوئے لہجے پر نانی اماں نے ایک تاسف بھری نظر ان پر ڈالی۔

کس قدر کم ظرف عورت تھی کہ اتنے دکھ بھرے موقع پر بھی اتنی گری ہوئی باتیں کررہی تھی۔

البتہ شگفتہ غفار ان کے جملے پر دھیان نہ دے سکیں وہ اُلجھی نظروں سے رومیلہ کو دیکھے گئیں جس کی بات ان کے سر پر سے گزر گئی تھی اور جو ان کے چہرے سے بخوبی ظاہر ہورہا تھا' مگر رومیلہ اب مزید وضاحت نہیں کرسکتی تھی اب اگر وہ ان سے کچھ بھی کہتی تو بھابھی بھی آرام سے سن لیتیں۔

مگر رومیلہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ مزید ایک لمحہ بھی خوف کے سائے کے زیر اثر گزاریں اس لیے بھابھی کی موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے بات کو گھما کر کہنے لگی۔

"اب آپ لوگوں کے یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے سمجھانے کا وقت گزر چکا ہے میں الیان سے طلاق لے چکی ہوں اور اب اسی سے شادی کروں گی جو مجھے پسند ہے لہٰذا آپ لوگ یہاں سے چلے جائیں تو بہتر ہوگا۔"

نانی اماں تو کیا شگفتہ غفار تک رومیلہ کی بات پر ششدر رہ گئیں۔

شگفتہ غفار اتنی بے یقینی سے رومیلہ کو دیکھ رہی تھیں کہ ایک پل کو تو رومیلہ کو لگا جیسے بھابھی کے ساتھ ساتھ خود انہوں نے بھی یقین کرلیا ہو کہ رومیلہ نے خود طلاق لی ہے وہ بھی کسی آشنا کے لیے۔

مگر رومیلہ کے پاس ابھی شگفتہ غفار پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا کہ بھابھی نے اس کے بے باکی سے کہنے پر گال پیٹنے شروع کردیے تھے۔

"توبہ توبہ کس قدر بے غیرت لڑکی دیدوں کا پانی ہی مرگیا ہے اور آفرین ہے آپ لوگوں پر کہ اتنی بے شرمی کی گفتگو سننے کے بعد بھی کھڑے ہیں۔

ارے اب طلاق ہونے کے بعد اسے کیا سمجھانے آئے ہیں جو سمجھانا تھا پہلے سمجھانا تھا اب کیوں خود کو ذلیل کرانے آگئے ہیں۔" بھابھی کا ٹیپ ریکارڈ فل والیم میں بجنا شروع ہوگیا تھا۔

نانی اماں اور شگفتہ غفار نے فوراً" وہاں سے چلے جانا مناسب سمجھا اور بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھ گئے ان کی شرافت اس قسم کی گفتگو سننے کی تاب نہیں لاسکتی تھی اور کچھ کہنے کے لیے بچا نہیں تھا جو وہ مزید وہاں ٹھہرتے۔

البتہ ڈرائنگ روم سے نکلتے وقت شگفتہ غفار نے پلٹ کر رومیلہ کو دیکھا تھا جو انہیں ہی دیکھ رہی تھی کچھ دیر اسے دیکھتے رہنے کے بعد وہ بغیر کچھ کہے پلٹ کر نکل گئیں رومیلہ کی نظریں تب بھی وہیں ساکت رہ گئیں جہاں سے وہ دونوں گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سارے راستے شگفتہ غفار اور نانی اماں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی شگفتہ غفار ایک طرف سوچوں میں گم تھیں جبکہ نانی اماں چپکے چپکے آنسو بہانے میں۔

دونوں اپنی اپنی کیفیت سے تب چونکیں جب گھر پہنچنے پر الیان اور ریاض غفار کو گھر پر ان کا منتظر پایا۔

"ممی خیریت تو ہے نا آپ اتنی جلدی گاؤں سے واپس آگئیں وہ بھی نانی اماں کے ساتھ اور اتنا لمبا سفر کرکے گھر آتے ہی کہاں نکل گئیں آپ دونوں۔" الیان ان پر نظر پڑتے ہی دھڑا دھڑ سوال پوچھنے لگا۔

نانی اماں نے ایک قہر برساتی نظر اس پر ڈال کے منہ پھیر لیا جبکہ شگفتہ غفار اس کے سوال نظر انداز کرکے تھکے تھکے لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"آپ دونوں اتنی جلدی کیسے آگئے کیا نوکروں نے ہمارے آنے کی اطلاع دے دی تھی۔"

"نہیں کیا ضرورت ہے اطلاع دینے کی۔ ہمارے گھر آنے کی وجہ تو کچھ اور ہے' لیکن تم اچانک کیوں آگئیں سب خیریت تو ہے بریرہ تو ٹھیک ہے نا۔" ریاض غفار کا دل خدشات کے تحت زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"ہاں سب خیریت ہے۔" شگفتہ غفار نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے جلدی سے کہا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولیں۔

"دراصل میں۔۔۔ میں نے اماں کو سب بتادیا ہے۔۔۔"

"کیا؟" شگفتہ غفار کی بات ابھی پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ریاض غفار چیخ پڑے جبکہ الیان انہیں ایسے دیکھنے لگا جیسے اپنا سر پیٹ لینے کے سوا اس کے پاس کوئی راستہ نہ ہو۔

ان دونوں کا یہ ردعمل دیکھ کر وہ کچھ لمحوں کا توقف کرتے ہوئے خجالت بھرے لہجے میں بولیں۔

"اماں رومیلہ کے گھر جاکر اس سے اور اس کے گھر والوں سے ملنا چاہ رہی تھیں اسی لیے۔۔۔"

"آپ لوگ رومیلہ کے گھر سے آرہے ہیں۔" الیان نے شدید حیرت کے ساتھ پوچھا۔

شگفتہ غفار نے ایک چور نظر اس پر ڈالتے ہوئے سر اثبات میں ہلادیا۔

"لیکن کیوں؟ کیا ضرورت تھی آپ دونوں کو اس طرح صبح سویرے اس کے گھر پہنچنے کی وہ بھی ان حالات میں جب اس کے گھر والے غصے سے بھرے ہوئے ہوں گے آپ نانی اماں کو لے کر ان کی کڑوی کسیلی سننے چلی گئیں۔" الیان سخت جھنجلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

شگفتہ غفار کو پتا تھا الیان کو ان کا وہاں جانا اچھا نہیں لگے گا لہٰذا وہ اس کے سوال پر خاموش ہی رہیں ویسے بھی یہ

ان کا نہیں نانی اماں کا فیصلہ تھا البتہ نانی اماں بڑے ضبط کے ساتھ بولیں۔
"بہت بد قسمت ہو الیان تم، تمہیں علم نہیں تم نے کیا گنوا دیا ہے۔" الیان کچھ چونک کر انہیں دیکھنے لگا جو روہانسی آواز میں بول رہی تھیں۔
"اس کی بھابھی کو دیکھ کر تو واقعی عبرت ہوتی ہے کہ لوگوں کے گھروں میں ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جن کی زبان کے نشتر گھر والوں کی عزت نفس کو تار تار کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ارے شگفتہ بھی کیا ہوگی اس کے سامنے، جو وہ رومیلہ کو سنا رہی تھی۔
ہمیں اس کے گھر والوں کی کوئی کڑوی کسیلی نہیں سنی پڑی یہ کام یہاں کی طرح وہاں بھی رومیلہ ہی کر رہی ہے۔ وہ دو بزرگ مہمان خواتین کے سامنے اس کی بھابھی جو اسے سنا رہی تھی اس کے والد کی موجودگی کا بھی اسے ذرا لحاظ نہیں تھا۔
اور وہ لڑکی!
کیا کہوں میں اس کے ضبط کو کہ اتنا کچھ سن کر سہہ کر بھی وہ کسی کو کچھ نہیں بتا رہی۔ بہت خوش نصیب تھے تم جو تمہیں ایسی بیوی ملی تھی لیکن بہت ناشکرے تھے تم جو تم اس کی قدر نہ کر سکے۔" نانی اماں کے لہجے میں تاسف ہی تاسف تھا۔
الیان اور ریاض غفار الجھن بھری نظروں سے انہیں دیکھنے لگے تو وہ غم و غصے کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہنے لگیں۔
"رومیلہ نے وہاں جا کر کچھ نہیں بتایا اس کی بھابھی کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ابرار نے الیان کو شادی پر کیسے راضی کیا تھا اور اب بھی طلاق کے فیصلے کو وہ اپنا مطالبہ ظاہر کر رہی ہے۔ جس کے پیچھے اس نے وجہ یہ بتائی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔" ریاض غفار نانی اماں کی بات پر بری طرح چونک اٹھے جبکہ الیان چپ چاپ انہیں دیکھے گیا۔
نانی اماں کو اس کا بے تاثر چہرہ دیکھ کر شدید غصہ آگیا وہ بگڑ کر بولیں۔
"ابرار نے اگر کچھ کیا تھا تو اس کا انتقام رومیلہ سے لینے کی کیا ضرورت تھی کیا فرق رہ گیا تم میں اور ابرار میں۔ اس نے اپنی ضد اور انا کے لیے اپنی بہن کی زندگی داؤ پر لگا دی۔ ٹھیک یہی حرکت تم نے بھی کی۔ تم نے بھی اپنی ضد اور انا کے لیے نہ صرف اپنی بہن کا گھر داؤ پر لگایا ہے بلکہ ایک بے گناہ معصوم لڑکی کی زندگی خراب کر دی ہے۔ اس کے گھر والے اس کے ساتھ ہوئے حادثے پر شرمندہ ہیں اور نہ افسردہ انہیں صرف یہ فکر کھا رہی ہے کہ اس کا ذمہ داری پھر ان پر مسلط ہو گئی ہے۔
پہلے بھی انہوں نے اسے بوجھ کی طرح اٹھا کر پھینکا تھا اب تو مطلقہ ہونے کے بعد بالکل ہی جو گیا گزرا رشتہ اس کے لیے آئے گا وہ اپنی جان چھڑانے کے لیے اس کے ساتھ رومیلہ کو رخصت کر دیں گے۔
اور اس بار اس کی بربادی کے ذمہ دار تم سب بھی اتنے ہی ہو گے جتنا کہ ابرار ہے۔" نانی اماں کہتی چلی گئیں اور شاید مزید بولتی رہتیں کہ شگفتہ غفار کے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑنے پر انہیں چپ ہونا پڑا۔
کمرے میں صرف شگفتہ غفار کی سسکیوں کی آواز گونج رہی تھی باقی سب اپنی اپنی جگہ خاموش سوچوں میں گم کھڑے تھے جب شگفتہ غفار کے رونے کی شدت میں تھوڑی کمی آئی تھی ریاض غفار ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگے۔
"جو ہوا بہت برا ہوا۔ الیان نے بہت جلد بازی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن میں پھر بھی الیان کو قصوروار نہیں

ٹھہراؤں گا اگر ہم سب رومیلہ کو کچھ بہتر طریقے سے قبول کر لیتے تو وہ یہ قدم بھی نہ اٹھاتا۔
اماں آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اس بار اس کی بربادی کے ذمہ دار ہم سب ہوں گے۔" ریاض غفار کی بات نانی اماں کو مزید تپا گئی وہ طنزیہ انداز میں کہنے لگیں۔
"اس کی بربادی کا چھوڑو بلکہ یہ سوچ کر خوشی مناؤ کہ بریرہ کا مستقبل محفوظ ہو گیا ہے وہ اب اس خطرے سے باہر ہے کہ ابرار کبھی اس راز کو فاش کر دے گا۔
تمہاری بیٹی خوش بس اور تم دونوں کو کیا چاہیے خاص طور پر شگفتہ کے تو کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی ہوگی۔" شگفتہ غفار آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھ کر رہ گئیں جبکہ ریاض غفار آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے ہوئے نڈھال سے انداز میں کہنے لگے۔
"تمہاری بیٹی نے اتنی تکلیف اٹھائی ہے تب ہی ہم دوسرے کی بیٹیوں کے درد کو سمجھ سکتے ہیں آج ہم دونوں کے جلدی گھر آجانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ آج میں نے اپنی قسم توڑتے ہوئے عائشہ کی طرف جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔" شگفتہ غفار چونک کر انہیں دیکھنے لگیں۔
"میں تمہیں ہی لینے آیا تھا کہ اگر تم میرے ساتھ چلو گی تو ہو سکتا ہے بلال تمہارے لحاظ میں تھوڑا بہتر طریقے سے پیش آئے۔
ورنہ اس بدتمیز سے تو کوئی بعید نہیں وہ اپنی ساری پریشانیوں کی وجہ ہمیں گردانتے ہوئے گھر سے باہر نکال دے۔"
"آخر ہوا کیا ہے؟" شگفتہ غفار فکر مندی سے بولیں۔
"زوبیہ پاگل خانے سے بھاگ گئی ہے آج تیسرا دن ہے اسے اور اس کا کچھ پتا نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔" پہلی بار الیان نے زبان کھولی تو تھوڑی دیر کے لیے نانی اماں بھی رومیلہ کو بھول کر زوبیہ کی بابت دریافت کرنے لگیں تو الیان نے وہ سب بتا دیا جو اسے پتا تھا۔
صبح آفس میں اس کے پاس خرم کا فون آیا تھا خرم نے اسے بتایا تھا کہ کل رات عائشہ اختر اس کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے اسے یہ دلخراش خبر سنائی ہے۔
اس نے یہ جاننے کے لیے فون کیا تھا کہ کیا الیان اسے کوئی مشورہ دے سکتا ہے کہ اسے زوبیہ کو کہاں تلاش کرنا چاہیے۔
شائستہ خالہ کے حوالے سے یا ان کی گزشتہ زندگی کے حالات کی روشنی میں کوئی ایسی جگہ یا کوئی ایسا مقام جہاں زوبیہ کا جانا ممکن ہو۔
الیان ایسا کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا اور پھر زوبیہ کو غائب ہوئے دو دن سے اوپر ہو گئے ایسی کون سی جگہ یا مقام ہو سکتا ہے جہاں ایک جوان لڑکی دو دن بخیر و عافیت گزار سکتی ہو۔
خرم کے فون نے اس کا دل کام سے بالکل اچاٹ کر دیا تو وہ فوراً" ریاض غفار کے پاس پہنچ گیا اس اطلاع کو پاتے ہی ان کے بھی ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تو وہ دونوں اسی وقت گھر کے لیے نکل گئے۔
"چلیں، ابھی عائشہ کے گھر چلتے ہیں میں ذرا ہاتھ منہ دھو کر آتی ہوں۔" شگفتہ غفار نے اٹھتے ہوئے اتنی آسانی سے رضامندی دے دی کہ الیان تک نانی اماں اور ریاض غفار کی طرح چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔
بلال اختر جس طرح کے انسان تھے ان سے امید کم تھی کہ وہ ان کے ساتھ اچھی طرح پیش آئیں گے اسی لیے ریاض غفار اور شگفتہ غفار نے ان دونوں گھرانوں کے بیچ کھڑی اجنبیت کی دیوار کو کبھی پاٹنے کی کوشش نہیں کی۔

جب کبھی مجبوری میں بلال اختر سے بات کرنی بھی پڑی تو ریاض غفار اور شگفتہ غفار کو بے جابکو اس سنی بڑی جس کے بعد وہ پکا ارادہ کرلیتے کہ آئندہ اس خردماغ آدمی کے منہ نہیں لگیں گے اور آج بھی وہ اپنے اس فیصلے پر قائم رہتے اگر جویریہ کے ساتھ وہ سب نہ ہوا ہوتا۔

جویریہ کے اغوا ہونے سے لے کر گھر آجانے تک ان لوگوں نے ایک ایک لمحہ انگاروں پر گزارا تھا اس وقت بلال اور عائشہ کیسا محسوس کررہے ہوں گے یہ وہ بہت اچھی طرح سمجھ سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

عائشہ اختر نے خرم کا ذہن بری طرح منتشر کردیا تھا لہٰذا ان کے جانے کے بعد وہ کھانا کھائے بغیر ہی اپنے کمرے میں چلا آیا کوئی ایک گھنٹے کے بعد مسز فرقان اس کے کمرے میں گرم دودھ لیے چلی آئیں تو خرم نے صرف ان کے اصرار سے بچنے کے لیے زہرمار کر دودھ کا گلاس پانچ سیکنڈز میں خالی کردیا۔

لیکن وہ طویل نشست کے ارادے سے آئی تھیں تب ہی اس کے دودھ پی لینے کے باوجود کمرے سے جانے کی بجائے اس کے سامنے ہی بستر پر بیٹھ گئیں۔

"کھانے کی میز پر فرقان نے مجھے عائشہ اختر کے آنے کی وجہ بتائی تو میں تو پریشان ہی ہوگئی۔ اصل میں، میں کچن میں چلی گئی تھی ان کے لیے چائے وغیرہ بنوانے۔ پہلی دفعہ گھر آئی تھیں کچھ تو خاطر کرنی چاہیے تھی، لیکن جب تک چائے اور پکوڑے تیار ہوئے پتا چلا وہ چلی بھی گئیں۔

اس پر فرقان نے بتایا کہ وہ تو بڑی پریشانی میں آئی تھیں۔

تمہیں کچھ اندازہ ہے زوبیہ کہاں ہوگی؟" انہوں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا تو خرم دل ہی دل میں زچ ہوجانے کے باوجود رسانیت سے کہنے لگا۔

"مجھے کیسے اندازہ ہوسکتا ہے۔ میں اسے جانتا ہی کتنا ہوں مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ پاگل خانے سے بھاگ گئی ہے۔" مسز فرقان کچھ دیر تو اسے دیکھتی رہیں پھر بڑے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولیں۔

" I think we have to talk about it " انہوں نے ایک لمحے کا توقف کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم زوبیہ میں کس حد تک انٹرسٹڈ ہو؟" خرم کو امید تھی وہ ایسا ہی کوئی سوال کریں گی وہ خود بھی اس موضوع پر کھل کر بات کرنا چاہتا تھا تب ہی ان ہی کی طرح پرسکون انداز میں بولا۔

"میں زوبیہ میں ایک فیصد بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں اور اس سے شادی کرنے کا تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔"

"پھر تم نے نمل سے منگنی کیوں توڑ دی اور ابھی اس کے غائب ہونے کا سن کر تم اتنے ڈپریس کیوں ہوگئے کہ کھانا تک نہیں کھایا۔" خرم کا دل چاہا وہ اپنا سر پیٹ لے، مگر اس وقت غصہ کرکے وہ ان کے شک کو ہوا نہیں دینا چاہتا تب ہی ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"وہ ایک شریف گھرانے کی لڑکی ہے، جو ذہنی طور پر بیمار ہے اس کا پاگل خانے میں ہونا اس لڑکی اور اس کے گھر والوں کے لیے نہایت اذیت اور شرمندگی کا مقام ہے اور ان حالات کا ــــ کسی حد تک ذمہ دار میں ہوں۔ پھر میں اس لڑکی کو جانتا ہوں وہ ایک اچھی لڑکی ہے، جو اس کے ساتھ ہورہا ہے وہ افسوسناک ہے ایسے میں اس کا پچھلے دو دن سے غائب ہونا میرے یا کسی بھی ہوش مند انسان کے لیے خوشی کی خبر تو نہیں ہوسکتی۔ خود آپ نیوز میں بھی اگر کسی لڑکی کے ساتھ کسی حادثے کا سن لیتی ہیں تو ڈپریس ہوجاتی ہیں اور یہاں وہ لڑکی جسے میں جانتا ہوں لاپتا ہے، تو کیا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے۔" خرم نے انہیں سمجھانے کے لیے خاصی تفصیل سے جواب دیا۔

"میں تمہاری بات سے ایگری کرتی ہوں، میں نے فرقان کو بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی، مگر ان کا موڈ بہت خراب ہے۔ اصل میں تم کھانے پر نہیں آئے تو..." انہوں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اوہ... کم آن مام... ڈیڈ کو تو جانے کیا ہوگیا ہے۔" خرم بالآخر چڑ گیا۔

"دراصل میں تم نے منگنی توڑ..."

"میں نے منگنی غصے میں توڑ دی تھی۔ مجھے خود بھی احساس ہے۔ میں نے غلط کیا ہے۔ لیکن اب کیا ہوسکتا ہے۔" خرم نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو مسز فرقان چونک اٹھیں۔

"غصے میں..."

"ہاں... ایسی ہی معمولی سی بات پر میری اور نمل کی لڑائی ہوئی تھی۔ میں نے نمل سے کہہ دیا، میں منگنی توڑ رہا ہوں۔ اس نے میری بات کو مذاق سمجھا تو مجھے غصہ آگیا اور میں نے واقعی منگنی توڑ دی۔" مسز فرقان ہکا بکا اسے دیکھ رہی تھیں۔

خرم یہ بات آج نہیں تو کل کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ اب اس وقت ذکر نکل آیا تھا تو اس نے سوچا موقع اچھا ہے۔ ان کے دل سے زوبیہ کا شک بھی نکل جائے گا اور اس کی بات بھی ان تک پہنچ جائے گی۔ تب ہی مزید کہنے لگا۔

"اپنی بات سچ کرنے کے لیے میں نے منگنی تو توڑ دی مگر بعد میں احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کردیا۔ نمل سے معافی بھی مانگ لی۔

وہ تو معاف کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن وہ کہتی ہے۔ اب عظمت خلیل دوبارہ اس شادی کے لیے نہیں مانیں گے۔ لیکن اس کے یہ کہہ دینے سے میری تسلی نہیں ہورہی، میں کچھ وقت گزرنے کا انتظار کررہا ہوں عظمت خلیل کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا ہوجائے تو آپ لوگوں سے بھی معافی مانگوں گا اور عظمت خلیل کو بھی منانے کی کوشش کروں گا۔" مسز فرقان حیرانی سے اسے دیکھتی رہیں۔ اس کی بات ختم ہونے پر انہوں نے واقعی دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

"تم لوگوں کی ان بچکانہ لڑائیوں کا کیا حل نکالا جائے؟ ارے منگنی کوئی مذاق ہے کہ آج کرلی، کل توڑ دی اور پرسوں پھر جوڑ لی۔" مسز فرقان برہمی سے اسے دیکھنے لگیں، تو خرم نے ایسے سر جھکا لیا جیسے بڑا شرمندہ ہو تو مسز فرقان ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"کیا تم نمل کے لیے واقعی سیریس ہو۔"

"آف کورس مام۔" خرم بے ساختہ بولا۔

"تو میں تمہارے ڈیڈ کو بتا دوں زوبیہ کے لیے تم صرف انسانیت کے ناتے فکرمند تھے۔"

"آف کورس مام۔" خرم دوبارہ اسی ٹون میں بولا، تو انہوں نے تشکرانہ انداز میں ایک گہرا سانس باہر خارج کیا اور شکایتی انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہنے لگیں۔

"عظمت خلیل کو منانا کوئی آسان کام نہیں ہوگا، لیکن بہرحال اس سے تو بہتر ہی ہے جو ہم سمجھ رہے تھے۔"

"آپ کیا سمجھ رہی تھیں؟" خرم ان کے منہ سے یہ بات سن کر اتنا مطمئن ہوگیا کہ قدرے شوخی سے پوچھنے لگا۔

"اب تم سے کیا کہوں۔" وہ کچھ جھجکتے ہوئے کہنے لگیں۔
"میں نے تو ابھی تمہارے ڈیڈ سے بھی کہہ دیا تھا کہ پچھلے کچھ دنوں سے تم بہت خوش نظر آرہے ہو، کہیں ایسا تو نہیں کہ زوبیہ تمہارے پاس ہو۔ تم نے ہی اسے پاگل خانے سے نکلوایا ہو اور کہیں روپوش کرکے رکھا ہوا ہو۔"
خرم کچھ دیر تو آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھتا رہا۔ قریب تھا کہ وہ اس حد تک بدگمانی اور کردار کشی پر بگڑ جاتا کہ مسز فرقان نے دعا والے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے چھت کی طرف دیکھ کر کہا۔
"اللہ کا شکر ہے کہ میرے ڈاؤٹس غلط نکلے۔ اب فرقان سب سنبھال لیں گے، نمل تو ہم دونوں کو پسند ہے۔"
"مام یو آر لمٹ" خرم کو غصے کے باوجود ہنسی آگئی۔ اسے اپنا آپ ایک دم ہلکا پھلکا لگنے لگا تھا۔ پھر بھی شکایت سے باز نہ آیا۔
"اتنا برا سمجھتی ہیں آپ مجھے اور یہ سب ڈیڈ سے بھی کہہ دیا۔ enough its enough" مسز فرقان اس کی بات پر شرمندہ ہونے کی بجائے مسکرانے لگیں تو خرم بھی مسکرا دیا۔
اسے یقین تھا اب اسے فرقان حسن کے سامنے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسز فرقان سنبھال لیں گی۔ فرقان حسن کو اس کا بغیر وجہ کے منگنی توڑنے پر غصہ تو ضرور آئے گا۔ مگر وہ بھی مسز فرقان کی طرح یہ جان کر خوش زیادہ ہوں گے کہ وہ زوبیہ میں دلچسپی نہیں لے رہا۔
لہٰذا اگلے دن ناشتے کی میز پر اس نے بڑے سکون سے زوبیہ کے حوالے سے ان کی رائے مانگی تھی کہ اسے اس معاملے میں کیا کرنا چاہیے۔
اس کی توقع کے عین مطابق انہوں نے کوئی طنز کرنے کی بجائے ایسے بولنا شروع کیا۔ جیسے وہ خود بھی اس مسئلے پر دیر تک غور کرتے رہے ہوں۔
"دیکھو خرم تم تو اس معاملے میں کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ بلکہ تمہارا تو بیچ میں بولنا بھی مناسب نہیں۔ خوامخواہ میں اسکینڈل ہی بنے گا۔ تم اسے اپنی دوست ظاہر نہیں کرسکتے، نہ وہ تمہارے ساتھ پڑھتی تھی اور نہ ہی وہ کوئی سوشل قسم کی لڑکی تھی جو ذرا دیر کی ملاقات میں دوستیاں کرلیتی ہیں۔
پھر سب سے بڑی بات یہ کہ بلال اختر کوئی بے وقوف آدمی نہیں ہے۔ تمام ممکنات پر وہ پہلے ہی پتا کرچکا ہوگا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ یہ خبر ابھی تک اخبار میں کیوں نہیں آئی۔
میرے خیال سے تو بلال کو اسپتال پر کیس کردینا چاہیے تھا کہ عملے کی لاپروائی کی وجہ سے اس کی بیٹی لاپتہ ہے۔ کیا پتا وہ فرار نہ ہوئی ہو، بلکہ کڈنیپ ہوگئی ہو۔
لیکن لگتا ہے بلال نے ایسا کچھ کیا نہیں ہے۔ اگر اسپتال پر کیس بنا ہوتا تو اخبار میں ضرور آتا۔ گویا زوبیہ کے غائب ہونے کی خبر ابھی تک خفیہ رکھی گئی ہے۔"
"ہوسکتا ہے وہ اس لیے چھپا رہے ہوں کہ اس طرح زیادہ بدنامی ہوگی اور پھر اس کا جرم بھی ثابت ہوجائے گا کہ وہ سزا سے بچنے کے لیے بھاگ گئی۔" مسز فرقان نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا۔
"ایک لڑکی جس کا ذہنی علاج چل رہا ہو، اس پر کیا جرم ثابت ہوگا اور اسے کیا سزا ہوگی۔ وہ ساری زندگی ٹریٹمنٹ کے نام پر وہیں پڑی رہے گی۔
ہاں یہ بات تمہاری ضرور صحیح ہے کہ لڑکی ذات کا غائب ہونا بدنامی کا باعث ہوتا ہے۔
پہلے قتل کا الزام ہونا پھر پاگل خانے میں داخل ہونا اور پھر آخر وہاں سے بھی بھاگ جانا یا کڈنیپ ہوجانا گھر والوں کے لیے تو چاروں طرف سے بدنامی ہی بدنامی ہے۔ لیکن اس طرح بدنامی سے بچنے کے چکر میں وہ زوبیہ کا

نقصان نہ کردیں۔
جتنا وقت گزرتا جائے گا زوبیہ کو تلاش کرنا مشکل ہوتا جائے گا۔" فرقان حسن کا لہجہ سوچتا ہوا تھا۔
"خیر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھے ہوں گے وہ لوگ۔۔۔ ان آفیشلی ساری کارروائی ہو رہی ہوگی۔
جب ہمیں سن کر اتنی فکر ہو رہی ہے تو ان کی تو اولاد ہے ان کا جو حال ہو وہ کم ہے۔" مسز فرقان نے کہا۔
خرم البتہ خاموش ہی رہا۔
فرقان حسن کا کہنا صحیح تھا۔ وہ اس معاملے میں کچھ خاص کر نہیں سکتا تھا۔ مگر وہ ایسے خاموش بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا منظر عام پر آئے بغیر زوبیہ کو اپنے طور پر تلاش کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شروعات کہاں سے کرے۔
اسی ادھیڑ بن میں وہ یونیورسٹی پہنچ گیا۔ پہلا پیریڈ اٹینڈ کرنے کے بعد دوسرا پیریڈ فری تھا۔ لہٰذا وہ کلاس روم سے باہر نکل آیا۔
نادر صبح ناشتا کیے بغیر گھر سے نکل آیا تھا۔ اس نے بھوک لگی، بھوک لگی کا شور مچایا ہوا تھا۔ خرم کا کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن ہارون کو بھی نادر کی طرح کینٹین جانے کے لیے تیار دیکھ کر وہ بھی محض وقت گزاری کے لیے ان کے ساتھ چل پڑا۔
آج کل اس کی وکی اور حمید سے زیادہ بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں خود بھی اپنی حرکتوں میں اس قدر مگن رہتے تھے کہ خرم، ہارون اور نادر کے پاس کم ہی بھٹکتے تھے جبکہ خرم خود سے ان کے پاس جاکر انہیں مخاطب کرنے کا بھی سوچتا بھی نہیں تھا۔
ابھی بھی ہارون اور نادر کے ساتھ آگے بڑھتے بڑھتے اچانک اس کی نظر نمل اور سنبل پر پڑ گئی جو لائبریری میں داخل ہو رہی تھیں۔
"یار ایسا کرو تم دونوں کچھ کھالو، مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔ بلکہ مجھے ایک کتاب ڈھونڈنی تھی، میں ذرا تب تک لائبریری کا چکر لگالوں۔"
"لائبریری میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ نیٹ پر دیکھ لو۔" ہارون نے چھوٹتے ہی کہا۔
"کون سی کتاب چاہیے تمہیں۔" نادر کے پوچھنے پر خرم کوئی فرضی نام سوچنے کے بجائے اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔
"ارے یار جاؤں گا تو ڈھونڈوں گا نا، مجھے پتا تھوڑی ہے کہ مجھے کون سی کتاب چاہیے۔" خرم یہ کہہ کر تیزی سے لائبریری کی جانب بڑھ گیا۔ تاکہ وہ دونوں مزید کچھ کہہ نہ سکیں۔
لائبریری میں داخل ہوتے ہی وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا بالآخر نمل اور سنبل تک پہنچ ہی گیا اس کی توقع کے عین مطابق وہ دونوں لائبریری کے بالکل آخری کونے میں سر جوڑے بیٹھی تھیں۔
کتابیں ان کے سامنے کھلی ضرور تھیں۔ مگر ان کی توجہ ہرگز بھی کتابوں کی جانب نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ دونوں کسی اہم مسئلے پر بات کر رہی تھیں۔
بلکہ قریب آنے پر تو خرم باقاعدہ چونک اٹھا نمل کی آنکھیں ایسے سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ کافی دیر روتی رہی ہو۔
خرم تیزی سے ان کی ٹیبل پر دونوں ہتھیلیاں رکھتے ہوئے بولا۔
"کیا ہوا نمل تم ٹھیک تو ہو نا۔" اس کے لہجے میں اتنی بے چینی تھی کہ وہ دونوں چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔

نمل اس پر نظر پڑتے ہی جلدی جلدی آنکھیں رگڑنے لگی مگر خرم سب دیکھ چکا تھا اب اسے ٹالا نہیں جاسکتا تھا وہ اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر وہیں بیٹھ گیا تو نمل گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔
ان کے ارد گرد کی کرسیاں خالی پڑی تھیں، مگر کوئی بھی کسی بھی وقت آسکتا تھا، نمل کے چہرے پر صاف تحریر لکھا دیکھ کر خرم دوٹوک انداز میں بولا۔
"تم مجھے جلدی سے یہ بتادو کہ تم کیوں رو رہی تھیں میں ابھی اور اسی وقت یہاں سے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔"
"خرم کوئی خاص بات نہیں ہے بس ذرا...." نمل نے جملہ ادھورا چھوڑ کر دوپٹے سے چہرہ صاف کرنا شروع کردیا۔
"تمہاری جیسی لڑکی بغیر کسی خاص بات کے تو نہیں رو سکتی ضرور کچھ سیریس ہوا ہے کہیں عظمت انکل نے تمہاری شادی تو نہیں طے کردی۔" خرم اتنی سنجیدگی اور اتنی بے ساختگی سے بولا کہ نمل روتے چہرے کے ساتھ مسکرادی۔
اس کی اس مسکراہٹ نے خرم کو اندر تک مطمئن کردیا گویا کم از کم یہ بات نہیں تھی جو اس نے سوچی تھی اب چاہے جو بھی وجہ ہو نمل کے رونے کی اس کی پریشان آدھی رہ گئی تھی پھر بھی پوچھنے سے باز نہ آیا۔
"بتاؤ نا آخر بات کیا ہے؟"
"بات کافی لمبی ہے یہاں نہیں ہوسکتی اور پھر جو ہوچکا ہے اس میں تم کچھ کر بھی نہیں سکتے۔" نمل کے چہرے پر بس لمحہ بھر کے لیے وہ مسکراہٹ ابھری تھی اس کے بعد وہ ایک بار پھر سنجیدہ ہوگئی تھی۔
"لیکن کچھ تو پتا چلا۔ رشیدہ آنٹی تو ٹھیک ہیں نا۔" خرم کے انداز میں اتنی بے قراری تھی کہ نمل اسے ٹال نہ سکی اور دھیمی آواز میں کہنے لگی۔
"سب ٹھیک ہیں۔ ایک لڑکا ہے حسام اس نے خودکشی کرلی ہے باقی اور کچھ نہیں ہوا ہے۔"
نمل یہ کہتے ہوئے خود بہ خود تلخ ہوگئی پھر اس نے مختصر الفاظ میں اسے حسام کے گرفتار ہونے سے لے کر خودکشی کرنے تک کے سارے حالات بتادیے۔
کچھ لمحوں کے لیے خرم بھی چپ سا ہوگیا بات واقعی دکھ کی تھی البتہ ماحول کو گمبھیر ہوتا دیکھ کر سنبل نے قدرے شوخی سے کہنے کی کوشش کی وہ نہیں چاہتی تھی کہ نمل اب مزید اس حادثے پر اپنا دل جلائے۔
"ویسے یہ آج آپ نے نمل کو یونیورسٹی میں مخاطب کرنے کا رسک کیسے لے لیا۔ کیا اس لیے کہ بہت دن سے آپ دونوں کے متعلق فیس بک پر کوئی خبر نہیں آئی۔" اس کی بات پر خرم ہلکے سے مسکرادیا اور کہنے لگا۔
"خبر تو میرے پاس تھی وہ سنانے کے جوش میں چلا آیا۔"
"کیسی خبر؟" نمل بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئی۔
"میں نے مام اور ڈیڈ سے بات کرلی ہے وہ لوگ دوبارہ تمہارے گھر آنے کے لیے تیار ہیں۔"
"کیا کہہ رہے ہو۔" نمل کے منہ سے بے اختیار نکلا تو سنبل نے مصنوعی کھانسی کے ساتھ اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔
"آرام سے ڈیئر، آرام سے ابھی وہ صرف تیار ہوئے ہیں گئے نہیں۔" نمل بے ساختہ بولے اپنے جملے پر واقعی خجل ہوگئی تب بھی خواہ مخواہ کی ناراضی ظاہر کرتے ہوئے بولی۔
"ان کا تیار ہوجانا ویسے بھی ایسی کوئی بڑی خبر نہیں۔ اصل مسئلہ تو پاپا کا ہے وہ کیسے مانیں گے۔"
"وہ بھی مان جائیں گے ڈیڈ انہیں راضی کر ہی لیں گے۔" خرم نے محض نمل کو پرسکون کرنے کے لیے لاپرواہی سے کہا۔

"لیکن تم نے اپنے پیرنٹس سے کیا بات کی۔" نمل ایک بار پھر سوال دہرانے پر مجبور ہوگئی۔
اگر سنبل موجود نہ ہوتی تو وہ نمل کو سچ بتادیتا کہ اس کے والدین زوبیہ کو لے کر اتنے فکرمند تھے کہ نمل کا نام سنتے ہی راضی ہوگئے۔
لیکن سنبل کے سامنے وہ یہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے آدھی بات ہی سنادی۔
"بھئی کہنا کیا ہے۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔ مجھے چھوٹی سی بات پر بھی غصہ آجاتا ہے۔ میں نے ان سے کہہ دیا نمل نے مذاق میں مجھ سے کہا تھا تم یہ منگنی نہیں توڑ سکتے۔
مجھے غصہ آگیا میں نے سچ مچ توڑ دی۔ لیکن اب غصہ ٹھنڈا ہوگیا ہے اور مجھے تو صرف اسی سے شادی کرنا ہے اگر یہ مجھے نہ ملی تو میں پہاڑی سے کود کر جان دے دوں گا۔" نمل اتنے انہماک سے اس کی بات سن رہی تھی کہ خرم کے اچانک شوخ ہونے پر جھینپ سی گئی۔
"خیر یہ تو کچھ زیادہ ہوگیا۔ اپنے پیرنٹس سے اس طرح تو بات نہیں کی ہوگی تم نے...."
"کوئی بعید نہیں یہ کر بھی سکتے ہیں۔" سنبل نے ہنستے ہوئے کہا نمل کا دھیان بٹ گیا تھا لہٰذا وہ بھی ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔
خرم نے سنبل کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا البتہ اچانک اسے رومیلہ کا خیال آیا تھا ان لوگوں کو زوبیہ کے متعلق کچھ بتانے کی بجائے اسے الیان سے بات کرنی چاہیے تھی۔
ہوسکتا ہے وہ زوبیہ کے غائب ہونے کے متعلق کچھ جانتا ہو۔ اپنے آپ جو بھی اس سے ممکن تھا اسے وہ کوشش کرنی تھی تب ہی فوراً بولا۔
"آج رومیلہ نہیں آئی۔"
"ہاں پتا نہیں کیا بات ہے۔ وہ فون بھی اٹینڈ نہیں کررہی۔" نمل نے اپنے موبائل کو اٹھاتے ہوئے کہا جہاں اس کے میسجز کے جواب میں بھی رومیلہ نے کوئی میسج نہیں کیا تھا۔
"اچھا چلو میں چلتا ہوں کہیں واقعی فیس بک پر کوئی خبر آہی نہ جائے۔" خرم نے اٹھتے ہوئے کہا اور لائبریری سے باہر آتے ہی اس نے الیان کا فون ملایا تھا۔ جو اس نے فوراً ہی اٹینڈ کرلیا۔
توقع کے عین مطابق زوبیہ کے غائب ہونے کی خبر سے وہ بے خبر تھا اور یہ جان کر خاصا پریشان بھی ہوگیا تھا کہ وہ تین دن سے لاپتہ ہے۔
"میں کیا مدد کروں گا میرا تو اپنا دماغ کام نہیں کررہا خیر، اگر کچھ پتا چلا تو میں تمہیں اطلاع کردوں گا۔" الیان نے فکرمندی سے کہا تو خرم نے فون بند کردیا۔
تب ہی حمید تیز تیز دوڑتا ہوا خرم کے پاس چلا آیا۔
"ارے یار تم یہاں ہو اور وہاں اتنا بڑا پھڈا ہو رہا ہے۔"
"کیا ہوا؟" حمید کے چہرے پر ہوائیاں اڑتی دیکھ کر خرم نے بے اختیار پوچھا۔

(باقی آئندہ ان شاءاللہ)

☆ ☆

ریحانہ امجد بخاری

اٹھارہویں قسط

سخت کافر تھا جن نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

کہنے والے نے کہا، پڑھنے والے نے پڑھا، سننے والے نے سنا اور سمجھنے والے نے سمجھا، لیکن سمجھتا ہر کوئی اپنی ذہنی استبداد کے مطابق ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے، سننے اور سمجھنے والے حضرات بات کی ایسی ایسی توجیحات بیان کرتے ہیں کہ لکھنے والے کو خود پتا نہیں ہوتا وہ کیا لکھ بیٹھا۔

لفظ کافر کو پتا نہیں انہوں نے زیر کے ساتھ کافِر یا زبر کے ساتھ کافَر لکھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔۔

ایک بات تو طے ہے کہ عشق کبھی بھی اختیاری فعل نہیں رہا ہے۔ اس معاملے میں انسان سدا سے بے اختیار ہے۔ سوچ سمجھ کر اور جان بوجھ کر کیا جانے والا عمل کم از کم عشق نہیں کہلایا جاسکتا۔ یہ تو ایک غیر اختیاری اور خود ساختہ عمل ہے جو خود بخود ظہور پذیر ہو جاتا ہے بقول حضرت خواجہ غلام فرید

یار ڈاڈھی عشق آتش لائی ہے
ہو یار سانوں لگ گئی بے اختیاری

عشق پر زور نہیں۔۔۔ عشق پر اختیار نہیں۔۔۔

یہ تو خودرو جھاڑیوں کی طرح انسان کے اندر خود بخود اگتا ہے اور پھر اس کی جڑیں زمین جسم کی ہر اک پرت تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کو خود پر بھی اختیار باقی نہیں رہتا۔۔۔ بہرحال میر جانے یا پیر جانے۔۔۔ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے۔ عمل مشترک صرف یہ ہے کہ مذہب عشق اختیار کرنے کے بعد من مندر میں ایسی آتش بھڑکی تھی کہ اذان کے لیے دامن بچانا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ شعلے تھے نہ انگارے اور نہ راکھ چاروں طرف دھواں ہی دھواں تھا۔

بریکوں کی تیز چرچراہٹ کی آواز گونجی تو دھویں کے یہ کثیف بادل یکلخت چھٹ گئے۔۔۔ بصارتوں نے انگڑائی لی تو وہ ملیح صورت دکھائی دی جو دھیرے دھیرے چلتی ہوئی دکان میں داخل ہو چکی تھی۔ اذان کی نظروں نے اس کا احاطہ بھی کر لیا تھا جب باوردی ڈرائیور نے مؤدب انداز میں گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تھا اور وہ بڑی شان بے نیازی کے ساتھ گاڑی میں سے برآمد ہونے کے بعد سبک رفتاری سے چلتی ہوئی اب اس کے قریب تر پہنچ چکی تھی۔

عین اس کے سامنے پہنچ کر اس نے ایک ادا کے ساتھ بالوں کو جھٹکا دیا اور پھر داہنی کہنی کاؤنٹر پر جمانے کے بعد اپنی ٹھوڑی مخروطی انگلیوں پر ٹکاتے ہوئے بغور اذان کی آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ اذان اور اس کے چہرے کا درمیانی فاصلہ بمشکل ڈیڑھ فٹ رہا ہوگا۔ اذان جو پہلے ہی اس کے خوب صورت سینڈل، نفیس قیمتی لباس، اور لمبے گھنے بالوں کا جائزہ لینے کے بعد اس کے دلکش نقوش میں الجھا ہوا تھا۔

اس کا ہاتھ بے اختیار سر پر پہنچ گیا۔ ٹھیک اسی لمحے اس کی مترنم آواز سنائی دی۔

”اذان فیضی آپ ہی ہیں؟“

اور اذان جو کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے بڑا۔ ریلیکس ہو کر بیٹھا تھا ایک جھٹکے سے سیدھا ہو گیا۔ ”حق ہو۔۔۔“

”یا حیرت! یہ کون حور شمائل ہے جو جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسی چلی جا رہی ہے۔ اس کے اندر سے ایک نعرہ مستانہ لپکتا ہوا بے اختیار گویائی کی دہلیز تک پہنچا لیکن اظہار کے کواڑوں سے باہر نکلنے تک وہ الفاظ کی ہیئت کو تبدیل کر چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے آزاد ہونے والا جملہ کچھ یوں تھا۔

”جی میں ہی ہوں، فرمائیے کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”اوہ۔۔۔!“ اس کے مسکراتے ہوئے ہونٹ گول دائرے کی شکل میں سکڑ گئے اور پھر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹتے ہوئے چند قدم دور جا کھڑی ہوئی۔ پھر ایک ہاتھ اپنے دائیں پہلو پہ جمانے کے بعد وہ چاروں طرف گھوم کر بہ نظر غائر دکان کا جائزہ لینے لگی۔ اذان جو بڑی باریک بینی سے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا بے چینی سے اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا کیونکہ اس کی کوئی کل سیدھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

اتنے اشتیاق سے نام دریافت کرنے کے بعد سلسلہ گفتگو آگے بڑھانے کے بجائے وہ بڑے مطمئن انداز میں گھوم پھر کر ریکس میں سجی ہوئی الیکٹرونکس مصنوعات کا نظارہ کر رہی تھی۔ جب کہ سمیر چراغ کے جن کی طرح مؤدب انداز میں اس کے ساتھ ساتھ ٹہل رہا تھا۔۔۔ کچھ لمحوں کے بعد اس نے اذان کی طرف دیکھا اور پھر تیر کی طرح سیدھی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”اذان صاحب! جہاں تک میری معلومات ہے آپ کی اس دکان میں ایک سٹنگ روم بھی ہے لیکن مجھے اس کے آثار دکھائی نہیں دے رہے؟ کیا آپ بتانا پسند کریں گے کہ وہ کس سمت ہے؟“

اور اذان جیسے اپنی جگہ پر ناچ سا گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ”باخبر“ خاتون کوئی خدائی فوجدار ہے یا سی آئی اے کی ایجنٹ؟

اس کا طور طریقہ اور رکھ رکھاؤ اسے ایک پڑھی لکھی اور اچھی فیملی کی لڑکی ظاہر کر رہا تھا۔

اس کا اطمینان اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ اذان کو اچھی طرح جانتی ہے نا صرف اسے بلکہ دکان میں موجود سٹنگ روم کی بات بھی کر رہی تھی لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اذان نے اس سے پہلے اسے قطعی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے بار بار ذہن پر زور دیا تھا لیکن وہ سو فیصد یقین سے کہہ سکتا تھا کہ آج سے پہلے وہ اس سے کبھی نہیں ملا تھا۔

لڑکی جس کی سوالیہ نظریں مسلسل اذان کے چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں، شاید اذان کی پریشانی کو بھانپ گئی پھر وہ ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئی۔

”پریشان نہ ہوں مسٹر اذان فیضی! میں اس سے پہلے آپ سے کبھی نہیں ملی۔۔۔ میں بھی آپ کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔۔۔ لیکن اس کی ضرورت کیوں پیش آئی یہ جاننے کے لیے مجھے آپ کے وقت میں سے چند قیمتی لمحات درکار ہوں گے۔۔۔ زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ میں آپ کی الجھن دور کر دوں لیکن اس کے لیے مجھے آپ کی دکان میں موجود سٹنگ روم دیکھنا ہو گا اور یہ ہی بہتر بھی رہے گا کہ ہم دو بدو بیٹھ کر تفصیل سے بات کر لیں۔“ اذان جو پے در پے حیرت کے بے شمار جھٹکوں سے کسی حد تک سنبھل چکا تھا، مزید وقت ضائع کیے بغیر اٹھتے ہوئے بولا۔

”آئیے میرے ساتھ۔“ اذان گھوم کر کاؤنٹر کے عقب سے باہر نکلا اور دکان کے انتہائی گوشے کی جانب بڑھ گیا۔ لڑکی اس کے تعاقب میں تھی۔ اذان نے ریک میں لگے ہوئے ایک ہک کو ہٹایا اور پھر دائیں ہاتھ کا دباؤ ڈالا تو ریک ایک جانب گھومتا چلا گیا اب وہ دونوں ایک خوب صورت نشست گاہ میں

داخل ہو چکے تھے۔

لڑکی نے طائرانہ نظر دوڑاتے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر پر اطمینان انداز میں چلتی ہوئی چند قدم آگے بڑھی اور آمنے سامنے رکھے ہوئے صوفوں میں سے ایک پر سہولت سے بیٹھ گئی۔ اذان کو احساس ہوا کہ اس نے خاصی بدتہذیبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے لڑکی کو بیٹھنے کی دعوت دینا چاہیے تھی لیکن وہ ایسا نہیں کر سکا تھا اور لڑکی نے بھی اس بات کا برا نہیں منایا تھا۔

”تشریف رکھیے اذان صاحب! یہ آپ کا ہی سٹنگ روم ہے۔“ اور وہ مزید گڑبڑا گیا۔ اس کے بجائے لڑکی نے خود بڑی بے تکلفی سے اسے بیٹھنے کی دعوت دے ڈالی تھی۔ وہ کھسیانا سا ہو کر آگے بڑھا اور جلدی سے صوفے پر براجمان ہو گیا۔

”آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ یہ آفت ناگہانی کہاں سے نازل ہو گئی اور اس کا شان نزول کیا ہے؟“ لڑکی نے گفتگو کے تسلسل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو اذان ایک نظر اس کی جانب دیکھ کر رہ گیا۔

وہ بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ متوقع ہو یا غیر متوقع، جانی پہچانی ہو یا ناگہانی، آفت بہرحال آفت ہوتی ہے اور آفت تو وہ تھی بلکہ اسے تو یہ احساس ہو رہا تھا کہ آفت کی پرکالہ ہے۔ اذان زیادہ دیر تک سوچوں کی ادھیڑ بن میں مصروف نہیں رہ سکا کیونکہ لڑکی کی آواز تسلسل کے ساتھ اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ جو انتہائی مہارت سے اپنی گفتگو کو آگے بڑھا رہی تھی۔ یقیناً وہ گفتگو کے فن سے بخوبی واقف تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”اذان صاحب! آپ کی حیرت اپنی جگہ لیکن میں یہاں تک پہنچ گئی ہوں تو جو کہنا چاہتی ہوں وہ کہہ کر ہی جاؤں گی۔۔۔ آپ نہ جانے کیا کچھ سوچ رہے ہوں گے، میرے بارے میں رائے قائم کر رہے ہوں گے۔۔۔ ہر سوچ کے دو پہلو ہوتے ہیں، کبھی کبھی سوچیں بھی اذیت کا باعث بن جایا کرتی ہیں اور کبھی یہی سوچیں ساون کی برکھا رت کی مانند جب سرزمین تخیل پر برستی ہیں تو اندر کے پت جھڑ موسموں پر بہار آ جاتی ہے۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھل اٹھتے ہیں۔ سوچوں کی پریاں جب اپنی جادو کی چھڑی لے کر یادوں کے دریچوں سے نیچے اترتی ہیں تو انوکھی دنیا کی سیر کراتی ہیں، کسی شاعر کا کیا خوب صورت شعر ہے اور آپ بھی تو شاعر ہیں۔“ چند لمحوں کے لیے وہ اپنی خوب صورت انگلی پیشانی پر رگڑنے لگی جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اذان کا ذہن جو اسی کے لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ پرواز کرتے ہوئے نئے جہانوں کی سیر کے لیے آمادہ نظر آ رہا تھا، اس کی پرواز میں بھی کوتاہی آ گئی۔ اس نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا اور وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے دوبارہ بولی۔

”حسیں گلابوں کی پنکھڑی ہے وہ اک پری ہے
جو ایک شاعر کی زندگی ہے وہ اک پری ہے“

اور اذان کو جیسے کسی بچھو نے ڈنک مارا ہو۔ اس کی نظریں جو اس خوب صورت چہرے کا طواف کرنے کے بعد نیچے جھک چکی تھیں۔ ایک جھٹکے سے دوبارہ اس کے چہرے پر جا ٹکیں۔ یہ اس کے لیے حیرت کا ایک اور جھٹکا تھا کہ سامنے موجود شخصیت شاید اور بھی زیادہ گہرائی کی حامل تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آئی ہے اور کیوں آئی ہے؟ لیکن اسے اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر اسی کا شعر سنا رہی تھی۔ وہ شعر جس کے پیچھے پوری داستان تھی۔ وہ شعر جس کا ایک مخصوص پس منظر تھا۔ یہ ملیح چہرہ اور یہ بڑی بڑی آنکھیں یقیناً اپنے اندر بہت سی گہرائیاں لیے ہوئے تھیں۔ لیکن وہ ان گہرائیوں کو ماپنے کی جستجو کا عمل زیادہ دیر تک برقرار نہیں رکھ سکا کیونکہ اس کے یاقوتی لب حرکت میں آ چکے تھے اور وہ ایک بار پھر گوش بر آواز تھا۔

”میرا نام نیلم ہے! ایک این جی او سے تعلق ہے۔ لیکن آپ سے ملنے کا مقصد بالکل ہی ذاتی

نوعیت کا ہے۔ کچھ باتیں، کچھ وضاحتیں آپ تک پہنچانی ضروری تھیں۔۔۔ بات کو بے جا طول نہیں دینا چاہتی اس لیے مختصر کرتے ہوئے صرف ایک سوال پوچھوں گی۔۔ کیا آپ ماہم نظامی سے واقف ہیں؟" بازگشت بن کر یہ سوال چاروں جانب سے حملہ آور ہوا تھا اور اذان کے لیے سنبھلنا مشکل ہو گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی برآمد نہیں ہوا لیکن اس کا وجود، اس کا چہرہ، اس کی آنکھیں، پیشانی پر ابھرنے والی شکنیں غرض یہ کہ اس کی پوری باڈی لینگویج ایک مکمل اعتراف نامے کی تصویر پیش کر رہی تھی۔ نیلم نے اپنا سوال دوہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ وہ اس کا جواب پڑھ چکی تھی۔

"آپ پریشان نہ ہوں مسٹر اذان! میں یہاں زخموں پر نمک چھڑکنے نہیں آئی صرف آپ کو یہ باور کرانا مقصود تھا کہ آپ دونوں کے تعلق میں دراڑیں آئی نہیں بلکہ ڈالی گئی ہیں، غلط فہمی صرف پیدا ہی نہیں کی گئی اسے بڑھاوا بھی دیا گیا ہے۔ آپ ماہم سے مخلص تھے میں جانتی ہوں لیکن ماہم آپ سے مخلص تھی میں یہ بھی جانتی ہوں۔ جو بھی ہوا یقیناً اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں، لیکن قصوروار ماہم بھی نہیں ہے۔ یہ سب کچھ کسی ایک شخص کی عداوت کا نتیجہ ہے اور جو بھی ہوا یہ اسی کا کیا دھرا ہے۔ میں یہاں صرف یہ ہی بتانے کے لیے آئی ہوں کہ اس شخص کا نام۔۔۔"

"فاروق ملک ہے۔۔۔ یہ ہی نا۔۔۔؟" اذان جو اس دوران پوری طرح سنبھل چکا تھا۔ نیلم کی بات کاٹتے ہوئے تلخی سے بولا۔۔۔ اور نیلم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"نہیں مسٹر اذان! آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ فاروق ملک کہیں نہیں تھا، کہیں نہیں ہے اور نہ کبھی ہو سکتا ہے، اس شخص کا نام رانا فہیم ہے۔" ماہم کا جملہ مکمل ہوتے ہی اذان کے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا۔ یوں جیسے کوئی شیشہ ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا ہو اور پھر یہ کرچیاں خود کار انداز میں اکٹھی ہو کر مجسم ہوتی چلی گئیں۔ ایک پورا وجود اس کی آنکھوں میں نمایاں ہوتا چلا گیا۔ اذان کی بے اختیارانہ نگاہوں نے اس وجود کو اپنے حصار میں لیا تو اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی اور پھر اس کی مخصوص مسکراتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"گل بنتی ہے۔۔۔؟"

☆☆☆

مجھے کمالِ سخن سے نوازنے والے
سماعتوں کو بھی اب ذوقِ آشنائی دے
کوئی کرے تو کہاں تک کرے مسیحائی
کہ ایک زخم بھرے دوسرا دہائی دے
میں ایک سے کسی موسم میں رہ نہیں سکتا
کبھی وصال، کبھی ہجر سے رہائی دے

شعلہ بیانیاں اگر آپ کا ہنر ہے تو سننے اور برداشت کرنے کے فن سے آشنائی بھی ضروری ہوتی ہے۔ اگر آپ اپنے زورِ بیان سے دوسرے کو متاثر کرنا جانتے ہیں تو کل یہ ہی ہنر کوئی آپ پر بھی آزما سکتا ہے۔ ہر عمل کا ردِعمل ہوتا ہے اور ہر بات کے جواب میں دوسری بات ہوتی ہے۔

تیر چلانا بہت آسان ہے تو سامنے سے آنے والے تیر کو اپنا سینہ پیش کرنا اتنا ہی مشکل۔۔۔ آخر ظرف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ اگر ہر کوئی آپ کی ہر بات خندہ پیشانی سے قبول کرنا جانتا ہے تو دوسرے کی تلخ و ترش باتوں کو سننا اور سہن کرنا آپ کو بھی آنا چاہیے۔ صبح کے بعد شام، دن کے بعد رات، عروج کے بعد زوال اور زوال کے بعد پھر سے عروج، زندگی کا حصہ ہے۔ اگر انسان کامیابی کے ساتھ پستی سے اونچائی کا سفر طے کرتا ہے تو بعض اوقات وہ ہی اونچائی دھکا دے کر انسان کو گہری کھائی میں بھی گرا دیتی ہے۔

اب یہ آپ کے حوصلے پر منحصر ہے کہ آپ گر گر کر دوبارہ سنبھلنے کی خو رکھتے ہیں یا ایک ہی دھکا آپ کے حوصلے پست کر دیتا ہے۔ اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ بہار، خزاں، سردیاں، گرمیاں ایک کے بعد ایک موسم تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ وقت آگے بڑھتا رہتا ہے۔ قدم قدم پر ٹھوکر کھانے، بار بار گر کر اٹھنے اور آگے بڑھنے کی لگن انسان میں کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ فطرت کا حصہ ہے۔ یہ بھی انسانی جبلت ہے۔ وقت آتا ہے، گزر جاتا ہے اور جب تک سانس ہے انسان کو بہر حال آگے بڑھنا ہی ہوتا ہے۔ گئے وقت کا ماتم کرنے والے لوگ ناکارہ ہوتے ہیں۔ حال سے آنکھیں ملانے اور مستقبل کی جستجو کرنے والے ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

وہ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے اس وقت ایسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ ماضی پر ماتم کرے، حال سے لپٹ جائے یا دونوں ہاتھ جھاڑ کر مستقبل کی طرف بڑھ جائے۔ مسئلہ اس کا تھا، الجھن اس کی تھی، کاروبار اس کا تھا، زندگی اس کی تھی سو فیصلہ بھی اسے ہی کرنا تھا۔

ذہن کے پردۂ اسکرین پر ایک فلم سی چل رہی تھی۔ منظر تبدیل ہو رہے تھے۔ بہت سی شکلیں، بہت سی شبیہیں نمودار ہو رہی تھیں اور پھر فوراً ہی معدوم بھی ہو رہی تھیں۔ خیالات کا ایک تسلسل تھا جو اس وقت اسے اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ ماضی کی بازگشت ایک گونج بن کر نقار خانۂ ذہن میں چکراتی پھر رہی تھی۔۔۔ اور حال اس کی بصارتوں کی گرفت میں محوِ رقص تھا۔

باپ۔۔۔ ماں۔۔۔ بھائی۔۔۔ بیوی۔۔۔

ایک زندہ جاوید ماضی تھا، پر حال نے اس کے سامنے سنہری مستقبل لا کر سجا دیا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور وہ اپنا ماضی بھول گیا۔

میٹنگز، شیئر مارکیٹ، کاروبار، دن بھر کی بھاگ دوڑ، کچھ بن جانے کی لگن اور شدید محنت آخر کار اسے اس مقام پر لے آئی کہ اس کے دیرینہ خواب کو تعبیر مل گئی۔ وہ بہت آگے آ چکا تھا۔ اب وہ ایک کامیاب انسان تھا لیکن کیا یہ کامیابی اس کی اپنی تھی۔۔۔؟ کیا یہ ترقی اس کی کاوشوں کا ثمر تھی؟ مال و دولت کی فراوانی، ملازمین کی یہ بھیڑ بھاڑ، طرح طرح کی گاڑیاں، کیا یہ سب اس کی ان تھک محنت کی بدولت تھا؟ آج سے ایک دن پہلے تک وہ یہ ہی سمجھتا تھا لیکن شاید اب نہیں۔ پہلے وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ سب اس کی ذہانت اور سوجھ بوجھ کی بدولت ہے۔ آج کسی نے اسے آئینہ دکھا دیا تھا۔۔۔ اسے اس کی اوقات بتا دی گئی تھی۔ آج اسے ادراک ہوا تھا کہ اس کی ذہانت کسی کام کی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ بھی آج تھا کسی کی پس پردہ مدد کی بدولت تھا۔ وہ فہم و فراست اور محنت کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے کاروبار کو رشوت اور سفارش نے پروان چڑھایا تھا۔

"کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔۔۔ اس غلط فہمی میں مت رہنا فرزان! کہ یہ سب کچھ تمہاری محنت کا نتیجہ ہے۔ تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان کی بلندیوں پر سجانے والا ہاتھ یاور زمان کا ہے۔ تمہاری ہر کامیاب ڈیل کے پیچھے یاور زمان ہے۔ وہ یاور زمان جو بزنس ٹائیکون ہے۔ وہ یاور زمان جو مارکیٹ کا بے تاج بادشاہ ہے۔"

اس نے گھبرا کر بے اختیار دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیے، یوں جیسے ذہن میں گونجتی ہوئی اس آواز کا راستہ بند کرنا چاہتا ہو۔ لیکن یہ آواز باہر سے تو نہیں آ رہی تھی۔ یہ آواز تو اس کے اندر سے اٹھ رہی تھی۔ کسی مہیب طوفان کی طرح دھاڑتی اور چنگھاڑتی ہوئی، زلزلے برپا کرتی ہوئی، کسی آہنی گونج کی مانند۔ جس نے شہرِ دل کی تمام بستیوں کو ملیا میٹ کر کے رکھ دیا تھا۔ جس نے انا کے بت کو پاش پاش کر دیا تھا۔ اس کی خودداری پر شدید ضرب پڑی تھی اور یہ چوٹ اٹھنے والی ٹیسوں کے ساتھ بہت کچھ مسمار کر گئی تھی۔

"کیا کرنا چاہیے؟ آخر اس آواز سے کیسے پیچھا چھڑواؤں میں؟ کوئی ہے جو مجھے اس عذاب سے بچائے؟" ایک فریاد تھی جو جسم کے پاتال سے بلند ہوئی اور گنبدِ ذہن کے مرکز پر آ کر دم توڑ گئی۔

وہ گھبرا کر اٹھا اور وحشت زدہ سے انداز میں آفس سے باہر نکلتا چلا گیا۔ چپڑاسی نے سلیوٹ جھاڑا

مگر وہ کوئی جواب دیے بغیر آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور بدن پر جیسے اس کا کنٹرول ختم ہو گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار چلتا ہوا کوریڈور سے باہر نکلا تو مسلح گارڈز الرٹ ہو کر اس کے پیچھے لپکے۔ ان کے وزنی بوٹوں سے پیدا ہونے والی دھمک سے فرزان بے خبر نہیں رہا۔ وہ فوراً پلٹا اور انہیں اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے وحشت زدہ انداز میں چلایا۔

"خبردار! جو کوئی میرے پیچھے آیا تو۔۔۔ میں نہ تو کسی ملک کا صدر ہوں نہ وزیراعظم۔۔۔ کوئی ضرورت نہیں ہے مجھے تم لوگوں کی۔۔۔ یہیں کھڑے رہو۔" گارڈز جو بے چارے اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے آگے بڑھے تھے۔ ٹھٹک کر رک گئے اور متذبذب سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے لیکن فرزان ان کی ہچکچاہٹوں کو دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔

وہ دروازہ کھولتے ہوئے آفس کی عمارت سے باہر نکل چکا تھا لیکن باہر قدم رکھتے ہی کوئی چیز بے اختیار اس کی ٹانگوں سے الجھ گئی اور وہ اوندھے منہ زمین پر جا گرا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنا چہرہ بمشکل زمین کے ساتھ ٹکرانے سے بچایا۔۔۔ اور پھر جلدی سے پلٹ کر سیدھا ہوتے ہوئے پیروں سے ٹکرانے والی اس چیز کو دیکھا جو یقیناً اس کے لیے کسی سانپ سے کم نہ تھی وہ اس چیز کو اتنی بار دیکھ چکا تھا کہ اسے پہچاننے میں وہ قطعی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ وہی مڑی تڑی شاخ تھی جسے اس سے پہلے وہ اس دیوانے کے ہاتھ میں بے شمار بار دیکھ چکا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر حیرت سے چھڑی اٹھائی اور ابھی وہ اردگرد دیکھنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایک جانب سے بلند ہونے والی اس مضحکہ خیز آواز نے سمت کا تعین خود بخود کر دیا۔

"کھی۔۔۔ کھی۔۔۔ کھی۔۔۔ کھی۔۔۔ کھی۔۔"

وہ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا پیٹ پکڑ کر ہنس رہا تھا۔ پھر یک دم ہمیشہ کی طرح اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور اس کی قدرے غصیلی آواز سنائی دی۔

"دیکھ لیا نا شیشہ۔۔۔ آ گیا نا عرش سے فرش پر۔۔۔ پکڑ لے پکڑ لے چھڑی پکڑ لے۔۔۔" وہ بھونچکا کھڑے فرزان کے ہاتھ میں دبی ہوئی اپنی چھڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"سیدھا کھڑے ہونے کے لیے چھڑی کا سہارا ضروری ہوتا ہے ورنہ انسان اسی طرح منہ کے بل گرتا ہے۔ چھڑی تو ہمارے آس پاس ہی ہوتی ہے۔ ہم خود ہی اس کا سہارا لینے میں توہین محسوس کرتے ہیں۔" فرزان جو اس وقت شدید وحشت کے عالم میں تھا اور اس فقیر مجذوب سے سخت عاجز بھی آیا ہوا تھا۔ وہ دانت کچکچاتے ہوئے چھڑی بلند کر کے فقیر کی جانب لپکا۔ فقیر نے شاید اس کے خطرناک عزائم کا اندازہ لگا لیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ بدک کر اپنی جگہ سے ہٹا اور دور جا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ وہ پھر چیخ کر بولا۔

"دیکھ اب بھی ہوش میں آ جا۔۔۔ بیٹھ کر سوچ کہ تیری اصل کیا ہے؟ دولت یا سکون؟" پھر وہ جیٹ طیارے کی مانند جیسے اڑتا ہوا فرزان کی طرف لپکا۔ فرزان کے وجود کو ایک جھٹکا سا لگا اور وہ لڑکھڑا کر چند قدم پیچھے ہٹتا چلا گیا، لیکن اس مختصر سے عرصے میں مجذوب اس کے ہاتھ سے چھڑی اچک کر ہوا ہو گیا تھا۔ اس نے سنبھل کر اِدھر اُدھر دیکھا لیکن اب اس کا نام و نشان نہیں تھا۔

ہوا کے ہاتھ میں کاسے ہیں زرد پتوں کے
کہاں گئے وہ تخی سبز چادروں والے
کہاں ملیں گے وہ اگلے دنوں کے شہزادے
پہن کے تن پہ لبادے گداگروں والے

☆☆☆

کوئی دھن ہو میں ترے گیت ہی گائے جاؤں
درد سینے میں اٹھے شور مچائے جاؤں
خواب بن کر تو برستا رہے شبنم شبنم
اور بس میں اسی موسم میں نہائے جاؤں
تیرے ہی رنگ اترتے چلے جائیں مجھ میں
خود کو لکھوں تری تصویر بنائے جاؤں

بے رنگ تصویر میں رنگ ابھر آئے تھے۔۔۔ خزاں رسیدہ شاخِ گل پھر سے سرسبز و شاداب ہو گئی تھی۔۔۔ چھم چھم برستے خواب جو انسان کو اپنے ساتھ ان چھوئی، ان دیکھی، ان جانی دنیاؤں میں بہا لے جاتے ہیں، جب ایک تواتر کے ساتھ آنکھوں پر اترتے ہیں تب یہ ادراک بھی بخوبی ہو جاتا ہے کہ ان کی دنیا بھی ان ہی کی مانند انوکھی ہے۔ کبھی خواب تعبیر کے تعاقب میں ہوتے ہیں تو کبھی کبھی تعبیریں باادب کھڑی ہو کر خوابوں کا خیر مقدم کرتی ہیں۔

ازان کے ساتھ بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ سراب نے حقیقت کی ردا اوڑھ لی تھی۔ تعبیریں ہاتھ باندھے صف بہ صف باادب کھڑی ہو گئی تھیں۔۔۔ پھر وہ کون ہوتا تھا کہ اختلاف و اجتناب برتتا، اسے خندہ پیشانی سے خوابوں کو، تعبیروں کو ایک ساتھ خوش آمدید کہنا پڑا۔۔۔ شیشہ ٹوٹ کر بکھرے تو کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ جسم کے جس حصے سے چھو جائے لہولہان کر دیتا ہے اور ٹوٹ کر کبھی بھی دوبارہ جڑنے کے عمل سے نہیں گزر سکتا۔۔۔ آنکھوں میں بسے خواب روٹھ جائیں تو دنیا اجاڑ ہو جاتی ہے لیکن تقدیر یاور ہو تو داور کائنات کبھی کبھی خزاں رسیدہ پیڑوں کو بھی ہریالی بخش دیتا ہے۔ شیشہ ہو یا دل، ٹوٹنے کے بعد نہیں جڑتا لیکن خواب کا تانا بانا بکھر جانے کے بعد بھی آنکھیں ان کے لمس کی لذت سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتیں۔۔۔ خوابوں کا سلسلہ پھر سے جڑ گیا تھا اور طلوعِ خواب کے اس عمل کی بدولت اجڑی ہوئی آنکھوں میں بہاریں امنڈ آئی تھیں۔ ٹوٹا ہوا دل سحر مسیحائی کے اثر میں آ کر دوبارہ جڑ گیا تھا اور دل کے جڑنے کے بعد اس شیشے کی کرچیاں یکجان ہو کر دوبارہ یوں جڑی تھیں کہ دراڑیں تک معدوم ہو گئیں۔ کہتے ہیں کہ شیشہ ٹوٹ کر نہیں جڑتا لیکن وہ اپنے شیشہ دل میں ماہم کے چہرے کو پھر سے صاف دیکھ سکتا تھا۔ خواب اور تعبیریں ایک دوسرے کے ہم قدم ہو کر تمام رات محوِ رقص رہیں اور دھڑکنوں نے مسرت آمیز ساز بکھیرتے ہوئے پوری رات ان کا ساتھ دیا۔

رات کے بیتنے، دن نکلنے اور دن نکلنے کے بعد گیارہ بج جانے کا احساس اسے ہرگز نہیں ہوا۔۔۔ دیوار گیر گھڑی نے اپنی مسحور کن موسیقی بکھیرتے ہوئے جب وقت کے گیارہویں قدم اٹھائے جانے کا اعلان کیا تو یہ موسیقی اس کی سماعتوں پر دستک دے گئی۔ اس نے کروٹ بدل کر نیم وا آنکھوں سے گھڑی کی جانب دیکھا تو اسے وقت کی رفتار کا اندازہ ہوا۔ نیند ہوا ہو گئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ آج کی رات ایک پرسکون رات تھی۔ جس میں طویل عرصے کے بعد وہ مکمل اور گہری نیند سویا تھا اور اٹھنے کے بعد بھی خود کو ہشاش بشاش محسوس کر رہا تھا۔ وہ بستر سے نیچے اترا اور پھر واش روم کی جانب بڑھ گیا۔ برش کرنے کے بعد اس نے طویل باتھ لیا۔ دیر تک شاور کے نیچے کھڑا وہ خود بخود مسکراتا رہا۔ پھر باہر نکل کر دھیمے سروں میں سیٹی بجاتے ہوئے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا بال بناتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اپنے پسندیدہ پرفیومز کی طرف متوجہ ہوا۔ اس ڈھیر میں سے اس کی نظر انتخاب اوپن گولڈ پر جا ٹھہری۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر نفیس بوتل کو اٹھایا اور اسپرے کی ٹھنڈک آمیز پھوار کو انجوائے کرنے کے بعد بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

آج وہ طویل عرصے کے بعد پوری طرح تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تھا۔ وسیع کوریڈور کو عبور کرنے کے بعد اسے نشست گاہ سے ہوتے ہوئے کچن کی طرف جانا تھا۔ لیکن وہ اپنے اس ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ کیونکہ جوں ہی وہ نشست گاہ میں داخل ہوا اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے اور ہاتھ بے اختیار سر پر جا پہنچا، کیونکہ سامنے ہی تین خواتین خوش گپیوں میں مصروف نظر آئیں اور سب کے چہروں سے چھلکتی ہوئی خوشی دور ہی سے دیکھی جا سکتی تھی۔ چہرے جانے پہچانے تھے جن میں سے ایک اس کی ماں یعنی ذکیہ بیگم، دوسری مختاراں خالہ لیکن تیسرا چہرہ شناسا ہونے کے باوجود خاصا غیر متوقع تھا۔۔۔ اور یہ ہی

بات اس کے لیے حیرت کا باعث بھی تھی۔
یہ وہی خوب صورت آفت ناگہانی تھی جو قبل ازیں دکان میں بھی نازل ہو چکی تھی اور یقیناً وہ نیلم کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی۔ غلط فہمیاں دور کرنے کا بیڑہ اس نے ضرور اٹھایا تھا لیکن اس قدر سرعت اور تیز رفتاری کے ساتھ وہ اس کے گھر تک کا فاصلہ طے کرلے گی یہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس نے پھرتی سے واپس پلٹنے کی کوشش کی لیکن دیر ہو چکی تھی کیونکہ بیک وقت تینوں ہی اسے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے اور حیرت زدہ انداز میں کھڑے دیکھ چکی تھیں۔ باوجود اس کے کہ وہ پلٹ کر دروازے کی جانب بڑھ چکا تھا۔ ذکیہ بیگم کی سنائی دینے والی آواز پر اس کے قدم وہیں ساکت ہو گئے۔
"اذان! کہاں جارہے ہو؟ ادھر آؤ۔۔۔ ناشتا نہیں کرو گے؟" اس نے پلٹ کر ماں کی جانب دیکھا اور پھر نظریں چراتے ہوئے بدحواس انداز میں بولا۔
"نن۔۔۔ نہیں۔۔۔ جی۔۔۔ وہ میں۔۔۔ بعد میں کرلوں گا۔" ٹھیک اسی وقت نیلم کی مخروطی انگلیاں گلاس ٹیبل پر رکھے اپنے خوب صورت ہینڈ بیگ کی جانب بڑھیں۔۔۔ اور پھر اگلے ہی لمحے وہ بیگ اٹھانے کے بعد اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک نظر اذان کی طرف دیکھنے کے بعد وہ ذکیہ بیگم کی جانب متوجہ ہوئی اور پھر اس کے ہونٹوں میں جنبش پیدا ہوئی۔
"تو ٹھیک ہے آنٹی پھر مجھے اجازت۔۔۔ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا۔ ہم لوگ کل آپ کا انتظار کریں گے۔ آپ ضرور آیئے گا۔" اور پھر پلٹ کر چھپاک سے باہر نکل گئی۔ اذان کی متعاقب نظریں جب پلٹ کر واپس آئیں تو انہیں مختاراں خالہ کی معنی خیز نظروں کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ اور وہ مزید بوکھلا گیا۔ اسی وقت ذکیہ بیگم کی مشفق آواز سنائی دی۔
"اذان بیٹا! ادھر دیکھو میری طرف۔۔۔ کیا میں ٹھیک نتیجے پر پہنچی ہوں۔ اب تو یقیناً تمہیں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوگا۔۔۔ یا پھر۔۔۔ ایسا کرتے ہیں دو چار مہینوں میں کوئی مناسب وقت نکال کر انہیں بلا ہی لیں گے۔۔۔" اور اذان کی نظریں زمین میں گڑ گئیں۔ پھر اس کی ہکلاہٹ آمیز آواز بلند ہوئی۔
"جی۔۔۔ وہ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔۔۔ مجھے دیر ہو گئی میں دکان پر جارہا ہوں۔۔۔" اور تیزی سے لپکتا ہوا بیرونی دروازے کی جانب بڑھا پھر دروازہ کراس کرنے سے پہلے دو مختلف جملے اس کی سماعتوں سے ٹکرائے تھے۔ جن میں ایک جملہ ذکیہ بیگم کا تھا۔
"اذان! ناشتا تو کر۔۔۔" اور دوسرا مختاراں بیگم کا تھا۔
"میں نے تو کہا تھا کہ معاملہ کچھ اور ہے۔۔۔ صاحب زادے تو چھپے رستم نکلے۔۔۔" اس نے رکے بغیر صرف ماں کی بات کا جواب دیا۔
"دکان پر کرلوں گا امی جان!" اور پھر غڑاپ سے باہر نکل گیا۔ اس کا دل رقص کناں تھا اور چہرے پر بکھرتے ہوئے رنگ چیخ چیخ کر یہ ہی کہہ رہے تھے۔

جانِ تو چیز ہے کیا، رشتہ جاں سے آگے
کوئی آواز دیے جائے میں آئے جاؤں
تواب اس کی ہوئی جس پہ مجھے پیار آتا ہے
زندگی آ تجھے سینے سے لگائے جاؤں

☆☆☆

تمہیں کہتا نہیں تھا خاک میں تاثیر بھی ہے
اِدھر دیکھو مسافر لوٹ کر آنے لگے ہیں
بیاباں پاؤں سے لپٹے ہوئے ہیں گرد ہو کر
ہمیں در پیش یہ کیسے سفر آنے لگے ہیں

یادوں کی گرد نے غبار بن کر اسے چاروں جانب سے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اور اس کے حوصلوں کے تمام تر مینار مسمار ہوتے چلے جارہے تھے۔ وہ اب یادوں کے ان بگولوں کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔ کب تک برسرِ پیکار رہتا، تھک گیا، ہلکان ہو گیا، تو اس نے سپر ڈال دی اور پھر وہ بے اختیار ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ بلند ہوا جس نے ٹیبل کے کونے پر لگے ہوئے بیل کے بٹن کو پش کر دیا۔ حسب معمول چپڑاسی

فوراً ہی نمودار ہو گیا۔ "منیجر صاحب کو بلاؤ۔" چند لمحوں بعد ہی منیجر کمرے میں داخل ہوا اور فرزان کے اشارے کے بعد سامنے رکھی نشستوں میں سے ایک پر براجمان ہو گیا۔ منیجر مؤدب بیٹھا تھا اور فرزان بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔
کمرے کی فضا میں سر پٹختی خاموشی جب تھکن سے چور ہو گئی تو فرزان کے ہونٹوں میں حرکت نمودار ہوئی۔
"منیجر صاحب! ہماری کمپنی کے لیگل ایڈوائزر کو طلب کریں مجھے ان کے ساتھ کچھ ضروری معاملات طے کرنے ہیں اور دوسری بات یہ کہ آپ بھی ذہنی طور پر اس بات کے لیے تیار رہیں کہ آپ کو کسی غیر متوقع خبر کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ جائیے اور فوراً لیگل ایڈوائزر صاحب کو بلوایئے۔" منیجر گردن خم کرتا ہوا اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
"دیکھ اب بھی ہوش میں آجا۔۔۔ بیٹھ کر سوچ کہ تیری اصل کیا ہے۔ دولت یا سکون۔۔۔؟"
تنہائی کے بے کراں سمندر کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی یہ آواز جب فرزان کی سماعتوں سے ٹکرائی تو وہ بے اختیار یہ سوچنے پر مجبور گیا کہ کیا واقعی وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھا۔
کیمرا ایک بار پھر چلنے لگا اور ایک کے بعد منظر تبدیل ہونے لگے۔ فرزان سوچ رہا تھا کہ دن رات کی ان تھک محنت اور بے تحاشا دولت نے آخر اسے کیا دیا۔ اس کا خیال تو تھا کہ والد نے اسے صرف اس بنا پر گھر سے نکال دیا تھا کہ وہ دولت کما کر نہیں لاسکتا۔ اس کی سوچ نے اسے تصویر کا یہ ہی ایک رخ دکھایا تھا کہ اس معاشرے میں سانس لینے کے لیے زندہ رہنے کے لیے، محبتیں پانے کے لیے عزت حاصل کرنے کے لیے اور رشتوں کو پروان چڑھانے کے لیے سب سے اہم چیز ایک ہی ہے، جسے دولت کا نام دیا جاتا ہے۔ سو اسے یقین ہو گیا کہ دولت بہت ضروری ہے، لٹانے کے لیے بھی اور دکھانے کے لیے بھی۔ اس کی نظر میں دولت ہی وہ حسین پری تھی جو اگر اس کے قبضے میں آجائے تو وہ اپنی سنہری چھڑی گھمانے کے بعد سارے حالات اس کی مرضی کے مطابق کر دے گی لیکن ایسا تو نہیں ہوا تھا۔ آج اس کے پاس دولت تھی، شہرت تھی، عزت تھی، مقام و مرتبہ تھا۔ وہ شہر کے چوٹی کے بزنس مینز میں شمار ہوتا تھا لیکن اس نے اپنے سے وابستہ ہر رشتہ خود سے دور کرلیا تھا۔
صرف اپنی جھوٹی ضد اور انا کی وجہ سے اس نے اپنے اس باپ کو فراموش کر دیا جس نے پڑھا لکھا کر اسے اس قابل کیا کہ وہ آج اس مقام پر بیٹھا تھا۔
اس ماں کو اس نے پلٹ کر نہیں پوچھا جو ہر لمحہ اس کی حمایت کے لیے تیار رہی تھی۔ جو باپ کی ڈانٹ ڈپٹ کے آگے ہمیشہ ایک دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی۔
اور پھر وہ بیوی جو اس سے اتنی شدید محبت کرتی تھی اس کی کہی ہر بات پر بنا تصدیق کیے ہوئے ایمان لے آتی اس نے اسے بھی تنہا کر دیا۔
اور بھائی پتا نہیں کس طرح ساری فیملی کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادے پھر رہا ہوگا۔
کیا باپ کے پڑھانے لکھانے کا یہ ہی نتیجہ نکلنا چاہیے تھا۔ آج اس کی اپنی ہی سوچ اس کا محاسبہ کر رہی تھی۔ کتھارسس کا عمل جاری تھا۔ آگہی کے در وا ہو رہے تھے اور اس کی آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی تیزی سے کھلتی چلی جارہی تھی۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ آج تک اس نے صرف جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ دولت جمع کرنے کی دھن میں اس نے وہ سارے حقیقی رشتے کھو دیے جو صحیح معنوں میں اس سے محبت کرتے تھے۔ اس کی لامتناہی تمناؤں نے اسے تہی دامن کر دیا تھا۔ اس نے جو سوچا وہ انتہائی غلط تھا۔ وہ ہمیشہ یہ ہی سمجھتا رہا کہ وہ دنیا میں اپنی من مانی کرنے آیا ہے۔ ہمیشہ اپنے مفاد کے لیے کوشاں رہا۔ دولت کی چکا چوند نے اس کی آنکھوں سے بصارت چھین لی تھی۔
اور وہ کسی اندھے کی مانند اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہا مگر یاور زمان کے الفاظ اسے وہ آئینہ

اک قصہ

فہمیدہ

دکھانے کا باعث بنے تھے جسے دیکھنے سے وہ ہمیشہ گریزاں رہا۔ سچ انتہائی کڑوا ہوتا ہے اور یہ کڑوا سچ آج اپنی تمام تر تلخیوں کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔ جس دولت کے پیچھے وہ ہمیشہ بھاگتا رہا وہ اس کی اپنی تھی ہی نہیں۔۔۔۔وہ یاور زمان کی تھی۔

یہ بے وقوفی نہیں تو اور کیا تھا۔۔۔۔وہ تقدیر سے لڑ رہا تھا۔ جو چیز اسے میسر تھی اس کی اپنی تھی وہ اسے چھوڑ کر ایسی چیز کے پیچھے بھاگ رہا تھا جو اس کی اپنی تھی ہی نہیں۔ آج پہلی بار اسے ادراک ہوا تھا کہ دولت قطعی اہمیت نہیں رکھتی، اہم صرف رشتے ہوتے ہیں۔

خیالات کے یہ آسیب نہ جانے کب تک اسے اپنی گرفت میں لیے رہتے لیکن ہلکی سی دستک کے بعد منیجر کے ساتھ کمپنی کے لیگل ایڈوائزر کمرے میں داخل ہوئے تو سوچوں کا شیرازہ منتشر ہو گیا اور وہ خود احتسابی کے عمل سے نکل کر کمرے میں حاضر ہو گیا۔ فرزان نے وکیل صاحب کو بیٹھنے کے لیے کہا پھر منیجر کی طرف دیکھا تو وہ اس کی نظروں کا مفہوم سمجھتے ہوئے واپس پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اب فرزان کی تمام تر توجہ وکیل صاحب پر مرکوز تھی۔ پھر اس نے ٹیبل کی دراز کھینچتے ہوئے ایک فائل نکالی اور وکیل صاحب کے سامنے رکھ دی۔ وکیل صاحب نے خاموشی سے فائل پکڑی اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ جیسے جیسے وہ صفحات پلٹتے گئے ان کے چہرے پر حیرت کا طوفان نمودار ہوتا ہوا دکھائی دیتا رہا۔ فائل بند کرنے کے بعد ان کی استفہامیہ نظریں فرزان کے چہرے کا طواف کرنے لگیں تو فرزان گویا ہوا۔

"کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔۔۔۔میں مکمل ہوش و حواس میں ہوں اور بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ ایک ایک کاغذ میں نے خود تیار کیا ہے اور تمام مطلوبہ کاغذات بھی اس میں لف کر دیے ہیں۔ مزید کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ خود وکیل ہیں۔ باقی کام آپ کو کرنا ہے۔ کوئی بھی الجھن یا رکاوٹ محسوس کریں تو اس سلسلے میں براہ راست مجھ سے رابطہ کریں۔"

فرزان نے ایک خوب صورت وزیٹنگ کارڈ وکیل صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

وکیل صاحب نے کارڈ پکڑتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کچھ کہنا چاہا۔

"مگر فرزان صاحب۔۔۔!"

"نہیں۔۔۔۔میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں کوئی سوال نہیں۔ یہ میرا پرسنل نمبر ہے اور کسی بھی ضرورت کی صورت میں آپ براہ راست مجھ سے بات کریں گے منیجر سے نہیں اور یہ کام آج کی تاریخ میں ہو جانا چاہیے۔۔۔۔اب آپ جا سکتے ہیں۔"

فرزان نے جھٹکے دار آواز میں ان کی بات کو درمیان سے ہی کاٹتے ہوئے فیصلہ صادر کیا۔ وکیل صاحب خاموشی سے اٹھ کر واپس پلٹ گئے تو انہیں اپنے عقب سے فرزان کی آواز سنائی دی۔

"پرائیویسی آپ کے پروفیشن کا حصہ ہے مجھے امید ہے کہ آپ اس بات کا خیال رکھیں گے۔"

وکیل صاحب ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رکے پھر پلٹ کر فرزان کی بات کا جواب دیتے ہوئے بولے۔

"آپ بے فکر رہیں فرزان صاحب! یہ کام شام تک ہو جائے گا۔"

"کیا آپ کوئی ٹائم لمٹ دے سکتے ہیں؟"

"تقریباً پانچ بجے تک۔۔۔۔"

"اوکے بیسٹ آف لک۔"

فرزان نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے گڈ کا اشارہ دیتے ہوئے کہا اور وکیل صاحب پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔

شہرِ دل میں جم گئی آوارہ سناٹوں کی گرد
ایک مدت سے یہاں آیا گیا کوئی نہیں
تو کہاں لایا ہے مجھ کو ذات کے اندھے سفر
اپنی جانب لوٹنے کا راستہ کوئی نہیں

(باقی آئندہ)

انسان کبھی رونا چاہتا ہے لیکن باوجود کوشش کے رو نہیں پاتا۔ میں شاید برف کی بن گئی ہوں۔ بے جان، ساکت کہتے ہیں کہ آنسوؤں کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک وہ جو آنکھوں سے بہہ کر زمین پر جذب ہو جاتے ہیں یا پھر شاید آنچل میں یہ بہہ جانے والے آنسو انسان کے سارے دکھ درد اور تکلیف کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں اور انسان ہلکا پھلکا ہو کر رہ جاتا ہے اور دوسرے وہ آنسو ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتے وہ آنکھ سے بہہ کر سرزمین دل پر گرتے ہیں سرزمین دل پر گرنے والے آنسو ایک کانٹے دار ببول کی آبیاری کرتے ہیں جس کا ہر کانٹا دل پر چبھتا ہے اور دکھ تکلیف کو ختم کرنے کے بجائے کئی گنا بڑھا دیتے ہیں یہ کانٹے اور یہ عمل جانے کتنی بار دہرایا جاتا ہے۔

میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے ہیں جو شاید میرے گالوں سے پھسل پھسل کر میرے دوپٹے میں یا پھر شاید زمین میں جذب ہو رہے ہیں لیکن میرے اندر آنسوؤں کا ایک سیلاب آیا ہوا ہے جو سرزمین دل پر گر رہے ہیں اور ہزاروں ببول اگ رہے ہیں جن کے کانٹے بڑی تکلیف پہنچا رہے ہیں میں زور زور سے چیخنا چاہتی ہوں۔ لیکن ساری چیخیں اندر ہی دم توڑ رہی ہیں۔

"کیا صرف دو بیٹیاں ہیں بے چارے غفورے کی" کوئی عورت پوچھ رہی تھی۔

"نہیں ایک اور بھی کلموہی تھی۔ جو باپ کی عزت کو نیلام کر گئی۔" میں خود بھی اس کو بتانا چاہتی ہوں۔

"دیکھو میں اس کی تیسری بیٹی ہوں۔ میں ہی وہ کلموہی ہوں۔" باجی سکینہ بین کر رہی ہیں میں بھی بین کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن سارے الفاظ کہیں کھو گئے ہیں۔

میں اپنے بابا کی چارپائی کے پاس بیٹھنا چاہتی ہوں۔ میں تو ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ آپا حضوراں اور باجی سکینہ کے ساتھ بیٹھنا چاہتی ہوں وہ بھی تو بابا کے پاس ہی بیٹھی ہیں۔ حالانکہ وہاں پر بیٹھنا تو میرا حق ہے لیکن شاید یہ حق میں گنوا چکی ہوں۔ اماں کے گلے لگ کر رونا چاہتی ہوں۔ آپا حضوراں کے گلے سے لگ کر اپنے سارے آنسو بہانا چاہتی ہوں۔

اپنے بابا کے قدموں کو چومنا۔ لیکن میں کیا کروں۔ یہ سب کیا ہے۔ میری طرف تو جو بھی نظر اٹھتی ہے۔ اس میں حقارت و ذلت ہے نفرت اور جانے کیا کیا ہے۔ اماں کی آنکھوں میں بھی میرے لیے نفرت ہے اس ساری نفرت کی آگ سے میرا وجود جل گیا ہے۔ آگ ہی آگ ہے میرے اندر، رشیدہ اور زرینہ میری سکھیاں ہمیشہ مجھ پر رشک کرتی تھیں رشک بھی کیسے نہ کرتیں چھوٹی ہونے کی وجہ سے میں بابا اور لالہ کی بہت لاڈلی تھی۔

سب سے بڑی آپا حضوراں، جاوید لالہ اور پھر باجی سکینہ تھیں۔ آپا حضوراں اور باجی سکینہ تو پڑھ نہ سکیں اور نہ ہی لالہ جاوید، حالانکہ جاوید لالہ کے لیے بابا نے کتنی کوشش کی تھی کہ کچھ پڑھ لے۔ لیکن ان کا جی ہی نہ لگتا تھا پڑھنے میں۔ آخر ابا نے انہیں اپنے ساتھ جوتے گانٹھنے پر بٹھا دیا کہ اور کچھ نہیں تو دو چار روپے ہی کما لائے گا۔ پھر میں بابا سے کہتی۔

"بابا غم نہ کر میں ہوں ناں۔ میں پڑھوں گی ڈھیر سارا۔" اور وہ شانت ہو جاتے اور پھر میں واقعی پڑھنے میں تیز نکلی بابا جب رات کو واپس آتے تو شریف حلوائی سے گلاب جامنیں لے آتے اور پھر چھپا کر مجھے دے دیتے کہ لے تو چھپ کر کھا لے اماں کہتی کہ تھوڑی سی میرے پتر کو بھی دے دے اور ابا کہتے چپ کرنا ہنجار اوروں کو نہ سنا۔

ہمارے دو کمرے تھے۔ جس میں سے ایک میں اماں اور ابا اور دوسرے کمرے میں ہم بہنیں اور بھائی سوتے تھے۔ مجھے روشنی اچھی لگتی تھی۔ اندھیرے سے ڈر لگتا تھا اور جب تک میں سو نہ جاتی تب تک ابا ان کو بلب بجھانے نہ دیتا تھا اور جاوید لالہ کو روشنی میں نیند نہ آتی تھی۔ لیکن اس کو روشنی برداشت کرنی پڑتی تھی۔ اس دوران وہ آنکھوں پر تکیہ رکھ لیتا۔ لیکن مجھے کچھ نہیں کہتا تھا۔ کیونکہ میں بابا کی لاڈلی تھی۔ آپا حضوراں دبلی پتلی تھیں جبکہ باجی سکینہ ٹھیک ٹھاک تھیں لیکن ان کو اکٹھا سونا پڑتا تھا۔ کیونکہ ہمارے گھر میں چارپائیوں کی کمی تھی۔ میں اماں کے ساتھ سوتی تھی۔ لیکن جب ذرا بڑی ہوئی تو ابا سے اپنے لیے علیحدہ چارپائی کی فرمائش کی اور اماں نے کہا۔

"اے لو جی ہور سنو۔ ابھی تک بڑی دو اکھٹی سوتی ہیں۔ تمہارے ابا کی کیا کوئی مل لگی ہے۔" لیکن ابا شام کو خوب صورت پلنگ اٹھا لائے کہ "آہستہ آہستہ پیسے دے لیں گے۔ قسطوں پر لایا ہوں۔"

اماں رات کو دودھ کا گلاس بھر کر دیتیں کہ لے پی لے ابا میرے لیے بادام اور چلغوزے لے آتے اور صبح جب باجی سکینہ جھاڑو دیتیں تو میرے پلنگ کے نیچے سے چھلکے برآمد ہوتے اور باجی سکینہ بڑبڑاتی رہتیں۔ تب اماں کہتیں۔

"اے سکینہ بشریٰ کے ساتھ ضد نہ لگائی کر۔ وہ پڑھائی کرتی ہے۔ ذہن مارتی ہے اور یہ بادام ذہن کو خشکی سے بچاتے ہیں حافظہ اچھا ہوتا ہے۔"

جب بھی کوئی تہوار آتا۔ اماں آپا حضوراں اور سکینہ کے کپڑے ہلکے بناتیں جبکہ میرے لیے مہنگے اور میری پسند کے بناتیں اور پھر آپا حضوراں اس پر مقیش یا کڑھائی کر کے چار چاند لگا دیتیں۔

رشیدہ کہتی "بشریٰ تو بڑی سوہنی ہے اور ان کپڑوں میں اور بھی سوہنی لگتی ہے۔"

اماں بھی کہتی تھیں کہ "میری سب بیٹیوں میں سے بشریٰ بہت خوب صورت ہے۔"

بابا کی تھوڑی سی زمین تھی۔ جب بھی فصل کٹنے لگتی تو سب فصل کاٹنے کے لیے جاتے۔ صرف گھر پر میں ہوتی اور جب باجی سکینہ برتن دھوتیں تو بشریٰ سے کہتیں۔

"گھر پر سارا دن کیا کرتی رہتی ہو۔ کم از کم برتن تو دھو دیا کرو۔" میں بابا سے کہتی۔

"بابا دیکھیں نا کتنے کالے برتن ہو جاتے ہیں آگ پر ______ اس سے تو میرے ہاتھ کالے ہو جائیں گے۔" تب بابا کہتے۔

"نہ سکینہ میری دھی سے برتن نہ دھلوانا۔ اس کے ہاتھوں پر کالک لگ جائے گی۔ میں تو اس کو ڈاکٹرنی بناؤں گا۔"

جب سے میں نویں سے دسویں میں آئی تھی۔ انگلش مشکل لگتی تھی۔ بابا نے ماسٹر صاحب سے بات کی ان کا بیٹا حال میں ہی شہر سے پڑھ کر لوٹا تھا اور پھر راحیل مجھ کو پڑھانے آنے لگا۔ اور پھر شاید میری بدقسمتی کا آغاز یہیں سے ہوا۔ منزل پر پہنچنے کے لیے انسان ایک راستہ چنتا ہے۔ جس پر چل کر انسان منزل پر پہنچتا ہے راحیل مجھے وہی راستہ معلوم ہوا۔ جس پر چل کر منزل تک پہنچ سکتی تھی۔ میٹرک کے پیپروں کے بعد راحیل نے ماسٹر صاحب سے بات کی اور ماسٹر صاحب راحیل کی بات سن کر بولے

"غفورے موچی سے نہ ہمیں آج رشتہ داری گانٹھنی ہے اور نہ کل۔" اور پھر راحیل کی منگنی انہوں نے اپنی بھتیجی سے کی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

راحیل نے کورٹ میرج کرنے کا ارادہ کیا اور میں تو جیسے تیار بیٹھی تھی۔ راحیل کی ایک سالہ محبت میں میں بابا کا سولہ سال کا پیار بھلا بیٹھی۔ آپا حضوراں اور باجی سکینہ کا زیور لیتے مجھے کوئی احساس نہ ہوا بابا کہا کرتے تھے کہ سکینہ میری دھی سے برتن نہ دھلوانا۔ اس کے ہاتھ کالے ہو جائیں گے اور میں نے ان کے چہرے پر کالک مل دی اور کالک بھی وہ جو کسی پانی سے مٹتی نہیں ہے کیونکہ ابھی تک کوئی بھی محلول ایجاد ہوا ہے اور نہ ایسا پانی ہے جس سے ایسی کسی کالک کو مٹایا جا سکے۔

میں نے بابا کی جھکتی کمر کو مزید جھکا دیا اور جاوید لالہ کی غیرت سے تنی گردن کو جھکا دیا۔ ہمارے گھر میں سب سے قیمتی شے عزت تھی اور میں وہ بھی نیلام کر آئی تھی اور پھر بابا نے پرچہ کٹوا دیا کہ راحیل نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے اور وہ شام میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ جب بابا میرے پاس آئے تھے اور ہاتھ جوڑ کر فریاد کی تھی کہ میں راحیل کے خلاف بیان دوں اور یہ کہ

بچی کچی عزت کو بحال کرنے کا صرف یہی راستہ ہے اور میں نہیں کتنی کٹھور اور کیسی نالائق بیٹی ہوں۔ میں نے ان کو ان کی محبت کا کیا صلہ دیا۔ کتنی نافرمان ہوں میں اور کتنی بے غیرت ہوں اور جب عدالت میں میں نے اپنی بے حیائی اور بے غیرتی کا ثبوت دیتے ہوئے راحیل کے حق میں بیان دیا۔ تو بابا کی آنکھوں میں امید کے ٹمٹماتے جگنو ایک دم سے بجھ گئے تھے اور وہ وہیں پر ڈھے گئے تھے۔

جاوید لالہ تو عدالت میں مجھے قتل کرنے کے درپے ہو گئے تھے لیکن مجھے بچا لیا گیا کاش مجھے نہ بچایا گیا ہوتا۔ انہیں مجھے قتل کرنے دیا گیا ہوتا۔ لیکن کاش۔

راحیل کے والد نے عدالت میں بیان دلوانے سے قبل کہا تھا کہ "اگر تم میرے بیٹے کے حق میں بیان دو گی تو ہم تمہیں بطور بہو تسلیم کر لیں گے۔"

لیکن بعد میں انہوں نے راحیل کی شادی اپنی بھتیجی سے کروائی راحیل کی آنکھوں میں میرے لیے محبت ختم ہو گئی تھی اور وہ یکسر تبدیل ہو گیا اسے نہ میری پروا تھی اور نہ میری بیٹی ثوبیہ کی۔

کبھی کی گئی غلطی پچھتاوے کا ناگ بن کر انسان سے چمٹ جاتا ہے اور یہ ناگ دن رات ڈستا رہتا ہے انسان کے پچھلے زخم مندمل نہیں ہوتے کہ ایک نیا زخم لگا دیتا ہے اور یہ زہر سارے جسم میں پھیل جاتا ہے یہ زہر کتنا زہریلا ہوتا ہے میرے بھی سارے جسم میں یہ سارا زہر پھیل چکا ہے اور پھر بھی میں زندہ ہوں کتنی سخت جاں ہوں میں۔

جب راحیل نے مجھے طلاق دینا چاہی تو راحیل کی بیوی نے کہا۔ "چھوڑو راحیل پڑی رہے گی ایک کونے میں اور پھر ویسے بھی مجھ سے زیادہ کام نہیں ہوتا۔ ہمیں ایک نوکرانی کی ضرورت تو ہو گی۔"

اور پھر اس گھر میں میں واقعی ایک نوکرانی بن کر رہ گئی۔ میں سارا دن کام کرتی اور رات کو اپنے زخموں پر کراہتی۔ مجھے اب بابا کی شفقت اور جاوید لالہ کا پیار یاد آیا تھا۔ آپا حضوراں اور اماں کی محبت۔ جن محبتوں کو میں نے اپنے ہاتھوں ٹھکرایا تھا۔ اب وہی محبتیں مجھ کو رلاتی تھیں میرے ساتھ جو سلوک ہو رہا تھا۔ اس کی خبر اماں اور بابا کو بھی تھی آخر ایک ہی محلہ تھا لالہ جاوید تو شروع میں مجھے قتل کرنے کے درپے تھا۔ لیکن بابا کے کہنے پر میری جاں بخشی کر دی لیکن یہ بھی وارننگ دی تھی کہ "اگر میرے گھر میں قدم رکھا تو تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

انہی دنوں بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ میں بھی جانا چاہتی تھی۔ کتنی بار اماں اور آپا حضوراں سے کہلوا بھیجا کہ میں آنا چاہتی ہوں لیکن کبھی میری حوصلہ افزائی نہ کی گئی بلکہ سختی سے منع کر دیا گیا۔

اور پھر بابا نے وصیت کی تھی کہ "انہوں نے مجھے معاف کر دیا ہے اور یہ کہ وہ بھی مجھے معاف کر دیں۔ اگر جاوید تو اس بدنصیب کو معاف نہیں کر سکتا تو پھر بشریٰ کو میری میت پر لے کر آنا۔" اور پھر ہاں خالہ زینب مجھے لے آئی تھی۔

آج اس گھر میں میں اس وقت تک ہوں جب تک بابا کی میت موجود ہے اب بابا کو غسل دینے لگے ہیں۔ ہاں جب بابا کو لے جائیں گے تو میرے لیے میرے بابل کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

میں نے جس رستے کو چنا تھا۔ منزل سمجھ کر وہ تو ایک ایسی بند گلی تھی جس میں واپسی کی کوئی راہ نہیں اور نہ ہی آگے کوئی راستہ ہے۔ اس رستے میں تو دور دور تک کوئی شجر نہیں ہے کیونکہ سارے سایہ دار شجر تو میں نے اپنے ہاتھوں سے ہی کاٹ ڈالے ہیں۔ اس پر تو صرف کانٹوں کے ببول ہیں۔ جن پر مجھے تا زندگی چلنا ہے کیونکہ یہ منزل نما رستہ میں نے خود چنا تھا۔ اور اب مجھے ہی اس کا خراج ادا کرنا ہو گا کیونکہ جو بویا ہے اب وہی کاٹنا ہے یادیں ہی سرمایہ ہیں۔

وقت کا سیل رواں
جس کے اس پار کہیں رکھی ہے
گمشدہ عمر کے لمحوں کی کتاب
اور اس پار فقط خواب ہی خواب
جو بھی رت آئے کھلا کرتے ہیں
تیری یادوں کے کنول تیری جدائی کے گلاب

☼ ☼

شعلہ عمیر

علم کا زوال اور جہل کی اشاعت

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں تم سے ایک ایسی حدیث بیان کرتا ہوں جو میرے بعد تم سے کوئی نہیں بیان کرے گا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ علامات قیامت میں سے یہ ہے کہ علم کم ہو جائے گا جہل پھیل جائے گا' زنا بکثرت ہو گا' عورتوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور مرد کم ہو جائیں گے' حتیٰ کہ پچاس عورتوں کا نگراں صرف ایک مرد ہو گا۔

(صحیح بخاری شریف)

اپنا جائزہ لیجیے

حضرت خبیب عجمی انتقال کے وقت بہت ہی گھبرا رہے تھے۔ کسی نے عرض کیا کہ آپ جیسے بزرگ اور ایسی گھبراہٹ اس سے پہلے تو آپ کا ایسا حال کبھی نہ ہوا تھا۔ فرمانے لگے سفر بہت لمبا ہے' توشہ خرچ پاس نہیں ہے' کبھی اس سے پہلے اس کا راستہ نہیں دیکھا' آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرنی ہے' کبھی اس سے پہلے زیارت نہیں کی' ایسے خوفناک منظر دیکھنے ہیں جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے' مٹی کے نیچے اکیلے ہی قیامت تک رہنا ہے' کوئی انس پیدا کرنے والا وہاں نہیں ہو گا اور کوئی ساتھ نہیں ہو گا' پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کھڑا ہونا ہے' مجھے یہ ڈر ہے کہ اگر وہاں یہ سوال ہو گیا کہ خبیب! ساٹھ برس میں ایک تسبیح بھی ایسی پیش کر دے' جس میں شیطان کا کوئی دخل نہ ہو تو اس کا کیا جواب دوں گا؟ جی ہاں! یہ اس شخص کے خیالات ہیں جن کا ساٹھ برس کی عمر میں ذرا بھی دنیا کی طرف جھکاؤ نہیں ہوا۔ ایک ہم ہیں کہ گناہ پر گناہ کرتے ہیں اور ایسے بے فکر رہتے ہیں گویا کہ آخرت میں ہم سے کسی قسم کا سوال نہ ہو گا۔ اس واقعے کے بعد فیصلہ کر لیجیے کہ وہاں ہمارا کیا حال ہو گا؟

رفعت جاوید۔ کراچی

ایک حکایت ایک سبق

مولانا جلال الدین رومی یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ صرف و نحو کا بہت بڑا عالم کسی سفر پر روانہ ہوا۔ سفر کے دوران ایک مقام پر دریا عبور کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو ایک کشتی کرائے پر لی اور آگے بڑھے۔ دوران سفر اس عالم نے بڑے فخریہ انداز میں ملاح سے دریافت کیا۔ "نوجوان! کیا تم صرف و نحو سے کچھ واقفیت رکھتے ہو' کیا تم نے کچھ علم حاصل کیا ہے" سادہ مزاج ملاح نے جواب دیا۔ "نہیں' میں نے صرف و نحو نہیں سیکھا' گھر کی فکر نے علم کی تحصیل کی اجازت ہی نہ دی۔" اس کی یہ بات سن کر اس عالم نے جسے اپنے علم پر بڑا ناز تھا تاسف سے کہا "بڑے افسوس کی بات ہے' تم نے اپنی نصف زندگی یوں ہی برباد کر دی۔" عالم کے یہ الفاظ نشتر بن کر اس ملاح کے دل میں اتر گئے۔ بہرکیف وہ خاموش رہا۔ سفر خاموشی سے جاری تھا کہ اچانک دریا میں طغیانی آ گئی اور کشتی ہچکولے کھانے لگی۔ یہ صورت حال دیکھ کر عالم کی سٹی گم ہو گئی اور گھبرا کر کشتی کے ناخدا سے پوچھا کہ "اب کیا ہو گا؟ زندگی بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ

رہی۔" ملاح نے عالم سے استفسار کیا "حضرت! کیا آپ کو تیرنا آتا ہے؟" عالم نے گھبرا کر کہا "نہیں مجھے تو بالکل بھی تیرنا نہیں آتا۔" اس کی یہ بات سن کر ملاح نے کہا "یہ تو بہت افسوس کی بات ہے، میں نے تو علم حاصل نہ کر کے نصف زندگی برباد کی تھی آپ نے تیراکی نہ سیکھ کر اپنی پوری زندگی برباد کر لی۔ یہ کشتی چند ہی لمحوں میں ڈوبنے والی ہے افسوس کہ میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔" مولانا جلال الدین رومی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس حکایت سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ حاصل شدہ نعمتوں پر کبھی غرور نہیں کرنا چاہیے، کسی کو حقارت سے نہیں دیکھنا چاہیے۔ ہر شخص اپنے فن میں طاق ہوتا ہے اور ہر شخص کو اللہ نے اس کے مقام پر اہم بنایا ہے۔

جویریہ عدنان۔ لاہور

اقوال زریں

☆ کوئی آئینہ انسان کی اتنی حقیقی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی اس کی بات چیت۔
☆ انسان ہو کر ایسے کام نہ کرو جس سے انسانیت کا دامن داغ دار ہو۔
☆ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لیے الفاظ نہیں اعمال ہوتے ہیں۔
☆ غیرت مند یا تو دنیا میں کامیاب ہوتا ہے یا پھر قربان ہوتا ہے۔
☆ وقت سحر مومن کی آنکھ سے ٹپکنے والے آنسو جہنم کی آگ بھی بجھا سکتے ہیں۔
☆ انسان پہاڑ سے گر کر تو کھڑا ہو سکتا ہے۔ مگر نظروں سے گر کر کھڑا ہونا اس کے بس میں نہیں۔
☆ کانٹوں سے بھری ایک شاخ کو پھول خوب صورت بنا دیتا ہے۔
☆ عمدہ مکان کے شیدائی کو قبر کا گڑھا یاد رکھنا چاہیے۔
☆ زبان میں ہڈی تو نہیں ہوتی مگر یہ آپ کی کھوپڑی تڑوا سکتی ہے۔

بشریٰ چودھری۔۔۔ بہاولپور

دسمبر

دسمبر کی سرد ہواؤں کو
کون بتائے کہ اندر سلگتی ہوئی آگ کو
اس کی برف ہوتی شامیں ٹھنڈا نہیں کر سکتیں
ان کہر آلود راتوں کو کیا پتا کہ
دل کی چوکھٹ سیاہ ہو جانے کے بعد
پھر وہاں سورج نہیں نکلتا

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

انسان سماجی اور تہذیبی ماحول کا تابع

انسان کو سن شعور تک پہنچنے میں دوسرے تمام حیوانوں سے زیادہ وقت لگتا ہے وہ پیدائش کے بعد کئی سال تک اتنا کمزور، بے بس اور لاچار ہوتا ہے کہ دوسروں کی نگہداشت کے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکتا یہی وجہ ہے کہ بچوں کو بہت عرصے تک اپنے سماجی اور تہذیبی ماحول کے تابع رہنا پڑتا ہے۔ انہیں مجبوراً وہی زبان سیکھنی پڑتی ہے جو ان کے گھروں میں بولی جاتی ہے وہی غذا کھانی پڑتی ہے جس کی توفیق ان کے ماں باپ کو ہوتی ہے، وہی کپڑے پہننے پڑتے ہیں جو دوسرے انہیں پہنا دیتے ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر نئی نسل کی شخصیت پرانی نسل کی تہذیب کے دائرے میں تشکیل پاتی ہے انسانی تہذیب میں تسلسل اسی سے پیدا ہوتا ہے۔

(سبط حسن کی کتاب "پاکستان میں تہذیب کا ارتقا" سے)

عائشہ اکرام۔ سیدو شریف
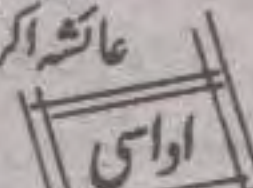
اداسی

محبت سے غم اور اداسی ضرور پیدا ہوگی وہ محبت ہی نہیں جو اداس نہ کر دے۔ اگر چاہتے ہو کہ محبت ابدی

اور پائیدار ہو جائے تو پھر ہی محبت ایسا نہ کر سکے گی اس کو طاقت عطا کرنے کے لیے اس میں عبادت کا رخ بتاتی ہے محبت ایک ہونے کی آرزو کرتی ہے اس کی طرف بڑھتی ہے۔ من تو شدم تو من شدی کا رنگ اپناتی ہے لیکن یہ ایک مک ہونے کا وعدہ نہیں کرتی اس آرزو کو مکمل کر کے نہیں دے سکتی، خواہش پوری نہیں کرتی اور یہی اداسی کا سبب بن جاتا ہے۔

چندھیانے والی روشنی آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے، زیادہ شیرینی کڑوی ہو جاتی ہے، محبت دل کو پکڑ لیتی ہے، اداس کر دیتی ہے۔

(اشفاق احمد کی کتاب "بابا صاحب" سے انتخاب)

سلمیٰ اسلام۔ چکوال

علاج

ایک صاحب نے ماہر نفسیات سے کہا۔ "سب سے بڑی مصیبت میرے خواب ہیں۔ میں خواب میں ہمیشہ ایک ہی منظر دیکھتا ہوں کہ لڑکیاں اسکول میں ادھر سے ادھر بھاگتی پھرتی ہیں۔ کچھ کھیلنے میں مصروف ہو جاتی ہیں اور کچھ باتیں کرنے میں..... پھر اچانک اسکول کی گھنٹی بج اٹھتی ہے اور میری آنکھ کھل جاتی ہے۔"
ماہر نفسیات نے غور سے مریض کے چہرے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ میں اپنے علاج سے تمہیں یہ خواب دیکھنے سے روک دوں؟"
"جی نہیں.... !" مریض نے جلدی سے کہا۔
"میں چاہتا ہوں کہ آپ اسکول کی گھنٹی بجوانا بند کر دیں۔"

نادیہ نواز۔۔۔ لاہور

خانہ دل

یہ غار کا سفر دراصل نہاں خانہ دل کا سفر تھا۔ اس غار میں وہی وسعت ہے۔ جو دل میں ہوتی ہے۔ اس کے روشن حصے شعور ہیں اور تاریک حصے لاشعور۔ یہ غار زخم دل کی طرح رستا رہتا ہے۔ اس کی چھت اور دیواروں کا چپہ چپہ دل کی طرح داغ داغ ہے چھت سے الٹی لٹکی ہوئی صورتیں وہ ہزاروں خواہشیں ہیں جن پہ دم نکلے یا وہ عریاں تصویریں ہیں، جو ہوس چھپ چھپ کے سینے میں بناتی ہے۔ دیواروں پہ بنی ہوئی شکلیں وہ بت ہیں جنہیں لوگ صنم خانہ دل میں سجائے رہتے ہیں۔ لیکن یہ صنم خانہ، خانہ خدا بھی تو ہے۔ اسی لیے اس شفاف اور خنک پانی کی طرح غار کے وسط میں بہہ رہا ہے۔ ایک سرچشمہ یقین دل کی گہرائیوں سے بھی پھوٹتا ہے۔ دل کا کنول اسی پانی میں کھلتا ہے اور اسی کی لہر سے زندگی عبارت ہے۔

(مختار مسعود کی کتاب سفر نصیب سے انتخاب)

ندا علوی۔۔۔ کراچی

کرنیں

○ بخل اور ایمان ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (حدیث نبویؐ)
○ سخی گناہ گار خدا کے نزدیک بخیل عابد سے اچھا ہے۔ (حدیث نبویؐ)
○ جہاد کفار، جہاد اصغر ہے اور جہاد نفس جہاد اکبر۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
○ دنیا میں وہی لوگ سربلند رہتے ہیں جو تکبر کے تاج کو دور پھینک دیتے ہیں۔ (حضرت علیؓ)
○ حاکم کا ایک گھڑی کا عدل ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے۔ (شیخ سعدی)
○ دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح کرنا ہے اور سب سے آسان کام نکتہ چینی کرنا ہے۔ (البیرونی)
○ آدمی کے علم کا اندازہ تو ایک دن میں ہو جاتا ہے۔ لیکن نفس کی خباثت کا پتا برسوں میں بھی نہیں چلتا۔ (شیخ سعدی)

سعدیہ سرور۔۔۔ چک چوہلہ

اقبالیات

☆ اے مرد مسلماں! تو ناموس ازل کا امین و پاسباں
اور خدائے لم یزل کا رازداں ہے تیرا ہاتھ خدا کا ہاتھ

ہے۔ تیری اٹھان مٹی سے ہے لیکن تجھی سے اس عالم کا وجود و بقا متعلق ہے۔ میخانہ یقین سے پی اور ظن تخمیں کی پستیوں سے بلند ہو جا فرنگ کی دلآویزی کی داد ہے نہ فریاد، جس نے عقل و دل دونوں کو مسحور و مخمور اور ناکارہ بنا دیا ہے نہ فریادِ ان بازی گروں سے جو کبھی ناز و انداز سے پکڑتے اور کبھی بیڑیوں میں جکڑتے ہیں۔ کبھی شیریں کا رول ادا کرتے اور کبھی پرویز کا روپ بھرتے ہیں۔ دنیا ان کی تباہ کاریوں سے ویران ہو گئی ہے۔ اے بانی حرم! اے معمار کعبہ! اور اے فرزند ابراہیم ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لیے اٹھ اور اپنی گہری نیند سے بے دار ہو۔

☆ محبت ہی ہے جو انسان کو پر لگا دیتی ہے اور جذبات کو بلند وارجمند کر دیتی ہے۔ عشق سے عقل صیقل ہوتی ہے اور خشت و سنگ میں جوہر آئینہ کی جھلک آ جاتی ہے۔ عشق سے اہل دل کو سینہ سینا اور اہل ہنر کو ید بیضا مل جاتا ہے۔

☆ موجودہ نظام تعلیم اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہا ہے۔ وہ نسل کو ایسی تربیت نہیں دے سکا کہ وہ اپنی معلومات سے فائدہ اٹھاتی اور زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر کے ایک صالح معاشرے کی بنیاد رکھتی۔ بلکہ اس کے برعکس وہ افریقہ اور قطب شمالی کی نامعلوم سرزمین سے واقف اور حیوانات و نباتات سے آگاہ ہے لیکن انسانیت کی پہچان اور خودی کے عرفان سے قطعاً غافل۔ برق و بخارات، ایٹمی اور جوہری توانائی اور نیوکلیائی طاقت کا پتا موجودہ نسل نے لگا لیا لیکن اپنی طاقت کا اندازہ اسے نہیں ہوا۔ دنیا کو مسخر کر لیا لیکن اپنے اوپر قابو نہیں پا سکا وہ ہوا میں اڑتا اور پانی میں تیرتا ہے لیکن زمین پر انسان کی طرح نہیں چل سکتا۔

☆ مغربی نظام تعلیم نے مسلم نوجوانوں کی معنوی روح کو کچلنے کی پوری کوشش کی ہے انہیں مردان کار کے بجائے مرد بیمار بنا دیا اور بانکا، سجیلا، صباحت پسند بن کر رہنا سکھا دیا۔ ان میں نزاکت و ملاحت، تخنث اور نسائیت پیدا کر کے جدوجہد کی سرگرمیوں سے بہت دور کر دیا ہے۔ اقبال کی نظر میں اس علم کی کوئی قیمت نہیں جو مجاہد سے اس کے مردانہ اوصاف چھین لے اور مصاف زندگی میں اسے سامان آرائش دے کر اس کے ہتھیار لے لے۔

عنبرین مفتی۔۔۔ کراچی

نادر و نایاب

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھیری رات ہے اور ایک درویش سن رسیدہ ہاتھ میں مشعل لیے کوچہ و بازار کی خاک چھانتا پھرتا ہے جیسے اس کی نگاہ کسی گمشدہ کی تلاش میں ہو۔ میں نے کہا "حضرت سلامت! کس چیز کی تلاش ہے؟" فرمانے لگے "ان درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے رہتے طبیعت عاجز آ گئی ہے اب اس وسیع کائنات میں کسی انسان کی تلاش میں نکلا ہوں۔ ایک ایسا نوجوان جس کی مردانگی اور شخصیت میری روح کو تسکین اور بالیدگی عطا کر سکے۔" میں نے کہا "آپ کس دھوکے میں ہیں؟ یہ تو عنقا کی تلاش ہے اس کے لیے خود کو کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں؟ میں نے اس راہ میں دردر کی خاک چھانی ہے دشت و صحرا، آبادی و ویرانہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں مگر حقیقت تو کیا پرچھائیں بھی نظر نہ آئی۔" درویش نے کہا "مجھے تو اس شے کی تلاش و جستجو زیادہ محبوب ہے جس کا وجود نادر اور حصول مشکل ہو۔"

حاجرہ خان۔۔۔ چیچہ وطنی

کرنیں

☆ وقت ہمارے پاس ایسے آتا ہے جیسے کوئی دوست بھیس بدل کر اور تحفے لے کر آتا ہے۔ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو چپ چاپ وہ اپنے تحفوں کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں اپنا ہر دن یہ سمجھ کر گزار دو کہ یہ تمہارا آخری دن ہے۔

بشریٰ محمود

رانی، کی ڈائری میں تحریر
گلزار کی نظم

الاؤ،

رات بھر سرد ہوا چلتی رہی
رات بھر ہم نے الاؤ تاپا
ہم نے ماضی سے کئی خشک سی شاخیں کاٹیں
تم نے بھی گزرے ہوئے لمحوں کے پتے توڑے
میں نے جیبوں سے نکالیں سبھی سوکھی نظمیں
تم نے بھی ہاتھوں سے مرجھائے ہوئے خط کھولے
اپنی ان آنکھوں سے میں نے کئی مانجے توڑے
اور ہاتھوں سے کئی باسی لکیریں پھینکیں
تم نے پلکوں پہ نمی سوکھ گئی تھی سو گرا دی
رات بھر جو بھی ملا اُگتے بدن پر ہم کو
کاٹ کے ڈال دیا جلتے ہوئے شعلوں میں
رات بھر پھونکوں سے ہر لو کو جگائے رکھا
اور دو جسموں کے ایندھن کو جلائے رکھا
رات بھر بجھتے ہوئے رشتے کو تاپا ہم نے

فرزانہ، کی ڈائری میں تحریر
نصیر احمد ناصر کی نظم

دسمبر اب مت آنا،

کھلی کھڑکی سے میرے خواب گرتے ہیں
سڑک پر کھیلتے بچوں کے ہاتھوں میں
غبارے بیچنے والے کی آنکھوں میں

ہوا جن کو اڑا دیتی ہے لمحوں میں
کہ منظر کو بدلنے میں
ذرا سی دیر لگتی ہے
نظر بھر دیکھ لینے میں
زمانوں کا خسارہ ہے
سلو موشن میں عمریں بیت جاتی ہیں

ہما خان، کی ڈائری میں تحریر
محسن نقوی کی غزل

جگنو، گہر، چراغ، اُجالے تو دے گیا
وہ خود کو ڈھونڈنے کے حوالے تو دے گیا

اب اس سے بڑھ کے کیا ہو وراثت فقیر کی
بچوں کو اپنی بھیک کے پیالے تو دے گیا

اب میری سوچ سائے کی صورت ہے اس کے گرد
میں بجھ کے اپنے چاند کو ہالے تو دے گیا

شاید کہ فصلِ گل زنی قریب ہے
وہ کھیلنے کو برف کے گالے تو دے گیا

اہلِ طلب پہ اُس کے لیے فرض ہے دُعا
خیرات میں وہ چند نوالے تو دے گیا

محسن اُسے قبا کی ضرورت نہ تھی مگر
دُنیا کو روز و شب کے دوشالے تو دے گیا

یسریٰ، کی ڈائری میں تحریر
سعید احمد اختر کی نظم

دسمبر کی آخری شام،

پھر کہیں ایک ہوئے دو سائے
پھر کسی ہونٹ نے رخسار چھوا
پھر کسی آنکھ نے رخصت چاہی
پھر کسی گال پہ آنسو ڈھلکا
پھر تیری یاد کے سائے مہکے
پھر تیرے پیار کا جھونکا آیا
پھر تیرے نام کی سرگم جاگی
پھر میرے درد کا سورج نکلا
پھر میری آنکھ پہ بادل چھائے

پھر میری یاس کی آندھی اٹھی
پھر میری پیاس کے کانٹے پھوٹے
پھر میری شام سحر تک روئی
میرے گھر سے تیرے در تک روئی

ارم شمس، کی ڈائری میں تحریر
اعتبار ساجد کی غزل

یہی آرزو رہی عمر بھر کہ محبتیں مرے ساتھ ہوں
کبھی ایسا عشق نہیں کیا کہ ندامتیں مرے ساتھ ہوں

کوئی ایسا حرف نہیں لکھا کہ ہو شرمسار قلم مرا
کوئی ایسا جرم نہیں کیا کہ وضاحتیں مرے ساتھ ہوں

فقط ایک شخص کی آرزو میں گزر رہی ہے یہ زندگی
یہ طلب نہیں کہ تمام شہر کی چاہتیں مرے ساتھ ہوں

میں کسی عدالتِ عشق میں، اسے سرخدا، رہوں سرخرو
کفِ دست پہ مرا دل رہے مری تہمتیں مرے ساتھ ہوں

یہ نہیں کہ راہ میں جو ملے، اسے ہمسفر ہی بناؤں میں
جو تمام عمر نبھا سکیں وہ رفاقتیں مرے ساتھ ہوں

آنسہ ناہید کنول، کی ڈائری میں تحریر
ارشد ملک کی غزل

کیسے کہہ دوں اب سفر میں حادثہ ہوتا نہیں
راہ چل پڑتا ہوں لیکن رہنما ہوتا نہیں

کیا چھپا ہے زندگی اس گردشِ ایام میں
وہ بھی چل پڑتے ہیں جن میں حوصلہ ہوتا نہیں

وقت خوشیوں سے بھی کٹ جاتا ہے لیکن دوستو
غم سے بڑھ کر کوئی جذبہ دیرپا ہوتا نہیں

راہ چلتے شخص کا چہرہ تو پڑھ لیتا ہے تو
لیکن اپنے آپ سے کیوں آشنا ہوتا نہیں

بچ نہیں سکتا کوئی بھی وقت کے گرداب سے
ایسے طوفانوں میں اکثر راستہ ہوتا نہیں

کوئی کیونکر فیض پائے ارشد اس انسان سے
جس کا اپنے آپ سے بھی رابطہ ہوتا نہیں

عفت جبیں، کی ڈائری میں تحریر
شفیق احمد خان کی نظم

ابھی وقت ہے میرے ساتھ چل
ابھی پاؤں میں ہیں مسافتیں
ابھی راستوں پہ گرفت ہے
ابھی ہاتھ رکھا ہے وقت کی باگ پر
ابھی مہرباں ہے رہگزر بڑی دور تک
ابھی راستے بھی نہیں اٹے ہوئے غبار میں
ابھی حوصلے ہیں جوان میرے
ابھی دل میں چلنے کا شوق ہے

شگفتہ سلیمان

مجھے یہ شعر پسند ہے

سعدیہ، مریم ــــــــ کراچی
اس کو نہ پا سکے تھے جب دل کا عجب حال تھا
اب جو پلٹ کے دیکھیے، بات تھی کچھ محال بھی

بنفشہ مدثر ــــــــ فیصل آباد
ہجر کی تمازت سے وصل کے الاؤ تک
لڑکیوں کے جلنے میں دیر کتنی لگتی ہے
بات جیسی بے معنی بات اور کیا ہو گی
بات سے مکرنے میں دیر کتنی لگتی ہے

بشریٰ انیس ــــــــ کراچی
سلجھا ہوا سا فرد سمجھتے ہیں مجھ کو لوگ
الجھا ہوا سا مجھ میں کوئی دوسرا بھی ہے

نوشین اقبال نوشی ــــــــ گاؤں بدرمرجان
یوں ہی رنجشوں میں گزر گئے کبھی وہ خفا کبھی میں خفا
چاہتوں کے موڑ پہ کبھی وہ رکا کبھی میں رکا
وہی رنجشیں، وہی چاہتیں نہ اسے خبر نہ مجھے پتا
ہم اپنی اپنی انا میں گم، کبھی وہ جدا کبھی میں جدا

شفق اشان شاہ ــــــــ گوجرہ
رات ہر چند کہ سازش کی طرح گہری ہے
صبح ہونے کا مگر دل میں یقین رکھنا ہے

نسرین ــــــــ کراچی
رہے گا یہ گلہ تقدیر سے ہمیشہ
کہ جس کو عمر بھر چاہا اسی کو عمر بھر ترسے

حافظہ سمیرا ــــــــ 157 این بی
میرے ہر عمل کی قبولیت تیری رحمتوں پہ ہے منحصر
نہ مجھے سلیقۂ التجا، نہ مجھے شعورِ نماز ہے

ثمینہ اکرم ــــــــ کراچی
جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

صبا نوشاہی، ثمینہ عطاری ــــــــ ڈوگہ
ان کے رخسار پہ ٹھہرے ہوئے آنسو توبہ
ہم نے شعلوں پہ مچلتی ہوئی شبنم دیکھی

صائمہ، اقراء ــــــــ وگھ شریف
بے پر ہوں تو کیا غم، آسماں کل تو دیکھے گا
اڑان کیسی شاہانہ ہے تکمیلِ بازوؤں کے بعد

صائمہ سندھو ــــــــ گوجرہ
شبِ غم تیرا تو کیا کہنا
خوشی کی رات بھی سوتا نہیں کوئی

ندا یوسف ــــــــ آدا اولیا
ہو میری مشکلوں کا ماٹر یہ آخری لمحہ
یہی سوچ کے ہر بار میں شکوہ نہیں کرتا

صدف عمران ــــــــ کے ڈی اے
فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا
سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا
یاد کر کے اور بھی تکلیف ہوتی ہے عدیم
بھول جانے کے سوا اب کوئی چارہ بھی نہ تھا

مسز نجیب ــــــــ کراچی
ساری رات کی جاگی آنکھیں
کالج میں کیا پڑھتی ہوں گی

آمنہ ناز محمد ــــــــ میرپور ساکرو
شہر ہوتا تو نیا روز تماشا ہوتا
آ گیا راس ہمیں دل کا بیاباں ہونا

نداء فضہ ــــــــ کراچی
اپنا آپ مٹا ڈالا اس بے کار سی خواہش میں
میرا ذکر کتابوں میں ہو میرا نام رسالوں میں

لبنیٰ خواجہ ———— سندھ

یہ ضروری تو نہیں کہ آگ سے جل جائے بشر
بعض لوگوں کو مقدر بھی جھلس دیتے ہیں

قمر بخاری ———— علی پور

تتلیاں رنگ لیے پھرتی ہیں چاروں جانب
کتنا مشکل ہے بہاروں کا قصیدہ لکھنا

لبنیٰ عروج ———— میرپور خاص

اک تمہی کو خدا سے مانگا ہے
تم ہی کہیں بے وفا نہ ہو جانا

فوزیہ غزل ———— رسالہ شیخوپورہ

بنا کر دوست میرے چارہ گر کو
میرے زخموں کو گہرا کر دیا ہے
محبت کی گواہی دے کے تم نے
مجھے سب میں اکیلا کر دیا ہے

رانی ———— کراچی

ہمیں بھی دکھ ہے دل زندہ کے مرنے کا
کسی کے پاس مگر کب علاج اُس کا تھا

روبینہ سید ———— کراچی

صبح کی دھوپ نہ دیکھی کبھی اُس رات کے بعد
وہ مجھے پھر نہ ملا، پہلی ملاقات کے بعد
عمر بھر میں نے بھی اُس سے نہ مانگا کچھ اور
دیا نہ اُس نے بھی کچھ درد کی سوغات کے بعد

شمع حام ———— میانوالی

رشتے مانگیں سچا ساتھ
سچے ساتھ کا مطلب پوچھے
ہر رشتے کی اوٹ میں جلتی
آدھی میں اور میری ذات

اقصیٰ خان ———— حجرہ شاہ مقیم

اس شہر تمنا سے فراز آئے ہی کیوں تھے
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور

ارم ملک ———— راولپنڈی

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کر دو

مریم ملک ———— گوجرانوالہ

سلوٹیں ہیں میرے چہرے پر تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

سوریٹھ ———— عمر کوٹ

کہا ساتھی کوئی دکھ درد کا تیار کرنا ہے
کہا تم کو اکیلے ہی دریا پار کرنا ہے
کہا میں لاڈلا تیرا بھر منی میں کیوں اترا
کہا یہ سمندر سبھی کو پار کرنا ہے

فریحہ نذیر ———— میاں چنوں

راستہ روکے کھڑی ہے یہی الجھن کب سے
کوئی پوچھے تو کہیں گے کیا کہ کدھر جاتے ہیں
نرم الفاظ، بھلی باتیں، مہذب لہجے
پہلی بارش ہی میں یہ رنگ اتر جاتے ہیں

ثوبیہ جہانگیر ———— مومبرآزاد کشمیر

مجھے منزلوں سے عزیز تر ہیں تیری راہ گزر کی مسافتیں
کہ لکھی ہیں میرے نصیب میں ابھی عمر بھر کی مسافتیں
اسی ایک پل کی تلاش میں جسے لوگ کہتے ہیں زندگی
تیری راہگزر میں بکھر گئیں میری عمر بھر کی مسافتیں

سیما ممتاز عباسی ———— لاڑکانہ

گھنے درخت کے نیچے سلا کے چھوڑ گیا
عجیب شخص تھا، سپنے دکھا کے چھوڑ گیا
یہ اجڑا گھر تو اسی ایک کی نشانی ہے
جو اپنے نام کی تختی لگا کے چھوڑ گیا

چندا سوئی ———— ٹنڈوالہ یار

خدا کی اتنی بڑی کائنات میں، میں نے
بس اک شخص کو مانگا مجھے وہی نہ ملا
بہت عجیب ہے یہ قربتوں کی دوری بھی
وہ میرے ساتھ رہا اور مجھے کبھی نہ ملا

این، ایس نوکی ———— عارف والا

نقش گزرے ہوئے لمحوں کے ہیں دل پر کیا کیا
مڑ کے دیکھوں تو نظر آتے ہیں منظر کیا کیا
کتنے چہروں پر رہا عکس میری حیرت کا
مہرباں مجھ پہ ہوئے آئینہ پیکر کیا کیا

==

ڈراپ سین

چچا چکرم کی وجہ سے کمال اور ان کی اہلیہ کی ازدواجی زندگی ہمیشہ الجھنوں اور بدمزگی کا شکار رہی۔ چچا ہر بات میں ٹانگ اڑاتے مہمانوں کے سامنے بدتمیزیاں کرتے، برے حلیے میں رہتے اور کھانے کی میز پر سب سے پہلے پہنچتے۔ ان کی فرمائشوں کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوتا۔ ان کی وجہ سے کئی بار میاں، بیوی میں طلاق ہوتے ہوتے رہ گئی۔

کافی بوڑھے ہونے کے بعد آخر کار چچا کو ڈبل نمونیا ہو گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ سوئم ہو چکا تو کمال نے گہری سی سانس لے کر بیوی سے کہا۔ "اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں بیس سال تک تمہارے چچا کو اس گھر میں ہرگز برداشت نہیں کرتا۔"

"میرے چچا...؟" بیوی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "خدا کی پناہ...! میں تو آج تک یہی سمجھتی آئی کہ وہ آپ کے چچا ہیں۔"

نویرہ فراز... فیصل آباد

بے چاری

چرچ میں ایک جوڑا پادری کے سامنے پیش ہوا اور شادی کی رسوم ادا کرنے کی درخواست کی۔ پادری نے نوجوان کو نشے کی حالت میں دیکھا تو حکم دیا۔ "باہر نکل جاؤ، کل آنا۔"

اگلے روز نوجوان کا پھر وہی حال تھا۔ جب تیسرے روز بھی وہ نشے کی حالت میں آیا تو پادری نے لڑکی سے کہا۔ "تم کیسی لڑکی ہو، کم از کم چرچ میں آتے وقت تو اسے پینے سے روک دیا کرو؟"

"مجبوری ہے فادر۔" لڑکی نے بے بسی سے کہا۔ "کیونکہ جب بھی اس کے ہوش و حواس قائم ہوتے ہیں تو یہ شادی سے انکار کر دیتا ہے۔"

صائمہ رمضان... وہاڑی

المیہ

ایک شخص نے اپنے دوست سے پوچھا۔ "اتنے اداس کیوں نظر آ رہے ہو؟"

"پانچ سال قبل میں نے اپنی بیوہ اور بے اولاد خالہ کو پاگل قرار دلوا کر ایک پاگل خانے میں داخل کروا دیا تھا اور ان کی دولت و جائیداد پر قبضہ کیے بیٹھا تھا، اب ان کا انتقال ہو گیا ہے اور مرتے وقت وہ ساری دولت و جائیداد میرے نام کر گئی ہیں۔" دوست نے بتایا۔

"تو اس میں پریشانی کی بات ہے؟" اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔

"اب مجھے یہ ثابت کرنا ہے کہ مرتے وقت وہ ذہنی طور پر بالکل ٹھیک تھیں کیونکہ پاگل کی وصیت پر اس کی دولت و جائیداد اس کی اولاد کے سوا کسی کو نہیں مل سکتی۔" دوست نے اداسی سے بتایا۔

ثمینہ کھوکھر... میانہ گوندل

فرض شناسی

فائر چیف نے فائر بریگیڈ میں بھرتی کے لیے آنے والے ایک نوجوان کا انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا۔ "فرض کرو فائر اسٹیشن میں ایک ہی فائر انجن موجود ہے۔ کہیں آگ لگنے کی اطلاع آئے اور میں وہ انجن لے کر چلا جاؤں، تم اسٹیشن میں اکیلے موجود ہو، اسی دوران ایک اور جگہ آگ لگنے کی خبر آتی ہے، ایسے میں تم کیا کرو گے؟"

"سر! میں فوراً ٹیکسی لے کر وہاں پہنچوں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ آپ کے آنے تک آگ

بجھنے نہ پائے۔" نوجوان نے مستعدی سے جواب دیا۔

خدیجہ صادق۔۔۔ تربت

وہم

علاقے کے بازار میں ایک خاتون نے اپنے سابق پڑوسی کی دس بارہ سالہ بچی کو سودا خریدتے دیکھا تو شفقت سے اس کا حال چال پوچھنے کے بعد دریافت کیا۔ "اور تمہارے امی ابو کیسے ہیں؟"

"امی تو ٹھیک ہیں' لیکن ابو بیمار ہیں۔" بچی نے جواب دیا۔

"ارے بیٹا۔۔۔ وہ بیمار ویمار کچھ نہیں ہیں' انہیں وہم ہو گیا ہو گا کہ وہ بیمار ہیں۔" خاتون نے بڑے یقین سے کہا۔

کچھ عرصے بعد اسی بازار میں خاتون کی ملاقات بچی سے ہوئی تو انہوں نے ایک بار پھر اس کے والدین کی خیریت دریافت کی۔

"امی تو ٹھیک ہیں۔" بچی نے دھیمی آواز میں سنجیدگی سے جواب دیا "لیکن ابو کو وہم ہو گیا تھا کہ وہ مر چکے ہیں۔۔۔ کل ان کا چالیسواں تھا۔"

لبنیٰ سومرو۔۔۔ ہرنائی

اندازہ

پروفیسر صاحب نے لیکچر کے اختتام پر کلاس روم میں ایک طالب علم سے پوچھا۔ "فرید! کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہندوستان کی آزادی کی قرارداد پر دستخط کہاں کیے گئے تھے؟"

فرید نے ایک لمحے سوچا' سر کھجایا اور پھر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"سر! کاغذ پر' جہاں قرارداد کا مضمون ختم ہوا ہو گا وہاں پر۔۔۔"

سعدیہ اکرم۔۔۔ رحیم یار خان

اپنائیت

پاگل خانے میں نئے ڈاکٹر صاحب مریضوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ معائنہ کرنے کے دوران ایک پاگل نے کہا۔ "سر! آپ پہلے والے ڈاکٹر صاحب سے زیادہ اچھے ہیں' یہاں سب لوگ آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔"

"اچھا! وہ کیوں؟" ڈاکٹر صاحب نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"سر۔۔۔ آپ ہم میں سے ہی ایک لگتے ہیں۔" پاگل نے جواب دیا۔

عابدہ صفدر۔۔۔ راولپنڈی

خوش نصیب

ایک وکیل نے اپنے موکل سے کہا۔ "بچپن کی عمر بھی عجیب ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے فلم بہرام ڈاکو دیکھی تو دل میں ڈاکو بننے کی خواہش کرنے لگا۔"

موکل بولا۔ "جناب آپ بڑے خوش قسمت ہیں' ورنہ اس دنیا میں بہت کم لوگوں کی خواہشات پوری ہوتی ہیں۔"

رشیدہ گل۔۔۔ کوئٹہ

سیاسی گداگر

بینکرز کی ڈکشنری میں جو شخص پانچ' دس روپے مانگے' وہ بھکاری اور جو پانچ دس کروڑ مانگے وہ زرداری کہلاتا ہے۔ سیاست دان غریبوں کو یہ کہہ کر کہ تمہیں امیروں سے بچائیں گے' ووٹ لیتے ہیں اور امیروں کو یہ کہہ کر تمہیں غریبوں سے بچائیں گے' پیسے لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کولمبس جب سفر پر نکلا تو اس کے پلے کچھ نہ تھا' لوگ اس کے ساتھ تھے' مگر کسی کو پتا نہ تھا کہ وہ انہیں کدھر لے جا رہا ہے۔ رقم وہ لوگوں سے مانگ کر نکلا تھا' آج ایسے کولمبس کو انتخابی امیدوار کہتے ہیں۔

صاحب! الیکشن' پڑھائی اور ہاکی میں کامیابی کے لیے فل بیک ضروری ہے۔ ہمارے ہاں رہنما مہنگائی کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ ایک پشتو حکایت ہے۔ "ایک بزرگ کسی گاؤں سے گزرے' گاؤں والوں نے اچھا سلوک کیا تو انہوں نے دعا کی کہ اللہ تمہارے ہاں ایک رہنما پیدا کر دے' اگلے گاؤں والوں نے برا سلوک کیا تو بددعا دی کہ خدا آپ کے گھر گھر میں رہنما پیدا کرے۔"

ڈاکٹر محمد یونس بٹ کی کتاب "جوک در جوک" سے

اقتباس

ندا علوی۔ کراچی

بچے ہمارے عہد کے

ایک بچے نے اپنے انکل سے پوچھا۔ "میں نے ایک ہاتھی کے سامنے بارہ کیلے رکھے۔ ہاتھی نے گیارہ کیلے کھا لیے اور ایک چھوڑ دیا' کیوں؟"

انکل نے جواب دیا۔ "ہو سکتا ہے کہ گیارہ کیلے کھا کر ہاتھی کا پیٹ بھر گیا ہو اور اس نے ایک اور کیلا کھانا ضروری نہ سمجھا۔"

بچے نے کہا۔ "جی نہیں' ہاتھی نے بارہواں کیلا اس لیے نہیں کھایا کہ وہ پلاسٹک کا تھا۔"

پھر بچے نے دوسرا۔۔۔ سوال کیا۔ "بتائیں کہ میں نے ایک ہاتھی کے سامنے بارہ کیلے رکھے اور اس نے ایک بھی نہیں کھایا' کیوں؟"

بچے کے انکل نے جواب دیا۔ "کیونکہ وہ بارہ کیلے پلاسٹک کے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔۔۔ اس مرتبہ ہاتھی پلاسٹک کا تھا۔" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

میمونہ ریاض' صدف مختار۔۔۔ بوسال مصور

اف یہ بے چارگی

کلاس ٹیچر نے طلبہ کو طویل لیکچر دینے کے بعد کہا۔ "آپ لوگ مجھ سے وعدہ کریں کہ عملی زندگی میں کبھی شراب اور سگریٹ نہیں پئیں گے۔"

"سر! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہرگز نہیں پئیں گے۔"

"لڑکیوں کا پیچھا نہیں کریں گے اور نہ انہیں کبھی چھیڑیں گے۔"

"سر! نہیں کریں گے۔"

"لڑکیوں سے کبھی فلرٹ نہیں کریں گے۔"

"سر! آپ اطمینان رکھیں' ایسا ہی ہو گا۔"

"ان پر آوازیں نہیں کسیں گے۔"

"سر! بالکل نہیں کسیں گے۔"

"اچھا! آخری بات یہ کہ اس وطن پر اپنی زندگی قربان کر دیں گے۔"

"کر دیں گے سر! بالکل کر دیں گے۔ آخر ایسی زندگی کا اور کرنا بھی کیا ہے۔"

صدف مختار۔۔۔ بوسال مصور

عہد

ایک نوجوان اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کر رہا تھا اچانک کشتی میں پانی بھرنے پر نوجوان گڑگڑا کر دعا مانگنے لگا۔

"اے خدا اگر میں بچ گیا تو یہ عہد کرتا ہوں کہ شراب کو کبھی منہ نہ لگاؤں گا' جوا کبھی نہ کھیلوں گا اور۔۔۔" خوب صورت گرل فرینڈ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"آگے کچھ نہ کہو ایک کشتی ہماری طرف آ رہی ہے۔"

نادیہ جمیل۔۔۔ مری

سرگوشی

طویل بیماری کے بعد اس کی داڑھی اور مونچھیں بے تحاشا بڑھ چکی تھیں۔ صحت یابی کے بعد جب وہ آب و ہوا کی تبدیلی کے لیے اپنی بیوی کے ساتھ ساحل سمندر پر واقع ایک ہوٹل میں ٹھہرا تو اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ اپنی داڑھی صاف کرے گا اور اس سے اگلے روز مونچھیں اور اس نے ایسا ہی کیا۔

تیسرے روز جب وہ کلین شیو ہو کر اپنی بیوی کے ہمراہ ہوٹل سے باہر آ رہا تھا تو اس کی بیوی کے کانوں میں کسی عورت کی سرگوشی کی آواز آئی جو اپنی ساتھی سے کہہ رہی تھی۔ "یہ عورت مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتی' آج یہ تیسرا آدمی ہے' جس کے ساتھ یہ باہر جا رہی ہے۔"

سائرہ سہیل۔۔۔ جلال پور' پیروالا

☼ ☼

حسن و صحت

ادارہ

دنیا بھر میں چاکلیٹ ،لیموں ،ایلوویرا اور آلو کو بیوٹی پروڈکٹس میں وافر مقدار میں استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ ان اشیاء میں حسن نکھارنے کی قدرتی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ آئیں اب ہم ان اشیاء پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور قدرت میں پوشیدہ کھانے پینے کی چیزوں کے ذریعے حسن کے راز سے پردہ اٹھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آپ اپنی خوب صورتی کو کس طرح مثالی حسن میں تبدیل کر سکتی ہیں۔

1 - چاکلیٹ

چاکلیٹ میں جلد کو نرم و ملائم رکھنے کی خصوصیت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ چاکلیٹ وقت کے ساتھ گہری ہوتی جھائیوں کو بھی روکتی ہے۔ چاکلیٹ میں شامل کوکوبٹر ایک طاقتور مانع تکسید جز (Anti oxidant) ہے جبکہ ڈارک چاکلیٹ کو عالمی سطح پر انسانی صحت کے لیے بے حد مفید سمجھا جاتا ہے۔ چاکلیٹ ایک بہترین مونسچرائزر ہے جو آپ کی جلد کی نمی برقرار رکھتا ہے اور جلد کے مردہ خلیے نئے سرے سے تشکیل دے کر جلد کو وافر مقدار میں آکسیجن فراہم کرتا ہے۔ جس سے آپ کی جلد کی شادابی اور تازگی سو فیصد یقینی ہوتی ہے۔ چاکلیٹ میں شامل فائبر ،پروٹین ،معدنیات اور فیٹی ایسڈز کی وجہ سے چاکلیٹ کا ماسک چہرے کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ چاکلیٹ کا ماسک چہرے کے خلیوں کی صحت مند افزائش کر کے آپ کی جلد کو جوان رکھتا ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ چاکلیٹ کی بھینی بھینی اور میٹھی سی دلفریب خوشبو جو اپنے آپ میں ایک بھرپور تاثر رکھتی ہے ،نہ صرف انسانی ڈپریشن کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے بلکہ ہمت ،حوصلہ بھی بڑھاتی ہے۔

ہاٹ کوکو فیشل

ایک کھانے کا چمچ کوکو پاؤڈر ،ایک کھانے کے چمچ گرم دودھ میں مکس کر کے چہرے پر اچھی طرح لگائیں۔ ماسک سوکھنے کا انتظار کریں۔ پھر ایک گیلے تولیے سے ماسک اچھی طرح صاف کریں۔

آئلی اسکین کے لیے چاکلیٹ فیس ماسک

1/3 کپ کوکو پاؤڈر ،ایک چائے کا چمچ کریم ،ایک کپ پکا پپیتا (گودا) 1/4 چائے کا چمچ شہد اور تین چائے کے چمچ جئی کا آٹا مکس کرلیں اور چہرے پر لگائیں پندرہ منٹ بعد چہرہ گرم پانی سے دھولیں۔

فیس کریم

1/3 کپ کوکو پاؤڈر ،تین چائے کے چمچے جئی کا آٹا ،ایک چوتھائی کپ شہد اور تین کھانے کے چمچے کریم اچھی طرح مکس کرلیں۔ یہاں تک کہ مکسچر کریم کی طرح گاڑھا ہو جائے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ مکسچر چہرے پر لگائیں اور کریم سے ہلکے ہلکے چہرے کا مساج کریں تاکہ ماسک میں شامل جئی کا آٹا آپ کے چہرے سے مردہ خلیوں کا خاتمہ بخوبی کر سکے۔ یہ ماسک پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر چہرہ نیم گرم پانی سے دھولیں۔

2 - ایلوویرا

ایلوویرا ایک ایسا پودا ہے جو انسانی جلد ،بال اور مختلف امراض کے لیے غذائی ،دوائی اور جادوئی اہمیت کا حامل ہے۔ ماہرین غذائیت مختلف امراض میں ایلوویرا کو بطور غذا استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ایلوویرا جلد کے لیے ایک محافظ کا کام کرتا ہے۔ اسی لیے ایلوویرا کو جلدی امراض میں سب سے بہترین قدرتی دوا تصور کیا جاتا ہے۔ ایلوویرا کا باقاعدگی سے استعمال جلد کو درکار نمی مناسب مقدار میں فراہم کرتا ہے۔ جس سے جلد نرم و ملائم اور ترو تازہ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ آئلی اور حساس جلد کے لیے بھی بہت مفید ہے کیونکہ ایلوویرا میں آئلی اسکن پر موجود چکنائی جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت ہوتی ہے۔ اس لیے ایلوویرا کا جوس یا گودا روزانہ آئلی اسکن پر لگانے سے چہرے کا آئل کنٹرول میں رہتا ہے۔ ایلوویرا دانے ،پھوڑے ،پھنسیاں ،داغ دھبے ،جلنے کے نشان اور زخم ،سن برن ،کیل مہاسے جھائیاں اور جھریاں ،خشکی اور بالوں کا گرنا ایسے غائب کرتا ہے جیسے ان کا نام و نشان نہ ہو۔

بالوں کا گرنا :

اگر آپ کے سر کے بال گر رہے ہوں تو ایلوویرا جیل کا متواتر استعمال گرتے ہوئے بالوں کو فوری طور پر روک دیتا ہے۔ ایلوویرا میں ایک ایسا خامرہ (Enzyme) ہوتا ہے جو بالوں کی بڑھوتی کو فروغ دیتا ہے۔ اس لیے ایلوویرا جیل سے بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح مساج کریں۔

جلد کے کھلے مسامات بند کرنے کے لیے :

دو چائے کے چمچے ایلوویرا جوس یا گودا اور ایک چائے کا چمچ لیمن جوس اچھی طرح مکس کر کے چہرے پر لگائیں۔ یہ عمل چہرے کے کھلے مسامات کو فوری طور پر بند کرتا ہے اور آپ کی جلد کو لچکدار اور چمکدار بناتا ہے۔

دھوپ سے جلد کا جھلسنا یا کالا پڑ جانا :

ایلوویرا دھوپ سے جھلسی ہوئی جلد کا قدرتی علاج ہے۔ ایلوویرا کے چند پتے لے کر ان کا گودا نکال لیں پھر گودے میں ایک لیموں کا رس شامل کر کے اس جیلی نما مادہ کو متاثرہ حصوں پر لگائیں۔ یہ عمل نہ صرف آپ کی جلد کے لیے کلینزنگ کا کام کرے گا بلکہ آپ کی جلد کی مکمل اور اندر تک صفائی کر کے اسے صاف و شفاف اور خوب صورت بھی بنائے گا۔

3 - آلو :

آلو حیاتین اور معدنیات کا بہترین مرکب ہے۔ آلو میں شامل وٹامنز بی کمپلکس ،وٹامن سی ،پوٹاشیم ،میگنیشیم ،فاسفورس اور زنک ،جلد پر پڑنے والے جلنے کے نشانات دور کرنے اور جلد کو ٹائٹ رکھنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔ میش کیے ہوئے آلو یا صرف وہ پانی جو آلو کو دھونے اور کاٹنے کے لیے استعمال کیا گیا ہو ،چہرے کے لیے زبردست قدرتی فیس واش ثابت ہو سکتا ہے۔ آلو آپ کی جلد کے سخت اور کھردرے حصوں مثلاً" کہنیوں اور ہاتھوں کی گہرائی تک صفائی کر کے انہیں نرم و ملائم بناتا ہے۔ کچے آلو کا رس چہرے سے پھنسیوں کا خاتمہ کرتا ہے۔ ابلے ہوئے آلو میش کر کے یا پھر کچے آلو کو چھیل کر اس میں شہد ملا کر بہترین ماسک تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ ماسک چہرے کے داغ دھبے دور کرنے کے لیے انتہائی مفید ہے۔ ہلکے پھلکے جلنے کے زخم یا نشانات دور کرنے کے لیے متاثرہ حصے پر کچے آلو کا ایک سلائس رکھ کر بیس تیس منٹ کے لیے بینڈیج باندھ لیں۔ یہ عمل نہ صرف جلن کم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے بلکہ اس سے جلنے کا نشان غائب ہو جاتا ہے اور آبلہ بھی نہیں پڑتا۔

پوٹیٹو پیک :

ایک عدد آلو کو کش کرلیں پھر اس میں شہد ملا کر چہرے اور گردن پر اچھی طرح لگائیں۔ پندرہ منٹ کے لیے چھوڑ دیں پھر نیم گرم پانی سے چہرہ دھولیں۔

کیل مہاسوں کے خاتمے کے لیے :

ایک آلو لے کر اس کے سلائس کرلیں۔ پھر ان سلائس کو کیل مہاسوں والے حصوں پر خوب اچھی طرح ملیں۔ آلو میں موجود وٹامنز چہرے کی تمام گندگی اور کیل مہاسوں سے ہونے والی سوجن اور الرجی اپنے اندر جذب کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔

خشک اور کھردرے ہاتھوں کے لیے :

دو آلو چھیل کر کش کر کے ان کا رس نکال لیں پھر

اس رس میں شہد ملا کر ہاتھوں پر ملیں۔ خاص طور پر انگلیوں کے جوڑ اور پوروں پر کیونکہ یہ دو حصے ہوتے ہیں جو دھوپ سے فوری طور پر متاثر ہو جاتے ہیں۔ آلو کا رس گہرے رنگ کو ہلکا کرتا ہے اور آپ کی جلد کو چکنار کھتا ہے۔

آلو بطور ٹونر :

ایک عدد آلو چھیل کر ٹکڑے کرلیں۔ پھر ان ٹکڑوں کو بلینڈر میں ڈال کر تین کھانے کے چمچے عرق گلاب شامل کر کے بلینڈ کرلیں۔ اس مکسچر کو آئس ٹرے میں ڈال کر آئس کیوبز جمالیں۔ پھر ان کیوبز کو بطور ٹونر استعمال کریں۔ یہ عمل خشک، جلی اور کٹی پھٹی جلد کے لیے انتہائی موزوں ہے۔

آنکھوں کی سوجن دور کرنے کے لیے

آلو کے قتلے کاٹ کر آنکھوں کی سینکائی کریں۔ بہتر نتائج کے لیے یہ عمل سو کر اٹھنے کے بعد دہرائیں۔ آنکھوں کی سوجن دور ہو جائے گی۔

4 - لیموں

لیموں میں کیلشیم، وٹامن سی، فاسفورس اور دیگر ضروری اجزا کثیر مقدار میں موجود ہوتے ہیں جو آپ کی جلد کی صحت اور خوب صورتی دونوں کے لیے بہت ضروری ہیں۔

بالوں کی چمک بڑھانے کے لیے

روکھے بالوں میں چمک پیدا کرنے کے لیے سر دھونے کے بعد ایک مگ پانی میں ایک لیموں کا رس ملا کر سر میں ڈالنے سے بالوں میں چمک آجاتی ہے۔

ناخن کی چمک :

لیموں کے رس دار چھلکے سے، جس میں نمی موجود ہو ناخن کا مساج کریں۔ ناخن صاف اور چمکدار ہو جائیں گے۔

دانتوں کی چمک

لیموں کا چھلکا جس میں ہلکا سا رس موجود ہو، اس پر نمک لگا کر دانتوں پر ملا جائے تو اس سے دانت صاف اور چمک دار ہو جاتے ہیں۔

سیاہ ہونٹ

ایک کھانے کے چمچ دودھ کی بالائی میں لیموں کے چند قطرے ملا کر ہونٹوں کا مساج کریں، خاص طور پر لپ اسٹک اتارنے کے بعد یہ مساج ضرور کریں۔ اس عمل سے ہونٹ کی سیاہی مائل رنگت دور ہو جاتی ہے۔

ناک سے سیاہ کیلوں کا خاتمہ

ناک پر اچھی سی کولڈ کریم سے مساج کرنے کے بعد ململ کے کپڑے سے کریم اتارلیں۔ اب لیموں کے رس دار چھلکے کو ناک پر رگڑیں اور کیلوں کو ہاتھوں سے دبا کر نکال دیں۔

پیروں پر سیاہ نشانات

پیر دھونے کے بعد ایک لیموں کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرلیں اور جو کا آٹا لگا کر پیروں کا مساج کریں۔ پانچ منٹ بعد پاؤں دھو کر پیٹرولیم جیلی لگالیں۔ پیروں پر سے سیاہ نشانات غائب ہو جائیں گے۔

☆ ☆

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

چکن پائی

اجزا :

مرغی کا گوشت	ایک پاؤ
ٹماٹر	تین عدد
بیکنگ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
پیاز	ایک عدد
گھی	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک لہسن	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
میدہ	دو کپ

ترکیب :

ایک پین میں تیل گرم کر کے اس میں مرغی کا گوشت ڈال دیں۔ اب اس میں نمک، ادرک لہسن، پسی لال مرچ شامل کر کے اتنا پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ اب اس میں ٹماٹر شامل کر کے بھون لیں، جب ٹماٹر مکمل گل جائے تو شملہ مرچ اور پیاز شامل کریں اور 3۔2 منٹ تک پکا کر چولہا بند کردیں۔ اب میدہ میں گھی، نمک اور بیکنگ پاؤڈر شامل کر کے پانی کے ساتھ گوندھ لیں، اب اس میدے کے اندر چکن والا مسالا بھر کر اوون کے اندر 160c پر بیک کر لیں۔ رنگ تبدیل ہونے پر نکال لیں، شام کی چائے کے ساتھ گرما گرم پیش کریں۔

نوابی مرغ بریانی

اجزا :

چکن	ایک کلو
چاول	ایک کلو
پیاز	تلی ہوئی
نمک	حسب ضرورت
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
تیل	ایک کپ
ہرا دھنیا	ایک گڈی
پودینہ	ایک گڈی
ٹماٹر	ایک پاؤ
دہی	پانچ سے چھ کھانے کے چمچے
جائفل جاوتری	آدھے سے تھوڑا کم چائے کا چمچہ
کاجو	پندرہ سے بیس عدد
دودھ (زعفران گھولنے کے لیے)	چار کھانے کے چمچے
ثابت گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
زردے کا رنگ	اندازے کے مطابق
زعفران	اندازے کے مطابق

ترکیب :

سب سے پہلے تیل گرم کر کے مسالا ثابت اور پیاز ڈالیں ہلکا براؤن ہونے پر ادرک لہسن اور چکن شامل کردیں ساتھ ہی ٹماٹر، ہری مرچ، دہی، ہرا دھنیا، پودینہ، لال مرچ، نمک ڈال کر پکائیں جائفل جاوتری بھی شامل کردیں۔ بھن جانے پر الگ رکھ دیں۔ اب چاول دو کنی ابال کر نتھار لیں اور تہہ لگالیں۔ سب سے اوپر دودھ میں گھلا ہوا زعفران ڈالیں پھر تلی ہوئی پیاز ڈالیں، کاجو ڈالیں اور دم پر رکھ دیں۔ چولہا بند کرنے کے بعد اوپر ہرا دھنیا چھڑک دیں۔ رائتہ سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

افغانی پلاؤ

اجزا :

چکن	ایک کلو
پیاز	چھ عدد
پسا گرم مسالا	تین سے چار کھانے کے چمچے
ادرک لہسن	تین کھانے کے چمچے
چاول	آدھا کلو
نمک	حسب ضرورت
گاجر لمبائی میں کٹی ہوئی	دو کھانے کے چمچے
کشمش	دو کھانے کے چمچے
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

پہلے تیل گرم کریں۔ اس میں پیاز کو ڈارک براؤن کریں۔ اب اس میں چکن اور ادرک لہسن شامل کر کے بھون لیں، ساتھ ہی نمک بھی شامل کریں جب بھن جائے تو پانی شامل کر کے گل جانے تک پکائیں اور چولہا بند کر دیں۔ اب چاول دو کنی پر نتھار لیں اور ایک پتیلی میں پہلے تھوڑے سے چاول ڈالیں پھر چکن آدھی ڈالیں اور پھر اندازے سے گرم مسالا ڈالیں۔ پھر چاول ڈالیں اسی طرح دو تہہ دیں اوپر چاول پھر کشمش، باریک کٹی گاجر اور گرم مسالا باقی کا ڈال کر دم پر رکھ دیں۔ لذیذ افغانی پلاؤ تیار ہے۔

چکن نوڈلز سوپ

اجزا :

نوڈلز	آدھا پیکٹ
مرغی کا گوشت	ایک پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	تھوڑی سی
گاجر	ایک عدد
پانی	آٹھ، دس کپ
کارن فلور	ایک دو کھانے کے چمچے
ہری مرچ	ایک عدد باریک کاٹ لیں
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ

سب سے پہلے 4 کپ پانی میں مرغی کا گوشت ڈال دیں۔ اس میں نمک، سفید مرچ شامل کر کے اتنا پکائیں کہ پانی آدھا سوکھ جائے۔ جب یہ سوپ تیار ہو جائے تو چولہا بند کر دیں۔ اب نوڈلز کو الگ سے ابال لیں جب نوڈلز گل جائیں تو ان نوڈلز کو چکن والے سوپ میں شامل کر کے گاجر اور کالی مرچ اور کارن فلور شامل کر کے ہلکا سا گاڑھا کر لیں۔ مزے دار سوپ تیار ہے۔ سوپ میں بہترین ذائقے کے لیے مختلف سبزیوں کا انتخاب اپنی مرضی سے بھی کیا جا سکتا ہے۔

چکن ان ٹیریاکی ساس

مرغی کا گوشت	آدھا کلو (بون لیس)
کٹی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
ٹماٹر	چار عدد
ہری مرچ	چار عدد باریک کٹی ہوئی
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک لہسن	ایک چائے کا چمچہ
ٹیریاکی ساس	حسب ذائقہ
تیل	آدھی پیالی
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

سب سے پہلے مرغی کے گوشت پر لیموں کا رس، کالی مرچ، لال مرچ، ہلدی اور ادرک، لہسن اور ٹیریاکی ساس شامل کر کے تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔ اب کڑھائی میں تیل گرم کریں۔ اس میں ٹماٹر شامل کر کے بھون لیں، اب اس میں مسالا لگی ہوئی چکن شامل کر کے ہلکی آنچ پر پکنے دیں، ساتھ ہی ہری مرچیں بھی شامل کر دیں، جب گوشت گل جائے اور تیل اوپر آجائے تو چولہا بند کر دیں۔ مزے دار چکن ٹیریاکی ساس تیار ہے۔ نان کے ساتھ پیش کریں۔

✲ ✲

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔

شاہدہ اعجاز..... حیدر آباد

س بھیا ذوقی! کیا وجہ ہے کہ شرم سے پانی پانی ہو جانے کے باوجود انسان کے کپڑے گیلے نہیں ہوتے ہیں؟

ج چونکہ پانی خود شرمندہ ہوتا ہے اس لیے کپڑے گیلے نہیں کرتا آخر اس کی بھی تو کوئی عزت ہوتی ہے۔

یاسمین روحی..... راولپنڈی

س
میں کس کے ہاتھ پر اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے کیوں؟

ج پورے ملک میں سردی بڑھ گئی ہے اس لیے۔

س سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے؟ کبھی تو بھیا ان لفظوں پر غور کر لیا کریں؟

ج بہت کیا بہت کیا پر سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

شہلا تمکین..... ڈیرہ اسماعیل خان

س اگر ہمارے نام نہ ہوتے تو ہم ایک دوسرے کو کیسے بلاتے؟

ج اے بھائی، اے بہن، اے ابا، اے اماں وغیرہ وغیرہ۔

فاطمہ مرتضیٰ ابڑو..... ٹنڈو جام

س نین بھیا! ہم نے سنا ہے کہ آپ کئی بھوتوں کے مالک ہیں۔ ایک عدد بھوت کی ضرورت ہے معقول معاوضہ بھی ملے گا۔ جلد از جلد ایک بھوت روانہ کر دیں؟

ج میں مصروف ہوں اس لیے نہ بھیج سکتا ہوں، نہ ہی آسکتا ہوں۔

تابندہ صدیقی..... اسلام آباد

س:
راس آتی نہیں تنہائی بھی
اور ہر شخص سے بے زار بھی ہیں
بتاؤ کیا کروں؟

ج بس ہماری طرح خوش رہو۔

زیبا عرفان، ہیلا عرفان..... کراچی

س پاگل انسانوں میں سب سے بڑی خوبی کیا ہوتی ہے؟

ج جو کہتا ہے سچ کہتا ہے، سچ کے سوا کچھ نہیں کہتا۔
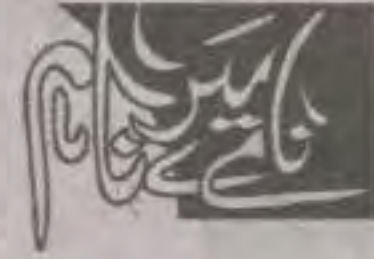
سارىہ چوہدری۔۔۔ڈوگہ گجرات

السلام علیکم! اس بار تو کرن ہم کو معمول سے زیادہ ہی کچھ پہلے مل گیا ہے۔ ورنہ ہر بار 17 کو ملتا ہے۔ کرن ہمارا بہت فیورٹ ہے۔ مگر نبیلہ آپی اور نایاب جیلانی کی وجہ سے۔ نایاب پلیز آپ بھی کرن میں لوٹ آئیں پلیز۔ ہم نے کرن پکڑتے ہی سب سے پہلے "دردل" کھولنا ہوتا ہے۔ سچی اس بار بھی گھر کے دروازے میں کھڑے کھڑے ہی کہانی پڑھنی شروع کردی تھی۔ مگر یہ کیا نبیلہ آپی؟ یہ کیا کیا آپ نے؟ میرا خیال تھا اب نبیل کو اس کی محبت دینا چاہ رہی ہیں، مگر آپ تو اس سوچ سے بھی آگے نکل گئیں۔ انیقہ آپی نے ٹھیک کہا تھا کبھی برداشت نہیں ہوتا تھا زری نبیل کی ہوتی اور اب مجھ سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا نبیلہ آپی کہ زری دل آور کی ہو بلکہ مرجانا چاہیے زری کو۔ اک قاری بہن نے لکھا تھا۔ زری کی بولڈنیس پہ اور انیقہ آپی نے جواب دیا تھا۔ بالکل وہی جواب میرا ارادہ تھا لکھنے کا اچھا ہوا آپی آپ نے لکھ دیا۔ پلیز نبیلہ آپی دل آور جیسے اکھڑ، مغرور، انا پرست، بندے کے لیے زری کو بھی اجنبی اور پتھر بنا دیں۔ کم از کم اس کا دل آور کی طرف پلٹنا مجھ سے نہیں سہا جائے گا اور پلیز آپی اب یہ سب راز فاش کردیں جلدی سے۔ انیقہ آپی اور سونیا ربانی سے ملاقات بہت اچھی تھی۔ بہت مزا آیا۔ مگر انیقہ آپی آپ نے اکثر جواب وہ لکھے جو میرے ذہن میں تھے۔ میری طرح باتیں کرتی ہیں آپ اور فوزیہ آپی آپ بھی بہت نائس ہیں۔ آپ گجرات میں کس جگہ رہتی ہیں؟ کیا آپ اور انیقہ آپی مجھ سے دوستی کریں گی؟ جواب پلیز لازمی دینا آپ دونوں اور آپی آپ میرا خط لازمی شامل کرنا تاکہ میرا میسج انیقہ، فوزیہ اور نبیلہ آپی تک پہنچ جائے۔ باقی رسالہ میں نے ابھی پڑھا نہیں، کیونکہ جب میں "دردل" پڑھ لوں پھر میرا دل کوئی رسالہ، کوئی کہانی پڑھنے کو نہیں کرتا اور یہ سلسلہ تب تک رہنا ہے اب جب تک زری منزل تک نہیں پہنچ جاتی، بلکہ کچھ عرصے پھر بھی یہ کسک جدائی کی مجھے بہت غمگین رکھے گی نبیلہ آپی۔ سونیا ربانی آپ نے شعر لکھا تھا۔

دائم آباد رہے گی دنیا
ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا

لاجواب تھا میری زبان سے اتر ہی نہیں رہا اب....

اگلے ماہ کے کرن کا شدت سے انتظار رہے گا، اجازت دیجیے فی امان اللہ

صائمہ، اقراء۔۔۔وگھ شریف

السلام علیکم نومبر کا کرن اس بار 19 تاریخ کو ملا بہت ساری مصروفیت ہونے کے باوجود چند گھنٹے نکال کر کرن کو ہاتھ میں لیا۔ ٹائٹل بس اچھا لگا۔ حمد و نعت سے مستفید ہونے کے بعد انٹرویوز کی جانب بڑھی جن میں ٹیپو شریف اور عظمی بلوچ کے انٹرویوز اچھے لگے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے "دردل" کو پڑھا۔ اس بار بھی قسط کافی دکھی لگی، محبت میں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے۔ جیسے کہ نبیل و زری اور آذر سہہ رہے ہیں۔ نبیلہ آپی آپ کیسے سنگدلوں کی طرح ان لوگوں سے زیادتی کررہی ہیں۔ نبیلہ آپی آپ کہانی کو ذرا تیز کریں۔ ہمیں تو یہ کہانی اسٹار پلس کے کسی سوپ کی طرح لگتی ہے۔ جلدی سے اس کو آگے بڑھائیں ماضی کو سامنے لائیں پلیز۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" اس بار نہیں تھی۔ فاخرہ گل کو حج کرنے کی سعادت پر دلی مبارک باد۔ فاخرہ آپی خوش قسمت ہیں جنہوں نے حج جیسی نیک سعادت حاصل کی۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو حج کی سعادت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین) مکمل ناول ابھی پڑھے نہیں، اگر پڑھتی تو شاید پھر خط نہ لکھ پاتی۔ ناولٹ بھی اچھے لگے۔ افسانوں میں کمپرومائز نور عین کا اچھا لگا۔ وہ محاورہ ہے نا جیسی کرنی ویسی بھرنی، اس کہانی میں کچھ ایسا ہی تھا۔ باقی افسانے بھی اچھے تھے۔ مستقل سلسلے زبردست تھے۔ کرن ٹیم کے لیے ڈھیروں دعائیں، سلام و پیار۔ میری دوستوں صبا، فوزیہ، پری وش، شربتی اعوان کو خصوصی سلام، خدا حافظ۔

عائشہ خان۔۔۔ٹنڈو محمد خان

السلام علیکم! تمام اسٹاف، قارئین، مصنفین اور مدیرہ آپی کیسے ہیں آپ سب لوگ! 12 نومبر کو اچانک ہی کرن کی آمد سے بے انتہا خوش ہوگئی، کیونکہ وہ دن میرے خوش اخلاقی کے ہوتے ہیں جب شعاع، کرن و خواتین آتا ہے۔ بہت پیارے سے ٹائٹل کو دیکھ کر دل خوش ہوگیا۔ بلیک کلر میں ماڈل پرسوز حسن میں بہت پیاری لگ رہی ہے۔ ہمیشہ کی طرح سب سے پہلے "دردل" پڑھا اچھی قسط تھی۔ "دست کوزہ گر" قسط اچھی لگی۔ بے چاری زوبیہ کہاں لاپتا ہوگئی۔ اس کے ساتھ کچھ غلط نہ ہوجائے اور رومیلہ کا بھی بہت دکھ ہوا۔ بالکل درست ہے یہ بات کہ شگفتہ راز خود افشا کردیں گی۔ افسانوں میں "چھوٹی چھوٹی باتیں" بہت بہت پسند آیا۔ باقی زیر مطالعہ ہیں۔ "میرے ہوکے رہو" فرحت عمران کا بھی بہت اچھا لگا۔ رملہ کا بچھنا، پھر واپسی اچھی لگی۔ فاخرہ گل کو حج کی بہت مبارک قبول ہو۔ "مقابل ہے آئینہ" میں سونیا ربانی پسند آئیں۔ ویسے مجھے اپنی قارئین بہنیں سب ہی بہت اچھی لگتی ہیں۔ شعروں میں نمرہ اقراء، فوزیہ ثمر بٹ، نواب زادی اور یاسمین حبیب کے شعر پسند آئے۔ ڈائری میں صغری یاسین اور نمرہ اقراء کی ڈائری پسند آئی۔ "آواز کی دنیا" سے عظمی بلوچ سمپل سی پسند آئیں اور یہ جنید خان، فیضان خواجہ، ماریہ زاہد، نور حسین، ان سب سے تو میرا دل گھبرا گیا ہے۔ اب کسی نئے اداکار اور اداکارہ کا انٹرویو شائع کریں۔ جیسا کہ شہریاراں کی درشہوار ہے اس کا اصل نام پتا نہیں کیا ہے۔

پہلی مرتبہ "نہلے پہ دہلا" پڑھتے ہوئے ہنسی کے بجائے مجھے رونا آگیا۔ جب ایک بہن (عظمی رانی، سیالکوٹ) کا سوال۔ س:۔ "بھائی جی شکسپیئر کہتا ہے کہ دنیا اک اسٹیج ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو بتائیے کہ آپ نے اس اسٹیج پر کون سا اہم کردار ادا کیا ہے؟" ج:۔ "بڑھاپے کے علاوہ ہر کردار" اور یہ جواب پڑھ کر میری آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ کیونکہ واقعی میں ذوالقرنین بھائی بڑھاپے سے پہلے ہی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ ان کے برجستہ جواب ہمیشہ ہی لاجواب ہوتے تھے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین) یہ لکھنے کے بعد اب کچھ لکھنے کا موڈ نہیں۔ دل اداس سا ہوگیا۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضر ہوں گے۔ (اللہ حافظ) اور ہاں فوزیہ ثمر نے بوندی کا پوچھا تھا کہ بوندی کیا شے ہے؟ بوندی، بیسن کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی پکوڑیاں ہوتی ہیں۔ ریڈی میڈ دہی بڑے بنانے کے لیے۔ نیم گرم پانی میں بھگو کر مٹھی میں نچوڑ کر دہی میں ڈال دیں۔ ہلکا سا چاٹ مسالا ڈال کر کھائیں۔ (ہاہاہا) اور سالگرہ پروش کرنا بھول گئی تھی۔ اب مبارک قبول کرو۔

سدرہ اکرام۔۔۔گولڑہ شریف

کرن کی تمام ٹیم کو ماہدولت کا سلام۔ نومبر کا شمارہ خلاف توقع 14 کو ہی ہمارے ہاتھوں میں آکر اچانک اور حیرت انگیز خوشی سے دوچار کر گیا۔ سب سے پہلے "دردل" کے صفحات کی طرف بڑھے۔ اس دفعہ کی قسط نبیل کے اظہار محبت اور ایسے محبوب سے جو بستر علالت پر ہو اس حالت میں سن سکتا ہو بول نہ سکتا ہو زندگی کی عجیب صورت حال سے آگاہ کر گئی۔ میرا دماغ محب اور محبوب کے الفاظ اور رد عمل میں الجھا رہا۔ یہ سچ ہے کہ نبیلہ کی لفظوں پر بہت اچھی گرفت ہے۔ لیکن یہ کہنے میں بھی عار نہیں کہ بے جا طوالت ناول کے پورے تاثر کو متاثر کررہی ہے۔ نبیلہ جی امید ہے میری اس بات کو آپ مثبت انداز میں لے کر ہماری شکایت کو دور کریں گی۔ "دست کوزہ گر" میں الیان کا رومیلہ کو اعتماد میں نہ لے کر انتہائی قدم اٹھانا برا لگا۔ باقی فوزیہ بہت اچھے طریقے سے ناول کے اختتام کی طرف گامزن ہیں۔ یہ ماہدولت کا تجزیہ ہے۔ "تیسرا دروازہ" بہت اچھی تحریر تھی۔ پلیٹ فارم، ٹرین، ویرانے، ریل گاڑی اور دو مسافروں کی زندگی کی داستان نے ایک عجیب سا فسوں طاری کردیا۔ ہم اپنی زندگی میں بہت سارے تجربے نہیں کرپاتے اور نہ ہی ہر سچویشن سے گزر پاتے ہیں۔ یہ تحریریں اور کہانیاں ہی ہوتی ہیں جو ہمیں زندگی کی سچائیوں اور لوگوں کے حالات سے روشناس کراتی ہیں۔ بہت خوب سدرہ۔ "خدائے عصر" ایک ایسا سچ جس نے عام لوگوں کی زندگیوں میں زہر گھولا ہوا ہے۔ بہت اچھی تحریر اور متاثر کن انجام۔ "میرے ہوکے رہو" ایک اچھی تحریر

تھی۔ بے شمار خواہشیں انسان کو ایسے خوار کراتی ہیں۔ شکریہ ہے کہ رومیلہ کو عقل آجاتی ہے۔ "وہ ایک پری ہے" کا شعری انتخاب بہت لاجواب ہوتا ہے۔ بس ایک شکایت ہے کہانی کے صفحات بڑھا دیں۔ افسانے سارے بہترین تھے۔ "یادوں کے دریچے" میں اس دفعہ کا انتخاب لاجواب تھا۔ مستقل سلسلے اچھی کاوش تھے۔ اگر یہ تبصرہ کرن کے صفحات میں جگہ پا گیا تو آئندہ بھی حاضری لگاؤں گی۔ بہت ساری دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ۔

فاخرہ بھٹی۔۔۔ چونکی

السلام علیکم پاکستان، کرن ڈائجسٹ بلاشبہ ایک بہترین ڈائجسٹ ہے۔ اس میں لکھنے کا بہت بار سوچا، مگر ہر بار کچھ نہ کچھ وجوہات کی بنا پر یہ کام ادھورا چھوڑنا پڑا۔ اسی کشمکش میں گرمی گزری، برسات نے ڈیرے ڈالے، برسات کے بعد خزاں بھی جاتے ہوئے سردیوں کا پتا دے رہی ہے۔

انہی گزرتے دنوں میں ایک اسٹوری جس نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ "دردل" نبیلہ عزیز کی لاجواب تخلیق، نبیلہ تمہاری اس اسٹوری نے تو ہم سب کزنز کو اپنی گرفت میں لیا ہوا ہے۔ اس کے ہر کردار کے ساتھ تم بہت انصاف کے ساتھ پیش آرہی ہو۔ خاص طور پر "دل آور" اور "زری" تو کمال کے کردار ہیں۔ اگر حقیقی دنیا میں سچ مچ کا دل آور ہوا تو نبیلہ ضرور بتانا۔ میں تو اس سے لازمی ملنا چاہوں گی۔ دل آور کا زری سے نظریں نیچی کرکے بات کرنا سب سے اچھا لگتا تھا۔ زری اور دل آور کی ناکام محبت اداس رکھتی ہے۔

اب بات کروں گی "دست کوزہ گر" کی، عجیب ڈگر پر چل نکلی ہے۔ الیان کا رومیلہ کو طلاق دینا ذرا بھی اچھا نہیں لگا۔ الیان بہت برا کیا تم نے۔ "میرے ہمنوا کو خبر کرو" پہلے اچھی خاصی چل رہی تھی۔ اب یہ بھی بور کررہی ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے۔ مکمل ناول دو اقساط سے زیادہ نہ دیا کریں بور کرنے لگتا ہے۔ "وہ اک پری ہے" خوب جارہا ہے۔ اس میں سب سے اچھا کردار ملنگ بابا کا ہے۔ اس میں شاعری بھی بہت اعلا پڑھنے کو ملتی ہے۔ باقی کے تمام سلسلے بھی اچھے ہیں۔ میری آپ کے پورے اسٹاف سے درخواست ہے کہ آواز کی دنیا میں آپ میرے پسندیدہ آرجے کا انٹرویو تو لے چکے۔ ایف ایم 103 کے محسن نواز، صائم اور مدیحہ عالم کے بھی انٹرویو ضرور شائع کریں۔ شمع مسکان تمہیں ادھر دیکھ کر اچھا لگا، جیتی رہو۔ بہت سی دعاؤں کے ساتھ خدا حافظ۔

ثمینہ کوثر عطاری۔۔۔ ڈوگہ گجرات

السلام علیکم! کیسی ہیں آپ سب۔ ایک لمبے انتظار کے بعد کرن 18 کو ملا۔ سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ سب سے پہلے "دردل" پڑھا او ہو یہ کیا زری دونوں طرف سے گئی۔ نہ نبیل ملا، نہ دل آور شاہ۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ اس کے بعد اشعار پڑھے۔ سارے ہی اچھے تھے۔ مسکراہٹیں مسکرانے پہ مجبور کرتی رہیں۔ ڈائری سے فوزیہ کا انتخاب اچھا لگا۔ "میرے ہو کے رہو" بہت اچھا ناول تھا۔ افسانوں میں سب سے بیسٹ "کیا ملا محبت سے" تھا۔ ظل ہمانے بھی اچھا ہی لکھا ہے۔ مجھے وہ اسٹوریز اچھی لگی ہیں جس میں ظالم سماج اور ذات برادری کے مسائل بھی ہوں۔ گرمیاں ختم ہوئیں۔ ساون گزرا، مٹی کی سوندھی خوشبو ختم ہوئی، پر راحت جبیں نہ لوٹیں، ان کا شدت سے انتظار ہے۔ "دست کوزہ گر" بھی ٹھیک جارہا ہے۔ اتنا تبصرہ کافی ہے یہ نہ ہو ہم تبصرہ لکھتے رہیں اور ریحانہ آپی ہماری تحریر ڈسٹ بین میں پھینک دیں۔ تمام پڑھنے والیوں کو پیاری فرینڈ عطیہ اور الیس کو سلام اللہ حافظ۔

فوزیہ ثمر بٹ۔۔۔ گجرات

نومبر کا شمارہ بہت تگ و دو کے بعد اس بار 17 تاریخ کو ملا۔ بے تابی سے آخر کے صفحے کی طرف دوڑ لگائی اور خوشی سے باچھیں کھل گئیں کہ میرے خط کو قبولیت کی سند مل چکی ہے۔ حرا قریشی کا خط دل باغ باغ ہوگیا۔ کیا خوب صورت الفاظ کی جادوگری تھی۔ ایک ایک لفظ موتیوں کی طرح لگا۔ حرا آپ کے افسانے کا انتظار رہے گا۔ انٹرویوز اس بار کچھ بہتر محسوس ہوئے۔ میری بھی سننے میں ٹیپو شریف لگتے تو نہیں (میری ذاتی رائے ہے) مگر باتیں بہت اچھی اور مذہبی معلوم ہوئیں۔ اب دلوں اور نیتوں کے حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ "مقابل ہے آئینہ" سونیا ربانی نے اچھے جوابات دیے۔ فاخرہ گل کو میری طرف سے حج مبارک، کاش ہمیں بھی کبھی ایسی سعادت نصیب ہو مرنے سے پہلے۔

"تیسرا دروازہ" بہت اچھی تحریر تھی۔ مجھے تحریر کی فلاسفی اچھی لگی۔ عورت بھی کیا چیز ہے۔ ساری زندگی اک محبت اور عزت پانے کے لیے کیا کیا جتن کرتی ہے۔ تین مختلف عادات و رویے کے مردوں کی نفسیاتی کہانی کا نچوڑ یا شاید زندگی کا نچوڑ یہی ہے۔ نصیب ملے نہ ملے دل ضرور ملنے چاہئیں۔ ام حبیبہ کو آخر اس کی منزل مل گئی۔

"میرے ہو کر رہو" شروع میں رملہ کا کردار کچھ پسند نہیں آیا۔ مگر شکر ہے یمنیٰ کو دیکھ کے اسے کچھ عقل آگئی اور کچھ حیان کی محبت نے رملہ کو سرتاپا بدل دیا۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آتی یہ مرد حضرات دو، دو محبت کیسے کرلیتے ہیں۔ کیا ان کے سینے میں دو دل فٹ ہوتے ہیں۔ یمنیٰ سے بھی محبت اور دوسری شادی بھی محبت کی۔ بانو قدسیہ صاحبہ نے صحیح فرمایا ہے کہ مرد دریافت کا پرندہ ہے۔ ناولٹ میں "خدائے عصر" کچھ کچھ اچھی تحریر لگی۔ غربت، سندھ کی پرانی اور ظالمانہ رسومات، جاگیردارانہ لائف اسٹائل۔ کیا واقعی حقیقت میں نئی جنریشن ان بے ہودہ رسومات کو مٹانے میں کامیاب ہوئی ہے۔ حسن نواز کا کردار بہت اچھا لگا۔ کیا کوئی مرد بھی اتنا حساس، نرم دل ہو سکتا ہے۔ بابا سائیں کی فرعونیت ذرا پسند نہیں آئی۔ ایسا لوگوں کا انجام عبرت ناک ہی ہوتا ہے۔ اللہ پاک مکافات عمل سے بچائے۔ "خواب اور خواہش" نازو نے راہ مستقیم پہ چل کے آخر اپنی خواہشات کو پالیا۔ اگر شہلا کے بہلاوے میں آجاتی تو سوائے رسوائی اور آخرت خراب کرنے کے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ رائٹر نے سچ لکھا کہ جسے اللہ کی ہدایت مل جائے اسے کوئی بھی گمراہ کرسکتا ہے۔ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہمیشہ رب عظیم کی ذات ہوتی ہے۔ "کیا ملا محبت سے" ضوباریہ کی تحریر "عورت کہانی" یہ محبت کچھ بھی نہیں دیتی ہے۔ پیار میں کچھ لوٹ لیتے ہیں اور کچھ لوٹے جاتے ہیں۔ بس اسی اک جملہ میں زندگی گردش کرتی رہتی ہے اور ایک دن تمام ہوجاتی ہے۔ "ریت کے گھروندے" بھی سبق آموز کہانی تھی۔ ان عورتوں کے لیے جو اپنے شوہروں پر اندھا اعتماد کرتی ہیں اور ان کا اعتماد چکنا چور ہوجاتا ہے۔ "چھوٹی چھوٹی باتیں" بشریٰ احمد نے زندگی کی روزمرہ کی باتیں کہیں ہیں۔ مگر ہوتا اس کے برعکس ہے اگر ہم انہی باتوں میں عمل کریں تو شاید گھروں میں بے سکونی نہ ہو۔ مگر کیا کیجیے یہ اک لفظ انا ساری تباہی اس کی پھیلائی ہوئی ہے۔ حالانکہ عزت بڑائی، سب اس ذات کریمی کو ہی زیب دیتا ہے، انسان مٹی ہے اور مٹی ہی ہوتا ہے۔ پھر کیسی انا۔ مستقل سلسلے لاجواب تھے۔ "یادوں کے دریچے" میں آپ نے میری فیورٹ نظم شائع کرکے دل خوش کردیا۔ حالانکہ خوشی مجھے راس نہیں آتی۔ شاعری اس بار بہت دکھی تھی۔

صدف مختار۔۔۔ بوسال مصور

کرن کا شمارہ 18 نومبر کو ہاتھ آیا۔ ٹائٹل بس ٹھیک ہی لگا۔ مگر ٹائٹل گرل کی آنکھیں چند لمحوں تک مبہوت کرگئیں۔ ٹیپو شریف اور فیضان خواجہ سے ملاقات اچھی رہی۔ "دردل" پہلے دل آور کا علیزے سے نکاح ہونا، زری کا کوما میں جانا۔ نبیل کا مومنہ سے نکاح کا فیصلہ کرنا، پھر زری کا ہوش میں آنا، نبیلہ عزیز دھچکے پہ دھچکے لگا رہی ہیں۔ بہرحال تحریر اچھے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مگر پلیز دل آور کا ماضی اب کھول ہی دیں۔ "دست کوزہ گر" پر کبھی کبھی کسی ستارے کا گمان ہوتا ہے کہ جو بڑی آہستگی سے اپنے مرکز کے گرد حرکت کرتا ہے۔ جب تھوڑی تیزی آئی تو پھر رک گیا پھر چل پڑا۔ بہرکیف فوزیہ جی آپ کی تحریر کافی اچھی ہے۔ مگر بے جا طوالت ہمیں بے زار کررہی ہے۔ مجھے زوبیہ کے کردار میں کافی پر اسراریت محسوس ہوتی ہے۔ "خدائے عصر" بے حد متاثر کرگیا۔ خاص طور پر حسن نواز کا کردار حیرت میں غوطہ زن ہوگئی کہ کوئی اتنا بے رحم اور سنگدل کیسے ہوسکتا ہے کہ اپنی سگی بیٹی اور بیوی کی وفات پر بھی اسے غم نہ ہو اور اپنی بیٹی سے زیادہ کسی دوسرے پر اعتماد کرے۔ نواز بخش اپنے انجام کو پہنچا۔ ساری زندگی دوسروں کو تکلیفیں دینے والے کو مکافات عمل کی موت ملی۔ دنیا کا اصول ہے ناکہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ رافعہ کی موت کا بے حد دکھ اور شاہ نواز کی موت کا بھی افسوس ہوا کہ سمجھ جاتا تو نہ دوسروں کی زندگیاں ویران کرتا اور نہ اپنی آخرت۔

"تیسرا دروازہ" سدرہ جی نے اپنے نام کی طرح خوب صورت تحریر لکھی نشیب و فراز سے بھی یہ تحریر تقدیر نامی چیز کا احساس دلا گئی۔ خصوصاً "یوسف اور حرا اپنے معاشرے کے سانس لیتے کردار محسوس ہوئے۔ افسانوں میں ضوباریہ ساحر "کیا ملا محبت سے" دسمبر کی سرد کہر برساتی راتوں کی طرح پور پور اداسی میں لپٹی دل کو چھو گئی اور مجھے بھی خاموشی پر مجبور کرگئی۔ کچھ عرصہ پہلے ایک نظم پڑھی تھی کہ بیٹیوں کے نصیب بھی ماؤں جیسے ہوتے ہیں۔

"آرزوئے دل" بھی اچھی تحریر لگی۔ "ہمنوا کو خبر کرو" میری دوست نویرا فیری کی فیورٹ اسٹوری' جسے نہ پاکر میں اور نویرا دونوں چراغ پا ہوگئیں۔ "مقابل ہے آئینہ" سونیا ربانی کا انداز بیان پسند آیا۔

تبصروں میں حرا قریشی بڑے فلسفیانہ انداز میں طویل تبصرہ کرتی اچھی لگیں۔ ویسے حرا اتنے مشکل الفاظ مجھے مشکل میں ڈال گئے۔ (اچھی خاصی نالائق ہوں نا) "مسکراتی کرنیں" پڑھتے ہوئے میرے لبوں پہ تو خفیف مسکراہٹ چھب دکھاتی رہی۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" سب کے اشعار اچھے لگے۔ مگر خصوصاً "نواب زادی اور مدیحہ یوسف کا انتخاب اچھا لگا۔ "یادوں کے دریچے سے" شازیہ 'مریم ملک اور نازیہ رئیس کا انتخاب پسند آیا۔ بہرحال اب ان شاءاللہ مارچ میں شرکت کروں گی۔ کیونکہ ایول ایگزیم نزدیک ہیں اور ان شاءاللہ خوب محنت کرنی ہے اس شعر کے ساتھ اجازت۔

فرصتیں ملیں جب بھی رنجشیں بھلا دینا
کون جانے سانسوں کی مہلتیں کہاں تک ہیں

طیبہ محمد خالد۔۔۔ گڈیالہ

سب سے پہلے تمام ریڈرز اور رائٹرز کو پیار بھرا اسلام۔ مئی کے مہینے میں آپ کو ایک تحریر بھیجی تھی ساتھ ایک خط۔ لیکن آپ نے نہ خط شائع کیا' نہ ہی میری تحریر کو جگہ دی۔ پلیز اگر تحریر قابل اشاعت نہ ہو تو کم از کم خط ضرور شائع کیا کریں۔ اب بھی میں آپ وانپی 2 تحاریر بھیج رہی ہوں۔ پلیز اگر تحاریر نا قابل اشاعت ہوں تو خط ضرور شائع کیجیے گا۔ ورنہ میرا نازک سا دل ٹوٹ جائے گا۔ اب کچھ سوال کیا مجھ میں لکھنے کی صلاحیت ہے؟ کیا یہ تحریریں قابل اشاعت ہیں؟ اگر نہیں تو پلیز غلطیوں کی نشاندہی ضرور کیجیے گا۔ تاکہ میں انہیں درست کرسکوں۔ پلیز' پلیز' پلیز ان سوالوں کے جواب ضرور دیجیے گا۔ اگر اب میرا خط شائع ہوگیا تو میں آئندہ خط لکھ سکوں گی۔ ورنہ میرے گھر والے مجھے اس کی اجازت نہیں دیں گے۔ (میں اب بھی سب گھر والوں کی مخالفت کے باوجود آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔) نو دسمبر کو میری کزن کی برتھ ڈے ہے۔ میں اسے کرن کے ذریعے وش کرنا چاہتی ہوں۔ ڈیئر میرب ویری ویری ہیپی برتھ ڈے۔ اللہ عزوجل تمہیں ہزاروں خوشیاں عطا کرے۔ (آمین) اب اجازت دیں اللہ حافظ

ج ۔ پیاری طیبہ آپ کی تحریر اور خط ہمیں تاخیر سے ملے تھے۔ لہٰذا شائع نہیں ہوسکے۔ آپ کے دونوں افسانے ناقابل اشاعت ہیں۔ فی الحال مطالعے پر توجہ دیں۔ امید ہے آئندہ تفصیلی تبصرے اور بہترین افسانے کے ساتھ شرکت کریں گی۔

ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

نومبر کا شمارہ 11 تاریخ کو ملا۔ جبکہ اس کا انتظار تو پہلی تاریخ سے شروع ہوگیا تھا۔ وجہ "نامے میرے نام" میں شرکت تھی۔ اپنا خط پڑھ کر دل کو بہت خوشی ہوئی۔ تھینک یو ریحانہ آپی۔ آپ جیو ہزاروں سال۔۔۔ سال کے دن ہوں ایک ہزار (آمین) سب سے پہلے اداریہ پڑھا۔ اس کے بعد حمد و نعت سے فیضیاب ہوئے۔ انٹرویوز نہیں پڑھے۔ کیونکہ مجھے کہانیاں پڑھنے کی جلدی تھی۔ تاکہ مکمل تبصرے کے ساتھ دوبارہ "نامے میرے نام" میں حاضر ہوسکوں۔ آپی "نامے میرے نام" کے صفحے بڑھا دیجیے' تاکہ تمام بہنوں کے خط شائع ہوسکیں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں سونیا ربانی کے جوابات پسند آئے۔ سب سے پہلے افسانے پڑھے۔ ویسے تو سارے اچھے تھے۔ لیکن "کمپرومائز" اور "چھوٹی چھوٹی باتیں" بازی لے گئے۔ دونوں میں بہت زبردست میسج تھا۔ "ریت کا گھروندہ" وہ ہی پرانے موضوع پر تھی کہانی۔۔۔ لیکن اچھی تھی۔ عورت کو شوہر کے معاملے میں کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی عورت محبت کرتی ہے تو اس محبت کا حق ادا کردیتی ہے۔ جبکہ مرد محبت کرتا ہے تو اس کی محبت کچھ سالوں میں ختم ہوجاتی ہے۔ میں سارے مردوں کی بات نہیں کررہی ہوں۔ بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی شریک سفر کے ساتھ ہمیشہ وفادار رہتے ہیں۔ میری تو اس سوہنے رب سے دعا ہے کہ میری زندگی میں جو بھی آئے وہ مجھ سے مجھ جیسی محبت کرے۔ وہ کبھی بے وفائی نہ کرے۔ میرے ساتھ ہمیشہ مخلص رہے اور صرف میرا ہوکے رہے۔ (آمین ثم آمین) آپ سب بہنیں بھی آمین کہہ دیجیے۔ اب آتے ہیں ناولٹ کی طرف' ناولٹ دونوں اچھے تھے۔ مگر۔۔۔ "خدائے عصر" بیسٹ تھا۔ واقعی برائی کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔ آپ اچھا کریں گے۔ تو اس کا جواب اچھائی کی صورت میں

سامنے آئے گا۔ برائی کا نتیجہ ہمیشہ برا ہی نکلتا ہے۔ مکمل ناول ابھی نہیں پڑھے۔ کیونکہ خط بھیجنے کی جلدی ہے۔ "کرن کرن خوشبو" میں سب کا انتخاب پسند آیا۔ اگلی دفعہ ان شاءاللہ تفصیلی تبصرہ کے ساتھ شرکت کروں گی' خدا حافظ۔

شمع مسکان۔۔۔ جام پور

السلام علیکم! کیسی ہیں آپ سب؟ میں آپ سب کی خوشیوں' خواہشوں کے لیے دعاگو ہوں۔ کئی ماہ کی غیر حاضری کے بعد آج پھر قلم اٹھایا ہے۔ افسوس ہوا یہ جان کر کہ میری کسی قاری فرینڈ نے میری غیر حاضری کو محسوس نہیں کیا۔ خیر۔۔۔ موسم کی بدلتی کیفیت اور ہمارے دل کی بدلتی کیفیت نے روح پر عجیب بے زاری سی طاری کردی ہے۔ بس ڈائجسٹ دیکھنے کے علاوہ کچھ دیکھنے کو دل نہیں کرتا اور ڈائجسٹ پڑھنے کے سوا کچھ پڑھنے کو دل نہیں کرتا ــــــــــــ اس ماہ ہمارے خوبرو شہزادے نے اپنی جھلک 14 تاریخ کو دکھائی۔ 10 محرم سے ایک دن پہلے۔ نو محرم کو۔ سرورق پر ماڈل سیاہ لباس زیب تن کیے محرم کا ہی احساس دلا گئی۔ بس ذرا سر پر دوپٹا بھی ہوتا تو۔۔۔

سب سے پہلے دل سوز ناول "دردل" پڑھا۔ جس سے دل کا درد اور بڑھ گیا۔ افسوس ہوا یہ پڑھ کر کہ نبیل 'مومنہ بی بی سے نکاح کررہے ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک اچھا قدم ہے۔ مگر زری کا کیا ہوگا؟ چلو زری کو ہوش تو آیا۔ دل آور شاہ پر ترس اور اس کے حوصلے پر رشک آتا ہے۔ نبیل کا ٹوٹا بکھرا اظہار ہماری آنکھیں نم کرگیا۔ پلیز نبیلہ جی اسے زیادہ طول مت دیں اور پاسٹ اوپن کردیں۔ نہ جانے مجھے ایسا کیوں لگا کہ دل آور شاہ' بتول شاہ کے سگے بیٹے نہیں ہیں۔ آگے چل کر دیکھتے ہیں کہ میرا خیال غلط ہے یا صحیح۔ اس کے بعد فوزیہ یاسمین کا "دست کوزہ گر" پڑھا۔ ارے میں تو طلاق کو الیان کا کوئی گیم سمجھی تھی۔ مگر یہ تو سچ تھا۔ بہت غصہ آیا الیان پر اور کچھ وہ بزدل بھی لگا کہ اس نے حالات کا اینڈ صرف رومیلہ کی طلاق سمجھا۔ اب اگر دوسری شادی کرنے پر بھی شگفتہ غفار کا لی ہیویر ایسا ہی ہوا تو کیا الیان اسے بھی طلاق دے دے گا۔ بہت دل گرفتہ ہوئے اسے پڑھ کر اور مجھے لگتا ہے۔ زوبیہ اب جب بھی ملے گی تو وہ شائستہ خالہ کے فیز سے نکل چکی ہوگی۔ دیکھیں فوزیہ جی

کے آثار کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ کہیں زوبیہ اور الیان کو نہیں ملادینا۔

اس ماہ جہاں فاخرہ گل کی قسط نہ پاکر مایوسی ہوئی وہیں ان کے حج کی سعادت حاصل کرنے پر خوشی ہوئی۔ فاخرہ جی آپ کو حج کی بہت بہت مبارک ہو..... مکمل ناولز میں پہلے فرحت عمران کی تحریر پڑھی۔ "میرے ہو کے رہو" اس سے جانا کہ مادیت پرستی انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ مادی اشیا سے اہم رشتے ہوتے ہیں۔ مادی اشیا سے محبت پیارے رشتوں کی محبت کھودیتی ہے۔ اشیا کے بغیر تو گزارہ ہو سکتا ہے۔ مگر محبت نہ رہے تو رشتے مجبوری بن جاتے ہیں اور مجبوری کے رشتے زیادہ پائیدار نہیں ہوتے۔ طویل ٹائم ساتھ نہیں چلتے۔ جلد ہی یہ ڈور ٹوٹ جاتی ہے۔ جس کا سب سے زیادہ نقصان لڑکی کو ہوتا ہے۔ شکر رملہ جلد سنبھل گئی۔ اس نے یمنی کی زندگی سے سبق لے لیا۔ سدرۃ المنتہیٰ کی تحریر "تیسرا دروازہ" بہترین تحریر تھی۔ اس میں مجھے ام حبیبہ کا دوسرا شوہر' یوسف کمپلیکس کا مارا ہوا سائیکی کیس لگا۔ مولویوں کی یہ قسم بھی ہماری نظروں سے گزر چکی ہے۔ ام حبیبہ کو صبر سے کام لینا چاہیے تھا۔ اسے اپنے پہلے شوہر سے طلاق نہیں لینی تھی۔ اللہ تعالیٰ سے اس کی ہدایت کی دعا کرتی' کیا پتا اللہ تعالیٰ اسے ہدایت دے دیتا اور وہ برائی چھوڑ دیتا۔ رؤف کا کردار بہت اچھا تھا۔ بس وہ بیوی کو خوش رکھنے کے چکر میں اپنی جنت کو ناراض کر گیا۔

ناولٹ میں "وہ اک پری ہے" ریحانہ امجد بخاری کی یہ قسط بھی لاجواب تھی۔ چلو فیضان کو اپنے رشتے یاد تو آئے۔ مگر اب محبت کرنے والی بیوی نہیں ملے گی۔ ویسے ریحانہ جی آپ کی تحریر میں فلسفہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ ماہم کو اب پچھتاوا ہوگا اپنے رویے پر' یہ جان کر کہ اذان کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ لبنیٰ طاہر کی "خواب اور خواہش" ایک سبق آموز تحریر تھی۔ شہلہ جیسی دوست سے تو بچ کر رہنا چاہیے۔ جو خود بھی گمراہ ہوں وہ دوسروں کو بھی اندھیرا ہی دکھاتا ہے۔ نازنین اپنے ماں' باپ کی دعاؤں اور اپنی کسی نیکی کی وجہ سے اس گناہ کی دلدل میں دھنسنے سے بچ گئی۔ جب اسے اپنے حالات پر صبر کرنا آگیا تو اللہ تعالیٰ نے عذیر کی صورت اسے انعام سے نواز دیا۔ اس ماہ پورے رسالے کی جان "خدائے عصر" اک جانا پہچانا نام سعدیہ عزیز آفریدی نے خوش ہی کردیا۔ خوب صورت پیرائے میں لپٹی دلکش تحریر میلہ لوٹ لے گئی۔ حسن نواز جیسا خوب صورت کردار ہمارے معاشرے میں حقیقت میں آجائے تو تمام دیہاتوں سے جاگیردارانہ رسموں' رواجوں میں جکڑی جہالت کو ختم کردے۔ ڈاکٹر فرحانہ پر تعجب ہوا۔ اتنی پڑھی لکھی ہونے کے بعد بھی اس کی سیکنڈ وائف بن گئیں۔ اس کے تمام سنگ دل رویوں کے باوجود' بہرحال احسن کا ہر فیصلہ قابل تحسین تھا۔ افسانوں میں' سیدہ ضوباریہ کا نام پڑھ کر اس کا افسانہ سب سے پہلے پڑھا۔ اچھی کاوش تھی۔ "چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات" کے مصداق لگا یہ افسانہ۔ "کیا ملا محبت سے' زیست کے گھروندے" اور "آرزوئے دل" نے کافی متاثر کیا۔

اب آتے ہیں مستقل سلسلوں کی طرف "یادوں کے دریچے" سے۔ شازیہ مریم' صابرہ یار محمد اور نمرہ اقرا کا انتخاب پسند آیا۔ "کرن کرن خوشبو" سے حافظ فوزیہ سلیم' سنبل تحریم اور کنول شاہین کے انتخابات اچھے تھے۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں سدرہ اکرام' صائمہ خان' زیب یوسف' امبر گل' رانی (کراچی) کے اشعار بیسٹ تھے۔ "مسکراتی کرنیں" میں شمسہ واحد' یمنی خان اور ثمینہ سلیم کے انتخابات نے بے ساختہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی انٹرویو میں۔ فیضان خواجہ سے مل کر اچھا لگا۔ "میری بھی سنیئے" کی پکار پر لبیک کہا اور خوبرو آرٹسٹ ٹیپو شریف کی باتیں سنیں اور بہت اچھا لگا ٹیپو کے بارے میں جان کر..... آواز کی دنیا سے عظمیٰ بلوچ کو کبھی سنا ہی نہیں۔ مگر اب پڑھا ضرور ہے۔ بہت خوش اخلاق اور چلبلی لگیں اپنے جوابات سے۔ "مقابل ہے آئینہ" میں سونیا ربانی سے مل کر بہت اچھا لگا۔ آپ کی اور میری ایک عادت یکساں ہے کہ آپ بھی اپنا وقت ڈائری اور ڈائجسٹ کے ساتھ گزارتی ہیں اور میں بھی..... فرق بس اتنا ہے کہ آپ اپنا خوشگوار وقت ان کے ساتھ گزارتی ہیں۔ جبکہ میری یہ چیزیں میری غم گسار ہیں۔ میری تنہائی کی ساتھی۔ پچھلے مہینے انا کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی یار۔ بس تبصرہ نہیں کر سکی۔ "نامے میرے نام" میں حرا قریشی کا طویل اور جامع تبصرہ بیسٹ تھا۔ جبکہ عائشہ خان کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ عائشہ خوشی ہوئی کہ آپ کے ہسبینڈ نے آپ کا تعلق رسائل سے نہ توڑنے دیا۔ اچھا ڈیر! قارئین اجازت چاہتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ کرن کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)